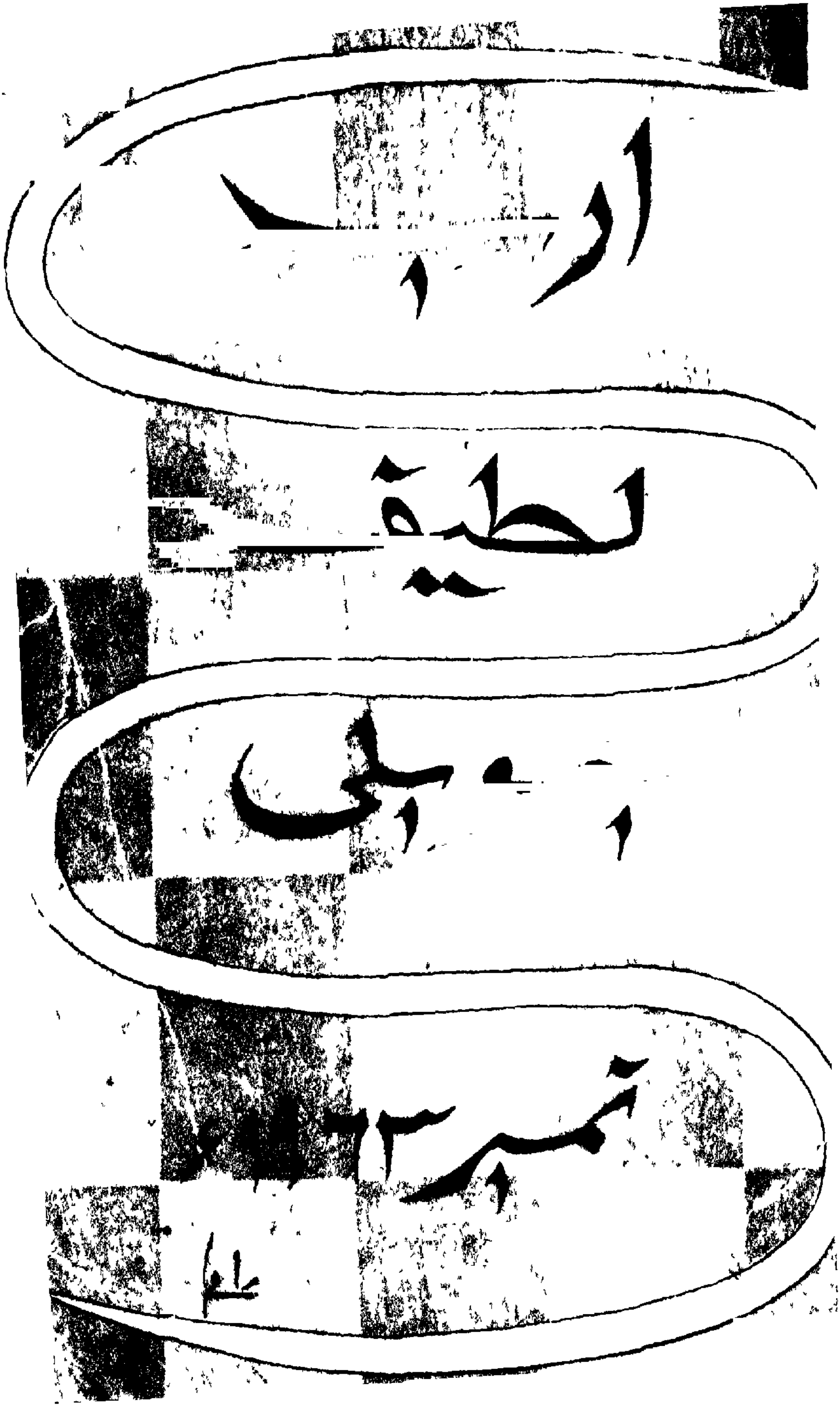

لطيفة



چوہدری برکت علی مرحوم



جناح باغ کی ایک شام !

ادارہ ادب لطیف کی دعوت پر باغ جناح کی ایک حسین شام کو مغربی پاکستان کے ادیبوں شاعروں اور صحافیوں کا ایک نمائندہ اجتماع ہوا جس میں اردو کے بزرگ انشا پرداز بھی شامل ہوئے اور نوجوان فنکار بھی —— یہ فوٹو گروپ اسی اجتماع کی یادگار ہے۔

اگلی صف میں دائیں سے بائیں : عبداللہ ملک ، مولانا چراغ حسن حسرت ، مولانا صلاح الدین احمد
قیوم نظر ، عبدالمجید بھٹی ، احمد ندیم قاسمی ، چوہدری برکت علی .
اے حمید ، حمید اختر قریشی ، ابراہیم جلیس ۔

پچھلی صف میں دائیں سے بائیں : تنویر نقوی ، یوسف ظفر ، احمد راھی ، ایوب سرور ، طفیل احمد خان ،
فضل سفائی ، اکرم افگار ، حسن طاہر ، جمیل ملک ، میرزا ادیب اور
شریف کنجاھی نظر آ رہے ھیں ۔



محمد حسن عسکری



ممتاز شیریں



قرة العين حيدر



منیر خاتون بیگم

ادبِ لطیف

ایڈیٹر

انتظار حسین

جوبلی نمبر ۶۳ء

شمارہ نمبر ۲-۳

جلد نمبر ۲۳

بنیاد گذار ——— چودھری برکت علی مرحوم و مغفور

مینجنگ ایڈیٹر ——— افتخار علی چودھری

ناشرین ——— دفتر ادبِ لطیف سرکلر روڈ لاہور

طابعین ——— اردو پریس لاہور

قیمت فی شمارہ: ——— ———

سالانہ چندہ ——— دس روپے، بیرونِ ممالک بارہ روپے

منظور شدہ برائے مدارس کراچی و مغربی پاکستان بموجب سرکلر 53506/54 مورخہ 1954ء

ترتیب

پہلا لفظ

"ادبِ لطیف" نے پچیس برس پورے کر لیے۔ اس عرصے میں اس نے ایک ادبی دور کو ابتدا کرتے اور انجام پاتے دیکھا۔ اب وہ ایک مختلف عہد میں سانس لے رہا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی، فیض احمد فیض، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی ——— مگر نام گنانے کی رسم مجھے ادا نہیں کرنی چاہئے۔ دراصل میں یہ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس رسالے کی ادارت تھوڑے تھوڑے وقفوں کے ساتھ ایسے لوگ سنبھالتے رہے ہیں جنہوں نے ہمارے ادب میں ایک وقت کے ممتاز رجحانات کی نمائندگی کی ہے۔ رسالے تو ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا نہ اڈیٹر بدلتا ہے نہ پالیسی۔ ایسے رسالے بھی ایک معنی رکھتے ہیں کہ وضع داری کی بھی تو ہماری تہذیب میں ایک قیمت ہے۔ مگر دقت یہ ہے کہ ادب کی وضع بدلتی رہتی ہے۔ اور ایک جیتے جاگتے رسالے کو زمانے کی تبدیلی کے ساتھ نئے سرے سے اپنی وضع قائم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یوں کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ۳۶ء کے بعد زمانہ بدلا ہی نہیں اور اب ادبی جمود ہے۔ مجھ ایسے لوگ یہ بات اس لئے نہیں مانیں گے کہ وہ ۳۶ء کی روایت کو بانجھ تصور نہیں کرتے۔ ایک ادبی روایت کی قدر و قیمت اس بات سے متعین ہوتی ہے کہ اس میں کسی نئی ادبی روایت کو جنم دینے کی کتنی صلاحیت ہے۔ آخر ادبی روایت کو اندھی گلی تو نہیں ہونا چاہئے۔

ہر ادبی روایت میں کچھ کمیاں اور کچھ گنجائشیں ہوتی ہیں۔ یہ کمیاں اور گنجائشیں ایک نئی ادبی روایت کے لئے زمین ہموار کرتی ہیں۔ اور ۳۶ء کی ادبی روایت میں ایک بڑی کمی یہ تھی کہ وہ یورپ کی انیسویں صدی میں بھٹک رہی تھی، اپنے افکار کے اعتبار سے بھی اور اپنے اسالیب بیان کے اعتبار سے بھی۔ یہ بات شاید افسانے کے واسطے سے زیادہ واضح ہو سکے۔ رومانی حقیقت نگاری کا وہ اسلوب جسے ۳۶ء کے افسانے نے اپنایا اپنے اس حقیقت کے تصور کے ساتھ جس کے پیٹ سے وہ پیدا ہوا تھا یورپ میں انیسویں صدی کے ساتھ ساتھ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ یوں بیسویں صدی میں بھی وہاں سومرسٹ ماہم جیسے بزرگ پیدا ہوئے مگر یہ مارکیٹ میں بکتے ہوں گے بیسویں صدی کے طرز احساس کی نمائندگی کا شرف ان کو حاصل نہیں ہے۔ مگر وہاں خود انیسویں صدی میں ایسے جنات پیدا ہو گئے تھے جن کا قد انیسویں صدی سے نکلتا ہوا تھا۔ آخر روسی فکشن کی روایت نے دستوئفسکی اور چیخوف کو بھی تو جنا تھا۔ مگر ہم نے اس روایت کے سب سے ضعیف آدمی گورکی صاحب کو قبلہ و کعبہ بنایا۔ اور ممتاز شیریں کی علمیت کا رعب مجھ پر نہ ہوتا تو میں ان سے یہ ضرور استفسار کرتا کہ موپساں صاحب کہاں کے بڑے ہیں۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عہد کے جنسی افسانے کے لئے لارنس سے سند کیونکر حاصل کی گئی۔ کیونکہ غریب لارنس نے تو جنسی جذبہ کو کبھی مکروہ شے نہیں سمجھا تھا۔

بیسویں صدی کی پیدائش کی اطلاع ہمیں ۴۷ء کے بعد ملی۔ لیکن یورپ سے اطلاع کا آنا ایک بات ہے اور کسی نئی بصیرت سے بہرہ ور ہونا دوسری بات ہے۔ اس نئی بصیرت سے بہرہ ور ہونے کے لئے ہمیں دکھ سکھ کی ایک بڑی واردات سے گزرنا پڑا۔ ۴۷ء اور ۴۸ء میں جو کچھ لکھا جا رہا تھا وہ اسی پچھلے عہد کی بصیرت کی روشنی میں فسادات اور ہجرت کی دکھ بھری واردات کو سمجھنے

اور تفسیر کرنے کی کوشش تھی۔ لکھنے والوں میں سے بہت سے اس تفسیر سے مطمئن ہو گئے لیکن ایسے لکھنے والے بھی تھے جو اس تفسیر سے مطمئن نہیں تھے۔ اس بے اطمینانی کی وجہ تھی۔ آزادی اور ہجرت کے بعد ہم نے اپنے آپ کو دو ٹکڑے کرتے ہوئے پایا تو کبھی ہم نے اپنے آپ سے منسوب نہیں کیا تھا اور شفا کے وہ سب نسخے جو ہم نے پچھلے عہد میں سوچ رکھے تھے ایک ایک کر کے بے اثر ہو گئے اور ہمیں شفا نہ بخش سکے۔ یہ احوال دیکھ کر ہمارے یہاں اپنے آپ سے بے اطمینانی شروع ہوئی اور اس شک نے جنم لیا کہ کہیں ہم نے اپنے آپ کو غلط تو نہیں سمجھا تھا۔ یہ بے اطمینانی اب ہمارے عہد کا مقدر ہے اور اپنے آپ پر شک اس نئی بصیرت کا حصہ ہے جسے ہمارے عہد کی اذیتوں نے جنا ہے۔ اپنے فعل و عمل کے بارے میں خوش فہمی ختم ہو گئی اور تفتیش کی کارروائی شروع ہوئی۔ یہ تفتیش ہمیں دور دور لے گئی۔ کھلا یہ کہ آج کے عمل کو آج کے چوکٹھے میں مقید کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ کل ہم کیا کر چکے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے تحت وہ افسانہ پیدا ہوا جس میں آج کو گذشتہ تہذیبی عمل اور سیاسی تاریخ سے پیوست کر کے سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ قرۃ العین حیدر نے "آگ کا دریا" لکھا۔ اس کے بعد خدیجہ مستور کا ناول "آنگن" اور عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" شائع ہوا۔

اپنے عیب و ہنر سے قطع نظر یہ ناول اپنے آپ کو اجتماعی سطح پر سمجھنے کی کوشش ہیں۔ اپنے آپ کو اجتماعی سطح پر سمجھتے سمجھتے ہم ایک اور وادی میں داخل ہو گئے ——— انسان بحیثیت فرد کیا شے ہے؟ اس سوال کا پیدا ہونا تھا کہ ۳۶ برس کے رومانی آدمی نے آخری ہچکی لی اور قضا کر گیا۔ اور اس شک نے جنم لیا کہ شاید آدمی ویسا نہ ہو جیسا اسے پچھلے عہد میں تصور کیا گیا تھا۔ اس شک کے تحت تفتیشِ ذات کی کارروائی شروع ہوئی۔ خالدہ اصغر کے نئے افسانے کچھ اسی سمت میں جاتے نظر آتے ہیں۔ اپنے آپ کو اپنے آپ سے قطعی طور پر الگ کر کے دیکھنے کی خواہش نے ان کے یہاں ایک معروضی رویئے کو جنم دیا اور وہ جذباتیت رخصت ہو اس سے پہلے کے افسانے میں اپنے آپ تک پہنچنے میں ہمیشہ حائل رہی۔ اس معروضی کا اثر یہ ہوا ہے کہ ان کے یہاں جذبہ جذباتیت کے واسطے کے بغیر معین لفظوں میں ادا ہوتا ہے اور اندر کی واردات بغیر کسی شاعرانہ لاگ لپیٹ کے ٹھوس خارجی تصویروں میں بیان کی جاتی ہے۔ "ایک بوند لہو کی" (کہ ادبِ لطیف کے پچھلے سالنامہ میں شائع ہوا) جس طرز کا افسانہ ہے اس سے اردو افسانے کی نئی نہج کا پتہ ملتا ہے۔ اور اس طرز میں ہمیں اردو افسانے کی زبان بھی بدلتی نظر آتی ہے۔ بیان کی فالتو رنگینی اور الفاظ کا بافراط استعمال یہاں نہیں ملے گا۔ جذبہ کو معین لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کے تحت افسانوی نثر مرحلی شاعرانگی سے قطع تعلق کر کے ایک نیا دردرا سا آہنگ پا رہی ہے۔

معروضی رویہ ایک اور رنگ لایا ہے۔ جذباتی رویہ نے تو اس مفروضے کو جنم دیا تھا کہ ارد گرد بدی ہی بدی ہے۔ اور میں واحد متکلم نیک ہوں اور اس لئے مظلوم ہوں، شہید ہوں۔ مگر معروضی رویئے کے تحت شک اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے، کہ شاید جو کچھ ارد گرد ہو رہا ہے اس میں میرا بھی حصہ ہے۔ گویا لکھنے والا پہلے خود اپنے آپ کو سولی پر چڑھا لیتا ہے اور یہ گنجائش ہی نہیں رہنے دیتا کہ مظلوم یا شہید کا روپ دھار سکے۔ شاید اسی لئے آج کا لکھنے والا قارئین کی دنیا میں ہیرو کا مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔

آج کا لکھنے والا قارئین کی دنیا میں ہیرو کا مرتبہ حاصل نہ کرے مگر دلوں اور دماغوں پر اسے اثر انداز ضرور ہونا چاہئے۔ مگر شاید اس عمل میں آج رخنہ ہو گیا ہے۔ اور یہاں سے ہمارے عہد کی نحوست شروع ہوتی ہے۔ ہمارے عہد میں ادب کو ایک معاشرتی طاقت کی، ایک تحریک کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اور جب ادب کے ساتھ کوئی خرابی واقع ہو تو اس کے اسباب ادب کے اندر نہیں ادب

سے باہر تلاش کرنے چاہئیں اس لئے کہ ادب کوئی خود مختار مملکت نہیں ہے۔ ہماری زندگی میں خارجی اور باطنی سطح پہ جو عوامل کارفرما رہتے ہیں ادب انہیں کا حاصل ہوتا ہے۔ ادب کی خوبی اور خرابی کو سمجھنے کے لئے ان عوامل کو سمجھنا چاہئے۔ جو معاشرہ اپنے آپ کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے اس میں ادب تحریک نہیں بن سکتا، بس اکیلے آدمی کا سفر بن سکتا ہے۔

آج کی بصیرت ایک سے قبر روح کی مثال بھٹکتی ہوئی بصیرت ہے۔ وہ تحریک نہیں بن سکی کہ اس راستے دلوں اور دماغوں میں گھر کرتی۔ ایسا وقت ادب پر ہمیشہ بھاری گزرا ہے۔ پھر ادب پروری فروغ پاتی چلی جاتی ہے مگر ادب کا وقار ختم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور ادیبوں کی گنتی دن بدن بڑھتی ہے مگر ادیب اکیلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ تخلیقی سرگرمی میں اکیلا رہ جانا بہت کٹھن ہوتا ہے۔ چیخوف نے بھی یہی کہا تھا اور یہ ہشتر کے سفر کی بھی یہی داستان ہے۔ یعنی پھر تخلیقی آدمی ویرانے کا مسافر ٹھہرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ تخلیقی سرگرمی اپنی جگہ ایک مسلک ہے۔ اسے کسی غیر تخلیقی مسلک کے ساتھ پیوند نہیں کیا جا سکتا۔ گداگری ایک غیر تخلیقی مسلک ہے۔ اور گداگری کو لاکھ نام دیجئے وہ گداگری ہی رہے گی۔ مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگنے یا خراج یا وظیفہ۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں لکھنے والے قلندر بھی ہوتے ہیں اور صاحب طبل و علم بھی۔ مگر گداگر وہ کبھی نہیں ہوئے تھے۔

تخلیقی سرگرمی بطور ایک مسلک کے ابھی پچھلے عہد تک قائم تھی۔ ہم سے پہلے کے لکھنے والے اپنی مظلومی کا رونا روتے بھی تھے تو اسے خلقت کی مظلومی سے پیوند کر کے اس میں کوئی معنی پیدا کر لیتے تھے۔ یہ ہمارے دیکھتے دیکھتے ہوا کہ ادیبوں نے خلقت کی مظلومی کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنی مظلومی کو جھنڈے پہ چڑھایا اور پنچایت کر کے گداگری کا طریق اختیار کیا۔ پتہ نہیں ہماری ادبی روایت پر یہ جو کلنگ کا ٹیکا لگا ہے وہ چند اچھے افسانوں اور اچھے شعروں سے دھل سکے گا یا نہیں۔

انتظار حسین

مقالے :

ڈاکٹر سید عبداللہ
محمد حسن عسکری
ڈاکٹر عبادت بریلوی
مظفر علی سید
سجاد باقر رضوی
فتح محمد ملک
اعجاز احمد

ڈاکٹر سید عبداللہ

رومانیت

اور جب ہم اپنی لغات الفنون کی ترتیب کے دوران **رُومانیت** کی اصطلاح پر آئے تو اپنی بے چارگی کا گہرا احساس ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ لفظ جتنا دل خوش کن اور دلچسپ ہے اتنا سہل اور بآسانی قابلِ تشریح نہیں۔ لغات اور فرہنگ اور اصطلاحات کے سائیکلوپیڈیا اور نقادوں کی رائیں — ایک ایک اور سب کی سب الگ الگ کہانی سنا رہی تھیں۔

اُردو لغات الفنون کے مرتبین کو یہ بھی احساس تھا کہ رومانیت کا ایک دبستانِ خاص اگرچہ مغربی ادب سے متعلق ہے تاہم رومانیت کا لفظ ایک خاص مزاج اور خاص طرزِ احساس کی بھی تو نمائندگی کرتا ہے۔ لہٰذا یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارے اپنے ادب میں یہ نمائندگی کن صورتوں میں ظاہر ہوئی — یہ جاننا ہمارے لیے اس وجہ سے بھی ضروری تھا کہ ہماری لغات الفنون زبانِ اردو میں لکھی جا رہی ہے — اور ظاہر ہے کہ اس زبان کی تعمیر میں فارسی وغیرہ نے بھی حصہ لیا ہے۔ پس لازم ہوا کہ یہ معلوم ہو کہ اُردو فارسی شاعری میں رومانیت اظہار کی کیا شکل اختیار کرتی رہی۔

اگر فیصلہ گوئٹے پر چھوڑ دیا جائے تو پھر اس کی رائے میں رومانیت ایک مرض ہے۔ اس کے نزدیک تخلیقی عمل یا مزاج کی یہ کوئی صحت مند صورت **نہیں**۔ گوئٹے نے صاف صاف کہہ دیا کہ رُومانی مسلک مریضانہ مسلک ہے اور یہ بھی کہ اچھا ادب پارہ ہمیشہ وہ ہوگا جو کلاسیکیت کے اصولوں کی پیروی کرے گا۔ لیکن نابغہ ہستیوں کی ایک کوتاہی ازل سے چلی آتی ہے کہ وہ خود تضاد کے بیمار ہوتے ہیں۔ گوئٹے نے کم سے کم دو کتابیں ایسی لکھی ہیں جن میں رومانیت موجود ہے اور پھر بھی ان کا شمار عظیم کتابوں میں ہوتا ہے — اول ورتھر کے غم، دوم فاؤسٹ — پھر کیا شاہکار رومانی ادب سے خارج ہیں؟ یا یہ بڑی کتابوں میں شمار نہیں ہوتیں — ؟

یہ مثال میں نے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے پیش کی ہے کہ رُومانیت کے صحیح مفہوم نیز اس کے کیف و کم کی تعیین اور شناخت میں اتنی دشواریاں ہیں کہ بڑے بڑے نابغہ نقاد بھی لڑکھڑا جاتے ہیں اور آج ہم رومانیت کے متعلق اگر کوئی معین بات کہنا چاہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ رومانیت کے معنی رومانیت ہیں — !

پھر بھی دور دور کی حد قائم کی جا سکتی ہے اور اس مضمون کی حد بھی یہی ہے۔

رُومانیت کا ایک ڈھیلا سا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ایسے اسلوبِ اظہار یا اندازِ احساس کا اظہار کرتی ہے جس میں تخیل پر فکر و تفکر کی گرفت مضبوط نہ ہو۔ رسم و روایت کی تقلید سے بالکل منہ موڑ کر خیالات کو سیلاب کے پانی کی طرح جدھر ان کا رُخ ہو ادھر ان کو آزادی سے بہنے دیا جائے۔ یوں ہر انسان کے مزاج میں کچھ نہ کچھ رومانیت ضرور رہتی ہے۔ ہر انسان اپنے لیے ایک خیالی دنیا بساتا ہے اور اندر ہی اندر اس کی تکمیل کا آرزو مند رہتا ہے — اس کے پورا نہ ہونے سے مغموم و متفکر ہوتا ہے اور اس کے حصول میں ذرا سی کامیابی سے بھی مسرور ہو جاتا ہے۔

اتنی رومانیت ہر انسان میں ہوتی ہے — آرزوؤں کی خیال دنیا! مگر ہر رومانی تخیل ضروری نہیں کہ تخلیقی بھی ہو۔ اس کا کم و کیف بھی دھما ہوتا ہے — اہلِ ادب و فن کی فطرت میں رومانیت کا زور اور جوش ہوتا ہے۔ رومانی تخیل کی تعریف پانسریج لا فونتین نے خوب کی ہے:-

"بیسیوں دن کے سہانے خواب ہوتے ہیں۔ ان خوابوں کا تجربہ کرنے والے وہ بھی ہوتے ہیں جن کی نیم مدہوشیاں حکمت کا نشہ لے ہوتی ہیں اور وہ بھی جو احمقوں کی جنت کے باسی ہوتے ہیں — مگر یہ خواب بڑے سہانے اور بڑے ہی شیریں ہوتے ہیں۔ ایسے سراب کہئے یا فریبِ خیال — ہم اس کی رَو میں بہہ جاتے ہیں۔ ہم اپنی بساط کو کچھ زیادہ ہی سمجھنے لگتے ہیں کہ دنیا کی ہر قیمتی اور حسین شے ہمارے ہی لیے بنی ہے اور بس ہماری ہے۔"

دراصل اس بہشتِ غفلت کی تہ میں حقائق کی تلخیوں سے گریز کی خواہش کارفرما ہے — گریز کی یہ خواہش شیریں اور سہانے خوابوں کی شکل اختیار کرتی ہے اور رسمیات کی اِس دنیا سے دُور جاکر شورِ بے قیدی اور ذوقِ آزادی کو جنم دیتی ہے — بعض رومانی مزاجوں کے معاملے میں یہ ذوقِ آوارہ گردی اور ہرزہ گردی کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ بعض رومانی مزاج ادیب عجائبات کے شائق ہوتے ہیں اور بچوں کے مانند تخیل کے تماشا خانے میں محظوظ و مسرور رہتے ہیں۔ روسو کے ایک خط کے یہ فقرے اس کے تخیل یا آرزو کی کتنی اچھی تصویر کھینچتے ہیں:-

"میں اپنے خوابوں میں گُم رہنا چاہتا ہوں — آزادی سے، فارغ البالی سے — اِس طرح کہ میرا دل تخیل کے گل گشت میں بے روک ٹوک پھرے — ... میری انتہائی خوشی اس میں ہے کہ میں بے غم پھرتا رہوں — تنہا درختوں میں — چٹانوں پر — تاکہ میں آزادی سے جو چاہوں سوچوں، یعنی ضابطے اور رسم کی ہر قید سے آزاد - بالکل آزاد" یہ تحریر، روسو کی ہے۔ روسو کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تخیل تہذیب کی پُرتکلف زندگی سے گریزاں تھا۔ اسی وجہ سے اس نے بدویانہ سادگی یا بدویانہ وضعِ زندگی (PRIMITIVISM) کو اپنا محبوب تصور بنا لیا تھا بلکہ اس نے اس بدویانہ کو حکیمانہ اسلوب کی حیثیت دے رکھی ہے چنانچہ اس نے لکھا ہے:-

"— قطار اندر قطار — درختوں کے جھنڈ — میں ان کے اندر گھس جاتا تھا اور اِس عالمِ بے خودی میں مجھے ابتدائے فطرت کے وہ صبح و شام نظر آجاتے تھے جو انسانی تاریخ کا قابلِ فخر حصہ ہیں —"

روسو اسی لیے فطرت کا عاشق تھا کہ اُسے اس کے اندر وہ تصویریں نظر آتی تھیں جن کے چہرے ابنِ آدم کے غلط کار ہاتھوں سے مسخ نہیں ہوئے تھے اور جن کو تہذیب کے فریب کارانہ ہتھیاروں سے انسان کی انگلیوں نے بگاڑ کر نہیں رکھ دیا تھا — فطرت سے روسو کی محبت کا اصلی راز یہی ہے۔

فطرت کی گود میں سر رکھ دینے کی اسی آرزو نے روسو کو مصنوعی تہذیب کے ہر رنگ محل کی شکست و ریخت پر آمادہ کیا — اور انہی جذبوں کے تحت مصنوعی معاشرے کی ہر قید سے آزادی اور ہر قسم کی خیالی، ذہنی اور جذباتی آوارگی کو اپنانے پر مجبور کیا۔ اسی ذہنی آوارگی کو اپنانے پر مجبور کیا۔ اسی ذہنی آوارگی کا نام کچھ لوگوں نے بے ساختہ پن رکھ دیا۔ مطلب اس کا بھی یہی ہے کہ خیال ہر قسم کی قید سے آزاد ہو۔ ہشلر نے بھی اسی انداز میں خوابوں کی وادی کا انکشاف کیا تھا اور خوابوں کی وہ وادی یونان کا حسین ملک تھا۔ شیلے کی رومانیت ادب کے

علاوہ سیاسی آزادی اور اجتماعی اصلاح کی شکل میں نمودار ہوئی۔ ورڈزورتھ اور بعد میں رسکن نے حسنِ فطرت میں اپنے خوابوں کی دنیا کی تصویریں دیکھیں۔

بعض لوگوں نے رومانی طبائع کی اس خصوصیت کا نام (NOSTALGIA) رکھا ہے۔ لیکن اگر اس اصطلاح کو روا بھی رکھ لیا جائے تب بھی اس کا معنی ہوا وہ بے نام آرزو جس کا خود آرزومند کو علم نہیں۔ یہی روسو نے ایک مرتبہ لکھا تھا:۔

"میں کسی خاص مدعا کے نظر کے بغیر شوق کی آگ میں جل رہا ہوں۔"

انگلستان میں خالص فطرت پرستی اور ماوراء الفطرت کے درمیان ایک ایسا زمانہ بھی آیا جس میں خدا پرستی کا ایک خاص رنگ نمودار ہوا۔ اس کا سب سے بڑا نمائندہ شیفٹسبری تھا جس نے فکر میں جدید فطرت پرستی کے رنگ اور قدیم روائی اور لذتی عناصر کا اجتماع تھا۔ خدا پرستی کا یہ انداز مظاہرِ فطرت کو خدا کی صفات کا مظہر قرار دیتا ہے اور اس خیال سے انکار کر دیتا ہے کہ خدا صرف معجزے کی کسی قوت سے ہی سو دار ہوتا ہے جیسا کہ پرانی روایت سمجھتی تھی۔ خدا پرستی کی یہ تحریک یہ بھی کہتی تھی کہ انسان فطرۃً خیر ہے اور فطرت بھی فیاض و مہربان اور حسین و جمیل ہے۔ فطرت پرستی کا یہ مسلک بالآخر اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ خدا، انسان اور فطرت بالآخر ایک ہی روحِ مطلق قرار پاتے ہیں — بلکہ ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے کہ خدا کی الگ فردیت کا تصور ہی غائب ہو جاتا ہے اور وجودی صوفیوں کی طرح ان لوگوں کا مسلک بھی یہ قرار پاتا ہے کہ فطرت اور خدا میں کوئی فرق نہیں ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

روسو کے زمانے تک عام رومانی نشاطِ غم کے تعیش میں بڑا مزا لیتے تھے۔ روسو نے غم اور فکرمندی اور خوف کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ بے ضرورت تواضع اور انکسار کو بھی خلافِ فطرت فعل خیال کرتا تھا جو اس عقیدے سے پیدا ہوتی ہے کہ انسان برا ہے اور گنہ گار ہے۔

روسو تو انسان کی اس ازلی گنہ گاری کا بھی قائل نہ تھا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ گناہ اور برائی انسان میں باہر سے داخل ہوتی ہے۔ اسی کے تحت وہ بار معاشرے پر ڈال دیتا ہے۔ اسی لیے وہ یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ دنیا میں خیر اور شر نہیں۔ یہی چیزیں فطرت اور بگڑی ہوئی سوسائٹی کے نام سے موسوم ہونی چاہئیں کیونکہ بگاڑ اور برائی کا اسی وقت آغاز ہو گیا جب انسان نے نیچر اور نیچرل کو ترک کر دیا۔

روسو فرد کے خیرِ محض ہونے کا قائل تو تھا ہی — مگر وہ اس میں اتنی دور چلا گیا کہ انسان کے باطن میں اس کشمکش کا بھی منکر ہو گیا جو عام خیال کے مطابق ضمیرِ انسانی کو برانگیختہ و بیدار کرتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کشمکش بھی معاشرہ کی پیدا کردہ ہے۔ پس اس کی اصلاح کیجیے تو انسان کامل خوب صورتی اور توازن اور سکون سے اسی وقت بہرہ ور ہو جائے گا۔

اس کی رائے ہے کہ سوسائٹی عام آدمیوں کو بگاڑ دیتی ہے مگر کچھ لوگ (ارواحِ پاک) ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو سوسائٹی بگاڑ نہیں سکتی۔ یہ ارواحِ پاک عام ہجوم سے مختلف، ان سے ممتاز اور عوام کے لیے ناقابلِ فہم سی ہوتی ہیں — ایسے لوگ سب سے الگ، سب سے جدا اور سب سے ممتاز ہوتے ہیں — غریب الدیار اور ناآشنائے عصر!

رومانی حسن اور نیکی کا یہ پیوند خاصا تشریح طلب ہے۔ روسو کا اعتقاد یہ تھا کہ حسین ارواح کا ہر کام نیکی میں شامل ہے۔ یہ تخیل دراصل عیسائیوں کے ازلی گنہ گاری کے اصول کا جواب ہے۔ یا اس کی تضحیک ہے — مگر ارواحِ پاک کا تصور بھی ایک لحاظ سے بڑا مخدوش ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں روحِ پاک کا حامل خود کو بہترین اور برترین تصور کرنے لگتا ہے اور جس طرح عیسوی مذاق میں تواضع و انکسا

ایک ریکارڈ بن جاتا ہے، روحِ پاک کے تصور میں پندار، غرور، برتری کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔

روسو سے رومانی تخیل میں انفرادیت، بغاوت کی سرحدوں کو چھو لیتی ہے۔ اس تخیلی نظام میں ابلیس خود ایک اہم رومانی کردار ہے۔ لیکن بغاوت کے اس روپ میں یہ خاص بات ہے کہ اس باغی کو رحم دل ضرور ہونا چاہیے۔ وہ باغی ہے تو نظام کا ہے، انسان کا تو ہمدرد ہے۔ اس رومانی تخیل میں ہمدردی ہر اس شخص کے ساتھ بھی ہے جسے سوسائٹی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے — پھر یہ کہا جاتا ہے کہ اس نظریے سے خواہ ذاتی کردار میں کوئی شخص کیسا ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ دوسروں کے لیے قربانی کرتا ہے تو وہ محبوب اور خیر ہے۔ کیونکہ یہ شخص دل کا اچھا ہے۔

نیکی کے اس تصور کو وکٹر ہیوگو نے سب سے اچھا ابھارا ہے۔ مگر رومانیوں کی اہم ترین خصوصیت نیکی نہیں شوق بے تاب ہے۔ وہ بے کراں آرزو جس کی تسکین کبھی نہیں ہو سکتی — وہ شعلۂ بے باک جو کبھی بجھ نہیں سکتا — ولیم بلیک نے کہا تھا کہ:

"افراطِ شوق حکمت کے ایوان تک لے جاتی ہے۔"

یہی افراط، اسی بے کراں آرزو کا نتیجہ ہے کہ بے اعتدالی رومانیت کی ایک صفت قرار پائی۔ روسو ایک طرف انسان کی اخلاقی سہل انگاری میں اعتقاد رکھتا ہے اور دوسری طرف انسان کی فطری نیکی میں۔ مگر یہ اخلاقی سہل انگاری دراصل اس ریاکاری اور نمائش گری کے خلاف تھی جو اس کے زمانے میں ایک فیشن بن چکی تھی۔

روسو نے جبلتوں کو جو بے لگام آزادی دی اس کا لازمی نتیجہ یہ تو ہونا ہی چاہیئے تھا کہ وہ بالکل وقتی ہیجانات کا غلام بن گیا۔ طبیعت کا یہ تلون — ہر اک نئے جھونکے سے اثر قبول کر لینے کا میلان ماسوا اس کے کیا ہو سکتا تھا کہ وہ زندگی کے ہر قاعدہ و نظام سے آزاد ہو گیا — چنانچہ باہر کا کوئی قانون، ضمیر کی کوئی آواز کسی فعل سے مانع نہ رہی — کیونکہ وہ خواہشوں کی آزادی پر ایمان رکھتا تھا نہ کہ ان کے احتساب پر۔ اس معاملے میں وہ طبعاً مردوں سے زیادہ عورتوں سے مشابہت رکھتا تھا کیونکہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں اپنے جذبات سے زیادہ مغلوب ہوتی ہیں — ان کی عقل بھی ان کے تابع فرمان ہوتی ہے۔!

جذبات کی یہ حکمرانی اور موڈ کا یہ تلون عام رومانیوں کا شیوہ اور بے اخلاقی اور بے تبدیلی کا یہ مذاق ان کا محبوب مسلک ہے —!

روسو کے اخلاقی تفکر میں ایک اور بنیادی شئے ہے اور وہ یہ کہ روحِ پاک یا روحِ جمال کا ہر فعل یا صدور درست ہوتا ہے مگر یہ کسی کوشش سے نہیں بلکہ بے ساختہ طور پر — یہ روحِ جمیل کوئی باشعور کارندہ نہیں۔ وہ نیچر کی ایک شکل اور روپ ہے جو روحِ جمیل کے اندر ملوث کیے ہوئے ہے۔

بہرصورت رومانیت میں تخیل کی آزادی ایک اہم عنصر ہے۔ رومانیت مروجہ اخلاقیت سے گریزاں ہے لیکن اس کی اپنی بھی ایک اخلاقیت ہے۔ نظریات کے اعتبار سے تو رومانی اخلاقیت شفقتِ خلق کے گرد مرکوز ہے لیکن عملی لحاظ سے اور بہت سی صورتوں میں اس کی سب سے بڑی اخلاقیت خود پسندی اور انانیت ہے جس کی وجہ سے فرد افراطِ اشتہا میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خواہش اور آرزو کی بے کرانی۔! گوئٹے کے کرداروں میں اس اشتہا کی تین قسمیں نمایاں ہیں: شیفتگیٔ علم کے لیے فاوسٹ، شغفِ شہوانی کے لیے ڈون جوان اور شغفِ استیلا کے لیے .... مگر یہ بھی یاد رہے کہ یہ شخصی کردار قومی سطح پر اقوام کے نمائندہ کردار بھی بن جاسکتے ہیں۔

تخیل پرست رومانی عموماً انہی میلانات کی نمائندگی کرتے ہیں — مگر خیال جذباتیوں کی اور قسمیں بھی ہیں — لطیف المزاج اور تند مزاج بعض اوقات

ایک ہی شخص میں یہ دونوں رنگ جمع ہو جاتے ہیں۔ مثلاً روسو میں لطیف المزاجی اور شدت کا خاص اجتماع ہو۔

ایک تربیت یافتہ مزاج کی آرزومندیاں شدید تو ہوتی ہیں مگر مہذب یافتہ ہوتی ہیں —— یہی تو وہ چیز ہے جو اُسے بے تربیت یافتہ رومانی مزاج سے مختلف کرتی ہے۔ بے تربیت رومانی غیر مہذب بے تابی کا اظہار کرتا ہے۔ مکروہ صورتیں پیدا کرتا ہے، ایک رومانی آرزومندی کے اس جنون کے باوجود قربانی کرتا ہے —— اور اپنی آرزومندی کو ایک مذہب و مسلک کے درجے تک پہنچا کر اس میں ترک و طہارت کی ایک صورت پیدا کر دیتا ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے باوجود اور اس کے علاوہ بھی، رومانیت کے چند مفہوم بتائے گئے ہیں۔ مثلاً رومانیت کل کے مقابلے میں آج کی آواز ہے۔ کل کی آواز کا اصطلاحی نام کلاسیکیت ہے لیکن یہ مفہوم بھی زیادہ دور تک ہمارا ساتھ نہیں دیتا۔

وکٹر ہیوگو رومانیت کا اغرابِ خلقت GROTESQUE کے ساتھ رشتہ جوڑتا ہے۔ لیکن یہ صفت یا یہ کیفیت بعض اوقات کلاسیکیت کے نمائندہ ادب میں بھی شامل ہو جاتی ہے اور وکٹر ہیوگو بعد میں اس تعریف سے خود بھی غیر مطمئن ہو گیا تھا اور اس خیال پر آ گیا تھا کہ رومانیت وسعتِ مشرب اور آزادی کے راستے سے ادب میں داخل ہوتی ہے۔ مگر یہاں پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزادہ روی اور وسیع المشربی رومانی ادب کا ایک عنصر تو ہو سکتا ہے لیکن اس سے خاص نہیں۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ادب میں انائی عنصر کا غلبہ رومانیت کی ایک علامت ہے۔ یہ بھی اگرچہ کامل طور پر ٹھیک بیٹھنے والی بات نہیں۔ پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ حد سے بڑھی ہوئی خود نگری شاعرانہ کار کو اس توازن اور اعتدال سے دور لے جاتی ہے جو عقل سے پیدا شدہ اندرونی سلیقہ کی پیداوار ہوا کرتی ہے۔

رومانیت کی تشریح کرتے ہوئے وفورِ جذبات پر عام طور سے زور دیا جاتا ہے —— عقلی اور فکری اندازِ نظر کے مقابلے میں جذباتی اور احساساتی رجحان کے غلبے کو رومانی رجحان سمجھا جاتا ہے۔

والٹر پیٹر کا خیال ہے کہ حسن اور ندرت و غرابت کے امتزاج سے رومانی عنصر ابھرتا ہے۔ ابرکرومبی کے خیال میں رومانیت کلاسیکیت کی ضد نہیں۔ حقیقت پسندی کی ضد ہے اور داخلیت اس کا وصفِ خاص ہے۔

رومانیت کے سلسلے میں جو پریشان خیالی ہے اس کی مزید تفصیل کی گنجائش نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ رومانیت کی اصطلاح کلاسیکیت اور حقیقت پسندی دونوں کے مقابلے میں پیش کی جاتی ہے۔ رومانی ادیب اپنے جذبے اور وجدان کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیتا ہے۔ اسلوب اور خیالات دونوں میں اس کی روش تقلید کے مقابلے میں آزادی اور روایت کی پیروی سے زیادہ بغاوت اور جدّت کا میلان رکھتی ہے۔ رومانی ادیب حال سے زیادہ ماضی یا مستقبل سے دلچسپی رکھتا ہے۔ حقائقِ واقعی سے زیادہ خوش آئند تخیلات اور خوابوں کی اور عجائبات و طلسمات سے بھری ہوئی فضاؤں کی مصوّری کرتا ہے۔ دوپہر کی چمک دار اور ہر چیز کو صاف صاف دکھانے والی روشنی کے مقابلے میں دھندلے افق اور چاندنی اور اندھیرے کی ملی جلی کیفیت اسے خوش آئند معلوم ہوتی ہے —— طبیعت کی بے قراری اور ذوق و شوق کی شدت رومانی مزاج کے خصائص ہیں۔ اردو فارسی مصطلحات میں آشفتگی شوریدگی اور جذب و جنوں، مندرجہ بالا صفات کے قریب قریب ہیں۔ بیدلؔ نے کہا تھا ؎

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقلِ کل شدہ بے جنوں مباش

صوفی شاعروں میں مولانا روم اور عراقی اور فارسی گویانِ ہند میں عرفی، اور غالب ---- اور پھر ان کے شعرائے اُردو میں میر و غالب اسی آشفتگی کے نمائندہ شاعر ہیں، لیکن اردو فارسی شاعری میں آشفتگی کی روایت اور اس کی رنگا رنگ صورتوں کی تفصیل ایک مستقل مضمون کی متقاضی ہے!

محمد حسن عسکری

اسلامی تصوّرات اور مغربی اصطلاحیں

آج کل جس طرح اسلامی تاریخی ناولوں اور سوانح عمریوں کا بازار اچھا جا رہا ہے اُسی طرح یہ مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے کہ اسلامی عقائد اور نظریات کو زمانۂ حاضر کی اصطلاحات اور اسالیبِ بیان میں ڈھالا جائے تاکہ ساری دُنیا اور خصوصاً مسلمان نوجوان اسلام کی عظمت اور حقانیت سے واقف ہوں۔ یہ خواہش افراد کی طرف سے بھی ظاہر کی گئی ہے اور انجمنوں اور تحریکوں کی طرف سے بھی۔ اس مطالبے کی پشت پناہی کے لیے دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اسلام ایک ابدی حقیقت ہے جو ہر زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے، چنانچہ اب اسلام کو موجودہ زمانے کے لباس میں دُنیا کے سامنے آنا چاہیے۔ ان حضرات کو یقین ہے کہ اسلامی علوم نے اب تک جن اصطلاحات کو استعمال کیا ہے وہ بے کار ہو چکی ہیں، اور اگر اسلامی تصوّرات کو "جدید علوم" کی اصطلاحات کے پیرائے میں بیان نہ کیا گیا تو مسلمان بھی اسلام سے بے گانے ہوتے چلے جائیں گے۔ اپنی تجویز کی تائید میں یہ حضرات عموماً شاہ ولی اللہؒ کا نام لیتے ہیں۔ یہ مطالبہ شروع تو ہوا ہے ایسے لوگوں کی طرف سے جنھوں نے انگریزی تعلیم پائی یا مغرب کی مادّی ترقی سے مرعوب ہوئے، لیکن اسلام سے یا مسلمانوں سے بھی الگ نہ ہو سکے۔ مگر یہ رُجحان ایسا قوی تھا کہ جن لوگوں نے خالص دینی تعلیم پائی تھی وہ بھی بعض دفعہ اُس کے اثر سے نہ بچ سکے اور ایسے الفاظ استعمال کرنے لگے جن کے پس منظر اور مفہوم سے وہ پوری طرح واقف نہ تھے۔ مغربی اصطلاحات کو اُردو میں منتقل کرتے ہوئے جو نئے الفاظ ہماری زبان میں داخل ہوئے وہ تو پھر بھی اتنے خطرناک نہیں۔ زیادہ گھپلا اُن اصطلاحی الفاظ کی وجہ سے ہوا جو پہلے سے ہمارے دینی علوم میں رائج ہیں، اور مغرب کے زیرِ اثر اُن کا مفہوم کچھ اور ہو گیا ہے۔

اُنیسویں صدی میں مغرب کے آزاد خیال لوگوں کے لیے بدی کا عیسوی عقیدہ بالکل ہی ناقابلِ قبول ہو گیا تھا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے چیسٹرٹن نے کہا ہے کہ جو لوگ بدی کے وجود سے انکار کرتے ہیں وہ بچارے نیک اور معصوم آدمی ہیں، اُنہوں نے کبھی کوئی بُری بات کی ہی نہیں جو اُنھیں معلوم ہوتا کہ بدی کیا چیز ہے۔ بالکل یہی حال ان حضرات کا ہے جو اسلامی علوم کو جدید لباس پہنانا چاہتے ہیں۔ وہ مغرب سے اس حد تک تو ضرور واقف ہیں کہ وہاں ہر آدمی کے گھر میں ریفریجریٹر ہوتا ہے۔ لیکن جن "علوم" کے ذریعے ریفریجریٹر وجود میں آیا ہے وہ کتنے بے اعتبار ہو گئے ہیں، اس کی اُنھیں خبر نہیں۔ یہ علوم اس اعتبار سے تو ضرور قابلِ قدر ہیں کہ ہمارے سامنے کوئی ایسی چیز بنا کے رکھ دیتے ہیں جسے ہم دیکھ سکیں۔ لیکن ان ایجادوں کے پیچھے جو تصوّرات ہیں وہ اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں کہ ہم ایک دن کے لئے بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ کون سی چیز کیا ہے۔ اور یہ تو اُن علوم کا حال ہے جنھیں یقینی کہا جاتا ہے۔ یہ محض میری اتہام طرازی نہیں، بلکہ پال والیری نے تیس سال پہلے بڑی تفصیل کے

ساتھ اس صورتِ حال کے نتائج اور عواقب کا اعلان کر دیا تھا۔ پھر جن علوم کا تعلق انسانی زندگی اور کائنات کی حقیقت سے ہے وہاں تو بالکل دھواں ہی دھواں ہے۔ نظریات ہزاروں ہیں، لیکن اُن کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں۔ اور نظریہ ساز اس بات پر راضی ہوتے ہیں کہ دوسرے کی بات سُن لیں۔ پھر یہ نظریے یا تو شخصی تخیّل کی پیداوار ہوتے ہیں یا سیاست کی۔ چنانچہ ایسے علوم میں الفاظ اور اصطلاحات کا کوئی واضح اور معیّن مفہوم باقی نہیں رہا۔ یہ کتاب پڑھتے ہوئے آپ کو دیکھنا پڑے گا کہ لکھنے والا کس لفظ کو کس معنی میں استعمال کر رہا ہے، بلکہ بعض دفعہ تو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ الفاظ میں معنی بھی ہیں یا نہیں۔ چنانچہ مغرب کی "علمی" دُنیا ایک پاگل خانہ بن کے رہ گئی ہے جہاں سب بیک وقت بول رہے ہیں، اور کوئی دوسرے کی نہیں سُنتا۔ یہ بھی میری افسانہ نویسی نہیں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور سارتر کئی دفعہ یہ رونا رو چکے ہیں۔ سارتر نے تو مثال دی ہے کہ جب جرمنوں نے فرانس پر قبضہ کر لیا تو جرمنوں کے حامی فلسفی لینے لگے "انقلاب" کے معنی ہیں چیزوں کو بدستور قائم رکھنا۔

مغرب نے اور زمانۂ جدید نے لفظوں کا یہ حال بنایا ہے۔ ترقی کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اب تو مغرب کی "علمی" دُنیا میں لفظوں کا استعمال ہی کم ہوتا جا رہا ہے۔ سائنس کے نئے نظریات صرف خاص علامتوں کے ذریعے بیان کئے جا سکتے ہیں، الفاظ کے ذریعے نہیں۔ اور اس سے بھی اگلا درجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کی رائے میں الفاظ کا استعمال بلکہ ہی ترک کر دینا چاہیئے۔ یہ خواب آج سے ساٹھ سال پہلے ایچ۔ جی۔ ویلز نے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

یہ ہے وہ "جدید علوم کا جامہ"، جو ہمارے یہاں کے بہت سے معصوم لوگ اسلامی علوم کو پہنانا چاہتے ہیں۔ اگر مغرب میں الفاظ کے معنی مبہم ہو گئے ہیں تو کچھ ایسی بُری بات بھی نہیں۔ وہاں کے لوگوں کے خیالات بھی اتنے ہی مبہم ہیں۔ لیکن عقیدہ تو واضح اور متعیّن چیز ہے۔ مغرب والوں کے نزدیک تو عقیدہ بھی محض ایک جذبہ ہے لیکن بہرحال مسلمانوں کے نزدیک تو عقیدہ متعیّن چیز ہے، اور اگر عقیدہ واضح اور متعیّن نہ ہو تو وہ عقیدہ نہیں رہیگا۔ چنانچہ اسلامی عقائد کے لئے جو اصطلاحات بنائی گئی ہیں وہ بھی واضح اور متعیّن مطلب رکھتی ہیں اور اصطلاحات بھی ایجاد بندہ قسم کی چیزیں نہیں۔ ہر اصطلاح کا اپنے مفہوم سے ایک لازمی تعلق ہے، اور ان دونوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ گر الگ کیا جائیگا تو مفہوم غلط ہو جائیگا۔ اسلامی علوم اور مغربی علوم میں اتنا اُصولی اور بنیادی تضاد ہے کہ ان دونوں کا امتزاج محال ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اسلامی علوم کو غلط سمجھ لیں، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اسلامی علوم کو "جدید علوم" کا جامہ پہنا دیا جائے۔ اگر زبردستی ایسا کیا جائے تو وہ اسلامی علوم نہیں رہینگے۔ ایک معمولی سا لفظ لے لیجئے ——— "حیات" اس کا جو مفہوم اسلامی علوم میں ہے وہ جدید علوم میں نہیں۔ ایک مثال دوسری جانب سے لیجئے۔ مغرب میں آجکل لفظ "نیچر" کا جو مفہوم ہے اُسے ادا کرنے کیلئے مشرق کی کسی زبان میں کوئی لفظ موجود نہیں۔

جو لوگ اسلام کو موجودہ دور میں مقبولِ عام بنانا چاہتے ہیں اُن کی نیّت تو نیک ہے۔ لیکن جو ذرائع اُنکے ذہن میں آئے ہیں وہ مہلک ہیں۔ اگر اسلامی عقائد کو مغربی اصطلاحات میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ اسلامی عقائد نہیں رہیں گے۔ یہ حضرات اپنی نیک نیتی کے جوش میں ایک اندھے کنوئیں کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر اُنہیں جدید علوم کی اصطلاحات پر ایسا ہی اعتقاد ہے تو کم سے کم وہ یہ تو معلوم کر لیں کہ یہ اصطلاحات کیا چیز ہیں۔ جن الفاظ اور اصطلاحات کو یہ حضرات بدلنا چاہتے ہیں وہی تو اس زمانے میں ایسی چیزیں باقی رہ گئی ہیں جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

حیدری کی غیر مطبوعہ مختصر کہانیاں

ہم لوگ سید حیدر بخش حیدری کو صرف "توتا کہانی" اور "آرائشِ محفل" کے مؤلف کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ہم میں سے بہت کم کو اس بات کا علم ہے کہ وہ اپنے زمانے کے سب سے اہم لکھنے والے تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کے دوسرے لکھنے والوں کی طرح ترجمہ و تالیف ہی کا کام نہیں کیا ہے۔ طبع زاد کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ ان تصانیف میں سب سے اہم اُن کی مختصر کہانیاں ہیں جن کو ابھی تک اشاعت کی منزل سے ہمکنار ہونا نصیب نہیں ہوا۔ یہ کہانیاں اُردو میں مختصر کہانی کے فن کے اوّلین نمونے ہیں۔ اِن سے قبل اُردو میں کسی نے باقاعدہ مختصر کہانیاں نہیں لکھیں۔ مجھے انگلستان کے کتب خانوں میں اُن کی کوئی ڈیڑھ سو کے قریب ایسی مختصر کہانیاں ملی ہیں جن کا ابھی تک کسی کو علم نہیں تھا۔ یہ کہانیاں حیدر بخش حیدری کو ایک طبع زاد مصنف اور ایک اعلیٰ درجے کا تخلیقی فن کار ثابت کرتی ہیں اور اردو میں مختصر کہانی کے فن کے اوّلین نمونے ہونے کی وجہ سے اس فن کی روایت میں مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔

سید حیدر بخش حیدری دِلّی کے رہنے والے تھے۔ وہ دِلّی ہی میں پیدا ہوئے۔ اُن کی صحیح تاریخِ پیدائش کا ابھی تک کسی کو علم نہیں۔ تمام تذکرے اس باب میں خاموش ہیں۔ اُن کے بارے میں مختلف تذکروں اور خود ان کی بعض مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بزرگ نجف اشرف سے ہندوستان آئے تھے اور دلّی میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ جب دلّی لٹی اور اُس سرزمین پر انسانوں کے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا تو حیدری کے والد سید ابوالحسن اس پریشان حالی سے تنگ آ کر دلّی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور انھوں نے بنارس میں رہائش اختیار کر لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تذکرۂ گلزارِ ابراہیم کے مؤلف نواب علی ابراہیم خاں خلیل بنارس میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے حیدری کے جوہرِ قابل کو پہچانا اور ان کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لی۔ خلیل نے انھیں قاضی عبدالرشید اور مولوی غلام حسین غازی پوری کے سپرد کیا اور ان بزرگوں سے حیدری نے عربی، فارسی، حدیث، فقہ، تفسیر وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں وہ کلکتہ پہنچے اور فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہو گئے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کو اُن کے ادبی کام سے بڑی دلچسپی تھی اور انھوں نے اپنی بیشتر کتابیں انھیں کی فرمائش پر لکھی ہیں۔ سید محمد نے لکھا ہے "یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں کب تک ملازم رہے اور کس سنہ میں وہاں سے علیحدہ ہوئے۔ اتفاق سے تذکرۂ ریاض الوفاق مؤلفہ ذوالفقار علی مست میں جو ۱۲۲۹ھ میں لکھا گیا ہے اور جس میں کلکتہ اور بنارس کے فارسی گو شعرا کے حالات بیان ہوئے ہیں، حیدری کے متعلق دو فقرے نظر پڑے۔ مست کا بیان ہے کہ حیدری ۱۲۲۹ھ میں بنارس میں تھے اور وہ کچھ عرصے تک فورٹ ولیم کالج میں منشی تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدر بخش ۱۲۲۹ھ سے بہت پہلے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے اور اس کے بعد وہ بنارس چلے گئے جس کو انھوں نے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اُن کی تاریخِ وفات بھی صرف ایک زبانی بیان کی بنا پر ۱۸۲۳ء قرار دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے منشی غلام حیدر کی زبانی یہ روایت لکھی ہے کہ حیدر بخش نے سنہ مذکور میں وفات پائی۔ منشی غلام حیدر، حیدر بخش کے دوست اور فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے۔ چونکہ اُن کے بیان کے علاوہ اور کوئی اطلاع نہیں ہے۔ اس لیے اس وقت یہی سنہ قابلِ قبول ہے۔"

حیدری نے اپنی غیر مطبوعہ تحریروں میں اپنے حالات کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس لیے ان تحریروں سے چند اقتباسات کا پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"احوال اس سید حیدر بخش حیدری تخلص شاہجہان آبادی کا یہ ہے کہ جس وقت سید ابوالحسن والد اس فقیر نے دلّی چھوڑی اور ہمراہی لالہ سکھدیو رائے کی فرمائی، تو بنارس میں تشریف لائے اور جیتے جی دلّی کے قصد دل سے بھلا دیے — اس وقت یہ ہیچ مداں نہایت خورد سال تھا۔ لیکن زیر سایۂ والدین قبلہ و کعبہ کے آفات فلکی سے از بس کہ بے خطر تھا۔ اُس سن میں بھی مشتاقِ اہلِ کمال تھا۔ چنانچہ کئی برس قبلہ گاہی نے ساتھ لالہ موصوف کے اوقات بخوبی بسر کی — اور اس فقیر کی بھی عمر حدِ بلوغیت کو پہنچی۔ اس عرصے میں امین الدولہ، عزیز الملک، نواب علی ابراہیم خاں بہادر مرحوم بموجب حکم نواب گورنر جنرل ہسٹنگس صاحب بہادر جلادت جنگ کے ملکی بنارس کی قبول کرکے ساتھ عزّ و وقار کے مسندِ عدالت پر بیٹھے تو قبلہ گاہی نے اُس قدر دان ... اور اس کمترین کو واسطے تربیت اور خوشہ چینی کے اُس خرمنِ سخن کے سپرد کیا — چنانچہ اس فقیر کو خدمت گزاری قاضی عبدالرشید خاں صاحب دام اقبالہ کی پسند آئی اور ساکن ... قیس و لیلیٰ ... مولوی غلام حسین کی بھائی۔ بیت

بہت سی میں نے یاں کی سیر ساقی حب ایسی گفتگو یہ مجھ کو آئی

اور صحبت سے ... دوستی سید بہیبت علی رضوی کی بھی اس عہد میں ہیچ مداں نے موافق اپنے فہم کے بہت سی کیفیت اُٹھائی ہے لیکن افسوس کہ گردشِ فلکی نے اُس گلبن باغ ... کی جدائی ہے — حاصل کلام اس گفتگو سے یہ ہے کہ خدمت گذرنے سے بزرگوں کی اور فرمانے سے دوستوں کی اس فقیر کو فرصت نہ ملی کہ جو کچھ واہیات بکا تھا اُسے جمع کرتا۔ اب ۱۲۱۵ھ ہجری عنایات و تفضیلات سے صاحبان عالیشان والا خاندان مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے ایک صورت اطمینان کی ہے۔ اور مفارقت میں یارانِ قدیم و دوستانِ ... کی ... قدرتی ہے — اس واسطے چند قصّے زبان ریختہ ہندی میں موافق اُردوئے معلّٰے کے نثر کئے گئے۔ جیسے قصّۂ حاتم طائی اور مہر و ماہ کا قصّہ اور طوطی نامہ بخشی، قصّہ لیلیٰ مجنوں کہ جو حضرت امیر خسرو دہلوی مرید حضرت نظام الدین اولیا نے اپنے خمسے میں لکھا ہے، لکھے گئے — اور چند اشعار پریشاں اور کئی مخمس، چند قطعہ جو اس ہیچ مداں نے تصنیف کئے سو احاطۂ تحریر میں آئے۔"

— پس اس سید حیدر بخش حیدری متخلص بہ حیدری شاہ جہان آبادی کو ۱۲۱۴ھ ہجری میں یہ خبر فیض اثر پہنچی کہ صاحبانِ عالیشان گفتگوئے اُردوئے معلّٰے کو مرغوبِ طبع رکھتے ہیں۔ اور اہلِ سخن کو از راہِ قدر دانی کے زیادہ بزرگی دیتے ہیں۔ خصوصاً صاحب والا مناقب، عالی مقام، صدر نشین محفل اہلِ کلام مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کہ جو بحرِ سخن ورزی و سخن دانی کے گوہر یکتائے جہاں ہیں اور موجد فوائد کلام شیریں سخنی کے سرچشمۂ سخن وراں کے

بہ دل دریا بہ کف چوں ابرِ نیساں جہاں ہے فیض سے جس کے دُر افشاں
نہ ہوں اُس کی شجاعت کے مقابل اگر ہوں رستم و زال و نریماں
لکھوں اس کی سخاوت کی جو تعریف دہن ہو صفحہ کا مثلِ زر افشاں
ہے اس کا نام نامی گلکرسٹ اب جہاں سے مہر جو اس کے لئے تاباں

دعا مقبول ہو یہ حیدری کی
رہے دنیا میں خوش یا رب وہ ہر آں

اس واسطے یہ دلِ منفعل اس قصّے مہر و ماہ کو باغ فصاحت و بلاغت سے تیار کر کے واسطے نظر حضور پُر نور اس صاحب موصوف والا شان کے لایا ہے یقین ہے کہ منظورِ نظر ہووے —"

(دیباچہ مہر و ماہ) (غیر مطبوعہ)

"حضرت امیر خسرو دہلوی مُرید حضرت نظام الدین اولیا کے کہ کئی کتابیں فارسی کی اُس حقیقت آگاہ نے تصنیف کی ہیں۔ در ایک مثنوی میں احوال لیلیٰ مجنوں کا جو لکھا سو اُس نے مضمون کو ساتھ فصاحت و بلاغت کے ادا کیا ہے۔ اور ہاتفی نے بھی اِس قصّۂ دلچسپ کو اپنے خمسے میں موزوں منظوم کیا اور عبارت فصیح سے اُس کی ہر ایک بیت مثنوی کو زیورِ معنی پہنایا ——— دراسی قصّے کو خواجہ حسن شاہجہان آبادی کہ شاعر زمین ہند کے تھے ہیں اور بالفعل مسندِ حیات پر جلوہ گر ہیں، بموجب فرمائش احمد علی خاں مرحوم کے کہ پیشکار صاحب نے جنکو صرف سے درخواست اُس قصے کی نظم ہندی میں کی تھی۔ خواجہ ممدوح نے زبان ریختہ ہندی میں حقیقت اُس کی بانی عہد سلطنت شاہ عالم بادشاہ غازی کے بوجہ احسن بطور مثنوی لکھی تھی۔ سنہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری مطابق ۱۸۰۱ء اٹھارہ سو ایک عیسوی کے کہ تینتالیسواں برس بادشاہ موصوف سے ہے۔ جناب صاحب عالیشان پشت پناہ سخن سنجان بحرِ ہمت گوہرِ مروت کوہِ حشمت مخزنِ سخاوت اعلیٰ رودمان جان گلکرسٹ صاحب بہادر زیادہ افضالہ نے اِس سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری دہلوی خوشہ چین خرمن علوم کو نیچی مولوی غلام حسین غازی پوری مولوی عدالت نواب علی ابراہیم خاں بہادر مرحوم حاکم بنارس کو فرمایا تو اِس قصّۂ منظوم نظم ہندی کو بیچ زبان ریختہ اُردوئے معلیٰ کے ساتھ فصاحت شیریں سخنی کے نثر اور ملاحظہ تحریر میں لا۔ کیونکہ عبارت سلیس منظوم سے اُن صاحبوں کو کہ جو بالفعل اس گفتگو سے واقف نہیں، ان کی درستی زبان کے واسطے ہے اس نثر سلیس سے اور کوئی عبارت نظر نہیں آتی۔ چنانچہ اس کمترین ہیچمدان نے موافق اپنی طبع کے زبان محاورہ اُردوئے معلیٰ کے قصّۂ نظم کو ہندی میں نثر کیا اور ہر ایک صاحب سخن سے سوال رکھتا ہے کہ جو کوئی اِس ترجمے کو چشم فیض اثر سے دیکھے اور کچھ نامربوطی الفاظ کی ملاحظہ کرے تو لازم ہے کہ وہ اپنی بخشندگی کی قلم غلط بردار سے اُس حرف افتادہ کو صفحۂ خاطر سے اٹھالے اور اجر اِس کا اس کو دونوں جہان میں خدا دے۔ قطعہ

کمیتِ خامہ کو میں نے اُٹھا کر / کیا ہے صفحۂ مضموں پہ جولاں
لکھا ہے قصّۂ لیلیٰ و مجنوں / سنو اک گوشِ دل سے نکتہ سنجاں

(دیباچہ لیلیٰ مجنوں، غیر مطبوعہ)

اِن بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ حیدر بخش حیدری نے تصنیف و تالیف کا کام فورٹ ولیم کالج میں شروع کیا۔ مترجمان گلکرسٹ کی شخصیت اس کام میں ہمیشہ اُن کی ممد و معاون رہی۔ اُن کی سب سے پہلی تالیف قصّۂ مہر و ماہ ہے جو ۱۲۱۴ھ ہجری میں لکھی گئی اور جس کو انھوں نے ڈاکٹر گلکرسٹ کے سامنے پیش کرکے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت حاصل کی۔ اُن کی دوسری کتاب "لیلیٰ مجنوں" ہے جو انھوں نے ۱۲۱۵ھ میں مکمل کی۔ ان دونوں کتابوں کے بارے میں یہ خیال عام تھا کہ یہ شائع ہو چکی ہیں لیکن مجھے یہاں ان کے قلمی نسخے مل گئے اور اب انشاء اللہ یہ جلد شائع ہوں گی ——— ان کے علاوہ طوطا کہانی، آرائش محفل، تاریخ نادری، گل مغفرت، اور گلزار دانش بھی اُن کی مشہور کتابیں ہیں۔ طوطا کہانی ضیاء الدین نخشبی کی فارسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۲۱۵ھ ہجری میں مکمل کی ——— آرائش محفل میں حاتم طائی کی کہانیاں ہیں۔ یہ بھی فارسی سے ماخوذ ہے لیکن اس میں حیدری نے کچھ اضافے بھی کئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۱۶ھ ہجری میں مکمل ہوئی۔ تاریخ نادری بھی فارسی کتاب تاریخ جہاں کشائے نادری کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے ۱۲۲۳ھ ہجری میں مکمل کیا۔ گل مغفرت ملا حسین واعظ کاشفی کی روضۃ الشہدا کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس میں شہدائے کربلا کے حالات ہیں۔ یہ ۱۲۲۷ھ ہجری میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ کئی بار چھپی ہے لیکن عرصے سے نایاب ہے۔ گلزار دانش فارسی کتاب بہار دانش کا اردو ترجمہ ہے لیکن اس کا کوئی نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ——— اُردو شعراء کا ایک تذکرہ بھی انھوں نے لکھا ہے لیکن اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اس میں شاعروں کے حالات حد درجہ اختصار کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ اس کے قلمی نسخے لندن اور آکسفورڈ میں میری نظر سے گزرے ——— اِن کے علاوہ جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا، حیدری نے کوئی ڈیڑھ سو کے قریب مختصر کہانیاں بھی لکھی ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئیں۔ میں نے ان کہانیوں کو مرتب کر لیا ہے اور اب یہ کہانیاں انشاء اللہ جلد ہی کتابی صورت

میں چھپ کر شائع ہو جائیں گی۔

یہ مختصر کہانیاں اردو افسانے کی نئی روایت میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں — ان میں مختصر افسانے کے فن کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ سب کی سب کسی نہ کسی بنیادی خیال کے گرد گھومتی ہیں — ان میں سے اکثر میں وحدت تاثر کا پہلو بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ رمز و ایمائی خصوصیت بھی ان میں سے بیشتر میں موجود ہے — ان کا مواد آس پاس اور گرد و پیش کی زندگی سے حاصل کیا گیا ہے۔ اسی لئے ان میں اس زندگی کے جذباتی اور ذہنی، معاشرتی اور تہذیبی مسائل فن کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

حیدری کی صرف دو غیر مطبوعہ مختصر کہانیاں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ ان سے اس حقیقت کا اندازہ ہوگا کہ مجموعی طور پر ان مختصر کہانیوں کی فنی قدر و قیمت کیا ہے اور اردو مختصر افسانے کی فنی روایت میں یہ کتنی اہمیت رکھتی ہیں۔

دو کہانیاں

(۱)

سنا ہے کہ ایک سوداگر بچہ نوجوان عالی خاندان، بیس اکیس برس کا سن و سال، دنیا کی دولت سے مالا مال، فارغ البال ہمیشہ اپنے شہر میں رہا کرتا۔

ایک دن اس کی جورو نے کہا کہ "میاں! تم مرد ہو۔ تمہارا اس صورت سے گھر میں بے حس و حرکت بیٹھ رہنا اچھا نہیں کیونکہ آدمی کو بے رنج راحت نہیں اور زر کو برکت بے تجارت۔ اسی طرح سے اگر گزران کرو گے تو قارون کے خزانے سے بھی عہدہ برآ نہ ہو سکو گے۔ جس سے بہتر یہی ہے کہ سفر کرو! — کچھ دنیا کے بھی کاروبار سے بھی واقف ہو! —"

اس واسطے کہ وہ گھر سے نکلے تو یہ اپنے یار سے چین کرنے لگے —

غرض بہ ہزار خرابی اس نے اسے اپنے گھر سے نکالا۔

جب وہ ... چلا تب ہر ایک عورت نے اپنے اپنے حوصلے کے موافق سوغات کو کہہ دیا۔ اور اس کی جورو نے بھی کہا کہ "صاحب! میرے واسطے اگر ہاتھ لگے، ایک سیر بھر چرتر لانا۔"

آخرکار وہ ایک جہاز پر سوار ہوا اور کسی شہر کا رستہ پکڑا۔ بعد دو چار مہینے کے ایک ملک میں جا پہنچا اور خرید و فروخت کرنے لگا۔ جب اپنا مال بیچا تب سوغات کی جنس اپنے لوگوں کی خاطر ڈھونڈنے لگا — جس جس نے جس جس چیز کو کہا تھا سو سو سب میسر آئی۔ مگر چرتر کی جنس کہیں نہ پائی۔ لاچار ہو کر اپنے جہاز کی طرف پھرا۔

اتفاقاً راہ میں ایک بڑھیا ملی اور اسے متفکر دیکھ کر کہنے لگی کہ "واری گئی۔ تو کس واسطے حیران ہے؟"

اس نے کہا کہ "ماما! میں نے بہت سا اسباب واسطے سوغات کے لیا ہے مگر چرتر کی جنس نہیں ملتی — اس لئے غمگین ہوں کہ بی بی کو کیا جواب دوں گا —"

اس نے کہا "لڑکے! اگر چھ مہینے میرے پاس رہنا قبول کرے تو وہ چرتر کون بڑی چیز ہے؟ میں خرید دوں گی۔"

اس نے یہ بات مانی اور صحبت بڑھیا کی غنیمت جانی۔

حاصل کلام اس نے اس کے سر کے بال کئی مہینے میں بڑھائے اور عروسانہ کپڑے پہنائے۔ دلہنوں کی سی صورت بنا کر بادشاہ کے پاس لے گئی اور عرض کرنے لگی کہ "جہاں پناہ! اس عورت کا خاوند سپاہی ہے۔ وہ زبردستی اس کو میرے پاس چھوڑ گیا۔ میں رنڈیا دکھیا اس جوان جہان جی کو اس ٹوٹی پھوٹی

مجھ نیڑی میں کیونکر رکھوں؟ آپ جہاں پرور ہیں اس کو محل مبارک میں داخل کریں ـــــ جب وہ گھوڑا آ دے گا تب بھی جانے گا۔

بادشاہ نے یہ بات بُڑھیا کی پسند کی اور وزیر سے کہا کہ "بیٹا تیرا بردیس گیا ہے۔ اُس کی بی بی اکیلی [illegible] ہوگی [illegible] سے بہتر یہی ہے کہ اس عورت کو اپنے گھر لے جا اور بہو سے ملا دے [illegible] دونوں آپس میں خوش رہیں گی اور باتیں بنا کر کریں گی۔"

وزیر نے یہ حکم بادشاہی قبول کیا۔ اُس عورت کو اپنے گھر لے گیا اور بہو سے کہنے لگا کہ "[illegible] تمہارا خاوند سفر سے [illegible] تم اس کو اپنے ساتھ رکھو۔ میری بھی اس میں خوشی ہے اور بادشاہ کی بھی مرضی یہی ہے۔"

غرض اس عورت کو وزیر کی بہو نے اپنے ساتھ رکھا اور ربطِ دوستی بہت بہم پہنچایا۔

ایک دن وہ دونوں کوٹھے پر بیٹھی تھیں اور دور دور نظریں دوڑاتیاں تھیں کہ اتنے میں ابر گھر آیا۔ مینہ برسنے لگا۔ ہوا ٹھنڈی چلی۔ ان کو بے کلی ہوئی۔ جوانی نے ستایا۔ سبزہ لہکا [illegible] وزیر کی بہو نے [illegible] اس وقت ایک مرد تو بہت خوب ہو [illegible] بے کھٹکے رہیں اور عیش عشرت کریں۔"

اُس نے اپنی دانائی سے معلوم کیا کہ اس وقت اس کا جی مرد کی خواہش رکھتا ہے۔ حقیقت میں تو وہ [illegible] وہ بھی ایک جوانی [illegible] اور حرصِ دنیوی غالب ہوئی۔ بطور ایکاوٹ کے بات اس سے کہی کہ "بی بی اس وقت ہم تم دونوں [illegible] اور دعا مانگیں [illegible] ہم دو میں سے ایک کو مرد کر دے!"

یہ سخن دونوں نے ٹھہرایا اور دُعا کی خاطر ہاتھ پھیلایا۔

بعد ایک ساعت کے وہ ہنسا اور کہنے لگا کہ "میری تو دعا جنابِ الٰہی میں مستجاب ہوئی۔ اُس نے اپنے کرم سے مجھے [illegible] اب ادھر تشریف لائیں۔ کچھ ہم سے مِل کر حظِّ دُنیوی اٹھائیں۔"

یہ بات سن کر وہ خوش ہوئی اور دوڑ کر اُس کے گلے لپٹ گئی

پھر تو وہ دونوں بخوبی اختلاط کرتے تھے اور چین اٹھاتے تھے۔

کئی مہینے کے بعد اُس کا شوہر آیا۔

وزیر نے اپنی بہو سے کہا کہ "بابا! تمہارا خاوند آیا ہے۔ اب اس عورت کو نیچے کے مکان میں جگہ دو اور تم اپنے دولہا سمیت اوپر کے مکان میں رہو!"

یہ بات اُس نے اپنے سسر کی طوعاً و کرہاً قبول کی۔ اور اپنے خاوند کے ساتھ رہنے لگی۔

بعد دو چار دن کے آدھی رات کو ایک خنجر تیز سے اپنے خاوند کو ذبح کیا اور لاش اُس کی مع سر دریا میں بہا دی۔ عشق سے بھری اُس کے پاس گئی اور کہنے لگی "میں نے تیرے واسطے اپنا خاوند مارا۔ اگر مجھ کو اب لے آؤ بھرنا ہے تو لے اور ایسا وقت پھر نہ پائے گا" ـــ مثل مشہور ہے شب حاملہ فردا چہ زاید۔

وہ یہ سخن سنتے ہی کہنے لگا کہ "بی بی! میں احمق نہیں جو تجھ سی قصابن کو ساتھ رکھوں کہ وقت بے وقت اپنے تئیں بھی ذبح کرواؤں ـــ"

یہ کہہ کر بھاگا اور بڑھیا کے گھر کا رستہ پکڑا ـــ

جب اس نے دیکھا کہ خصم کا خصم مرا اور یار کا یار جُدا ہُوا تو لاچار ہو کر وہاں سے پھری اور اپنے بچھونے پر جا کر سو رہی۔

صبح کو سسر نے آکر پوچھا کہ "بہو! تمہارا خاوند کیا ہُوا؟"

اُس نے کہا کہ "بابا جان! پچھلے پہر وہ میرے پاس سے اُٹھے اور اُس سپاہی کی جورو کو اپنے ساتھ لے کر خدا جانے کہاں چلے گئے"۔

یہ سُن کر وزیر کو دو غم ہوئے - ایک تو بیٹے کا چھٹنا - دوسرے امانت میں خیانت کا پڑنا - لاچار کیا کرتا - بازی ہاتھ سے جا چکی تھی - چُپ ہو رہا۔ اور وہ اُسی زنانے لباس سے بڑھیا کے پاس گیا اور احوالِ گزشتہ کہنے لگا۔

یہ بات سُن کر وہ خوش ہوئی اور بولی "واری گئی - اگر کچھ عقل رکھتا ہوگا تو احوال چرز کا معلوم کرے گا"۔

غرض صبح کو اُس کا سر منڈا - مردانے کپڑے پہنا - سپاہیوں کی صورت بنا، بادشاہ کے پاس لے گئی اور عرض کرنے لگی کہ "یہ وہی سپاہی جاہل ہے جس کی عورت محل میں داخل ہے - اب یہ حضور میں آیا ہے - اِس کی امانت اِس کو ملے"۔

بادشاہ اُس کی شیریں سخنی سے خوش ہوا - وزیر سے کہنے لگا کہ "اے خیر اندیش و نیک نظر! اس کی عورت کو اِس کے حوالے کر!"

وزیر یہ سخن سن کر متفکر ہوا اور یہی اپنے جی میں ارادہ کرنے لگا کہ وہ تو اِس کی جورو لے گیا ہے تو اِس کی بی بی اِس کے حوالے کر کیونکہ تو بھی سرخ رو پیشِ شاہ بجز دیر ہو اور جبر و نقصان برابر ہو۔

یہ بات ٹھہرائی اور اس سپاہی کو اپنے گھر لا کر اپنی بہو بہ نسبت اُس کے حوالے کی۔

وہ اِس عورت کو لئے ہوئے پھر بڑھیا کے پاس گیا - وہ اُن دونوں کو دیکھ کر ہنسی اور کہنے لگی کہ "مبارک! کل اپنے جہاز یہاں سے کھلوائیے اور پھر سیدھے اپنے شہر تشریف لے چلیے - کچھ بنے بازی یہاں دکھلائی ہے اور کچھ کارستانی وہاں دکھلاؤں گی"۔

غرض اِس عورت کو اور اُس سوداگر بچے کو بعد کئی مہینے کے اُس کے شہر میں لائی اور کہنے لگی کہ "تو اپنے گھر کہلا بھیج کر میں خدا کے فضل سے آج کی شہر میں داخل ہوا لیکن تاریخ منحوس کے باعث سے گھر میں نہیں آ سکتا — انشاء اللہ تعالیٰ تڑکے آؤں گا"۔

یہ خبر سنتے ہی اُس کی جورو ظاہر تو خوش ہوئی پر باطن میں مر ہی گئی — دو چار گھڑی رات گئے اپنے یار کو بلا کر کہنے لگی کہ "صاحب! وہ کم بخت آ پہنچا - بہتر یہی ہے کہ آج ہم تم دل کھول کر عیش و عشرت کریں - کل خدا جانے کیا ہو — مثل مشہور ہے - بیت ؎

یہ وہ دل کو کبھی بھاتا نہیں　　کسی کا اسے وصل بھاتا نہیں

یہ کہہ کر شرابیں منگوائیں اور بدمستیاں شروع کیں - گلے میں باہیں ڈال کر لیٹے اور بہ فراغت تمام سو رہے۔

جب آدھی رات کا عمل ہوا تب وہ بڑھیا ایک خنجر اپنی کمر سے لگا کر جہاز سے اُتری اور اُس سوداگر بچے کے گھر کسی سبب سے گئی تو کیا دیکھتی ہے کہ سوداگر بچے کی جورو اور ایک مردِ نوجوان آپس میں لب سے لب ملائے اور چھاتی سے چھاتی بھڑائے عالمِ عیش میں بسترِ راحت پر پڑے ہیں۔

یہ تماشا دیکھتے ہی اُس نے خنجر کمر سے نکالا اور اُس مرد کا سر کاٹ ڈالا - دھڑ تو وہیں چھوڑا - سر رومال میں باندھ کر وہاں سے لے اڑی اور سوداگر بچے کے پاس آ کر کہنے لگی کہ "صبح کو دو چار گھڑی دن چڑھے اس سر کو مع اسباب سوغات اپنے گھر لے جا - جس وقت وہ لوگ تجھے دیکھیں اور اپنی اپنی سوغات طلب کریں اُسی وقت ہر ایک کی امانت ہر ایک کے حوالے کرنا اور اپنی بی بی سے کہنا کہ "صاحب! آپ بھی ادھر آئیں اور اپنی سوغات لیں - آپ نے تو یہ بھر چیز منگوایا تھا - میں سوا سیر لایا - اس کو لو اور میری محنت کی داد دو!" — یہ کہہ کر وزیر کی بہو کو سامنے کر دینا" اور اس سر کو اس کی گود میں دھر دینا"۔

غرض صبح ہوتے سوداگر بچہ اُن دونوں کو لے کر اپنے گھر گیا اور اُس بڑھیا کے کہے کے بموجب اپنے عمل میں لایا - چنانچہ ہر ایک کی بہو کو سوغات دے کر وزیر کی بہو کو اپنی بی بی کے سامنے کھڑا کیا اور اُس سر کو گود میں رکھ کر کہنے لگا کہ "اجی! تم نے سیر بھر کہا تھا - میں سوا سیر لایا ہوں — دیکھو! سیر بھر تو یہ عورت ہے کہ جس نے میرے واسطے اپنے شوہر کو مارا اور پاؤ سیر یہ ہے کہ جس کا سر تمہاری گود میں کٹا — اپنے دل کی ترازو میں تول لو اور سمجھے

مجھ سے جواب دو۔ دیکھو تو تمہارے چہرے سے میران طلق ہے یا نہیں ـــ سچ کہو ـــ"

جونہی اس نے دوسرے دیکھا وہیں شرمندہ ہوئی اور چاہتی تھی کہ گردن نیچی کرے کہ اتنے میں اس نے تلوار کمر سے لی۔ پہلے دونوں کو مار ڈالا پھر اپنے پیٹ میں مار کام تمام کیا اور جب تک جیا پھر زندگی کا نام نہ لیا۔

---

(۲)

بیان ہے کہ ایک وزیر بچی کسی سوداگر بچے پر لڑکپن ہی سے مرتی تھی۔ اور وہ بھی اسے ابتدا ہی سے چاہتا تھا۔ اور یہ دونوں ایک ہی مکتب میں بیٹھے ہیں۔ شب و روز جز پڑھنے کے بات نہ کیا کرتے تھے۔

جب عالم جوانی کا اُس کے رُخ پر چھایا، ایک روز نکل کر باہر کا جھونکا سے کینہ سے باہر ہوا ـ دونوں کے ماں باپوں نے اُن نوجوان سمجھ کر مکتب سے اُٹھایا۔ اس کو تو اُس کی ماں نے اپنے پاس رکھا اور اُس کو اُس کے باپ نے کارِ تجارت سونپا۔

بعد چند روز کے اُس کو اُس کی مفارقت میں ... جب تب دو روز نہ ہوا اور اس کو کارِ تجارت میں سودا ہونے لگا۔

غرض سوداگر بچے نے ایک عورت کے ہاتھ یہ کہلا بھیجا کہ "میں تیری فرقت میں قریبِ مرگ کے پہنچا ہوں اور منتظرِ دیدار ہوں۔ بہت سے

اگر اپنی صورت دکھا دے مجھے ۔۔۔ تو اس قیدِ غم سے چھڑا دے مجھے

یہ خبر جس وقت اُس وزیر بچی نے سُنی، وہیں وہ بھی بے اختیار ہوئی اور کہنے لگی کہ "بی بی! میری طرف سے بھی اُس کی خدمت میں سلام شوق کے بعد یہ پیام کہیو کہ مجھ کو بھی تیری جدائی میں زندگانی حرام ہے اور بیقراری مارے ڈالتی ہے۔ مگر یوں تدبیر ملاقات کی ٹھہری ہے کہ جب آدھی رات کا عمل ہو تب تنہا اُدھر سے کمند ڈال کر اس کوٹھے پر آؤ تو بعد ایک مدت کے ملیں اور باہم قرآن خوانی کریں۔"

غرض اس بڑھیا نے اُس کے کہنے کے بموجب اُس سے جا کر کہا اور اُس نے بھی یہ بات قبول کی، اور اسی کمند کے وسیلے سے یہی آمد و رفت مقرر رکھی۔

قضا کار ایک شب آدھی رات کو بادشاہ اُس شہر کا اپنے محل سے نکلا اور ہر ایک کوچہ و گلی کی بخوبی خبر لینے لگا۔ اور وہ بادشاہ ایسا عادل و حاکم تھا کہ ظالم و چور کی تصویر رسائی نہ رکھتا تھا۔

ناگہاں اس کوچے میں گیا کہ جس میں وہ سوداگر بچہ کمند کی راہ سے وزیر کی حویلی پر چڑھتا تھا۔

یہ حالت دیکھتے ہی نہایت غضب ہوا اور اُس نوجوان کو بہ طور چوروں کے باندھ ہی لیا اور کہنے لگا کہ "اے اجل گرفتہ! تو نہیں جانتا کہ یہاں کا بادشاہ اس قدر عادل و منصف ہے کہ باگھ بکری کو ایک گھاٹ پانی پلاتا ہے۔ اور تو ایسا دیدہ دلیر ہے کہ اُس کے وزیر کی حویلی پر کمند کی راہ سے چڑھے اور ارادہ اس کے زر و اسباب غارت کرنے کا کرے۔"

اُس نے کہا کہ "تم کون ہو مجھے باندھ کر یہ نصیحت کرتے ہو؟"

اُس نے کہا کہ "میں اس شہر کے کوتوال کا پیادہ ہوں۔ تجھے صبح کو اُس کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ بادشاہ کے پاس پہنچا دے گا ـــ وہ بلا تامل گردن مارے گا۔"

یہ سخن سن کر وہ سوداگر بچہ کہنے لگا کہ "اے پیادے کوتوال کے! اگر میری قسمت میں صبح کو قتل ہی ہونا ہے تو از برائے خدا اسی وقت

فرصت دے گا میں اپنے یاروں سے ملاقات کروں تاکہ یہ آرزو لیے اس دارِ فانی سے نہ جاؤں!"

اُس نے کہا کہ یہ تیری نادانی ہے جو تجھ سے ایسی باتیں کرتا ہے۔ کسی شکاری نے آج تک اپنے صید پر رحم کیا ہے اور پنجرے سے چھوڑا ہے۔"

اُس نے کہا کہ اگر کچھ خطا میرے سے ہو جانے کا شبہ ہے تو میں اپنے باپ کو ضامن دیتا ہوں۔

یہ بات سن کر اُس نے کہا کہ بہتر اگر ضامن دے گا تو شب کی شب فرصت پاوے گا۔"

غرض اس کو وہ اپنے گھر لے گیا اور دروازے پر کھڑا ہو کر اپنے باپ سے کہنے لگا کہ" بابا جان! میں اس وقت بہ علت دزدی گرفتار ہوں۔ اگر تم ضامن ہو تو چھوٹوں۔"

یہ بات سنتے ہی اندر سے اُس نے کہا کہ نامعلوم تو کس کا بیٹا ہے اور یہ بات کس سے کہتا ہے؟ میں تو خود لا اولاد ہوں۔"

بادشاہ نے دیکھا کہ وہ صاف مُکر گیا اور کانوں پر ہاتھ دھر گیا۔ تب اُس نے کہا کہ اب کیا کہتا ہے؟"

اُس نے کہا کہ فلانے محلے میں میرا ایک یار ہے۔ اب اُس کے پاس تجھے لے چلتا ہوں۔ اغلب ہے کہ وہ اس وقت دستگیری کرے۔"

اُس نے کہا کہ "چل اُس کو بھی دیکھ لے۔"

غرض وہ اُس کو لیے ہوئے اپنے یار کے گھر گیا اور باہر ہی سے کہنے لگا کہ "بھائی! آج میں پکڑا گیا ہوں۔ یقین ہے کہ صبح کو مارا جاؤں گا۔ اگر تو اپنی ضامنی سے چھڑا دے تو چھوٹوں اور کچھ کچھ کام اس عرصے میں کروں۔ پھر خدا جانے کل کیا ہو اور کیا نہ ہو۔"

یہ بات سنتے ہی وہ نکلا اور اُس کو اپنی معتبری پر چھڑوا دیا۔

اُس نے جو وہاں سے فرصت پائی تو پھر اُس حویلی کی راہ لی۔ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے بادشاہ!

آخرکار وہ اُس حویلی پر چڑھا اور وہ بھی اس کے ساتھ ہی —— وہ تو اُس وزیر کی بیٹی کے ساتھ قرآن خوانی کرنے لگا اور وہ دور سے اِن کا تماشا دیکھنے لگا۔

جب وہ دونوں قرآن کی تلاوت کر چکے تب یہ گفتگو کرنے لگے۔

چنانچہ وزیر بچی نے کہا کہ "اے سوداگر بچے! آج خلافِ معمول کیوں آیا ہے؟ اور اتنی دیر کہاں تھا؟"

اُس نے کہا کہ "اے وزیر بچی! اب میری تیری قرآن خوانی قیامت پر موقوف رہی۔ کیونکہ آج مجھ کو اس حویلی پر چڑھتے کوتوال کے پیادے نے پکڑا تھا۔ اگر میں اپنے آشنا کو ضامن نہ دیتا تو وہ مجھے ہرگز نہ چھوڑتا۔ اور اب صبح کو وہ مجھے اپنے بادشاہ کے پاس لے جاوے گا تو وہ مروا ڈالے گا۔"

یہ بات سنتے ہی وہ روئی اور کہنے لگی کہ "الٰہی! یہ بلا کیا ہوئی؟" دوہرا ؎

سبھی سکارے جائیں گے اور نین مری گے روئے   بدھ صفا ایسی رین کرو کہ بھور کبھو نہیں ہوئے

اور کہنے لگی کہ کل صبح کو میں بھی سیاہ کپڑے پہن کر گُنبدِ ناامید پر سوار ہو کر اور اس کثرت پر حشر میں آؤں گی۔ جس وقت خدانخواستہ تو مارا گیا تو میں بھی اپنے پیٹ میں چھری مار کر مر جاؤں گی۔ لیکن افسوس یہ رہا کہ دورہ قرآن شریف کا مراد کو نہ پہنچا۔"

بادشاہ نے یہ باتیں اپنے کانوں سے سُنیں اور یہ حالاتیں آنکھوں سے دیکھیں کہ اتنے میں صبح ہونے لگی۔ بادشاہ تو پہلے ہی وہاں سے

ہو کر اپنے محل میں داخل ہوا اور وہ بھی اپنے یار کے گھر گیا۔

جب سوا پہر دن چڑھا تب بادشاہ نے کوتوال کو بلوا کر کہا کہ "فلانے محلّے میں تو جا! وہاں اس طرح کا ایک گھر ہے۔ وہاں اُس کی ڈیوڑھی پر کھڑا ہو کر پکار کہ فلانے صاحب گھر میں ہیں تو میری امانت میرے حوالے کریں ——— یہ کہہ کر وہاں کھڑا ہو رہنا —— پھر جو کوئی اندر سے جو چیز دے اور وہ تیرے حوالے کرے تو اس کو لے آنا۔"

غرض وہ گیا اور اُسی حویلی کی چوکھٹ پر کھڑا ہو کر پکارنے لگا۔ کہ اتنے میں دو شخص اندر سے نکلے۔ ایک تو کہتا ہے کہ 'میں چور ہوں' اور دوسرا کہتا تھا کہ 'میں ہوں'۔ وہ کہتا تھا کہ 'مجھے لے چل!' وہ کہتا تھا کہ 'مجھے' ——

حاصلِ کلام کوتوال حیران ہوا اور اُن دونوں کو باندھ کر حضور میں لایا۔

بادشاہ نے اُن کو دیکھتے ہی کوتوال سے کہا کہ فلانے چور کو میرے سامنے سولی دے!"

اور وزیر سے کہا کہ "جب تک میں تیرا حکم نہ دوں تب تک نہ دے دینا۔

جب وہ قریب سولی کے پہنچا تب بادشاہ نے پھر اُس سے پوچھا کہ "سچ کہہ تو کون ہے؟"

اُس نے کہا کہ "میں چور ہوں۔ جھوٹ کیوں کہوں۔ جو چاہو سو کرو!"

بادشاہ نے پھر یونہی پوچھا ——

اس نے پھر وہی کہا ——

غرض اسی ردّوبدل میں چار گھڑی کا عرصہ کھنچا کہ اتنے ایک سوار سیہ پوشش، منہ پر بُرقع ڈالے نمودار ہوا اور گرد سولی کے پھرنے لگا۔

وہ اُس کو دیکھ کر بیقرار ہوا اور روئے ——

یہ حالت جو بادشاہ نے دیکھی تو اپنے وزیر سے یہ بات کہی کہ "تو اس جوان سیہ پوش کو پہچانتا ہے؟"

اُس نے کہا کہ "نہیں!"

ارشاد ہوا کہ "جا کر دریافت کر کہ کون ہے؟"

وزیر اُس کے پاس آیا پر کچھ نہ دریافت کر سکا کہ یہ کون ہے۔

اسی طرح سے کئی بار بادشاہ نے اُسے بھیجا لیکن وہ ہرگز نہ پہچان سکا۔

تب تو بادشاہ نے کہا کہ "اب کے بار جا اور اُس کا بُرقع اٹھا کر دیکھ کہ وہ کون ہے اور مجھے خبر کر!"۔

غرض وزیر گیا اور بُرقع اُٹھا کر جو اُس کی صورت دیکھی تو اُسے اپنی ہی لڑکی نظر پڑی۔ اس واردات پر نظر کر کے نہایت شرمندہ ہوا اور آکر بادشاہ سے عرض کرنے لگا کہ "خداوند! آپ خوب جانتے ہیں۔ میں کیا التماس کروں؟ مگر امیدوار اس بات کا ہوں کہ یہ بھی اسی کے ساتھ ماری پڑے۔"

بادشاہ نے کہا "اے وزیر! واللہ یہ مجھ سے کبھی نہ ہوگا کہ ایسے عاشق معشوق کو قتل کروں ——— تو نہیں جانتا میں ان سے بخوبی واقف ہوں۔ بلکہ یہ آرزو رکھتا ہوں کہ میں اس سیہ پوش کو اپنی بیٹی کروں اور تو اس لڑکے کو اپنا بیٹا کر جو ہم اِن دونوں کو بہ طور دُلہن دولہا کے دیکھیں —— کیونکہ یہ تاحال آلائش دُنیا سے پاک ہیں ——"

حاصلِ کلام قرآن کی برکت سے ان دونوں کی جان بچی اور شادی کی شادی ہوئی۔

مثل مشہور ہے بھلا کر بھلا ہو!

مظفر علی سید

تنقید اور سنجیدگی

ایک مدت سے ہماری تنقید، ادب کو خانوں میں بانٹنے کا فرض انجام دے رہی ہے اور ادیب لوگ ان خانوں کو پُر کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ ہماری تنقید اور ہمارے ادب میں بہت کام ہو رہا ہے۔

مگر یہ گروہ بندی اور خانہ پُری قسم کا کام ادب سے یا تنقید سے کیا تعلق رکھتا ہے؟ کیا ادب کو اصناف و انواع، شاخوں اور شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؟ اس بات پر غور کر کے ہم اپنے زمانے کی ظاہری ادبیّت کے اس چکر سے نکل سکتے ہیں جس نے ہمیں ادب کے اصلی اور حقیقی کام کے قابل نہیں رہنے دیا۔ ذرا سوچئے تو آج کتنے غزل گو ہیں جو کبھی کبھار بھی کسی شعر میں مزاح کا کوئی پہلو رکھتے ہوں، محبوب سے بات کرتے ہوئے خوش فعلی اور خوش فکری تو کہاں معمولی درجے کی خوش گوئی بھی کبھی کر لیتے ہوں۔ اس کے باوجود ہم اُردو غزل کی عظیم روایت کی بات کرتے ہیں اور اس روایت کے ایک اہم پہلو کو صاف نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اس کے جواب میں کہا جائیگا کہ غزل اور چیز ہے اور مزاح و ظرافت اس سے مختلف چیزیں ہیں۔ اگر آپ کو دوسری چیز کا شوق ہے تو ظریف جبلپوری، مجید لاہوری اور راجہ مہدی علی خاں کا کلام دیکھئے اور تغزل سے رغبت ہو تو حضرت فراق گورکھپوری، حفیظ ہوشیارپوری اور ناصر کاظمی کا مطالعہ کیجئے۔ انشاء اللہ رہی سہی ظرافت بھی رفوچکر ہو جائے گی۔ یہ زمانہ تقسیم کار کا ہے۔ کچھ کارخانوں میں کابلے اور پیچ بنتے ہیں۔ کچھ میں ٹونٹیاں اور کچھ میں صرف نل بنتے ہیں۔ مستری سب کو جوڑ جاڑ کے غسل خانے میں نلکا لگا دیتا ہے اور یوں پانی بہنے لگتا ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ غزل کہتے ہیں۔ کچھ لوگ ظریفانہ کلام کہتے ہیں، کچھ افسانہ لکھتے ہیں، کچھ طنزیہ مضامین اور کچھ انشائیے۔ نقاد لوگ جو ادب کے مستری ہیں اُن کو یکجا کر کے ایک نصاب یا ایک کتاب میں جمع کر دیتے ہیں۔ یوں ادب کا نلکا بہنے لگ جاتا ہے اور تہذیب کا غسل خانہ مکمل ہو جاتا ہے۔

اس تقسیم کار نے ادیب کو مشین بلکہ مشین سے بدتر بنا ڈالا ہے۔ آپ وقت پڑے پر چاقو سے پیچ کش کا کام تو لے لیتے ہیں مگر ادیب کو زندہ فقرہ لکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ قطعہ لکھنے والے کو رباعی لکھنے سے منع کرتے ہیں اور رباعی لکھنے والے سے کہتے ہیں کہ تمہاری رباعی میں کچھ کچھ تغزل کا رنگ آگیا ہے۔ مجھ ایسے نقاد سے کہ خود کو ادب سے بے تعلق نہیں سمجھتا کہتے ہیں کہ تم تنقید میں مزاح لکھنے کی کوشش نہ کیا کرو۔ انتظار حسین سے کہتے ہیں کہ تم فقرے بازی کرتے ہو۔ ذرا سوچئے تو آپ شیخ سعدی کے زمانے میں ہوتے تو گلستان پڑھ کے بھی اُن سے یہی کہتے؟ غالب آپ کو غزل سُناتا تو بھی یہی ارشاد کرتے؟

نقادوں نے ادب کو خانوں میں تو بانٹ دیا مگر سعدی اور فردوسی، چوسر اور شکسپیئر، دوستوئیفسکی اور چیخوف، رابلے اور والتیر، غالب اور نظیر کو اُن خانوں میں فٹ نہ کر سکے۔ چڑیوں کے پنجروں میں کبوتروں اور کبوتروں کے کابکوں میں شیروں کو کیسے رکھا جا سکتا ہے؟ پھر بھی کئی ایک نقاد اس کوشش میں محنت کئے جاتے ہیں۔ کئے جاؤ محنت مرے دوستو۔

میتھیو آرنلڈ صاحب نے کوئی اسّی برس پہلے فرمایا تھا کہ ہومر کو کلاسیک کا رُتبہ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس میں اعلیٰ سنجیدگی نہیں پائی جاتی؟ یہ اعلیٰ سنجیدگی کیا ہوتی ہے اور ہومر میں کیسے نہیں پائی جاتی، اس کا کوئی شافی جواب اُن کے پاس نہ تھا۔ انہیں اعتراض تھا تو اس بات پر کہ ہومر ہنستا ہے اور دیکھئے صاحب، ہنسنے ہنسانے والے تو مسخرے ہوتے ہیں کلاسیک نہیں ہوتے۔ کلاسیک تو ہومر ہے جو اعلیٰ سنجیدگی کے ساتھ رزمیہ لکھتا ہے۔ میتھیو آرنلڈ صاحب پیرِ تسمہ پا کی طرح کوئی پچاس ساٹھ برس انگریزی ادب اور انگریزی تنقید کے سر پہ سوار رہے، جس طرح اُن کے اُردو مقلدین اب تک ہمارے سر پر سوار چلے آتے ہیں مگر آرنلڈ صاحب کا بھرم روبرٹ گریوز نے یوں کھولا کہ حضرت نے ہومر کو زندہ طریقے سے پڑھا ہی نہیں کیونکہ انہیں خبر بھی نہ ہوئی کہ ہومر ہنستا ہے، اعلیٰ سنجیدگی کے ساتھ رزمیہ لکھتے ہوئے بھی ہنستا ہے۔ یہ وہی کبوتر کے کابک میں شیر کو بند کرنے کی کوشش تھی۔ یا یوں کہیے کہ ہومر کو کلاسیک نہ ماننے کی سزا ادب نے یوں دی کہ ہومر کا مطالعہ بھی ٹھیک سے نہ ہو سکا۔

یہی سزا نظیر اکبر آبادی کے سلسلے میں اب تک ہمارے نقادوں کو ملتی چلی آ رہی ہے۔ ہمارے پُرانے نقاد اس کو مسخرا سمجھتے تھے یعنی ہومر کا بھائی بند اور اب بھی ایک آدھ نقاد اُن کی ہمنوائی کرتا ہوا پایا جاتا ہے۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ نقادوں نے پوری سنجیدگی سے اسے پڑھنا شروع کیا اور اس کی ہنسی کے لئے اپنے کان بہرے کر بیٹھے۔ ایک نقاد نے نظیر اکبر آبادی کا اُردو فارسی ہزل گوئی سے کچھ متعلق نکالا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ اس تعلق کو اچھا کہا جائے یا بُرا۔ نظیر کے کلیات میں بہت سے لفظوں کی جگہ نقطے چھپتے چلے آ رہے ہیں مگر اُن کے بعد ایسا کوئی شاعر کم ہی ملے گا جسے چھاپنے کے لئے نقطوں کی ضرورت پڑے۔ یوں ایسے شاعر ہوئے ہیں کہ اُن کا کلام سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے اور ایک آدھ ایسا بھی ہوا ہے جس کا پورا دیوان ہی چوری چوری چھپتا اور بکتا رہا ہے۔ مگر نظیر کے بعد (اکبر کے سوا) شاید ہی ایسا کوئی شاعر اُردو میں ہوا ہو جس کے یہاں سنجیدگی اور ظرافت یوں ایک ہو جائے کہ اس کا کلیات کھلے بندوں چھپے اور بکے بھی اور نقطوں کے سوا چارہ بھی نہ ہو۔

اعلیٰ سنجیدگی اور متانت کے مبلغوں نے اس معاشرے کو اس طرح بدل ڈالا ہے کہ اب نظیر جیسا شاعر اُردو میں پیدا ہونا ہی ناممکنات میں سے ہو گیا ہے۔ کیا ہماری معاشرت پہلے سے زیادہ مہذب ہو گئی ہے؟ یہ بات ماننے کی نہیں جب کہ جنسی جرائم اور نفسیاتی عوارض کا چاروں طرف دور دورہ ہو۔ شاید یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ ہم نے توانا زندگی اور توانا ادب کو اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے۔ اور دونوں کی باگ ڈور تنگ نظر مصلحین اور نقادوں کے ہاتھ میں دے رکھی ہے۔ اس کے علاوہ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ نثر میں تو ہم کسی حد تک یعنی منٹو اور عصمت کی حد تک، اس چیز کو گوارا بھی کر لیتے ہیں مگر غزل میں، مثلاً سلیم احمد کی غزل میں، یہ بات آ جائے تو کانوں پر ہاتھ رکھنے لگ جاتے ہیں کہ توبہ توبہ کیا زمانہ آ گیا، غزل میں لوگ ایسی باتیں کرنے لگے۔ معلوم نہیں جن لوگوں نے انشاؔ اور نظیرؔ کو پڑھا ہے انہیں کس نظر سے پڑھا ہے اور جن لوگوں نے غالبؔ اور داغؔ کو پڑھا ہے انہوں نے دماغ سے کام لینے کی زحمت کیوں گوارا نہیں کی۔ درحقیقت اس معاملے میں پڑھنے والے اور ان پڑھ سب برابر ہیں۔ جب کوئی معاشرہ زندگی سے قطع تعلق کرتا ہے تو اپنے ہی خوف کے زنداں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

کراچی سے ایک دو ورقی اخبار نکلتا ہے۔ اس کی سنجیدگی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس پہ نہ کسی ایڈیٹر کا نام ہوتا ہے اور نہ زیادہ تر چیزوں پہ لکھنے والوں کا۔ یہ گزٹ تنقید کو ”زرد صحافت“ کی زبان میں پیش کرتا ہے اور ادیبوں پر اعتراض کرتا ہے تو کہتا ہے

کہ فلاں سنسنی خیزی کرتا ہے فلاں فقرے بازی۔ اگر اس اخبار میں لکھنے والے اور اسے نکالنے والے "ادارہ ثقافت اسلامیہ" یا "بزم طلوع اسلام" سے متعلق ہوتے تو ان اعتراضات کی وجہ سمجھ میں آسکتی تھی۔ ایک گزٹ میں اس قسم کے اعتراضات؟ مگر آج کے کیا اخبار اور کیا رسالے، کیا گزٹ اور کیا نقاد، سب ادب کو کابکوں اور پنجروں میں گرفتار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے چند ایک نقادوں کو محمد حسن عسکری کی فقرے بازی سے گلہ پیدا ہوا تھا حالانکہ جس چیز کو عسکری کی فقرے بازی کہا جاتا ہے وہ زیادہ تر اسلوب کی کرشمہ کاری ہے اس لئے پیچھے کسی آدسکر وائلڈ یسی برنارڈ شو کا ذہن موجود نہیں۔ بہرحال مطلب یہ ہے کہ فقرے بازی کا گلہ اصل میں اسلوب کا گلہ ہے اور یہ گلہ ان لوگوں کو ہوتا ہے جو ایسا نہیں کر سکتے۔ چند ایک گلہ گزاروں نے اپنی سی کوشش بھی کی مگر جب سیدھے سبھاؤ بات نہ بنی تو گزٹ کا پردہ تان کر بیٹھ گئے اور لگے کوسنے سنانے۔ ایسے لوگوں کو بنے بنائے تعصبات کا ایک ڈھانچہ بڑی آسانی سے وراثت میں مل جاتا ہے اور وہ معاشرت اور تنقید کے تیار کئے ہوئے پنجروں اور کابکوں کو مضبوط کرنے کی خدمت بھی انجام دینے سے باز نہیں آتے۔

آج کے ادب سے یہ شکوہ صرف کراچی کے اس دو ورقی گزٹ تک محدود نہیں۔ ہمارے بہت سے بھاری بھرکم رسالوں میں کبھی کوئی ایسی چیز خال خال ہی چھپتی ہے جس میں صداقت ہو، لگی لپٹی کے بغیر خدا لگتی بات کہی گئی ہو اور مرنجان مرنج قسم کی مردہ تحریر سے پرہیز کیا گیا ہو۔ صرف ایک صورت میں اس کا امکان ہے اور وہ یہ کہ تان ایڈیٹر صاحب کی تعریف پہ ٹوٹے اور اگر ان کے چند ایک ساتھیوں کے حق میں بھی خیر کا کوئی کلمہ ہو جائے تو سبحان اللہ۔ یعنی ہم معاشرت کے تعصبات سے بھی اسی وقت نکلتے ہیں جب ذات کا پرچم لہرانا چاہتے ہوں۔ پھر یہ بات کراچی اور لاہور تک محدود نہیں، میں نے پشاور کے ایک پرچے میں بھی یہی کچھ دیکھا ہے۔ گویا ادیبوں کا "دن یونٹ" ہی اس چیز کے خلاف ہے کہ تحریر میں کسی غیر سنجیدہ یا کم سنجیدہ بات کی آمیزش ہو۔ ویسے جغرافیائی جائزہ مکمل کرنے کے لئے عرض کردوں کہ مشرقی پاکستان سے بھی ایسی آوازیں آتی رہتی ہیں جو کہتی ہیں کہ ہم ایک ہی ملک کے دو حصے ہیں۔

یہ مسئلہ انتظار حسین یا سلیم احمد یا میری یا کسی ایک آدھ آدمی کی تحریر کا نہیں بلکہ مجھ سے پوچھئے تو کہوں گا کہ کم از کم انتظار حسین سے یہ گلہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ان کے یہاں کھلنڈرے پن کی ایک خواہش یا حسرت کے باوجود، ایک اس طرح کی سنجیدگی یا ثقاہت ملتی ہے جو مولانا حالی سے لے کر عبادت بریلوی صاحب تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ مولانا حالی کے یہاں ایسی نثر اور شاعری تو مل جائیگی جسے پڑھ کر ہنسی آئے مگر وہ ہمارے ساتھ ہنستے ہوئے نظر نہیں آئیں گے۔ پھر بھی انہوں نے اپنی حدود میں رہ کر یہ بڑا کمال کیا کہ غالب اور سعدی جیسے اپنے سے مختلف آدمیوں کو سمجھنے اور ان سے حظ اٹھانے کی پوری کوشش کی۔ اگرچہ ان کے اپنے لفظوں سے غالب یا سعدی کی تصویر نہیں ابھرتی جس طرح کہ محمد حسین آزاد کے لفظوں سے دس بیس شاعروں کی زندہ تصویریں ابھرتی ہیں۔

آزاد کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ آب حیات کے چھپتے ہی ایک غیر سنجیدہ غیر علمی "خیالوں کے طوطے مینا اڑانے والے" کا تاثر قائم ہو گیا تھا مگر جیسے جیسے اردو ادب کی تاریخ ہم پر واضح ہوتی جاتی ہے۔ آب حیات کے مرقعوں کی صحت اور صلاحیت بھی ہمیں محسوس ہوتی جاتی ہے۔ آزاد نے جس طرح علم اور مشاہدے، تخیل اور زبان کو ملا جلا کر ایک مکمل تصویر معاشرتی پس منظر کے ساتھ کھینچی ہے اسی کا نام ادب ہے اور اسی کا نام تنقید بھی ہے۔ آزاد کے سلسلے میں ایک اور بات آب حیات سے بھی زیادہ دلچسپی کی حامل ہے۔ اسے سننے سے پہلے یہ نوٹ کر لیجئے کہ اردو ادب میں طنز و مزاح کی کسی تاریخ یا جائزے میں ان کا یا ان کی کسی تحریر کا ذکر ابھی تک نہیں آیا۔ دوسرے یہ کہ انگریزی طنز کے بارے میں لکھتے ہوئے تقریباً ہر اچھے نقاد نے اٹھارویں صدی کے مؤرخ ایڈورڈ گبن کو انگریزی

زبان کا سب سے عمدہ نہیں تو نہایت عمدہ طنز نگار قرار دیا ہے۔ خصوصاً اُن نقادوں نے جو سمجھو آزاد صاحب کے اصلی تنقید کی ذات تصور کے دریچہ تک نہیں آتے۔ اب دیکھیے دربار اکبری میں ملاں عبدالقادر بدایونی کا احوال۔ ملاں صاحب ایک دیندار ہیں کہ ہمارے سامنے آتے ہیں وہ اکبر کی مذہبی پالیسی کے خلاف جہاد بالقلم کا پرچم لہراتے ہیں۔ ابوالفضل اور فیضی کے خیالات و افکار کی تردید کرتے ہیں۔ اُس عہد کی تاریخ لکھتے ہوئے ہر اس چیز کی مخالفت کرتے ہیں جو زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ہے۔ ان کے مشاہدات و دلائل میں کچھ صداقت بھی نظر آتی ہے۔ دین کہ ان کا معیار ہے ہماری نظر میں بھی محترم ہے۔ اس کے باوجود ان کو شیخ احمد سرہندی کا پیرو کہنا بہت مشکل ہے۔ ان کی بات میں کسی خاص چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے اور محمد حسین آزاد نے کچھ اس طرح اُن کا نقشہ کھینچا ہے کہ آدمی اور عصر، مؤرخ اور تاریخ ایک ہو جاتے ہیں۔ شروع سے آخر تک کوئی ایسا فقرہ یا لفظ بھی نہیں جو ان کی دینداری اور علم سے انکار پر دلالت کرتا ہو۔ ساری بات اتنی ہمدردی، فہم اور تہذیب سے کہی گئی ہے کہ اختلاف کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ سارے مضمون میں کہیں اُن کو تنگ نظر یا ظاہر پرست، خود غرض یا موقع پرست، شکست خوردہ اور یاس پرست نہیں کہا گیا مگر مضمون پہ غور کیجیے تو شاید اردو ادب کی پوری تاریخ میں ایسی عمدہ طنزیہ تنقید یا شخصیت نگاری شاید ہی کہیں ملے، مہذب طنز کی اس سے اچھی مثال اُردو ہی نہیں کسی بھی زبان میں کم دکھائی دے گی۔ اس کے باوجود محمد حسین آزاد کا اُردو طنز کی تاریخ میں کہیں نام نہیں آتا کیونکہ دربار اکبری میں ہمارے نقادوں کو گمان تک نہیں گزرتا کہ طنز کا کوئی موقعہ یا کوئی گنجائش ہو سکتی ہے۔ تاریخ کو ہم لوگ ادب کی ایک شاخ نہیں سمجھتے اور اس میں چاہے وہ محمد حسین آزاد کی لکھی ہوئی کیوں نہ ہو طنز کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے۔

ایک طرف ہم ادب سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ کبھی غیر سنجیدہ بات نہ کرے یعنی دوسرے معنوں میں زندگی اور توانائی کا ثبوت ہی نہ دے اور دوسری طرف سنجیدہ نثر میں جو جو کمالات ہوئے ہیں ان سے بھی واقفیت رکھنا پسند نہیں کرتے۔ میں ایسے ادیبوں اور نقادوں سے واقف ہوں کہ حسرت موہانی کی عشقیہ شاعری کو نصاب میں رکھتے ہوئے گھبراتے ہیں اور اپنے دور کی سنجیدہ تحریروں مثلاً مودودی کی نثر سے بھی بدکتے ہیں۔ دراصل انہیں ہر اس چیز سے دوری مطلوب ہے جو ان کو اپنی کتابوں سے باہر نکلنے پر مائل کر سکے یا کر سکتی ہو۔ چاہے وہ جدید ادب سے تعلق رکھتی یا قدیم ادب سے۔ میرؔ کو انہوں نے یاس پرست بنا کے رکھ دیا ہے۔ غالبؔ کو مفکر اور اقبال کو پیغمبر۔ شبلی صاحب کی انسائیکلوپیڈیا آف ورلڈ لٹریچر میں اُردو ادب پر جو مضمون ہے اس میں لکھا ہے کہ نظیر اکبر آبادی بچوں کا شاعر ہے۔ صرف نظیر پر کیا موقوف ہے ہمارے اساتذہ مکتب نے ہر شاعر کو بڑی عمر کے بچوں کا شاعر بنا کے رکھ دیا ہے یا بلوغتِ فکر و نظر سے ادب کا کوئی رابطہ باقی نہیں رہنے دیا۔

ہمارے کالجوں میں ادب اسی زاویے سے پڑھایا جاتا ہے کہ جسم یا ذہن میں ہلکا سا بھی ارتعاش پیدا نہ ہونے پائے۔ نصاب کی کتابیں اور مصنف اور دیوانوں کے اجزا بھی اسی طرح درس میں شامل کئے جاتے ہیں اور طریقہ تعلیم اس پر مستزاد۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے یہاں عربی اور فارسی ادب ایسے نہیں پڑھا جاتا تھا۔ جیسے اب اُردو ادب پڑھایا جاتا ہے۔

اسی شہر لاہور کے ایک کالج میں ایک مولوی عبداللہ ٹونکی صاحب درس دیتے تھے جن سے پڑھنے شبلی یہاں آئے تھے۔ ان کے زمانے میں جریر اور فرزدق کی باہمی ہجویات جو "النقائض" کے نام سے موسوم ہیں درس میں شامل تھیں۔ ان ہجویات میں چند ایک الفاظ پر طالب علموں کو اعتراض ہوا تو مولوی صاحب نے سمجھایا کہ آپ لوگ عربی زبان پڑھتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ عرب کیسے

گالی دیا کرتے تھے تو آپ کی زباندانی مکمل نہ ہوگی۔ حیرانی ہے کہ کسی کالج کا پروفیسر ادب کے معاملے میں استاد وسیع المطالعہ اور وسیع النظر ہو، پھر وہ بھی ایک مولوی۔ آج کل تو ہر بے ریش استاد تنگ نظری اور بے بصری میں کسی بھی بدنام مولوی سے میلوں آگے ہے۔ اب ادب میں "اعلیٰ سنجیدگی" نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا؟ نظیر اکبر آبادی اور غالب اور داغ اور حسرت موہانی تو اس زمانے میں نہیں ہو سکتے۔

حیرت ہے کہ عربی والے تو جریر اور فرزدق پڑھیں، متنبی اور ابو نواس اور معری کا مطالعہ کریں اور اردو والے نظیر اکبر آبادی کو کچوں کا شاعر سمجھیں، باقی اقبال کی بات نہ کریں، داغ اور حسرت کو مخرب اخلاق قرار دیں، سودا کی ہجویات کو ہاتھ نہ لگائیں، ریختی کو زوال کی یادگار کہہ کے پس پشت ڈال دیں، باغ و بہار کا ایک چوتھائی حصہ کاٹ کے پھینک دیں ــــ کس لئے کہ نقاہت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ہمیں فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ ہماری قوم کو نقاہت چاہیئے یا ثقافت۔ ثقافت میں تو زندہ ادب ضرور آئیگا۔ جس کا ایک بڑا حصہ ہم نے متروکات کے ضمن میں لکھ رکھا ہے۔

اب جو لوگ مولوی عبدالله لونکی کی مسند پر متمکن ہیں ان کی اخلاقیات میں بہت سی چیزیں جائز ہیں مگر مجمع عام سے ہٹ کر پڑھانا چونکہ کھلے بندوں پڑتا ہے اس لئے وہاں ان چیزوں کا گزر نہیں ہو سکتا جو خلوت اُستادی سے تعلق رکھتی ہیں۔ چلئے اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ جعفر زٹلی کا کلام کلاس میں پڑھایا نہیں جا سکتا تو نہ سہی مگر یہ اصحاب تو غالب کو حالی اور حالی کو اپنے جیسا بنا کر دم لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ تنقید بھی لکھتے ہیں اور ادبی بحثوں وغیرہ میں بھی شریک ہوتے ہیں اس لئے اب یہ نظام تعلیم ہی کا نہیں، اردو ادب کا بھی درد سر بن چکے ہیں۔

ادب کو کابکوں میں تقسیم کر کے ادیبوں کو ان میں بند کرنا ـ ان اساتذہ ادب و تنقید کا مقصد حیات ہے۔ ان بزرگوں نے اپنی کتابوں، شاگردوں، حلقوں، دائروں اور امداد یافتہ اداروں کے ذریعے علمی کام کا ایک اتنا اونچا، پاکیزہ، سنجیدہ اور پست مذاقی سے مبرا معیار قائم کیا ہے کہ ادیب بچارا اس کے مقابلے میں سرکس کا بھانڈ بن کے رہ گیا ہے۔ اس بلندی، پاکیزگی اور سنجیدگی کی بنیاد ملکہ وکٹوریا کے زمانے کی دوہری اخلاقیات پر قائم ہے یا ہماری تہذیب کی وسعت قلب و نظر پر، اس کا فیصلہ بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر ان ہی لوگوں کے سامنے کسی غیر درسی ادیب کی اہمیت کا ذکر چھیڑا جائے یا محض ان کے کسی ساتھی کا نام ان کے سامنے لے دیا جائے تو ساری بلندی، سنجیدگی اور پاکیزگی پل بھر میں رخصت ہو جائے گی۔ شاید اسی اونچے معیار کی توقع وہ ادیبوں سے کرتے ہیں مگر سچا ادیب یوں کرنے لگے تو ایک سطر نہ لکھ سکے۔ یہ تو کچھ ان ہی بزرگوں کا جگرا ہے کہ کچھ بھی محسوس کئے بغیر لکھتے چلے جاتے ہیں۔

ان بزرگوں کا تقاضا ہے کہ آپ طنز و مزاح لکھنے بیٹھیں یا اس قسم کا کوئی ارادہ یا خواہش آپ کے دل میں ہو تو پہلا مصرع یا پہلی سطر لکھنے سے پہلے عنوان یا انتساب یا کسی ذیلی سرخی کے ذریعے ہمیں بتا دیجئے کہ آپ طنز و مزاح لکھنے جا رہے ہیں۔ کیوں؟ تاکہ فیصلہ کر سکیں کہ اس تحریر کو کب اور کہاں پڑھا جاتے اور پڑھا بھی جائے کہ نہیں۔ یہ نہیں کہ لکھنے تو آپ غالب یا میر پر بیٹھیں اور کوئی فقرہ مار دیں ہم پر یا حکومت کے کسی محکمے پر یا سرکاری امداد پانے والے کسی ادارے پر گویا اردو تنقید میں طنز، یہ مزاحیہ فقرے پر جو قدغن ان بزرگوں نے لگا رکھی ہے بہت سوچ سمجھ کر لگا رکھی ہے۔ ان کی خیریت اسی میں ہے کہ تنقید کی زبان سنجیدگی اور ثقافت سے مملو ہو۔ اساتذہ تو خیر ہوئے، جناب جمیل الدین عالی بھی کہتے ہیں کہ سلیم احمد تھا جانا جدید شاعری پر لکھتے لکھتے فیملی پلاننگ کی گولیوں کو بیچ میں لے آتے ہیں۔ گویا تنقید صرف ادب کے ظاہری پہلوؤں پر ہوتی ہے۔ اسکے معنوں یا معنوں کی وساطت سے زندگی پر نہیں ہوتی۔

جیسے تنقید کا زندگی سے کوئی ربط نہیں۔ پھر بھی ادب تو اس کا موضوع ہے ہی۔ جب ادب کی روایت میں سنجیدگی، ثقاہت، ٹھہراؤ، مزاج کے ساتھ ہم بغل ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے تو تنقید میں اس کا عکس کیونکر نہ آئے گا۔ تنقید، ادب کی بجائے عمرانیات، معاشیات، نفسیات، تاریخ اور فلسفے وغیرہ کی ایک شاخ نہیں پھر بھی ہر تحریر کا اسلوب اس کے موضوع سے متعین یا پیوست ہوتا ہے۔ ادب میں تو یہ کچھ ہو اور تنقید میں کچھ بھی نہ ہو۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تنقید میں ادب کا پرتو بھی موجود نہیں اور اگر واقعی ایسا ہونا ضروری ہے تو پھر ادب سے اس کا کیا تعلق؟

بات کچھ یوں ہے کہ تخلیقی ادب کی طرح ادبی تنقید بھی زندہ اور مردہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ جس تنقید کا پرچم سنجیدگی اور ثقاہت کا نام لے کر بلند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ مردہ تنقید ہے۔ تنقید میں اس چیز کو کیسے حرام کیا جا سکتا ہے جس کا نام ان لوگوں نے نعرے بازی رکھ چھوڑا ہے جبکہ اردو تنقید کی ابتدا اسی قسم کی نعرے بازی سے ہوتی ہے۔ غزلوں کے مقطعے، خطوں میں کسے ہوئے فقرے اور تذکروں میں کی ہوئی چھیڑ چھاڑ ——— کیا اردو تنقید کا آغاز ان سے نہیں ہوا تھا؟ میر یا غالب کی تنقید میں کسی چیز کی کمی تھی تو اس کا نام تجزیہ ہے۔ یہ تجزیہ بھی بہرحال کیمیاوی تجزیے سے مختلف چیز ہے۔ لیبارٹری میں آپ کے مزاج اور جذبات کا کوئی مصرف نہیں کیونکہ اس سے تجزیے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی مگر کسی ادب پارے، کسی ادیب، کسی ادبی دور کا تجزیہ اس قسم کا تجربہ نہیں ہوتا کہ نقاد کے مزاج اور جذبات سے اس میں کوئی مدد نہ مل سکے۔ ہم تنقید کو کیمسٹری نہیں بنا سکتے۔ کیونکہ تنقید کا موضوع یعنی ادب اور زندگی کسی کیمیاوی مرکب کا نام نہیں۔

جناب احتشام حسین، وقار عظیم، آل احمد سرور، ممتاز حسین، مجتبیٰ حسین، عبادت بریلوی بلکہ جناب عابد حسن منٹو تک یعنی ترقی پسند تنقید کے سب چھوٹے بڑے، کوئی ایسا فقرہ نہیں لکھتے کہ پایۂ ثقاہت سے گرا ہوا ہو۔ کوئی ایسا شعر بھی کسی استاد کا درج نہیں کرتے کہ اس درجے سے فروتر ہو۔ ان کی گفتگو میں متانت اور لئے دئے رہنے کا جو اندازہ پایا جاتا ہے وہ ان کو ہماری نظروں میں قابل صد احترام بنا دیتا ہے۔ دیکھیے کیسے شائستہ بزرگ ہیں، ان کے مقابلے میں تو شبلی اور محمد حسین آزاد بھی پھکڑ معلوم ہوتے ہیں۔ فراق گورکھپوری، کلیم الدین احمد اور محمد حسن عسکری اس پائے کو نہیں پہنچتے کہ وہ بھی کبھی چوک جاتے ہیں۔ سلیم احمد اور انتظار حسین اور مظفر علی سید کا تو ذکر نہ کیجیے، خصوصاً جبکہ ان سب لوگوں کے نئے ایک کتاب ''دوسری نسل'' کے سائن بورڈ کے ساتھ تیار ہو چکی ہے جس میں انکے ساتھ کچھ ہندوستانی پاپیوں جیسے وحید اختر، خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ کو بھی بند کیا جائیگا۔ یہ سب لوگ اپنے آپ کو تخلیقی فنکار سمجھتے ہیں (یوں تو احتشام صاحب بھی خود کو افسانہ نگار سمجھتے تھے مگر یہ مثال بے موقع ہے) ان کو نقاد کہنا تنقید کی تذلیل ہے۔ یہ لوگ تنقید کے نام پر جو کچھ لکھتے ہیں وہ تنقید نہیں کہی جا سکتی۔ تنقید میں ہلکی پھلکی نثر لکھنا کیا معنی؟ تنقید میں زٹل بھگارنے کی کیا گنجائش؟ ان میں سے ایک آدھ تو تنقید میں فحش نگاری پر اتر آتے ہیں۔ کیا فرماتے ہیں مصلحین قوم بیچ اس مسئلے کے؟

ابھی تو منٹو اور عصمت بھی ہمارے امتحانی ادب کے نصاب میں جگہ نہیں پا سکے حالانکہ انہوں نے جو کچھ سلیبیت مذاقی کی افسانے میں کی، جس میں چونکہ اہل تدریس ان کے حریف نہیں، اس لئے بات رفت گزشت کہنے کی ہے۔ اور یہ لوگ جو تنقید میں کالی شلواریں اور لحاف لہراتے ہوئے پھرتے ہیں، اردو تنقید کی عصمت کیلئے ایک خطرہ ہیں۔ ہم نے اپنے طالبعلموں کو ہدایت کر رکھی ہے کہ کسی مسلم الثبوت نقاد کی لکھی ہوئی تحریر کے سوا جیسے تنقید کہتے ہیں اور کچھ نہ پڑھا جائے۔ اب تو خدا کے فضل، ناشروں کے کرم اور امدادی اداروں کی برکت سے اس کا بھی انتظام ہو گیا ہے کہ طالبعلموں کو میر اور غالب پڑھنے کی زحمت بھی نہ اٹھانی پڑے۔ ان کے بارے میں ہماری کتابیں مارکیٹ میں آچکی ہیں جن میں اتنی جامعیت اور اتنا توازن ہے، اتنی سنجیدگی اور پاکیزگی ہے کہ طلباء و طالبات ان کو جوشاندے کی طرح پی کر تمام امتحانی سوالوں کا، جو ہم خود بناتے ہیں، کافی و شافی جواب دے سکتے ہیں۔

سجاد باقر رضوی

ہمارا عہد اور تنقید

سب سے پہلے میں یہ واضح کرتا چلوں کہ آپ تنقید کے ارتقا، تنقیدی رجحانات و نظریات کے بارے میں مجھ سے کسی بحث کی توقع نہ رکھئے۔ مختلف تنقیدی مسائل اور معلومات کے سلسلے میں اردو اور انگریزی کی بیشتر کتابیں آپ کی تشفی کر دیں گی۔ چند موٹے موٹے تنقیدی مسائل کے متعلق معلومات حاصل کرنی ہوں تو تنقید کے ارتقا پر عبادت بریلوی سے، معاشرتی تنقید پر احتشام حسین سے، مارکسی تنقید پر ممتاز حسین سے، نفسیاتی تنقید پر ریاض احمد سے، تاثراتی تنقید پر فراق گورکھپوری سے، ادب برائے زندگی کے مسئلہ پر مجنوں گورکھپوری سے، ادب برائے ادب کے متعلق محمد حسن عسکری سے، داستانوں افسانوں اور ناولوں کے مسائل پر سید وقار عظیم، ڈاکٹر احسن فاروقی اور کلیم الدین احمد سے رجوع کیجئے۔ میں نے تنقیدی مسائل اور ناقدوں کے ناموں کا ذکر کسی خاص رعایت سے نہیں کیا ہے چند مشہور ناقدوں کے نام میرے ذہن میں اور آ رہے ہیں۔ جنہوں نے اردو ادب کے مختلف مسائل پر روشنی ڈالی ہے میں ان کا نام بھی لئے لیتا ہوں۔ تاہم میری یادداشت میں ناقدوں کی کوئی جامع فہرست نہیں ہے۔ آل احمد سرور، حمید احمد خاں، ڈاکٹر سید عبداللہ، عابد علی عابد، عندلیب شادانی، فیض احمد فیض، ڈاکٹر وحید قریشی، قاضی عبدالودود، مجتبیٰ حسین نے بیشتر تنقیدی و تحقیقی مقالے اور کتابیں تحریر کی ہیں۔ جن کا مطالعہ اردو ادب کی مختلف النوع ابھروں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ ان تمام اصحاب میں بیشتر ادبیات اردو و انگریزی کے اساتذہ شامل ہیں۔ ان کی ذہنی بلوغت کے باعث ان کی تنقیدی آرا ادب پر محاکمہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

میرے اس مضمون میں آپ کو مغربی ناقدوں کی اسناد اور ان کے خیالات اور ان کی تحریروں سے اقتباسات بھی نہیں ملیں گے۔ تنقید کے چند مکاتیب فکر کا ذکر محض اجمالاً آئے گا۔ اس کے علاوہ جو کچھ آپ تک پہنچے گا۔ وہ محض چند سوالات اور چند مفروضے ہوں گے۔ جنہیں آپ چاہیں تو سننے کے بعد فوراً رد کر دیں۔ میں اس مضمون میں تنقید کا کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کر رہا۔ میں تنقید پر گفتگو کرنے کے بجائے زیادہ تر تنقیدی ذہن کی بات کروں گا۔ اور اسی لئے میرے مضمون میں مخصوص قسم کے مستند نقادوں کا ذکر بھی نہیں آئے گا۔ اور اگر اس کے باوجود میری اس تحریر سے ان سوالوں اور مفروضوں سے جنہیں پیش کر رہا ہوں، آپ کے ذہن میں کوئی تنقیدی نظریہ ابھرے تو اس کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔

مجھے مختلف تنقیدی نظریات و مکاتیب فکر کی افادیت سے قطعی انکار نہیں ایسے تمام نظریات ادب پارے کے فنی، ادیب کے ذہنی و معاشرتی لوازم کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ذہنی و جذباتی معاشرتی و تاریخی عوامل کی شناخت و دریافت یقیناً مسرت بخش ہوتی ہے۔ یہ بات بھی بحث طلب نہیں کہ کسی ادبی تخلیق کے لئے معاشرہ و ماحول جو مواد فراہم کرتا ہے۔ ذہن جو تخلیق کا باعث بنتا ہے۔ اور فنی اصولوں سے آگاہی تاکہ تخلیق فن کی سطح پر ہو۔ یہ تمام چیزیں ضروری و لازمی ہیں تاہم یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس قسم کے سارے نظریئے مل جل کر ادیبوں کی ذہنی تربیت کر سکتے ہیں؟ اور دوسرا اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ اگر ان تمام نظریوں اور تنقیدی مفروضوں کی موجودگی کے باوجود تخلیقی صلاحیتیں مدھم اور کمزور رہیں تو کیا ہم یہ سوچنے پر مجبور نہیں ہوتے کہ یہ تمام نظریات اور مفروضے اپنے اپنے طور پر تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لانے کے اہل نہیں ہیں؟۔ ادبی مباحث کے سلسلے میں ہم سب کا یہ تجربہ ہے کہ بالعموم کسی فن پارے کو پرکھتے وقت یا تو معاشرتی عوامل اور ماحول کا تجزیہ کر دیا جاتا ہے۔ یا پھر نفسیاتی گتھیوں اور الجھنوں پر بحث ہو جاتی ہے یا فنی لوازمات پر گفتگو ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود ہوتا یہ ہے کہ مردے میں جان نہیں آتی اور فن پارہ ہمیں متاثر نہیں کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ صحیح معنی میں جاندار فن پارہ محض معاشرتی عوامل، نفسیاتی پیچیدگیاں اور فنی لوازم

کے اظہار کا نام نہیں۔ وہ ان تمام چیزوں سے بالاتر کوئی شے ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس بات کو یوں کہیے کہ وہ ان تمام عوامل و محرکات کا اظہار ہونے کے باوجود ایک عمل تخلیق ہے۔ فن کار کو فن پارے کی تخلیق کا عمل مسرت بہم پہنچاتا ہے اور قارئین کو تخلیقی عمل کا حاصل۔ ہر تخلیق میں فن کار کی نفسیاتی الجھنیں اس کا طرز احساس، اس کے ماحول کا اثر اور اس اثر پہ اس کا ذہنی ردعمل معاشرتی سیاسی حالات یہ تمام باتیں شامل ہوتی ہیں۔ تاہم ان تمام باتوں کے یکجا ہو جانے سے ہی کسی تخلیقی فن پارے کا ظہور لازمی نہیں ہے۔ اور ناقد کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اس بات کو سمجھے اور اس طرح ماحول سے جزئیہ نفسیاتی عوامل یا پس منظر یا محرکات کی تشریح کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی خیال رکھے کہ فن پارہ ایک تخلیق ہے نہ کہ معاشرتی تاریخ یا نفسیات یا سیاسیات کی کوئی کتاب۔ ساتھ ہی ناقد کا فرض یہ بھی ہے کہ آج کے زمانے میں ناسخ یا مومن کی غزل کو کوئی پسند کرے یا نہ کرے مضمون لکھتے ہوئے وہ ہمیں یہ بھی بتائے کہ وہ شاعر آج ہمارے زمانے میں کس اہمیت کے حامل ہیں اور ان شعرا کو آج ہم کس طرح قبول کریں یعنی یہ کہ ان کا مطالعہ ہماری تخلیقی صلاحیتوں کے لیے کیوں ضروری ہے۔

تنقید کے مختلف منصب بتائے گئے ہیں۔ تعین، تشریح، حسن و قبح کی توضیح، تجزیہ فن پارے کی قدر، تعین وغیرہ مگر تنقید کا سب سے مفید کام یہ ہے کہ وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ تخلیقی بنانے کے متعلق سوال اٹھاتی ہے۔ میں یہاں محض ادبی و فنی تخلیق کے متعلق بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں یہاں ادب و فن کے ان سوتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جو ان کی زندگی کے ضامن ہوتے ہیں اور جہاں سے وہ پنپنے کے لیے مواد اخذ کرتے ہیں یعنی پوری زندگی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی فن پارے کے متعلق نظریات اسی وقت کارگر اور مفید ہو سکتے ہیں جب کہ وہ پوری زندگی کے نظریات سے ہم آہنگ ہوں یعنی یہ سوال کہ مومن و مصحفی و میر و غالب کے فن کو آپ کیا سمجھتے ہیں، اس بڑے سوال کا ایک حصہ ہے کہ آپ زندگی کے بارے میں کیا تصور رکھتے ہیں۔ اس طرح ادبی و فنی تخلیق پوری زندگی کے تخلیقی عوامل کا محض ایک حصہ ہے۔ پوری زندگی کے تخلیقی ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر آدمی ادب پیدا کرنے لگے یا فن کار ہو جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں زندگی کے تمام شعبے تخلیقی طور پر کام کرنے لگیں چاہے وہ سائنس ہو، سیاست ہو، تعلیم ہو، ادب ہو یا سیر و تفریح کے مشاغل۔

ادب و فن زندگی کے دوسرے عوامل سے قطع نظر کوئی عمل نہیں ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ ادب پر مختلف سیاسی، معاشی و معاشرتی عوامل محض بالواسطہ طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ان عوامل کے تاثرات اور وہ چیز جو ادبی و فنی شہ پاروں میں مسرت بخش ہوتی ہے۔ وہ عمل تخلیق کی کارروائی ہے۔ ادیب و فن کار کے لیے تخلیقی عمل خود باعث مسرت ہوتا ہے اور قارئین و ناظرین کے لیے اس تخلیقی عمل میں ان کی اپنی ذات کی شمولیت جس کے باعث وہ فن پاروں میں اپنے جذبات و احساسات کی شناخت اور دریافت کرتے ہیں۔ تاہم ناقد کے لیے سیاسی، معاشرتی، معاشی، نفسیاتی عوامل کا شعور بالواسطہ طور پر لازم ہے اور صرف اس طرح وہ ادب و فن کے متعلق ان تخلیقی نظریات کی تشکیل کر سکتا ہے جو پوری زندگی پہ منطبق ہو سکیں۔ مثال کے طور پہ اگر ناقد ادب میں کلاسیکی یا رومانی رجحانات کا قائل ہے تو آپ کو اس سے یہ پوچھنے کا حق حاصل ہے کہ وہ پاکستان کے سیاسی نظام کے متعلق کیا نظریہ رکھتا ہے اور اس کا سیاسی نظریہ ادب کے کلاسیکی یا رومانی نظریہ سے کس طرح ہم آہنگ ہے۔ اسی طرح ادب میں آزاد خیالی یا رجعت پسندی یا ترقی پسندی کے نظریات کو پوری قومی زندگی اور زندگی کے ہر ادارے و شعبے میں منطبق ہونا چاہیے۔ ادب میں کلاسیکی رجحانات کا پرچار اور زندگی میں بے تنظیمی یا آزادہ روی کی حمایت کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اسی طرح ادب میں روایت کا مدعی ہونا اور زندگی میں بے تنظیمی کی حمایت ایک بنیادی تضاد ہے۔ ادب میں ہیئت کے تجربوں کو زندگی میں ہیئتوں کی توڑ پھوڑ اور نئے تجربوں سے منطبق ہونا چاہیے۔ اور ادب و فن میں تجریدیت کو زندگی کی تجریدیت سے ہم آہنگ ہونا چاہیے ورنہ ادب و زندگی کے بنیادی تضاد سے تخلیقی سوتوں کا خشک ہو جانا لازمی ہے۔ یہیں میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا چلوں کہ زبان و بیان و موضوعات کی ان منازل کو جنہیں یورپ نے صدیوں کے سفر میں طے کیا ہم ایک جست میں طے کر لینا چاہتے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ آج ہمارے یہاں ادیب و شاعر اپنی پیدائش کے ساتھ ہی سیدھے سادے سچے جذبات کو چھوڑ کر تجرید اور علامتی اظہار کی طرف مائل ہو جاتے ہیں بمقابلتاً۔ نقاد ادیب فلسفیانہ موشگافیوں میں لگے رہتے ہیں اور ایم اے میں پڑھنے والی لڑکیاں قیسی رامپوری کے ناولوں سے ادبی ذوق کی

تسکین کرتی ہیں۔

تخلیقی زندگی کے معنی یہ ہیں کہ گرد و پیش کے حقائق و اشیا کتابوں سے حاصل کی ہوئی تعلیم ہمارے روحانی تجربات و قلبی واردات کا حصہ بن جائیں۔ ان کا تعلق محض جسمانی، مادی و مفادی زندگی سے نہ ہو۔ بلکہ وہ قلبی واردات اور اقداری زندگی سے بھی منسلک ہوں۔ یہ بات لباس، زبان، تفریح، مثلاً فلم اور مادی ضروریاتِ زندگی سبھی چیزوں پر صادق آتی ہے میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک یہ تمام چیزیں مقصد سمجھی جائیں گی۔ وہ ہمارے روحانی تجربات کا حصہ نہیں بنیں گی۔ یعنی یہ کہ وہ محض ذریعہ ہیں کسی اور مقصد کے حصول کے لئے اور مقاصد کا تعلق مادی زندگی سے نہیں ہوتا۔ ان کا تعلق روحانی اور ذہنی زندگی سے ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات کافی نہیں ہے کہ محض ایک دو افراد اپنے اپنے طور پر مادی اسائشوں کا تعلق کسی بڑے مقصد کے ساتھ قائم کریں۔ یہاں مقاصد اور روحانی زندگی سے میری مراد قومی زندگی کے مقاصد اور قومی زندگی کی روح سے ہے۔

شعر و ادب نئی نئی تشبیہات اور نئے استعارے محض اس وقت داخل ہوں گے جب کہ گرد و پیش کی مادی تبدیلی میں قومی مقاصد و قومی زندگی کی روح شامل ہو۔ سرسید، حالی وغیرہ نے بھی "تقلیدِ مغربی" کا نسخہ بتایا تھا۔ لیکن شاید وہ یہ اندازہ نہ کر سکے کہ ہم اس سے مراد امریکی ایڈ اور مغرب کی مشینوں اور تہذیبی عناصر کی درآمد سمجھیں گے ان کا مطلب شاید یہ تھا کہ ہم مغرب کی ترقی کی اساس کو سمجھیں اور اس کی مدد سے اپنی قومی زندگی کے فروغ کا سبق لیں۔ اس طرح ہماری مادی ترقی کا بھی اصل مفہوم اس وقت متعین ہوگا جبکہ ہم اپنی مفاداری و مادی زندگی کو خود فروغ دیں اور اس فروغ کو اپنی روح اور اپنے دل کی نیج سمجھیں، وہ مغرب کے رائٹ اور امریکہ سے درآمد کی ہوئی مشینیں۔ ہماری شاعری اور ہمارے ادب میں علامتوں اور استعاروں کے طور پر کبھی داخل نہیں ہو سکتیں آج ناقد کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان باتوں کا شعور رکھے اور اپنی مادی و روحانی زندگی کے کھوکھلے پن کو انٹرنیشنلزم کی چادر سے نہ ڈھانپے مغرب کے مستعار استعاروں، مستعار فلسفوں اور وہاں کی ادبی تحریکوں کے زیر نگرانی تخلیق کا مطلب ویسا ہی ہے جیسے امریکی ایڈ کے سہارے پاکستان کی مادی ترقی اور ان دونوں باتوں کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ ہے سیاسی و تہذیبی و ذہنی غلامی۔ اس لئے آج ہمارے ناقد کا فرض یہ ہے کہ وہ پرانے تنقیدی ٹوٹکوں سے ساتھ مفاہمت کرنے کے بجائے مغربی علوم کی مدد سے اپنے حالات کا صحیح اندازہ لے اور اپنے لئے ایسے تخلیقی نظریات وضع کرے جو پاکستان کی قومی زندگی کو تخلیقی بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔ ورنہ زرین غزلوں اور ناقابلِ فہم نظموں اور مغرب سے مستعار بنجر استعاروں اور تشبیہوں سے مفر ممکن نہیں۔

تقریباً پچھلے سو سال میں ہماری ادبی تنقید کی ایک خصوصیت یہ رہی آتی ہے کہ اس میں پچھلے معیارات و روایات کو ہمیشہ چیلنج کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب یہ چیلنج ہماری فطرتِ ثانیہ بن گیا ہے اور بے راہ روی بطور مقصد قبول کر لی گئی ہے۔ ہماری زندگی کے ایک موڑ پر یہ چیلنج اور اس سے پیدا شدہ آزاد خیالی تخلیقی زندگی کے لئے ضروری تھی۔ اس لئے کہ زندگی کا بنجر پن دو صورتوں میں پیدا ہوتا ہے۔ پہلی صورت وہ ہے جہاں بندھے ٹکے معیارات اسے آگے نہ بڑھنے دیں۔ جہاں معیارات اور جذباتی زندگی کا رابطہ ٹوٹ جائے۔ اور جہاں زندگی کو زرخیز کرنے والے معیارات، اقدار اور علامتیں تعصبات کی شکل اختیار کر لیں۔ ایسی صورت میں تجربات و مشاہدات ختم ہو جاتے ہیں۔ اور ساری زندگی لکیر پیٹنے اور مکھی پر مکھی مارنے کے مترادف ہو جاتی ہے۔ اس وقت معاشرے کے خلاق ذہن پرانی اقدار اور پرانے معیارات کو چیلنج کرتے ہیں۔ نئے نئے تجربات کرتے ہیں نئی ہیئتیں وضع کرتے ہیں۔ یوں کہئے کہ پرانے ملبے سے نئی عمارت تشکیل کرتے ہیں۔ زندگی کے بنجر پن کی دوسری صورت وہ ہے جہاں انتشار اور بے راہ روی کے باعث زندگی میں معیارات و اقدار و نصب العین ختم ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ معاشرے کے افراد کسی معیار و ضابطہ کو نہیں اپناتے تو ایسی صورت میں خلاق ذہن زندگی کے تخلیقی اصول کے تحت، معیارات و اقدار و نصب العین کی تلاش کرتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں ناقد کے کام کی اہمیت واضح ہے کہ اگر وہ تنقید کی "الف زبر آ ب زبر با" سے آگے کا شعور رکھتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ ادیبوں شاعروں اور فنکاروں کے کام کا محاسبہ کر کے ہمیں یہ بتائے کہ آیا وہ ہماری زندگی کی تخلیقی ضرورتوں کو پورا کر رہے ہیں؟

نہیں۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ روایت سے بغاوت اور معیارات و اقدار کے چیلنج کے پچھلے تقریباً سو سال ہماری زندگی کو تخلیق کی نئی جہتیں دکھانے کے لئے کافی ہیں اور اگر آج ہم اپنا محاسبہ تنقیدی نظر سے کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اب تخلیقی زندگی کو استوار کرنے کے لئے بغاوت و تبدیلی کے نعروں کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ شاید اب ہمارے پاس وہ اقدار و معیارات اور روایتیں ہی باقی نہیں جن سے بغاوت کی جائے یا جنہیں تبدیل کر کے ایک تخلیقی عمل ثابت ہو۔ اس لئے آج ہمیں ایسے نظریات اور معتقدات کی ضرورت ہے جو تجزیاتی ہونے کے بجائے تعمیری ہوں تاکہ ہم اپنی زندگی کے نئے معیاروں کی تشکیل کر سکیں اور نئی قدروں اور معیارات کا تعین کر سکیں اور اس طرح باضابطہ زندگی کی شکلیں وجود میں آئیں اور یہ بات ہماری قومی زندگی کے ہر شعبے کے لئے ضروری ہے۔ سیاست، ادب، سائنس، فکری زندگی اور تفریحی مشاغل سب اس ضمن میں آتے ہیں۔ میں اپنی یہ بات ایک استعارے کے ذریعے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ پوری قومی زندگی کو ایک برگد کا درخت سمجھ لیں بشرطیکہ آپ کے ذہن میں قومی زندگی کا کوئی تصور ہو ورنہ آپ بین الاقوامیت کی شاخ سے لٹکے ہوئے بندر نظر آئیں گے۔ تو اس برگد کی مختلف شاخیں بلند ہو کر دوبارہ زمین میں دھنس جاتی ہیں اور وہاں سے ایک نئے درخت کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف آپ پوری قومی زندگی پر نظر ڈالیں تو آپ کو ہر شعبے میں ایسے لوگ ملیں گے جو مغرب کے درختوں کی شاخیں بلا کسی تخلیقی اصول کو سمجھے ہوئے اپنے آنگن میں گاڑ لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ شاخیں جلد ہی جڑ پکڑ لیں گی اور پھر چند دنوں میں سایہ دار درخت لہلہانے لگے گا۔

ہمارے یہاں بالعموم تجربہ اور روایت آپس میں متضاد چیزیں سمجھی جاتی ہیں اور آج صحیح قسم کی تخلیقی زندگی کا تصور اس تضاد کے حل میں مضمر ہے۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں ہو سکتا کہ کسی قوم کی روایات دراصل اس قوم کی زندگی کے اعلیٰ تجربات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی یہ امر بھی وضاحت طلب نہیں ہے کہ سائنس اور ادب دونوں میں نئے تجربوں کی بنیاد پرانے تجربات پر ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سائنس کے تجربے خارجی دنیا کے تجربے ہوتے ہیں جو ایک قوم دوسری قوم سے مستعار لے سکتی ہے اور ادب کے تجربے اندرونی دنیا کے تجربے ہوتے ہیں۔ جو مستعار نہیں لئے جا سکتے۔ اب جب آپ نئے تجربات کے لئے اپنی روایت کی طرف جاتے ہیں یعنی نئے تجربے کے لئے بنیاد تلاش کرتے ہیں۔ تو اعجاز حسین بٹالوی اسے ناسٹیلجیا (nostalgia) کا نام دے دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اکثر ملکوں کی مثلاً امریکی ادب کی بنیاد ہی نوسٹیلجیا (nostalgia) پر ہے۔ انگریزی کی ایک مثل ہے کہ کتے کو برا نام دے دیجئے اور اسے پھانسی پر لٹکا دیجئے۔ مگر اعجاز صاحب پوری تہذیب کو پھانسی دینے کے درپے ہیں۔ آج ہمارے نقاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ روایت و تہذیب اور تجربہ کے صحیح مقامات کا شعور رکھے اس لئے کہ روایت و تہذیب نام ہے اقداری زندگی کے اعلیٰ تجربات کو جمع کر کے انہیں قائم رکھنے کا اور تجربہ و ترقی نام ہے ان اعلیٰ تجربات کے بھرپور احساس کے ساتھ نئی ہیئتوں کی تشکیل کا۔ روایت و تہذیب کے ساتھ متعصبانہ لگاؤ تخلیقی زندگی کے لئے اتنا ہی مضر ہے جتنا کہ بغیر روایت و تہذیب کے احساس کے تجربے کرنا۔

۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان کے جغرافیائی حدود کے تعین سے ہندی مسلمانوں کی تہذیبی و روحانی زندگی کی ایک ہیئت متعین ہو گئی اور اس معنی میں پاکستان کا قیام خود ایک تخلیقی عمل ہے ایک ایسا تجربہ جس کی بنیاد پچھلے اعلیٰ تجربات پر رکھی گئی اور پاکستان خود ہماری تاریخی و تہذیبی روایت کا ایک حصہ بن گیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس عظیم الشان تجربے کی بنیاد پر قومی زندگی میں۔ سیاست، ادب، معاشیات اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں کون کون سے نئے تخلیقی تجربے ہوئے ہیں۔ ہمارے ناقدوں نے پاکستان کے اس تجربے کو کس حد تک اپنایا اور تخلیقی زندگی کی نئی جہتوں کے تعین کے لئے کیا کیا؟ نفسیاتی، معاشرتی، مارکسی، جمالیاتی تنقید اسی طرح ہوتی رہی جیسے پہلے ہوتی تھی۔ محمد حسن عسکری فرانس کے ادیبوں سے رشتہ جوڑتے تھے تو بھی انحطاط پسند تھے اور جب اسلامی ادب پر کچھ لکھنے لگے تو بھی انحطاط پسند و رجعت پسند کہلائے۔ ترقی پسندوں نے کھدر کی بش شرٹ سلوائی اور نیو پارک کو لاہور سے ملایا۔

کلکتہ کلبوں میں لگانے اور انٹرنیشنل تہذیب کے دامن میں گئے۔ تہذیب کی گہرائی کا اندازہ لگانے کے لئے سینکڑوں تہوں کے نیچے دبے ہوئے موہن جوڈارو اور ہڑپا سے تعلق استوار کرنے لگے اور لندن ناپنے کے لئے ٹیمز پایا۔ نہ اور لندن کی بلند بالا عمارتوں کو دیکھنے لگے۔ اور اس زمین اور اس مٹی کے متعلق سب کچھ بھول گئے۔ جس سے ان کا جزو بدن کا ساتھ ہے۔ معاشی ضروریات کے لئے امریکی ایڈ اور تہذیبی ضروریات کے لئے موہن جوڈارو اور انٹرنیشنل کلچر زندگی بسر کرنے کا آسان نسخہ بن گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منفی عدم تشخص (یہاں تو میں ایک نئی اصطلاح گھڑنے کی معافی چاہتا ہوں) زندگی کی قدروں کا اہم حصہ بن گئے۔ اور حالی، سرسید بحث کے بے محل ہو گیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد کی اردو تنقید کا کوئی مفہوم صرف اس امر کے پیش نظر متعین ہو سکتا ہے کہ اس میں قومی طرز احساس اور اس طرز احساس کے پیش نظر تخلیقی ضرورتوں کو کس طرح اجاگر کیا گیا ہے۔ ادب میں بھوک اور مفاہمت اور سیاست میں بغاوت کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ نہ ہی سیاست میں مفاہمت اور ادب میں انقلاب کے کوئی معنی ہیں۔ ادب میں قومی تہذیب و روایات پر زور دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ قومیت کا کوئی نہ کوئی سیاسی نظریہ ضرور رکھتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان کے لئے ایک آزاد قومی سیاسی نظریہ رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ پاکستان کو ایک آزاد مملکت اور پاکستانیوں کو ایک آزاد قوم بھی مانتے ہیں جس کی اپنی قومی تہذیب و روایات ہیں، جو دوسروں کی قومی تہذیب و روایات سے اتنا مختلف اور آزاد ہیں، جتنی کہ پاکستانی قوم و مملکت۔ میں قوم و مملکت و قومی تہذیب و روایت کے آپس کے رشتے کو جسم و روح کے رشتے سے تعبیر کرتا ہوں اور اسی لئے آج کے ناقد سے میرا تقاضہ یہ ہے کہ وہ ادب و زندگی کے رشتے کو اس طرح استوار کرے کہ ادبی تنقید میں قومی تہذیب و روایات و اقدار پر زور دے اور ... قومی احساس کو مضبوط کرے۔ یہاں میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مغرب کے تنقیدی نظریات ہمارے لئے بالکل بے کار ہیں۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم مغربی تنقیدی نظریات کی عینک سے اپنی تہذیب و روایات و اقدار کو پرکھنے کے بجائے اپنے تہذیبی تقاضوں کی عینک سے مغربی تنقیدی نظریات کو جانچیں اور پرکھیں اور صرف وہ نظریے اپنائیں جو ہمارے اپنے عظیم تہذیبی ورثہ کو لایعنی و بے معنی قرار نہیں دیتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں بیشتر تضادات ایسے ہیں جنہیں ہمارا ناقد ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اس لئے کہ وہ تخلیقی اور تخیلاتی سطح پر سوچنے کی سعی نہیں کرتا۔ اردو غزل کی تعریف کرنا اور ٹیگور اور لورکا کو اپنا تہذیب سے انٹرنیشنلزم کے نام پر مفاہمت کرنا ایک بنیادی تضاد ہے۔ پچھلے سولہ سال میں ہمارے تنقیدی رجحانات پچھلی تنقید کی طرح زیادہ تر معذرت خواہی کے رجحان پر مبنی نظر آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب تک مرثیہ کو ایپک کے معیار پر ناپا نہ جائے تنقید کا حق ادا نہیں ہوتا۔ مغرب سے مستعار تنقیدی رجحانات و نظریات کو چبائے اور ہضم کئے بغیر اردو ادب پر نافذ کر دینے کو میں فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن کے نفاذ سے تشبیہ دیتا ہوں کہ اگر ادبی جرائم کا خاطر خواہ پتہ نہ چلے تو بھی ناقد ان کا جرگہ کسی نہ کسی کو پھانسی ضرور دے دیے جہاں تک ٹاپک ٹوئیاں مارنے کا تعلق ہے، بیسیوں مضامین سرسید کی نثر، حالی کی نظم، غالب کی غزل اور میر کی مثنوی پر روزانہ لکھے جاتے ہیں۔ ایسے مضامین جو ایم اے اردو کے طالب علموں کو امتحانوں میں جواب مضمون لکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ چلیئے ایسے مضامین بھی کسی نہ کسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ مگر کم از کم وہ کسی تخلیقی ضرورت کو پورا نہیں کرتے اس لئے کہ وہ قومی طرز احساس اور تہذیبی رجحانات کو اس طرح سامنے نہیں لاتے کہ تخلیقی نہجوں کے تعین میں مدد مل سکے۔ ایسے مضامین میں حقائق کو تو پیش کیا جاتا ہے۔ مگر وہ حقائق نہ تو تخیلاتی و تخلیقی طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ نہ قبول کئے جاتے ہیں۔ نہ ہی ان حقائق کا قومی شعور یا طرز احساس سے کوئی رابطہ قائم کیا جاتا ہے۔

اب میں یہاں چند ایسے ادیبوں کا ذکر کرتا ہوں جن کی تحریروں میں شعور و احساس کے نئے سانچے ڈھلتے دکھائی دیتے ہیں اور ان کی سوچ پرانے نقادوں کی سوچ سے یوں الگ ہے کہ ان کے یہاں یا تو قومی سطح پر سوچنے کا رجحان ملتا ہے۔ یا پھر وہ ان رجحانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو قومی احساس و قومی شعور کی تعمیر کے لئے ضروری ہیں۔ اس سلسلے میں، میں اعجاز حسین بٹالوی کے دو چار مضامین اور خطبات کی طرف سب سے پہلے اشارہ کرتا ہوں۔ اعجاز صاحب کو زندہ دلان لاہور سے مجلسی گفتگو کا فن اور ترقی پسندوں سے آزاد خیالی ورثے میں ملی ہے۔ وہ ادب میں "سفید پوشی" کے قائل نہیں ہیں اور

اس طرح ادب اور زندگی کے رشتہ کو اہم سمجھتے ہیں۔ تہذیبی ضروریات کے مدت سے قائل ہیں اور ادیبوں کو پاکستان کی سرزمین سے رشتہ جوڑنے کی تلقین کرتے ہیں مگر اس طرح جب وہ تہذیب دشمن عناصر کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہیں تو ان کے تہذیبی جہاد کی زد میں ترقی پسند طبقہ اور متعصب مولوی سے علاوہ وہ لوگ بھی آتے ہیں جو پاکستان کو ہند مسلم تہذیب کا محافظ سمجھتے ہیں۔ چونکہ الطاف حسین حالی اور علامہ اقبال جیسے بزرگ ہند مسلم تہذیب کی کوئی اہمیت نہیں دیتے اس لئے وہ ابھرتے ہوئے ادیبوں کی بزرگوں کو محض پرانی یادیں سمجھتے ہیں۔ اس طرح شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی حد تک رشتہ میں وہ باقی رشتوں کو آسمانی اور روحانی رشتوں پر ترجیح دیتے ہیں اور یہ بات انہوں نے ترقی پسندوں سے سیکھی ہے اسی طرح انسانی تہذیب کا کوئی مشترکہ شعور رکھنے والے ہی تو صرف آسمانی رشتوں کو ماننے والے مولوی جو قومیت کے نظریہ کو سرے سے نہیں مانتے جن کے پیش نظر صرف ملت اسلامیہ کا تصور ہے۔ اور اس لئے وہ پاکستان کی سرزمین کو جذباتی طور پر قبول کرنے سے قاصر ہیں۔ دوسری طرف زمینی رشتوں کو ماننے والے مولوی جن میں ترقی پسند حضرات اور اسی طرح صاحب جیسے لوگ شامل ہیں، وہ آسمانی اور روحانی رشتوں کو بالکل نہیں مانتے جن کی وجہ سے ہندی مسلمانوں میں ایک تہذیبی کشمکش پیدا ہوئی۔ آسمانی رشتوں اور زمینی رشتوں کا تجزیہ یہ ہے کہ ان نتیجہ پر پہنچیں گے۔

(۱) آسمانی رشتے علامت ہیں تجریدی طرز اظہار کی، روحانی و اخلاقی اقدار کی اور تنظیمی و شعوری اصول زندگی کی۔

(۲) زمینی رشتے علامت ہیں اعلامتی و تجسیمی طرز اظہار کی، جذباتی اقدار کی اور تخلیقی و لاشعوری اصول زندگی کی۔

اس میں پہلا اصول تخلیق کا ذریعہ اور دوسرا اصول تخلیق کا مقصد ہے اور یہ تخلیق ہیں ان دو اصولوں کا یکجا ہونا ضروری ہے اس لئے ان کے آپس کے اختلاط سے ہی تخلیق ممکن ہے۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ آج ہمیں کسی تجزیاتی فلسفہ سے زیادہ ایک ترکیبی فلسفہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ تخلیق ترکیب سے ممکن ہے تجزیہ سے نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ آسمانی رشتوں کو ماننے والے مولویوں کے پاس نری روح ہی روح ہے اور زمینی رشتوں کے ماننے والے مولوی صرف جسم پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور زندگی نام ہے جسم اور روح کی یکجائی کا۔

سلیم احمد کی کتاب "نئی نظم اور پورا آدمی" اردو ادب کو ایک نئے زاویہ سے دیکھنے کی ایک کوشش ہے۔ اس کے ساتھ ہی سلیم احمد تخلیقی عمل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے صحیح قسم کا تخلیقی اصول بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ غدر کے بعد آدمی مکمل آدمی کی صورت میں باقی نہیں رہا دوسری آدمی بن گیا یعنی اخلاقی آدمی یا سیاسی آدمی، مذہبی آدمی وغیرہ۔ غدر کے بعد کی شاعری محض آدھے آدمی کی شاعری ہے پورے آدمی کی نہیں۔ اخلاقی شاعری ہو یا روحانی شاعری یا سیاسی شاعری ان سب قبیل کی شاعری میں صرف آدھا شاعر کارفرما نظر آتا ہے یعنی محض "اوپر کا دھڑ" چونکہ شاعر "نچلے دھڑ" کو نہیں اپناتا۔ اس لئے اس کی شاعری کسری شاعری رہ جاتی ہے۔ ایک اعتبار سے دیکھئے تو "اوپر کا دھڑ" علامت ہے عقلی، روحانی و اخلاقی زندگی کی اور "نچلا دھڑ" علامت ہے جبلی و جذباتی زندگی کی۔ اس طرح "اوپر کا دھڑ" تنظیمی اصول زندگی اور "نچلا دھڑ" تخلیقی اصول زندگی بن جاتا ہے۔ اور سلیم صاحب کا یہ دعویٰ بھی صحیح ہے کہ ان دونوں اصولوں کے ربط و اختلاط سے (یعنی اوپر کے دھڑ اور نچلے دھڑ دونوں کے یکجا ہونے سے) ہی تخلیقی زندگی ممکن ہے۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے، مگر خرابی وہاں سے پیدا ہوتی ہے جہاں سلیم احمد "نچلے دھڑ" کو یا بہ الفاظ دیگر جبلی و جذباتی عنصر کو "اوپر کے دھڑ" پر (یعنی عقلی و روحانی و اخلاقی عنصر پر) فوقیت دینے لگتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی دلیلوں سے بھی وہی نتائج برآمد ہوتے ہیں، جو ترقی پسندوں کی دلیلوں سے نکلتے ہیں۔ یعنی زمینی و جذباتی رشتوں کی اہمیت۔

غدر کے بعد سرسید کی تحریک کے ساتھ عقلیت و تعقل پرستی کا رجحان زندگی کے ہر شعبے میں شروع ہو گیا۔ اس کی معاشرتی و تاریخی وجہ تو درمیانہ طبقے کا عروج ہے جو اس زمانے سے شروع ہوا اور دوسری وجہ اٹھارویں صدی کے تعقل پرستی کے فلسفہ کی درآمد ہے۔ شعور کی ترقی کے ساتھ عقلیت کا پرچار

اور جبلی و جذباتی رویوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش ایک لازمی امر ہے۔ اقبال کے ہاں عقلی و جذباتی رویوں میں ایک مفاہمت ملتی ہے۔ اور اس طرح اگر وہ خودی کے تعلق سے شعور و ذات کی تعمیر کرتے ہیں تو عشق کے تعلق سے صحیح قسم کے جذباتی رویوں کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اقبال اس بات کے قائل ہیں کہ عشق اور ان جس کا تعلق شعوری زندگی سے ہے اور خیالات جن کا تعلق جذباتی و خیالی زندگی سے ہے دونوں کو تخلیقی زندگی کے لئے یکجا ہونا چاہیے۔

وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

اقبال کے بعد کے دور میں جذباتی و فکری نظام کی یکجہتی و اکائی برقرار نہ رہ سکی۔ ترقی پسندوں کی جذباتیت ہو یا میراجی کی "جبلیت" دونوں صورتوں میں اس نظام کی اکائی کے ٹوٹنے کا احساس ہوتا ہے جب ترقی پسند شاعر یہ کہتا ہے کہ

؎ مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
؎ اب میرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو
؎ اس بار مجھے بھی جانے دو جانے دو مجھے میں جاؤں گا

تو مجبوبہ سے یہ انکار عقل کا جذبے سے چھٹکارا پانے کی سعی کی علامت بنتا ہے۔ ترقی پسند شاعر جذبے کو چھوڑ کر تعقل کو اپنانے کی سعی کرتا ہے۔ اور میراجی تعقل و شعور کو ترک کر کے جبلی زندگی کو سمجھنے اور اپنانے کی سعی کرتے ہیں۔ مگر فکری و جذباتی نظام کی اکائی دونوں طرف ٹوٹتی نظر آتی ہے۔ تاہم سلیم احمد میراجی کو اپناتے ہیں اس لئے کہ انہیں میراجی کے ہاں "نچلا دھڑ" محفوظ نظر آتا ہے۔

اس طرح سلیم احمد پاکستان میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس کا تتبع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ انگلستان کی تہذیب ضرورت سے زیادہ شعوری تہذیب ہے اور شعور و لاشعور کے توازن کے لئے یعنی تہذیبی توازن کے لئے لارنس جنسی جبلت پر زور دیتا ہے اس لئے کہ وہاں جبلت تخلیق کا سرچشمہ ہے اور لارنس کی تحریریں میکانکی زندگی کے خلاف تخلیقی زندگی کا احتجاج ہیں۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے یہاں کا مرض دوسرا ہے۔ دوسرے شہروں کو تو چھوڑیئے ابھی تک کراچی میں بھی تجارتی ماحول پورے طور پر پیدا نہیں ہوا ہے۔ انگلستان کے برعکس پاکستان کا مرض یہ ہے کہ یہاں زیادہ تر لوگ جبلی و لاشعوری طور پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارے ملک میں تہذیبی توازن کے لئے جبلی و لاشعوری زندگی کی ترویج کی ضرورت نہیں۔ شعوری و عقلی زندگی کی ترویج کی ضرورت ہے لہذا ایسے حالات میں سلیم احمد صاحب کا "نچلے دھڑ" پر زور جنسی زندگی کو اہم سمجھنا صحیح تخلیقی اصول زندگی کے منافی ہے۔ یوں ساری کتاب میں سلیم احمد رومانی زاویہ نظر کے خلاف دکھائی دیتے ہیں وہ غالب کی انفرادیت اور ترقی پسندوں کی جذباتیت دونوں کے خلاف ہیں۔ تاہم "نچلے دھڑ" پر ان کا پورا زور "فطرت کی طرف واپسی" کے رجحان کا ہی مظہر ہے اس کے ساتھ ہی وہ اپنے نقطۂ نظر کو اپنی شاعری میں عملی طور پر بھی واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاہم ان کی "نچلے دھڑ" کی شاعری انہیں اسی رومانوی گورکھ دھندے کا اسیر کر دیتی ہے۔ جس سے وہ بظاہر بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے نظریات اور شعری عمل دونوں میں رومانوی رجحان یعنی فطرت کی طرف واپسی (نچلے دھڑ کی شاعری) کے حامل ہیں۔

رومانویت کے خلاف ایک احتجاج علی عباس جلالپوری کے مضامین میں بھی نمایاں ہے۔ مگر ان کا سارا زور اقبال کی اولین دور کی شاعری سے پنجہ کشی میں صرف ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اقبال اور دیگر عظیم شعرا رومانیت اور کلاسیکیت دونوں کے لیبل سے مبرا ہیں۔ اقبال کی شاعری میں رومانوی عناصر اسی طرح ہیں۔ جس طرح کلاسیکی عناصر ہیں۔ ادب میں اس بات کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ آپ رومانیت کو یا کلاسیکیت کو گالی کی اصطلاح سمجھیں۔ اگر یہ بات ہے۔ تو ناقد کا کام بڑا آسان ہو جاتا ہے کہ جس شاعر کو چاہے کسی لیبل سے موسوم کر دے اور بزعم خود اسے پھانسی پر چڑھا دے۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعر نے

اپنی شاعری میں تخلیقی عمل کو کس طرح برتتا ہے، اور اقبال کی شاعری سے تو ایک مکمل تخلیقی فلسفہ کا استخراج کیا جا سکتا ہے، تاہم علی عباس جلالپوری کے ایسے مضامین جن میں وہ فلسفیانہ نظریات کا پرچار کرتے ہیں، ہمیں ایک سمت ضرور دکھاتے ہیں اور وہ سمت یہ ہے کہ ہم اپنی اقدار اور اپنے معیارات کا نہیں کر سکتے۔ اور انہیں تغیر کی حالت میں دیکھنے کے بجائے ثبات و قیام کی صورت میں دیکھیں۔ آج ہماری قومی زندگی کی صحت کے لئے یہ رجحان طبع اور یہ نقطۂ نظر زندگی بخش ہے اور صرف اسی طرح ہم قومی و تہذیبی تشکیل کر سکتے ہیں۔

جیلانی کامران اپنی تنقید میں خاصتاً روحانی اقدار پر زور دیتے ہیں۔ یوں وہ داستانوں اور تلمیحات سے ان کی روح اور معانی کا استخراج کرتے ہیں۔ اس طرح وہ تصویر سے اس کے خیال کو الگ کر کے ایک خاص قسم کے اخلاقی و روحانی ضابطۂ فکر کے حامل نظر آتے ہیں۔ تہذیبی رجحان، تصور یا جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس طرح بھی مجروح ہوتا ہے کہ آپ تخلیق کے محض ایک اصول پر زور دیں۔ یہی روحانی و تنظیمی اصول ہے اور تخلیقی جدلیاتی صورتوں کو خاطر میں نہ لائیں۔ جیلانی کامران اسی قسم کی غلطی کے مرتکب ہوتے نظر آتے ہیں جیسی غلطی سلیم احمد کرتے ہیں۔ ایک نچلے درجے اور جبلی اصول کو اہم سمجھتا ہے تو دوسرا روحانی و اخلاقی اصول کو۔

جیلانی کامران تصویر سے خیال کو الگ کر لیتے ہیں اور انتظار حسین ہر خیال کو تصویر کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ یوں انتظار حسین کسی خاص روحانی و اخلاقی اصول کے حامی نہیں ہیں۔ مگر ان کی خرابی دوسری قسم کی ہے۔ وہ ایک حقیقت یا کسی تصویر کے دریے لگاتے ہیں اور پھر اس کے گرد تانا بانا بنتے ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے طرح بعض وحشی قبائل میں آگ کے گرد رقص کرنے کی رسم ہے اسی طرح انتظار حسین کی تحریر دائروں میں چلتی ہے۔ وہ سیدھی لکیر کی صورت میں اپنے دلائل پیش نہیں کرتے نہ ان کی تحریروں میں دلائل کے ارتقاء کا سراغ ملتا ہے۔ وہ ساری دلیلیں ایک جزوی دلیل یا حوالے کے اردگرد گھومتے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں صرف بات سے کہانی، دلچسپی کا سراغ ملتا ہے، اور یہ بات ان کے افسانوں کے لئے اتنی ہی صحیح ہے جتنی کہ ان کے تنقیدی مضامین کے لئے۔ محمد حسن عسکری کے بعد جن معدود سے چند لوگوں میں پاکستان کا قیام ایک فکری و جذباتی حوالہ بنا ان میں انتظار حسین بھی شامل ہیں۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ عسکری صاحب کے بعد قومی نقطۂ نظر کی وضاحت و تشریح میں انہیں اولیت حاصل ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ ان کی تنقیدی تحریروں سے آپ کوئی ٹھوس نظامِ فکر کا سراغ نہیں نکال سکتے۔ وہ معاشرے سے ابھرتے ہوئے اقداری نظام سے چھوٹی موٹی علامتیں نکال کر ان کے ذریعے اپنی بات کہتے ہیں، اور رائفل پریڈ، بکلش، کرکٹ اور ہُلڑ ڈے کے خلاف صراحی، مونڈھا، پتنگ، کبوتر اور کوے کو علامتیں قرار دے کر ہندی مسلمانوں کی تہذیبی و جذباتی زندگی کی داستان بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انتظار حسین کا نام آیا تو مجھے مظفر علی سید یاد آ گئے حالانکہ ان کا نام ایک لحاظ سے پہلے آنا چاہیے تھا، اس لئے کہ سید صاحب اس گروہ کے باقاعدہ ناقد تھے، جس کے افسانہ نگار انتظار حسین اور شاعر ناصر کاظمی گنے جاتے ہیں۔ نئی پود کے اس گروہ نے پرانی نسل کے خلاف احتجاج اس بنا پر کیا تھا کہ ان کے جواب پاکستان کے وجود سے جو نئی فکر پیدا ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی اور اب نئی پود نے ایک نئے نظامِ فکر کی ترتیب کا بوجھ اپنے سر لیا۔ مگر محمد حسن عسکری یہ کام پہلے ہی شروع کر چکے تھے اور نئی پود والوں نے محمد حسن عسکری کو پرانی نسل کا آدمی کہہ کر الگ کر دیا۔ تاہم نئی پود کی تحریک کے اس ناقد نے (میرا اشارہ مظفر علی سید کی طرف ہے) اپنی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے کوئی فکری نظام مرتب نہیں کیا۔ ان کے تنقیدی مضامین مختلف موضوعات اور مختلف شعراء پر مل جائیں گے۔ سید صاحب کے مضامین میں ان کے علم اور ان کی ادبی بصیرت کا پتہ چلے تو چلے، مگر کسی مخصوص زاویۂ نظر یا نظامِ فکر کا پتہ نہیں چلتا۔ مظفر علی سید کی بیشتر نظریاتی تحریروں میں بالعموم دوسروں کے نظریات کا رد ملتا ہے۔ مگر وہ اپنے منفی رجحان سے کسی مثبت زاویۂ نگاہ کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے یہاں دوسروں کے نظریات کا رد و قبول تو ملتا ہے۔ مگر اس سے ان کے اپنے نظریات کا خاطر خواہ پتا نہیں چلتا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے ایک بات کا احساس اور بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ ان کی تحریروں میں رد و قبول کی شدت بھی نہیں ہے۔ وہ شدت جو نظری معتقدات سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے ان کی ضرب میں کاٹ کا احساس نہیں ملتا۔ میں ذاتی طور پر مظفر علی سید کی تحقیقی صلاحیتوں اور ان کی ادبی معلومات کا بہت قائل ہوں اور ان کی تحریروں میں آپ کو بھی معلومات کا ذخیرہ ملے گا۔ علمیت ملے گی۔ تحقیق کی روشنی ملے گی۔ مگر میری

طرح آپ کو بھی ایک چیز نہیں ملے گی۔ اور وہ ہے کسی نظریہ، کسی عقیدے کے ساتھ دلی وابستگی۔ ظاہر ہے کہ یہاں میری مراد ان نظریات اور ان عقائد سے ہے جو پوری زندگی پر منطبق ہو سکیں اور جن سے ذہنی زندگی کا استخراج ہو سکے۔ ناصر کاظمی کا خیال ہے کہ بہت سے ناقد اپنی لامحدود معلومات کو اپنے مضامین میں اس طرح بکھیر دیتے ہیں، کہ ان کا ایک کل تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ بالکل اس خاندانی طبیب کی طرح جو کسی ایک گھر میں ایک مریض کو دیکھنے آتا ہے مگر پاس پڑوس کے بچوں کو بھی نزلے، کھانسی کی دوائیں تقسیم کرتا چلا جاتا ہے۔

منیر احمد شیخ اور فتح محمد ملک اپنے مضامین میں نظریاتی نہج کے اعتبار سے سلیم احمد اور انتظار حسین کی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے یہاں بھی پاکستانی قومیت و تہذیب کے نظریے سے ساتھ وابستگی اور پچھلی ادبی تاریخ کا ان نظریات کی روشنی میں تجزیہ کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ منیر احمد شیخ تہذیبی مسائل کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں معاشرے کی کور و بینہ ذہنیت اور تخلیقی فقدان کے خلاف ایک احتجاج ہیں۔ فتح محمد ملک آج کے غیر تخلیقی رجحانات کے پیچھے سرسید، پبلک اسکول کی ... کارفرما اصولوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اور اس طرح ایک تاریخی شعور کے ساتھ ان رجحانات کا پتہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں، جو ہماری قومی زندگی کے بحران کی ذمہ دار ہیں۔

لیجئے اب میں اپنا یہ مضمون ختم کرتا ہوں اور اپنے ایک معروضے کا پھر اعادہ کرتا ہوں اور وہ یہ کہ تخلیقی ذہن روایات و تہذیب کے شدید احساس کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے۔ اور اگر میرا یہ مفروضہ مان لیا جائے۔ تو آج کے ناقد سے میرا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنی تنقید میں قومی طرز احساس، قومی روایات و قومی تہذیب کو حوالہ بنائے اور اس طرح تخلیقی سرگرمیوں کے نئے راہیں ہموار کرے۔ قومی زندگی میں معیارات نصب العین اور قومی علامات جو افتخار کی تلاش کرے اور انہیں جاری و ساری کرنے کی کوشش کرے۔ اور اس طرح ادب کو صرف زندگی سے نہیں، قومی زندگی سے ہم آہنگ کرے۔ آج اس کا فرض یہ ہے کہ وہ پوری ادبی تاریخ کا تجزیہ کرکے ان عبادات و اقدار کی ترویج کرے جو تخلیقی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ اگر وہ یہ نہیں کرتا تو اسے یہ کبھی نہ معلوم ہو سکے گا کہ روس میں اسپٹنک کے اڑنے اور چالیس ہزار آدمیوں کے دوڑ ہی کی مدد سے مسلسل بائیس گھنٹے شطرنج کا میچ دیکھنے میں کیا تعلق ہے اور پھر سید سبط حسن کی طرح کبوتر بازی، پتنگ بازی اور اردو ادب کی تخلیقاتی پرواز میں بھی کوئی رابطہ تلاش نہ کر سکے گا۔

فتح محمد ملک

افسانہ اور نیا افسانہ

قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی اردو افسانہ نگاری (مختصر افسانہ اور ناول) کی اس روایت کا طلسم ٹوٹ گیا جو سن ستاون کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔ نقادوں سے پوچھئے تو وہ آپ کو بتاتے کہ اردو افسانہ نگاری کی روایت انگریزی راج کی منجملہ برکات میں سے ایک ہے۔ اب مجھ سے پوچھا ہے تو سن رکھیئے کہ اردو افسانہ تو سن ستاون کے ہنگامۂ دار و گیر میں ہی کھو یا گیا تھا۔ قرآن حکیم کی آیۂ اِنّ الملوک میں کہا ہے کہ "جب بادشاہ پہلے پہل مفتوحہ بستیوں میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں کے عزت داروں کو ذلیل کرتے ہیں"۔ یہ واردات صرف ان بستیوں کے باسیوں پر ہی نہیں گزرتی ان کے تہذیبی سانچے بھی اس کی زد میں آتے ہیں۔ ہمارے ہاں ملکۂ معظمہ انگلستان کی عملداری شروع ہونے ہی غزل اور داستان پر یہ افتاد پڑی۔ اردو ادب کی ان معزز ترین اصناف میں سب سے بڑا عیب یہ نکلا کہ یہ برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیبی اقدار کی امین اور محافظ ہیں۔ مسلمانوں کی زوالِ زندگی کا ثبوت مل جانے کے بعد ان کی صدیوں کی ذہنی و روحانی ریاضت کا ثمر زوال پسندی کی سند سے کیسے محروم رہتا؟۔

قوم کا بھلا چاہنے والوں نے زوال کو عروج میں بدلنے کی پرخلوص جد و جہد شروع کی تو ہوا یوں کہ جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز نے حلقۂ گردن کو سازِ دلبری جانا اور ایک ملازمِ سرکار نے کہ عالمِ دین بھی تھا اصغری اور اکبری کا "قصہ" لکھا۔ یہ قصہ، قصہ گوئی کی کسی فنی روایت کی روشنی میں پورے معاشرہ کی پوری زندگی کی بھرپور عکاسی اور رہبری کی خاطر وجود میں نہیں آیا۔ بلکہ مولانا نذیر احمد نے، عہدِ غلامی کے تقاضوں کے پیشِ نظر اپنی بچیوں کو صرف جسم و زبان کی سلامتی اور شادابی کے چند کار آمد گر بتاتے ہیں۔ (ان میں سے ایک گر یہ ہے کہ ادب دنوں سے لگاؤ اخلاقی گراوٹ کا پیش خیمہ ہے) سرکاری قدر دانی نے اس قصے کو ساری قوم کا سرمایہ بنا دیا۔ مولانا نذیر احمد نے سرکاری سرپرستی کو سند جانا، تابڑ توڑ "قصے" لکھے اور اردو افسانہ نگاری کے جدِ امجد بنے۔ اردو افسانہ میں حقیقت نگاری کے اولین نمونے فراہم کرنے والے ان "قصوں" کی بنیاد اس جھوٹ پر ہے کہ انسانی زندگی کا سارا حسن، دولت، ثروت اور جاہ و منصب کا حسن ہے۔ پس دیدۂ دل وا کرکے جمالیاتی اور روحانی اقدار کی تخلیق و ترویج بے کار محض ہے۔ صرف ظاہر کی آنکھ سے تماشا کیجئے اور معلومات کو علم کا اور وظیفۂ زوجیت کو عشق کا نعم البدل مانیئے۔ اس حقیقت نگاری نے جنم ہی کچھ ایسے سائنٹفک انداز میں لیا تھا کہ جس معاشرہ کی حقیقت کا اظہار مقصود تھا اس کی بنیادی اقدار کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا لازمۂ حقیقت نگاری ٹھہرا، مثلاً مسلمانوں کی زندگی میں اسلام جس انداز سے جاری و ساری تھا۔ اسے توہمات کہہ کر گشتنی و سوختنی قرار دیا گیا اور عقلی اسلام (وہ اسلام جس کی رو سے شہرِ خموشاں میں بسنے والوں کو زندوں کی طرح پکارنے کو شرک مگر انگریزوں کی حکومت کو برحق اور سرکار پرستی کو عین اسلام ثابت کیا جا سکے) کا نعرہ بلند کیا گیا۔ اسی طرح مرد و عورت کے تعلقات میں جنسی جبلت کے علاوہ انسانی جذبات کی کارفرمائی کو بھی آلائش مان کر شجرِ ممنوعہ سمجھا گیا۔

جس زمانے میں مولانا نذیر احمد اردو افسانہ جنم دینے اور اس میں حقیقت نگاری کے متذکرہ بالا اسلوب کی ترویج میں مصروف تھے اسی زمانہ میں بلکہ اس سے سالہا سال بعد تک افسانہ نگاری کی مشرقی روایت کی روشنی میں پوری قوم کی روحانی اور مادی زندگی کی ترجمان اور رہبری کی خاطر داستانوں کا کہنا، سننا، اور لکھنا، پڑھنا برابر جاری رہا مگر اصغری اور اس کی سہیلیاں کے مشوروں پر عمل پیرا ہو کر محمد کامل اور اس کے ساتھی ادب میں بھی چھری کانٹے اور میز کرسی کی سی افادیت ڈھونڈنے لگے تھے۔ علاوہ اس کے داستانیں سرکاری سرپرستی سے محروم تھیں اور ان کے مبتذل اور متروک صنفِ اظہار ہونے کا یہ ثبوت اس نسل کے لئے بہت کافی تھا۔ خیر صاحب! ادب کے اس افادی تصور کے زیر اثر حقیقت نگاری کا اسلوب خوب پھلا پھولا۔ اسی کے نتیجہ میں پڑھے لکھے طبقے کی زندگی سے اسلام (کہ توہمات کی پوٹ تھا) عنقا ہوا اور اس کی جگہ مغربی عقلیت کو مشرف بہ اسلام کرنے کی صلاحیت نے لے لی۔ پہلے اسلامی تاریخی ناول آیا اور اس کے بعد دہریت۔ دہریت کا نشانہ وہی کتابی اور عقلی اسلام بنا اور باغیوں نے کہ ذرا رومانی واقع ہوتے تھے اسے چھوڑ دیا جسے نذیر احمد نے شجرِ ممنوعہ بتایا تھا۔ مگر بات چھونے تک ہی رہی چکھنے کی نوبت نہ آئی اس لئے کہ یہ باغی انسانی زندگی میں جنسی جبلّت کی کارفرمائی کو سمجھنے سمجھانے سے تو بدستور خائف رہے البتہ جذباتیت خوب خوب نکھاری گئی۔ بیدرم اور نیاز وغیرہ کی یہ جذباتیت صابن کے جھاگ کی مانند بیٹھ گئی تو پتہ چلا کہ جنسی جبلّت کے انگارے، تو سلگتی ہوئی پھلجھڑیوں کا روپ دھار چکے ہیں۔ چنانچہ نئی نسل کے باغیوں نے شجرِ ممنوعہ کے پھل کو چکھ کر نام پیدا کیا۔ مولانا نذیر احمد کے لگائے ہوئے اس درخت کے پھل کے چٹ پٹے ذائقے نے دوبارہ حقیقت نگاری کی اہمیت واضح کی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نذیر احمد جہاں عقلی اسلام کا نام لیتے ہیں وہاں یہ لوگ (کرشن، منٹو، عصمت، مفتی وغیرہ) کتابی مارکسیت اور سستی نسائی فرائیڈیّت کا دم بھرتے ہیں۔ اسی دوران میں پریم چند نمودار ہوتے مگر ان کے ساتھ وہی حادثہ ہوا جو مولانا حالی کو پیش آیا تھا۔ قومی مصائب نے انہیں بچپن ہی میں بوڑھا کر دیا تھا۔ جو ان کا قد و قامت مولانا حالی سے بہت کم ہے تو اس کی ذمہ داری ایک حد تک ان پر عاید نہیں ہوتی۔ مہاتما گاندھی جتنے کم تر سر سید تھے پریم چند اتنے ہی کمتر حالی بنے۔ پریم چند کا شعور کانگرس کی پالیسیوں کی سنائی میں آگے، پیچھے بڑھتا چھپتا رہا۔ چنانچہ پہلے ان کے ہاں قومی اصلاح کا تصور ہندو قوم تک محدود تھا، پھر ہندوستانی بنا اور اس کے بعد کانگرس کے دائیں بازو کی تقلید میں انسانی بن گیا۔

حقیقت نگاری اور رومانیت کے اسالیب کو پروان چڑھانے والوں نے ممتاز شیریں کو اس پر خوش ہونے کا موقع تو مہیا کیا کہ اردو افسانہ اس بالی عمریا میں ہی مغربی افسانہ کا ہم پلہ ہے۔ لیکن ان اسالیب کے تحت کی گئی افسانہ نگاری کی مثال کچھ یوں ہے۔ کہ:

"لاہور میں میں (کرشن چندر) نے ایک افسانہ کمرہ نمبر ۴۴ لکھا تو وہ (اپندر ناتھ اشک) ہوسٹل میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے کمرہ نمبر ۴۴ کے سامنے ہی آ نکلے ان کا خیال تھا کہ افسانے کے مطابق میرا اپنا رہنے کا کمرہ بھی نمبر ۴۴ کا ہی ہوگا۔ ان کا خیال درست نکلا۔" (کرشن چندر سے انٹرویو از جوگندر سنگھ)

لیجئے، ادب میں حقیقت کا اظہار اس لحاظ سے ہو رہا ہے کہ قاری افسانہ پڑھنے کے بعد کرداروں کے بارے میں اور کسی حقیقت سے آشنا ہو نہ ہو ان کے گھر جا کر ملاقات ضرور کر سکے۔ بغاوت کا احوال یہ ہے کہ ہر نئی محرومی پر خدا کو 'کمینے' شلے، رذیل!' کہا جائے اور عوام کے ساتھ حقارت انگیز ہمدردی کی نمائش کی جاتے (ان داتا)۔ رومان ملاحظہ ہو:

چند میل آگے جا کر نوجوان عورت لاری سے اتر گئی۔ . . . . . اس نے ایک نگاہ پرکاش پر ڈالی۔ گویا کہہ رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح دیکھ لو، ہم تم پھر کبھی نہ ملیں گے، میں اپنے گھر جا رہی ہوں، جہاں میرا خاوند اپنی منتو کا انتظار کر رہا ہے. . . . . . اور پرکاش جو باغیانہ

خیالات رکھتا تھا، اپنے دل میں کہنے لگا ٹھیک ہے پھر اس میں میرا تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ سماج کا قصور ہے۔ اس زندگی میں اب کوئی خاص مرد یا عورت نہیں۔ بھائی، بہن، خاوند، بیوی، بھانجا، بھتیجی، ماموں، پھوپھی اور خالہ ہیں۔ لیکن ایسا کوئی نہیں جو اپنے آپ کو مرد یا عورت کہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔" (زندگی کے موڑ پر)

یہ تو ہوئے رومانی حقیقت نگار، اب جنسی حقیقت نگار سے ملئے:

"۔ ۔ ۔ ۔ اور زندگی کے اس طوفانی دور میں مجھے (عصمت چغتائی کو) کالج کا وہ زمانہ یاد کر رہی ہیں جب وہ حجاب امتیاز علی کی ہیروئن بننے کے خواب دیکھا کرتی تھیں، ایک طوفانی ہستی سے ملنے کا موقع ملا جس کے وجود نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ پہلی دفعہ میں نے انھیں ریجانے کورن سے جلسے میں دیکھا تھا۔ بیگم حبیب اللہ صدارت کر رہی تھیں۔ بیویاں موٹے موٹے دوشالے اور کوٹ ڈانٹے پنڈال کے اندر سوں سوں کر رہی تھیں اور رشیدہ آپا (رشید جہاں) بغیر آستین کا بلاؤز پہنے دھواں دھار کچھ کہہ رہی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیویاں بڑبڑا رہی تھیں۔ ان کے کٹے ہوئے بالوں پر، بغیر آستین کی بلاوز پر اور کھلی ہوئی کھڑکی سے آتی ہوئی بر فیلی ہوا پر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس دن ان کی بے حیائی اور بے باکی کا تہلکہ مچ گیا اور میں نے بے سمجھے بوجھے ان کے ہر لفظ کو موتی سمجھ کر پہن لیا۔" (شخصیات جنھوں نے مجھے متاثر کیا ـــــ عصمت چغتائی)

کٹے ہوئے بالوں، اور بغیر آستین کی بلاؤز کے علاوہ ڈاکٹر رشید جہاں کی جس صفت پر عصمت چغتائی فریفتہ ہوئیں وہ "ان کی بے حیائی اور بے باکی کا تہلکہ" ہے۔ سو عصمت نے "بے سمجھے بوجھے" ان کی خوب خوب تقلید کی اور حق یہ ہے کہ اپنی راہ نما سے بھی کوسوں آگے نکل گئیں، ان کی کتاب "چھوٹی موٹی" کی ابتدا میں جو کہانی درج ہے وہ یوں شروع ہوتی ہے:

"پرانے زمانہ میں ایک بادشاہ تھا ـــ اس بادشاہ کے سب سے چھوٹے یا سب سے بڑے لڑکے کو کسی حسین ترین شہزادی کی جوتی یا آنچل دیکھ کر عشق ہو جایا کرتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد غریب شہزادہ عشق کے سوا اور کر ہی کیا سکتا ہے ـــ وہ حور وش جس کے جوتے پر وہ ایک جان چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہو جایا کرتا وہ حسینہ اس کا بڑا ناک میں دم کرتی۔ نہایت ڈھٹائی سے اسے چڑیا کے دودھ اور بلّی کے انڈوں قسم کی کوئی شے لانے کا حکم دیتی اور وہ بیچارہ بغیر چوں وچرا گھوڑے پر بیٹھ کر چل کھڑا ہوتا۔ ایک دفعہ بھی تو اس احمق کے دل میں یہ خیال نہ آتا کہ یہ نیک بخت ان واہیات چیزوں کو منگا کر کیا کرے گی۔ کیوں خواہ مخواہ حیران کرتی ہے اس سے تو بہتر ہے کہ اس ابلہانہ مہم پر جانے کے عوض ہم محبت میں وقت گذاریں۔"

سعادت حسن منٹو بھی داستانوں اور مثنویوں پر اسی طرح خیال آرائی کرتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ داستانوں کی یہ تفسیر پیش کرنے کی جسارت صرف وہی کر سکتا ہے جس نے "بے سمجھے بوجھے" جنسی حقیقت نگاری شروع کر دی ہو۔ داستان لکھنا تو رہا الگ، داستان کے تہ در تہ معانی تک رسائی کے لیے جس حکمت و تخیل کی ضرورت ہے وہ عصمت چغتائی اور منٹو وغیرہ کے ہاں نایاب ہے۔ سو عشق بیزاری در فکر دشمنی کے بل بوتے پر تو "روٹی کپڑے کی فکر" کے موضوع پر ہی کہانیاں لکھی جا سکتی ہیں اور کہانیاں بھی ایسی جن کے ہیرو نہ تو عشق میں مبتلا ہو کر جان جوکھوں میں ڈالتے ہیں، نہ جنسی جذبات کی تہذیب و ارتفاع کے کرب کو برداشت کرتے ہیں اور نہ ہی اعلیٰ انسانی اقدار کی تخلیق کا کٹھن مرحلہ عبور کرتے ہیں، بلکہ جو اس "ابلہانہ مہم" پر جانے کے عوض محبت میں وقت گذارتے ہیں۔ (شرطیہ! یہاں عصمت چغتائی نے محبت کا لفظ انگریزی محاورہ "LOVE MAKING" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس پر مجھے فراق گورکھپوری

یاد آتے ہیں جو حسرت موہانی کے ہاں عشق کی جسمانیت کی مثالیں پیش کر کے کلامِ حسرت کو سچائیوں کا ترجمان ثابت کر رہے تھے کہ ایک خاتون نے کہا: بے شک حسرت کا کلام ہمیں سچائیاں دیتا ہے مگر بہت چھوٹی سچائیاں ———— اردو افسانہ میں حقیقت نگاری اور رومانیت کے علمبرداروں نے کیا یہ کہ صحافیوں کی طرح پہلے تو اپنے گردوپیش کی چھوٹی چھوٹی سچائیوں کو بہت بڑی حقیقتیں مشہور کیا اور بیٹھ گئے ان حقیقتوں کی فہرست مرتب کرنے۔ اس دوران میں جب کلیم الدین احمد جیسی محمد حسن عسکری یا جیسی گیان چند نے بھی داستانوں میں جنسی اور سماجی حقیقت نگاری کے نمونے دکھائے، زوال پسندی کا تمغہ حاصل کیا۔

گیان چند کی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" سن سنتالیس میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ سنتالیس ہی میں ہم آزاد ہو گئے۔ آزادی اپنے ساتھ فسادات لائی۔ فسادات میں رومانیت اور حقیقت نگاری کے اسالیب اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ یعنی کرشن چندر کا "نمبرنامہ" اداریہ اور سعادت حسن منٹو کا افسانہ "سیاہ حاشیہ" بن کر رہ گیا۔ فسادات ہی میں عصمت چغتائی کو احساس ہوا:

"اس وقت تک میں نے جتنی کہانیاں لکھی تھیں۔ ان میں ماں باپ یا تو تھے ہی نہیں اگر تھے تو نہایت فضول سی شے۔ انھیں نظرانداز کر کے ہی میری دانست میں ان پر فتح پائی جا سکتی تھی ———— میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا، پھر اپنی بچی کی طرف دیکھا اور ان دونوں ہستیوں کے درمیان خود کو جکڑا ہوا پایا۔" کاش عصمت چغتائی اس احساس کو زائل ہونے سے بچا لیتیں مگر انھوں نے تو محض اس جرم کی پاداش میں قرۃ العین حیدر کے جوتوں سوتوں کو چن ڈالا کہ موصوفہ نے خود کو باپ اور بیٹے کے بیچ میں جکڑا ہوا محسوس کرتی ہیں (دیوم ہوم ڈوار لگ) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انتظار حسین کے فسادات میں گھرے ہوئے کردار دن کو رہ رہ کے سن تاون یاد آتا ہے اور حسن پور کے باغوں کی چڑیاں، حسن پور کے لوگوں سے بھی پہلے ہجرت کر جاتی ہیں۔ سن تاون کے ہنگاموں ہی میں اردو افسانہ کی حقیقی روایت گم ہوئی تھی۔ یہ کردار ۱۹۴۷ء کی واردات کو ۱۹۵۷ء کی واردات سے آمیز کر کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو داستانوں میں پیش کیے گئے جانبازی کے جیسے معروف پیکر نظر آتے ہیں "چاند گہن" کا "شیر خان" جس کا دماغ خراب ہو گیا تھا اور جو مسلسل دو دن تک مشین گن چلاتا رہا تھا۔ "ایسا ہی کردار ہے۔ فیاض خاں اس کے بارے میں سوچتا ہے:

"شاید اسے میں نے کہیں نہ دیکھا ہو۔ یہ محض میرا خیال ہو۔ ممکن ہے شیر خان کوئی شخص نہ ہو محض ایک خیال ہو۔ ایک تصور ہو۔ وہ تصور جو اپنی قوم کی بربادی کے ہر موقعہ پر اپنی جھلک دکھاتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے وہ تصور جو کبھی ٹیپو کے غفار کا بھیس بدلتا ہے اور کبھی بہادر شاہ ظفر کے کالے خان گول انداز کے پیکر میں ظاہر ہوتا ہے۔"

یہیں سے اردو افسانہ کی حقیقی روایت کے احیاء کی جدوجہد شروع ہوتی ہے۔ رومانیت اور حقیقت نگاری کے اسالیب موت سے ہمکنار ہوتے ہیں اور احمد ندیم قاسمی کی "صداقت پسندی" کا اسلوب روشنی کے مینار کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے یوں تو احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری کی عمر اتنی ہی ہے جتنی افسانہ نگاری میں رومانیت اور حقیقت نگاری کی ہے اور انھوں نے آزادی سے پہلے رومانیت اور حقیقت نگاری کے اسالیب میں کامیاب مختصر افسانے تخلیق کئے ہیں مگر اس دور میں کہ سطحیت پسندی اور صحافتی اندازِ نظر ہماری افسانہ نگاری کا غالب اور معقول رجحان تھا۔ یہ صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں شمار نہیں کئے گئے۔ ان کے ساتھ یہ سلوک بھی ایک معنی رکھتا ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ ندیم کسی "حقیقت" کے گرد بیٹھ کے "کہانی بننے" کے قائل نہیں اور وہ جنسی اور اقتصادی مسائل پر لکھتے وقت بھی زندگی کے روحانی تقاضوں کو فراموش نہیں کرتے۔ ان کا اسلوب صداقت پسندی کیا ہے؟ یہ انھی کی زبان میں سنئے:

"اگر ہم حقیقت پسندی اور صداقت پسندی کے فرق کو اپنے ذہنوں میں واضح کر لیں تو ادب و فن میں حقیقت کے اظہار سے متعلق

تمام الجھنیں دور ہو سکتی ہیں اور یہی وہ نکتہ ہے جو ترقی پسند ادب کی تحریک کی ابتدا میں ایک حد تک نظر انداز کیا جاتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ادیب بھی جو محض ادھوری اور مجرد حقیقت کی تصویر کشی کر کے بزعم خود حقیقت نگاری کا منصب ادا کر لیتے تھے ترقی پسند کہے جانے لگے۔ ان ادیبوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حقیقت کوئی جامد چیز نہیں، ہر خارجی حقیقت کے اندر متعدد لہریں رواں ہیں۔ یہ تو خود اس حقیقت کی نفی کی حرکت ہے دوسرے اس کا ماضی کی تاریخی حقیقتوں سے رشتہ ہے اور تیسرے مستقبل کے ساتھ اس حقیقت کی وابستگی ہے۔ اگر خارجی حقیقت کو فن میں منتقل کرنے والا اس بات سے ہی بے خبر ہے کہ حقیقت کو موجودہ صورت اختیار کرنے میں کتنی صدیاں صرف ہوئی ہیں تو وہ حقیقت کا فن کار انہ یا دوسرے لفظوں میں صداقت پسندانہ اظہار نہیں کر سکتا۔ . . . . صداقت پسندی فن کار کو خواب دیکھنے سے نہیں روکتی۔ . . . . . اور اس نے اس تضاد کو ختم کر دیا ہے جو حقیقت پسندی اور رومانیت کے درمیان حائل رہا ہے۔" (حقیقت اور نئی حقیقت ۔ احمد ندیم قاسمی مطبوعہ نقوش جولائی ۱۹۵۰ء)

گویا حقیقت پسندی اور رومانیت کے اسالیب کے زندہ عناصر کو فنی نقطۂ نظر سے آمیز کر کے یہ اسلوب ایجاد کیا گیا ہے۔ گذشتہ پندرہ برس کے دوران پاکستان کا دیہی اور شہری معاشرہ جس سماجی اور تہذیبی انتشار سے دوچار ہے اور اس انتشار کے باعث ہمارے جذباتی اور روحانی رشتوں میں شکست و ریخت کا جو بھیانک عمل جاری ہے اس کی ترجمانی اور تنقید کا فریضہ احمد ندیم قاسمی نے اس انداز میں ادا کیا ہے کہ جہاں زمانۂ حال کا اقتصادی اور سیاسی استحصال بے نقاب ہو گیا ہے وہاں ماضی کی زندہ روایات کے سہارے تعمیرِ نو کے امکانات بھی روشن ہو گئے ہیں۔ سناٹا، الحمد للہ، رئیس خانہ، ثواب، گھر سے گھر تک، ایسے ہی کئی مختصر افسانوں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی کے ہاں افسانہ نگاری بازی گری یا سنسنی خیزی کی بجائے تہ در تہ معانی کی ترسیل کا ذریعہ ہے۔ فسادات جیسے ہنگامی موضوع پر لکھے گئے مختصر افسانہ "پرمیشر سنگھ" تک میں تہ در تہ معانی کی یہ کیفیت موجود ہے۔ ترقی پسندوں کے ہاں یہ بات عام تھی کہ پاکستان کا قیام نفرت کے منفی جذبہ کا رہینِ منت ہے اس کا ثبوت فسادات ہیں سو پاکستان کے قیام کو "بٹوارے" کے نام سے منحوس نام سے یاد کیا جاتا۔ احمد ندیم قاسمی نے فسادات کے موضوع پر لکھتے ہوئے کبھی ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے نہیں دکھایا بلکہ اسے آزادی سے تعبیر کیا۔ "پرمیشر سنگھ" میں انھوں نے نفرت کے نظریہ کا مفہوم بدل کر رکھ دیا۔

مسلمان جب سے برصغیر میں آئے ہیں متحدہ قومیت کی تعمیر کے خواہاں رہے ہیں مگر ہندوؤں کا طبقاتی سماج ہمیشہ مسلمانوں کو شودر سے بھی کم حیثیت دینے کا خواہاں رہا ہے جب ہندوؤں نے متحدہ قومیت کی تعمیر کی ساری کوششیں خاک میں ملا دیں تو مسلمانوں نے اپنے صدیوں کے تجربات کے پیشِ نظر ہندوؤں کی نفرت کا شکار ہونے سے بچنے کی سوچی اور ایک علیحدہ قومیت کی بنیاد پر نیا وطن حاصل کیا تاکہ وہاں برہمن، شودر اور مسلمان کی طبقاتی منافرت کی فضا سے نکل کر مثبت بنیادوں پر رنگ و نسل سے بے نیاز ملت کی تعمیر کر سکیں۔ "پرمیشر سنگھ" اختر کو اختر کی بجائے کرتار سنگھ کے روپ میں دیکھتا ہے اور اس کے ساتھ وہ سارے چاؤ چونچلے کرتا ہے جو وہ اپنے بیٹے کرتار سنگھ سے نہیں کر سکا۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی، اس کی بیٹی امر کور بلکہ پورا گاؤں اختر کو کرتار سنگھ کے روپ میں دیکھتے ہوئے بھی اسے اس نفرت کا نشانہ بناتا ہے جو اس بستی میں آباد "مسلے" کا صدیوں سے مقدر رہی ہے۔ پرمیشر سنگھ کی بیٹی امر کور جو بیمار اختر کے حلق میں پانی کی ایک بوند ٹپکانا گناہ سمجھتی ہے۔ اختر کی بوٹی بوٹی کر ڈالنے کے سنہری موقع کی تلاش میں سرگرداں ہے اس بھرپور نفرت کی علامت ہے اسی نفرت کے تحت اختر وطن کی راہ لیتا ہے اور پاکستان سے بلند ہوتی ہوئی آذان کی آواز سن کر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔

ایک کہانی پرانی توجہ صرف کرنے سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ مثبت طرزِ فکر احمد ندیم قاسمی کا رشتہ اس طرزِ احساس سے جوڑتا ہے جو انتظار حسین کی افسانہ نگاری کی بدولت آزادی کے بعد نمودار ہونے والی نسل میں عام ہوا اور رفتہ رفتہ عہدِ حاضر کا طرزِ احساس ٹھہرا۔ اس طرزِ احساس کی بات ایک بار پھر ملتوی کیجئے اور یہ دیکھئے کہ صداقت پسندی کے اسلوب میں جیلانی بانو، انتظار حسین، رام لعل، ابن الحسن اور اشفاق احمد نے چند کامیاب مختصر افسانے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مختصر افسانے اور خدیجہ مستور اور عبداللہ حسین کے ناول اس اسلوب کی زرخیزی اور تنوع کے شاہد ہیں۔ اس کے پہلو بہ پہلو حقیقت نگاری اور رومانیت کے متروک اسالیب میں بھی عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور ممتاز مفتی وغیرہ آزادی سے پہلے خود اپنے قائم کردہ معیار کو برقرار رکھنے کی سعیٔ لاحاصل میں مصروف دکھائی پڑتے ہیں۔ اس صورتِ حال سے اکتا کر قرۃ العین حیدر اور ممتاز شیریں مغربی افسانہ کے تازہ ترین تکنیکی تنوعات کو اردو افسانہ میں رائج کرنے کی مہم میں برسوں سے مصروف ہیں۔ ممتاز شیریں کے مختصر افسانہ 'کفارہ' اور قرۃ العین حیدر کے ناول 'آگ کا دریا' کی دھونگی میں بھی یہ رجحان جڑ پکڑتا نظر نہیں آتا، کیونکہ ہمیں تو خود اپنی جڑوں کی فکر کھائے جا رہی ہے۔

"ہماری جڑیں کہاں ہیں؟" یہ سوچتے ہوئے انتظار حسین ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے اس لمحہ کو یاد کرتے ہیں "جب ہم پاکستانی مہاجر تھے، غیر مقامی بھی اور مقامی بھی، اس لئے کہ سوال اصل میں اس علاقے سے دوسرے علاقے میں نقلِ وطن کا نہیں بلکہ ایک پرانے ملک سے ایک نئے ملک میں ہجرت کا تھا۔ کچھ لوگ سپیشل گاڑیوں میں بیٹھ کر پاکستان پہنچے۔ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو پرانے ملک سے نئے ملک میں داخل ہوتے دیکھا۔ . . . . . اس وقت پاکستان کا مطلب تھا ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں ہجرت، یہ اس عہد کا مرکزی سوال تھا۔"

یہاں تک تو انتظار حسین بخیر و خوبی پہنچتے ہیں مگر اس کے بعد یہ سوچتے وقت کہ سوال قرۃ العین حیدر اور اے حمید کے ہاں مخصوص طور پر اٹھا ہے وہ ساون کے اندھے بن جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ہجرت کا وہ تصور جو مسلمان قوم کی تاریخ میں زماں زماں دہرائے گئے منور تجربات سے مستعار ہے وہ تو صرف انتظار حسین کے ہاں مرکزی سوال بنتا ہے۔ قرۃ العین حیدر اور اے حمید کے علاوہ خدیجہ مستور (آنگن)، عبداللہ حسین (اداس نسلیں) اور جمیلہ ہاشمی (تلاشِ بہاراں) کے ہاں ہجرت کی بجائے محض نقلِ وطن کا تصور ہے اور اس کی جنم دی ہوئی یادِ ماضی کی مختلف و متنوع شکلیں۔ ہجرت کے تجربہ میں ماضی کو محض یاد کرتے رہنے (یا چلئے ماضی کے وسیلے سے اپنے آپ کو دریافت کرنے) کا تصور کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہجرت نام ہے اس اعلیٰ و ارفع نصب العین کے زیرِ اثر ماضی کی از سرِ نو تخلیق کا جس کے تحت نقلِ مکانی لازم ٹھہری۔ قرۃ العین سے لے کر جمیلہ ہاشمی تک نقلِ مکانی کسی نصب العین کی خاطر نہیں کی گئی بلکہ یہاں "تاریخ نے ہمیں دھوکا دیا ہے" کی منطق کارفرما ہے۔ اس سلسلہ میں قرۃ العین حیدر کے کارناموں کا تصور دھوکا پیدا کر سکتا ہے کیونکہ وہ جمیلہ ہاشمی اور اے حمید اور دوسرے بہت سوں کی طرح محض رقت، تلخی اور جھلاہٹ کے ساتھ ماضی کو یاد ہی نہیں کرتیں بلکہ ماضی میں زندہ ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ہاں ماضی اوّل اوّل "ہندوستان کا بہترین گرلز کالج' ازابیلا تھوبرن' لکھنؤ" ہے۔ "اس کالج کی طالبات اپنی سادگی کے لئے مشہور ہیں۔ یہ لوگ سفید ساریاں پہنتی ہیں اور جس طرح کے فیشن یہ کرتی ہیں سارے صوبہ میں ان کی نقل کی جاتی ہے ——— اس شدید ارسٹوکریٹک کالج میں سیاسیات کا تذکرہ بالکل نہیں ہوتا۔ محض دنیا میں گریس فل اور متوازن طریقے سے زندگی بسر کرنے کے فن پر توجہ دی جاتی ہے۔" (آگ کا دریا) ایسے میں جب پاکستان قائم ہو جاتا ہے تو "زندگی روشنی اور امید کا خاتمہ" ہو جاتا ہے۔ یعنی ان کے پاس مستقبل کا کوئی تصور نہیں رہتا اور وہ بہت دکھ سے سوچتی ہیں کہ تقسیم نے ان کا ٹکڑا ٹکڑا کر دیا ہے۔" (میرے بھی صنم خانے)۔ سراب،

"ہماری غلطیوں کا سایہ ہمارے آگے آگے چلتا ہے اور مات ہمارے تعاقب میں ہے" (جلا وطن)

غلطیوں کے حقیقت پسندانہ تجزیہ کی زحمت سے بچنے کے لئے وہ ان کے جواز کی تلاش میں ماضی میں سفر کرتی ہیں اور ایسے تاریخی واقعات اور دیومالائی قصوں تک رسائی حاصل کرنے کی خاطر جو ان کی غلطیوں کا جواز بن سکیں وہ قدیم آریائی عہد تک جاتی ہیں۔ اب یہ سارا علاقہ ان کا ماضی ہے اور حق تو یہ ہے کہ اسے زندہ کرنے اور اس میں زندگی پیدا کرنے کی کوششوں کے دوران قرۃ العین حیدر نے جس فنی ریاضت، روحانی کرب اور انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے وہ عہد حاضر کی اردو افسانہ نگاری میں یادگار رہے گا لیکن اس سب کے باوجود نقل وطن کو وہ ہجرت کا نام دینے کے خلاف ہیں (انھوں نے ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے کہ ۱۹۵۹ء میں بیٹھ کر اسلام میں منبع تلاش کرنا کار بے کاراں ہیں) آزادی کے بعد جلا وطن کی کشوری لندن میں بیٹھی سوچتی ہے۔

تم نے کبھی سوچا ہے اب میں کہاں جاؤں گی؟ میرا گھر اب کہاں ہے؟ کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستانی مسلمان ایسے مضحکہ خیز نوٹ بننے کے قابل تھے؟! —— لیکن پاکستان کو جہاں اس کا بھائی فوج میں میجر ہے، اپنا گھر نہیں بناتی۔ آگ کا دریا، کا کمال نامساعد سے نامساعد حالات میں بھی یہی طے کئے رہتا ہے:

بھوکا مر جاؤں گا۔ مگر ترک وطن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا —— یہ سب کچھ طے کرنے کے باوجود اسے ایک روز بھارت کو خیرباد کہنا پڑتا ہے مگر پاکستان کو وہ اپنا وطن نہیں محض پناہ گاہ ہی تصور کرتا ہے اب "جلا وطن" کی کنول کماری کی طرح اس کے سامنے "بکراں تنہائی اور زندگی کے ازلی و ابدی پچھتاووں کا ویرانہ ہے" —— اور پچھتاووں کے دہرانے میں ڈانواں ڈول ہونے والے محض دہشت زدہ پناہ گزیں ہوتے ہیں مہاجر نہیں بن سکتے۔

خدیجہ مستور نے ان جذباتی رشتوں کو دکھ کے ساتھ یاد کیا ہے جو ۱۹۴۷ء میں ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئے اور جن کی موجودگی اور شدت کا احساس ٹوٹ جانے پر ہوا۔ خدیجہ مستور ماضی سے گریہ وزاری کی نہیں بصیرت کی طلبگار ہیں چنانچہ ان کے ہاں رقت نہیں دردمندی ہے۔ اسی بصیرت اور دردمندی کے سہارے جب وہ ماضی میں سفر کرتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ان پر مستقبل کی طرف جانے کی دھن سوار ہو۔ "آنگن" کی عالیہ نے جس گھر میں آنکھ کھولی ہے اس میں "وقت کٹھن ہے، زندگی پل صراط پر سے گذرنے کا نام ہے۔" ہوش سنبھالتے ہی اماں بیزاری کی دھند میں لپٹی نظر آئیں "جیسے کسی طویل سفر سے دو چار ہو گئی ہوں اور منزل بہت دور ہو۔" ابا اور بڑے چچا اپنے آپ کو پوری قوم کی محرومیوں اور تشنہ کامیوں کے ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وہ مستعد حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے، پھولوں کے ہار پہنانے والی قوم کے سامنے سینہ تان کر چلتے مگر سرفروشی، جانبازی اور فقر غیور کے یہ پیکر اپنے آنگن میں چوروں کی طرح داخل ہوتے تھے۔ آنکھیں نیچی کئے، سہمے سہمے سے، گھر والوں کی محبت اور ایثار کے مقروض جو تھے۔ وجیہہ مگر مسکین صورت صفدر بھائی سے بات نہ کرنے مگر چوری چھپے ان کا خیال رکھنے والی "آپا کی موت نے اسے اپنی عمر سے دس سال آگے بڑھا دیا" —— اور یوں عالیہ شباب کی رہگذر پہ قدم رکھنے کی بجائے آناً فاناً بڑھاپے کی دہلیز پر آ کھڑی ہوئی۔ آزادی کے بعد وہ اپنی ماں کے ہمراہ محض اس لئے نقل وطن پر آمادہ ہو گئی کہ پاکستان میں اس کے ماموں کو جو کوٹھی الاٹ ہوئی تھی اس کا آنگن جمیل بھیا کے گھر کے آنگن سے بہت زیادہ کشادہ اور خوش نما تھا۔ پاکستان پہنچتے ہی جب عالیہ کی زندگی اقتصادی طور پر سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے تو اسے ایکا ایکی وہ جذباتی رشتے یاد آ جاتے ہیں کہ تھے مگر زندگی کے اقتصادی طور پر بے آب و گیاہ ہونے کی وجہ سے معلوم ہوتا تھا، نہیں ہیں! —— اب عالیہ ماتم یک شہر آرزو

میں مصروف ہو جانے کی بجائے سوچتی ہے :

"جمیل میرے جسم پر تم جو جادو کی سوئیاں چبھو گئے ہو اسے کون سا شہزادہ آ کر نکالے گا ؟"

وقت کے شہزادے نے جادو کی یہ سوئیاں عبداللہ حسین کے ناول 'اداس نسلیں' کے نعیم کے جسم میں بھی چبھو رکھی ہیں۔ جادو کی یہ سوئیاں نعیم کو ہر آن از خود رفتہ و بے چین رکھتی ہیں اس از خود رفتگی و بے چینی کو عبداللہ حسین نے اداسی کا نام دیا ہے۔ اداسی کا یہ طلسم توڑنے کی خاطر نعیم عمر بھر (اور یہ عمر ۱۹۱۳ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے انتہائی نازک وقفہ زماں پر محیط ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایک پوشیدہ اور خاموش آگ سڑکوں اور گلیوں اور بازاروں میں دوڑتے ہوئے شہریوں کے درمیان لپک رہی تھی۔ آگ جو جسموں کی بجائے دلوں اور آنکھوں میں لگی تھی ایک خوفناک غصہ جو تمام شہریوں کے سروں پر لہرا رہا تھا" اور جب لوگ بظاہر پر امن طریقے پر کھڑے تھے مگر ایسا ہراساں اور چپ چاپ من جس سے بدامنی کا خدشہ پیدا ہوتا تھا"۔) ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں میں زندگی کی ہر کروٹ سے نبٹتا ہے مگر فوجی اعزاز، سیاست اور رشیلا سے فلرٹیشن۔ انگریز کی کاسہ لیسی، سول سروس اور انسان کی ساری شرافت، سارے کرب اور ساری قربانی کے ساتھ خوشی اور رضامندی سے محبت کرنے والی بیوی عائشہ کی رفاقت — کہیں بھی تو اداسی کا یہ طلسم نہیں ٹوٹتا — بالآخر جب وہ ان ساری آلائشوں سے پاک ہو کر نفقر کا دامن تھامتا ہے اور پاکستان کے سفر پر نکلے ہوئے پیدل چلنے والے قافلہ کے ساتھ ہو لیتا ہے تو چند دہقانوں کی شکل میں عرفان کی پریاں آتی ہیں اور جادو کی سوئیاں نکال لیتی ہیں اب وہ مطمئن ہے اور کہہ رہا ہے :

ہمارے پاس نہ آئیڈیل تھے نہ سیاست، صرف بگڑی ہوئی زندگیاں تھیں اور زہریلے دماغ، جس کا نتیجہ اس بگڑی ہوئی تاریخ میں ظاہر ہوا ہے — یہ سب —" اس نے چاروں طرف ہاتھ پھیلایا۔" تم دیکھ ہی رہے ہو یہ تاریخ کی کونسی شکل ہے؟ یہ وہ نسل ہے جو ایک ملک کی تاریخ میں عرصے عرصے بعد پیدا ہوتی رہتی ہے جس کا کوئی گھر نہیں ہوتا کوئی خیالات کوئی نصب العین نہیں ہوتا جو پیدائش کے دن سے اداس ہوتی ہے اور ادھر ادھر سفر کرتی ہے ہم ہندوستان کی اس بدقسمت نسل کے بیٹے ہیں"

فسادی آتے ہیں اور اسے پکڑ کر لے جاتے ہیں، جانتے کہاں؟ مگر اس کا چھوٹا بھائی علی (جس نے اس کی اداسی کے علاوہ اپنے باپ کی دلیری، سخت جانی اور خود مندی بھی ورثہ میں پائی ہے اور جو فطری طور پر کسان ہے گر جسے ملوں میں کام کرنا پڑا اور جو ایسے میں یوں محسوس کرتا رہا" جیسے وہ اکھڑے ہوئے نوجوان درختوں کے سایے میں سستا رہے اور درخت روز بروز خشک ہوتے جا رہے ہیں") پاکستان پہنچ جاتا ہے، یہاں پہنچ کر شادی کرتا ہے اور گاؤں میں بسنے کی سوچتا ہے۔

"گاؤں کے لوگ سادہ اور دیانت دار ہوتے ہیں وہ ہماری مدد کریں گے۔ یہ میرے بھائی نے کہا تھا اور یہ سچ ہے ہم بھی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ وہاں ہم کھیتی باڑی شروع کریں گے اور آہستہ آہستہ گھر بھی بنا لیں گے گاؤں میں گھر بنانا کوئی مشکل نہیں ہوتا تم فکر نہ کرو کھلی جگہ، آب و ہوا بھی مفید ہوتی ہے۔ میرا بھائی —" وہ کراہ کر چپ ہو گیا،

یہیں پہنچ کر نعیم علی کا آئیڈیل بن گیا، علی میں سما گیا اور یہ بات معنی خیز ہے کہ علی کی بیوی کا آئیڈیل بھی نعیم ہی ہے۔ نعیم جس نے بالآخر چند بے علم اور گنوار دہقانوں کو "تمام بنی نوع انسان کی دانائی اور وقار" کا حامل دیکھا — سو علی نے اپنے سینہ میں تغیر لذت کا دلولہ محسوس کیا" اسے اپنے جانے کا خیال آنے لگا۔ حویلی کر اس کے تئیں ماضی کی اڑتی ہوئی خوشبو تھی مانند ایک خواب کے ذہن سے بسرنے لگی۔ اب سفر اس پہ سوار تھا"

لیٹا دادین میں دیا گیا آخری جملہ ایک بار پھر پڑھیے کیونکہ یہ عبداللہ حسین کی بجائے انتظار حسین کے مختصر ناول "دن" کا آخری جملہ ہے۔ یہاں سے اُس طرزِ احساس کی بات پھر چل نکلتی ہے جس کے زیرِ اثر عہدِ حاضر کا افسانہ نگار، افسانہ نگاری کی مشرقی روایت سے اپنا رشتہ جوڑنے میں کوشاں ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ایک بار پھر سن سینتالیس کا ذکر چھیڑنا ہوگا۔ "گلی کوچے" اور "چاند گہن" کی بدولت ہمارے ہاں یہ طرزِ احساس جنم لیتا ہے کہ عقلیت پسندی کے علمبردار افسانہ نگاروں نے جس چیز کو توہمات کہہ کر مسلمانوں کی زندگی سے نکال باہر کرنے کی ٹھانی تھی وہ توہمات نہیں استعارے ہیں کہ حاضر حقیقتوں کا رشتہ غائب حقیقتوں سے جوڑتے ہیں چنانچہ خاکِ شفا کی تسبیح کے دانے اگر ہر سال عاشورہ کی صبح سرخ پڑ جاتے ہیں، سن سینتالیس میں سرخ پڑ جاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ سن ستاون میں ان کا سرخ پڑ جانا قومی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوا تھا۔ سن ستاون سے پہلے چاند گہن پڑا تھا اس سے بڑی بوڑھیوں کو سینتالیس میں بھی چاند گہن پڑنے کے ڈراونے خواب دکھائی دینے لگتے ہیں یہ طرزِ احساس فسادات کی تباہی کو مسلمانوں کی تاریخ میں تباہی کے پرانے واقعات کی روشنی میں سمجھنے کا غماز ہے۔ سو ان کے ہاں نقلِ وطن کی بجائے ہجرت کا تجربہ جنم لیتا ہے۔

یہ اسی طرزِ احساس کا کرشمہ ہے کہ انتظار حسین مروجہ اسالیب میں کامیاب افسانے لکھنے کے باوجود بہت جلد ان سے اکتا گئے اور داستانوں کی طرف متوجہ ہو گئے چنانچہ اپنی افسانہ نگاری کے دوسرے دور میں وہ نہ صرف داستانوں کے استعارے زمانۂ حال کے تقاضوں کے مطابق دوبارہ زندہ کرنے میں مصروف ہیں (آخری آدمی) بلکہ انھوں نے "جل گرجے" کے نام کی داستان لکھنے کا تجربہ بھی کیا ہے۔ یہ داستان ۴۷ء کی واردات کو سن ستاون کی واردات کے وسیلے سے سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش ہے مگر اس سے کہیں زیادہ قابلِ توجہ مختصر "زرد کتا" ہے اس حیرت انگیز حد تک کامیاب (اور اپنی مثال آپ) مختصر افسانہ میں بہت سے چھوٹے چھوٹے استعارے مل کر ایک بڑے استعارے کو جنم دیتے ہیں۔ نفس پرستی اور طمعِ دنیا کے موضوع پر تخلیق کئے گئے اس استعارہ میں معاشرتی حقیقت نگاری اور قصہ گوئی کے فنی محاسن بالکل ضمنی حیثیت رکھتے ہیں اور اسلامی دیو مالا کی تخلیق مرکزی اہمیت کی حامل ہے اس لئے اس کے فنی محاسن کی فہرست مرتب کرنے کی بجائے میں انتظار حسین سے پوچھتا ہوں کہ کہیں اس افسانے کا قاری اسلامی تصوّر کو غیر اسلامی (عجمی نہیں) رہبانیت تو نہ سمجھ بیٹھے گا؟

یہاں اس نقطۂ نظر کی بات آ پڑتی ہے جس کے تحت عصرِ حاضر کے تجربات کو مسلمانوں کی تاریخ کے گذشتہ تجربات میں سمو کر پیش کیا گیا ہے۔ لکھنے والا، بار بار دہرائے جانے والے بہت سے تجربات میں کون سے تجربات چنتا ہے اور کون سے رد کرتا ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ سنہ ۱۹۵۵ء سے لے کر سنہ ۱۹۷۲ء تک بلکہ آج تک قاری پر جو وارداتیں گذری ہیں انھوں نے اس کی نفسیات کو بہت کچھ بدل دیا ہے اور یوں تجربات کے انتخاب کا مرحلہ اور زیادہ اہم ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا تعلق بات سے زیادہ بات کی تاثیر سے ہے ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ ابوالقاسم خضری کی بجائے حضرت ابوذر غفاری کو اگر "زرد کتا" کا مرکزی کردار بنایا جاتا تو کہانی کے تاثر اور اور دیو مالا کی تخلیق کے لئے بہتر ہوتا۔ "بن لکھی رزمیہ" کے پچھوا کر جب پاکستان میں نئی زندگی کی تعمیر کے لئے مدد نہیں ملتی تو وہ واپس قادر پور پہنچ کر جامِ شہادت نوش کر لیتا ہے مگر اپنے تصورات سے غداری نہیں کرتا یہاں بھی اگر انتظار حسین مکہ کے مسلمانوں کی مدینہ ہجرت کے ساتھ ساتھ حضرت ہاجرہ اور ننھے اسماعیل کی وادیٔ غیر ذی زرع میں ہجرت اور نئی اور قابلِ رشک زندگی کی تعمیر کی واردات کو پیش نظر رکھتے تو یہ کردار عہد آفریں کردار بن سکتا تھا اسی طرح کربلا کی واردات کا ذکر کرتے وقت بھی انتظار حسین یہیں کہیں لکھنؤ کے گرد و پیش میں ہی گھر کر رہ جاتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم، تعزیہ اور ان سے متعلقہ رسومات تو کبھی کبھی علامت بنتی نظر آتی ہیں مگر اصل واردات کی روح اس طرح منعکس نہیں

ہو پاتی جس طرح مثلاً اقبال کے اس شعر میں ہے:

میرا دل، میری رزم گاہِ حیات — گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات

یا: حقیقت ابدی ہے حسین ابن علی — بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

داستان گوئی کے علاوہ علامہ اقبال کی شاعری بھی اسلام میں دیومالا کی تلاش و جستجو کی حامل ہے توقع کرنی چاہیئے کہ انتظار حسین نے برسوں پہلے کلیاتِ میر کو سر کلر ناول کی حیثیت سے پڑھنے کا جو اعلان کیا تھا اس کے مطابق وہ اب تک کلیاتِ میر کے مطالعہ سے فارغ ہو چکے ہوں گے اور اب کلامِ اقبال کو بھی زندہ و متحرک استعاروں کی حامل داستان کی حیثیت سے پڑھ ڈالیں گے اب تک ایسا نہ کر سکنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ بقول حمید شاہین "انتظار حسین کو ایلیٹ پہلے یاد آتا ہے اور نانی اماں بعد میں"۔ اور ایلیٹ ماضی کے اسیر ہیں تو اقبال کھوئے ہوؤں کی جستجو کرتے ہوئے بھی مستقبل کے پیامبر۔

اس نوعیت کی کسی بحث کا ماحصل بیان کرنا بد مذاقی سے کم نہیں مگر یہاں یہ کہنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور ان کے حلقہ ہائے اثر کی موجودگی کے باوجود ہمارے عہد کی افسانہ نگاری جمود کی جس کیفیت سے دوچار ہے وہ کئی اعتبار سے تخلیقی جمود نہیں ہے قیامِ پاکستان کے ساتھ افسانہ نگاری کی مصنوعی سماجیت کا تو خاتمہ ہو گیا مگر داستانوں میں افسانہ نگاری کی جو روایت موجود ہے اس سے رشتہ جوڑ کر نئے افسانے کا رنگ روپ چمکانا کچھ آسان نہیں اس مہم کو سر کرنے کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے، عصرِ حاضر کے اکثر فن کار ان صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی بجائے "زرد کتے" کے خلاف جہاد میں مصروف ہیں پھر اس سلسلہ میں لکھنے اور پڑھنے والے کے بڑے بھلے تعصبات بھی کار فرما ہیں ان سب عوامل کے باوجود چند پرانے لکھنے والوں مثلاً عزیز احمد (دیباچہ طلسم ہوشربا ــــ جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں) اور ہاجرہ مسرور ("مجھے ماضی کے مخالف برے لگتے ہیں") کے رویہ میں تازگی کا احساس اور گذشتہ چند برس کے دوران نمودار ہونے والے افسانہ نگاروں کے تیور دیکھئے اور مایوسی کو جھٹک دیجئے!

اعجاز احمد

پاؤنڈ کی ہدایات نئے لکھنے والوں کو

"نئے ادب" کے نام سے اظہار کے نئے نئے طریقے ہر زبان میں وقتاً فوقتاً ایجاد ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے کیونکہ تحریر کا اسلوب دراصل ذہنی اور جذباتی زندگی کا اسلوب ہوتا ہے۔ اور اگر نیا اسلوب واقعی ٹھوس اور سچا ہے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ سوچنے اور محسوس کرنے کا ایک نیا طرز دریافت کر لیا گیا ہے۔ مگر یوں بھی ہوتا ہے کہ جس چیز کو ہم وقتی طور پر اظہار کا نیا اسلوب کہتے ہیں وہ یا تو کسی پرانے اسلوب کی بازگشت ہوتی ہے یا لکھنے والے کے خراب ہاضمے کی دلیل۔ بعض اوقات جو چیز "نئی نظم" کے عنوان سے چھپتی ہے وہ محض ایک چٹکلے کی حیثیت رکھتی ہے جو ادب کے چالاک تاجر صرف اس زور پر لکھتے اور رواج دیتے ہیں کہ تھوڑا بہت ادب پڑھا ہوتا ہے۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اچھا شعر تخلیق کرنا بہت صلاحیت اور جوکھم کا کام ہے اور اپنی اصل حیثیت سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ اچھا شعر کہہ نہیں پاتے۔ لہٰذا چٹکلے تیار کر کے ناشر کے سر پر دے مارتے ہیں۔ ناشر بہر حال تاجر ہوتا ہے۔ وہ کتاب ہی ایسی چھاپے گا جس سے منفعت کی راہیں نکلیں۔ پس کتاب چھپتی ہے۔ گرمیوں گرمیوں خوب تذکرے رہتے ہیں۔ پھر برسات آتی ہے۔ پھر جاڑے۔ سال ختم ہوتے تک کسی کو یاد بھی نہیں رہتا کہ کیا چھپا تھا اور کس نے لکھا تھا۔

'نئی شاعری' کے ذیل میں آج کل بھی بہت کچھ چھپ رہا ہے اس شاعری کے متعلق کچھ کہنے کو میرا بھی جی چاہتا تھا۔ مگر کہتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ میں کچھ بولا تو شاعر حضرات فرمائیں گے کہ "میاں! غزل لکھی نہ نظم۔ ڈیڑھ بالشت کے آدمی ہو مگر تنقید کرنے میں سب سے آگے" کوئی یوں کہے تو میں کیا کہوں؟ اس اعتراض سے بچنے کی ترکیب میں نے یہ وضع کی کہ جو کچھ خود کہنا چاہتا تھا وہی پاؤنڈ کی تحریروں میں سے نکال لایا۔ اُردو کے نئے شاعر بھی آخر اپنی سند یورپ سے ہی منگواتے ہیں اور پھر پاؤنڈ صاحب تو وہ شخص ہیں کہ پچھلے پچاس پچپن برس سے ہر "نئی نسل" کو سبق دیتے چلے آ رہے ہیں۔ ویسے عسکری صاحب تو کہتے ہیں کہ پاؤنڈ آج کل دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کیونکہ عسکری صاحب کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہونگے۔ میں نے دنیا بھر کی شاعری تو پڑھی نہیں ہے کہ اتنی بڑی بات اس قدر وثوق سے کہہ سکوں۔ البتہ اتنا عرض کرونگا کہ نقاد دو قسموں کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو پڑھنے والے کو بہتر قاری بنانا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جو پڑھنے والے کو بہتر ادیب بننے میں مدد دیتے ہیں۔ پاؤنڈ صاحب دوسری قسم کے نقاد ہیں اور لکھنے والے کو بہر حال اسی طرح کے نقادوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

پیشِ نظر تحریر کوئی ایک مضمون نہیں ہے بلکہ پاؤنڈ کی مختلف تحریروں سے اقتباسات نکال کر ایک عنوان کے تحت جمع کر دیئے گئے ہیں۔ پاؤنڈ کی جتنی تحریریں اس وقت میرے سامنے ہیں ان میں سے سب سے پہلی تحریر ۱۹۰۷ء کی ہے۔ اس حساب سے اس کی تحریر کی عمر چھپن برس بنتی ہے۔ اس طویل مدت میں پاؤنڈ نے بہت کچھ لکھا ہے اور یہ تحریریں ہزارہا صفحوں پر پھیلی پڑی ہیں۔ پیشِ نظر

انتخاب بجۂ کسی صورت سے بھی پاؤنڈ کی تنقیدی صلاحیتوں کی نمائندگی نہیں کرتا۔ نمائندہ انتخاب پیش کرنا میرا مقصد بھی نہیں۔ میں تو محض وہ باتیں نکال لایا جو ہمارے عہد کی اُردو شاعری کی بدیہی خامیوں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ اقتباسات ترجمہ کرتے ہوئے میں نے کسی خاص تسلسل کا بھی خیال نہیں رکھا کیونکہ میں تو فقط یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ برطانیہ کی جس نسل کی تقلید ہم کر رہے ہیں اس نسل کے اچھے شاعروں نے آخر کن اصولوں کے تحت شعر لکھے اور کن خوبیوں کو اچھی تحریر کا ضامن جانا۔ جہاں جہاں مجھے ان اصولوں کا ذکر ملا میں نے فقرے کا ترجمہ کر ڈالا۔ مضمون کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے حصے کے اقتباسات "پڑھائی کی الف۔ ب۔ ت" میں سے ہیں۔ دوسرے حصے کے اقتباسات پاؤنڈ کے مختلف مضامین سے۔ اور تیسرے حصے کے فقرے اس کے خطوط میں سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ واضح رہے کہ خطوط کی صورت میں پاؤنڈ نے جدید انگریزی تنقید کی سب سے اہم اور دلچسپ دستاویز تیار کی ہے۔ اس کے بیشتر خطوط فی الحال چھپے نہیں ہیں مگر جو بھی چھپ گئے ہیں تنقید کی اچھی اچھی کتابوں پر بھاری ہیں۔

پاؤنڈ ہی نے کہیں لکھا ہے کہ خراب شاعری ہمیشہ ایک سی ہی ہوتی ہے اور اپنے بودے پن کے لحاظ سے اٹلی کا Petrarch[illegible] [illegible]m اور ہمارے یہاں کے "چاول کے سفوف" والے شعراء قطعاً یکساں ہیں۔ کچھ یہی بات اچھی شاعری کی بھی ہے۔ اچھی بُری تحریر کے جو اصول پاؤنڈ نے انگریزی کے لئے وضع کئے تھے وہ اُردو شاعری پر بھی جوں کے توں صادق آتے ہیں۔

میں اپنی کہہ چکا۔ اب ذرا پاؤنڈ پڑھئے اور اندازہ کیجئے کہ آج کی اُردو شاعری "چاول کے سفوف" والی شاعری ہے یا "گفتار موزوں" والی۔

(۱)

تنقید کے ذیل میں بہت سی الابلا محض اس لئے چھپی اور ضائع گئی کہ دو بالکل متضاد قسم کی تحریروں میں امتیاز نہیں کیا گیا۔

(الف) وہ کتابیں جو آدمی اس لئے پڑھتا ہے کہ اس کی صلاحیتوں میں اضافہ ہو تاکہ وہ چیزوں کو پہلے کی نسبت بہتر طریقے سے اور کم وقت میں سمجھ سکے اور واقفیت حاصل کرے۔

اور

(ب) وہ کتابیں جو آدمی محض وقت گزارنے کے لئے یا افیم کے طور پر یا ذہنی بستر کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔

(پڑھائی کی الف۔ ب۔ ت صفحہ ۸۸)

ایماندار نقاد کو اس بات کے لئے ہمیشہ تیار رہنا چاہئے کہ اس کے عہد میں بہت ہی کم تحریریں واقعی سرکھپانے کے لائق ہوں گی۔ مگر یہ بھی چاہئے کہ نئی اور قابل قدر تحریر پہچاننے کے لئے ہر وقت تیار رہے اور جب کوئی ایسی تحریر سامنے آئے تو پچھلی تحریر کو پیچھے ہٹا کر نئی تحریر کو آگے بڑھا دے۔　　(صفحہ ۹۱)

نااہل لکھنے والا بے مصرف الفاظ کے استعمال سے پہچانا جائے گا۔

کسی تحریر کا تجزیہ کرتے وقت پڑھنے والے کا پہلا کام تو بس یہی ہے کہ ایسے الفاظ دیکھتا جائے جن کا اپنا کوئی مصرف نہیں ہوتا۔ یعنی جو الفاظ تحریر کے مفہوم میں کوئی اضافہ نہیں کرتے یا جو پڑھنے والے کا ذہن تحریر کے اہم تر پہلوؤں سے ہٹا کر کم اہم پہلوؤں کی طرف لے جاتے ہیں۔　　(صفحہ ۶۳)

کسی لفظ یا ترکیب کے "بے مقصد" ہونے کا سوال محض گنتی کا مسئلہ نہیں ہے۔ (صفحہ ۲۹)

اچھے لکھنے والے وہ ہیں جو زبان کی صلاحیتیں برقرار رکھیں یعنی واضح اور کھری زبان کو رواج دیں۔ یہ کوئی لازم نہیں کہ اچھا لکھنے والا ہمیشہ کسی مقصد کے تحت ہی لکھتے۔ بڑا لکھنے والا وہ ہے جو تعمیری کاموں میں حصہ نہیں لیتا۔ (صفحہ ۳۲)

کہتے ہیں کہ موپساں کو لکھنا فلابیئر سے سکھایا تھا۔ جب موپساں ٹہل کر آتا تو فلابیئر اسے کسی شخص کا حلیہ بیان کرنے کی ہدایت دیتا۔ مثلاً کسی ایسی سبزی بیچنے والی عورت کا حلیہ بیان کرنے کو کہتا جسے فلابیئر پہلے سے نہ پہچانتا ہو اور جسے اگلی بار ٹہلنے کے لئے جاتے ہوئے دونوں دیکھتے۔ فلابیئر شرط رکھتا کہ بیان ایسا ہو کہ اس عورت کو فلابیئر خود بخود پہچان لے اور وہ بیان کسی دوسری سبزی بیچنے والی پر صادق نہ آتا ہو۔ (صفحہ ۶۵)

اگر آپ ادب میں "کھرے عناصر" تلاش کرنا شروع کریں تو پتہ چلے گا کہ ادب پیدا کرنے والے لوگ مندرجہ ذیل قسموں میں بانٹے جا سکتے ہیں۔

۱۔ ایجاد کرنے والے۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے کوئی نیا اسلوب دریافت کیا یا جن کی کوئی تحریر ایسی ہے جس میں کسی مخصوص اسلوب کی پہلی مثال ملتی ہے (خسرو)

۲۔ اساتذہ۔ وہ لوگ جنہوں نے مختلف مروّجہ اسالیب یکجا کئے اور انہیں ایجاد کرنے والوں کی سی مہارت کے ساتھ یا ان کی نسبت زیادہ اچھی طرح سے استعمال کیا۔ (میر و سودا)

۳۔ تخفیف کرنے والے یعنی وہ لوگ جو پہلی دو قسم کے لکھنے والوں کے بعد آئے اور اپنا کام اتنی زیادہ مہارت کے ساتھ انجام نہیں دے پائے۔ (مومن، ناسخ)

۴۔ اچھے لکھنے والے جن کی اپنی کوئی منفرد خوبی نہیں ہوتی۔ وہ لوگ جو تقدیر کی خوبی سے ایسے عہد میں پیدا ہوئے جب کہ ملک کا ادب اچھی حالت میں تھا یا ادب کی کوئی مخصوص صنف ذاتی جاندار تھی (قائم چاندپوری یا میر کے آدھی درجن ہمعصر)

۵۔ خالص ادب یا انشائیے تحریر کرنے والے۔ یعنی وہ حضرات جنہوں نے ایجاد کچھ بھی نہیں کیا مگر کسی ایک مخصوص صنف میں لکھتے چلے گئے، جنہیں کسی صورت سے بھی بڑا ادیب نہیں کہا جا سکتا اور جو اپنے عہد کی مکمل عکاسی نہیں کر پائے (سیماب یا نیاز سکول)

۶۔ جو چٹکلوں کو رواج دیتے ہیں۔

جب تک پڑھنے والا پہلی دو قسموں کے ادب سے واقف نہیں ہوتا وہ ادب کا مطالعہ ایک مربوط روایت کی حیثیت سے نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے وہ اپنی ذاتی پسند کی چیز پہچان سکتا ہو۔ یہ بھی امکان ہے کہ وہ کتابوں سے عشق کرنے کے سارے لوازمات نبھاتا ہو یعنی اس کے پاس نہایت اہتمام کے ساتھ چھپی ہوئی اور موٹی موٹی قیمتی جلدوں والی کتابوں کا ذخیرہ ہو مگر اسے خود اپنے علم کے حدود دیتہ نہیں ہونگے اور وہ پچھلی تحریروں کے حوالے سے نئی تحریر کی قدر و قیمت کا تعین نہیں کر سکے گا۔ اسّی یا سو سال پرانی کتابوں کے متعلق تو وہ بھلی بری رائے شاید دے دے مگر جب جب کوئی نیا لکھنے والا روایت سے انحراف کر کے ادب میں کوئی نیا اضافہ کرے گا تو ایسا پڑھنے والا نئی تحریر کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کا قطعاً نااہل ہوگا۔

(صفحات ۴۰-۳۹)

نئے لکھنے والے کے لئے پہلا امتحان

۱ ۔ چاہئے کہ ایک دوسرے کی تحریریں دیکھیں اور یہ دیکھیں کہ کتنے الفاظ زائد از ضرورت ہیں۔ کتنے الفاظ ایسے ہیں جن سے کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوتی۔

۲ ۔ کتنے الفاظ ایسے ہیں جن سے مفہوم مبہم ہو جاتا ہے۔

۳ ۔ کتنے الفاظ ایسے ہیں جن کی نشست قواعد کی رو سے غلط ہے اور یہ کہ آیا اس تبدیلی سے تحریر میں کوئی نیا زور یا زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔

۴ ۔ کیا فقرہ مبہم ہے؟ کیا فقرے کے ایک سے زائد معنی بنتے ہیں؟ کیا ایسے معنی بھی بن جاتے ہیں جو خود لکھنے والے کے مطلب سے سوا ہوں؟ کیا فقرے کو ایسے پڑھا جا سکتا ہے کہ مفہوم لکھنے والے کے مطلب سے بالکل مختلف بن جائیں؟

۵ ۔ کیا تحریر ایسی ہے کہ کاغذ پر صاف اور سلیس نظر آئے۔ مگر بلند آواز سے پڑھتے وقت مبہم ہو جائے۔ (صفحات (۶۵-۶۴)

دوسرا امتحان

۱ ۔ کسی درخت کا بیان لکھئے۔

۲ ۔ ایسے لکھئے کہ درخت کا نام تحریر میں نہ آئے (نیم، کیکر، برگد وغیرہ) مگر ایسا واضح ہو کہ پڑھنے والا درخت کو فوراً پہچان لے اور کسی دوسرے درخت کا گمان نہ ہو۔ (صفحہ ۶۶)

ہر مرتبہ امتحان کا ایک نسخہ بہت کارآمد ثابت ہوگا —— دو کیا یہی مواد کسی دوسری صنف میں بہتر طریقے سے استعمال ہو سکتا تھا؟ (صفحہ ۶۷)

"لیکن جناب کیا ہمیں ورڈ سورتھ نہیں پڑھنا چاہئے؟"

"ہاں میرے بچو ضرور پڑھو۔ بلکہ جو جی چاہے پڑھو۔ مگر مجھ سے یا کسی اور سے پوچھنے کے بجائے اپنے طور پہ خود دیکھو کہ کتاب کے ورق پر کیا لکھا ہے۔"

"کیا ورڈ سورتھ صاحب ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے معنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا؟"

"سوئنبرن صاحب (SWINBURNE) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہت سے الفاظ ایسے استعمال کرتے تھے جن سے فقط رنگ یا "جمال" ہی ظاہر ہوتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ عورت کے بیان میں بھی وہی اسمائے صفت استعمال کرتے ہیں جو پہلے شفق کی تعریف میں استعمال کر چکے ہوں۔" (صفحہ ۷۷)

یاد رہے کہ بیانیہ تحریر کے کچھ اوصاف ایسے بھی ہیں جو ہومر، رڈیارڈ کپلنگ اور کپلنگ کے مایۂ ناز شاگرد جناب ایڈگر ویلس میں مشترک ہیں۔

(۲)

زبان کا مسئلہ

مت استعمال کرو وہ لفظ جو ضرورت سے زائد ہے یا وہ اہم صفت جس سے کسی نئی بات کا انکشاف نہیں ہوتا۔
ابہام سے خوف کھاؤ۔ خراب شاعری میں وہ باتیں مت دہراؤ جو اچھی نثر میں کہی جا چکی ہیں۔ یہ مت سمجھو کہ اگر تم اچھی نثر کے بے انتہا مشکل فن کی دقتوں سے کترا کے اپنی بات کو الگ الگ مصرعوں میں پھیلا دو گے تو ذہین اشخاص بھی اس دھاندلی سے مرعوب ہو جائیں گے۔
جس بات سے پڑھا لکھا شخص آج تنگ آ گیا ہے۔ اسی بات سے کل عوام بھی تنگ آ جائیں گے۔
یہ مت سمجھو کہ تحریر کا فن موسیقی کے فن سے سہل ہے اور جب تک تم لکھنے کی مشق پر کم از کم اتنا ہی وقت ضائع نہیں کر لیتے جتنا پیانو کا معمولی استاد موسیقی کے فن پر ضائع کرتا ہے تو یہ مت سمجھو کہ تمہاری تحریر ماہرین فن کو بھی متاثر کرے گی۔
مقدور بھر کوشش کرو کہ تمہاری تحریر زیادہ سے زیادہ بڑے فنکاروں سے متاثر ہو۔ مگر ساتھ ہی ساتھ تمہارے اندر اس قدر شرافت بھی ہونی چاہیئے کہ یا تو اعتراف کر لو کہ تم نے یہ اثرات قبول کئے ہیں یا اُن اثرات کو اس طور سے قبول کرو کہ قاری کی نظروں سے چھپ جائیں۔ (ادبی مضامین صفحات ۵-۴)

آہنگ اور قافیہ

یہ مت سمجھو کہ شاعری میں وہ بات بھی چل جائے گی جو غیر دلچسپ ہونے کی بنا پر نثر میں نہیں چل سکی۔
اپنی بات کے ہاتھ پیر کاٹ کے الگ الگ مصرعوں میں بند مت کرو۔ ایسے مت لکھو کہ بات مصرعے کے آخر میں آ کر ایک دم ختم ہو جائے اور اگلا مصرعہ دھچکے کے ساتھ شروع ہو۔ شعر ایسے لکھو کہ آہنگ کی لہر پھیل کر اگلے مصرعے میں پہنچتی ہوئی معلوم ہو۔ بشرطیکہ تم خود یہ نہ سمجھتے ہو کہ مصرعے کے آخر میں ٹھہراؤ ضروری ہے۔
ساتھ ہی یہ بھی خیال رکھو کہ اصوات کا آہنگ مرتب کرتے وقت تم الفاظ کی اصل شکل یا اُن کی اصل آواز یا ان کے معنی بگاڑ نہیں رہے ہو۔
قافیہ شعر میں لذت صرف اسی صورت سے پیدا کر سکتا ہے کہ اس میں کوئی انوکھا پن ہو۔ یہ بھی نہیں کہ قافیہ اس قدر انوکھا ہو کر اچنبھا بن کے رہ جائے۔ تاہم اگر قافیہ استعمال کر رہے ہو تو ڈھنگ سے کرو۔
اگر کوئی مناسب ہیئت (غزل، رباعی وغیرہ) استعمال کر رہے ہو تو ایسے مت کہو کہ پہلے جو بات کہنی ہوئی وہ کہہ دی اور پھر اوپر سے بقایا مصرعے ٹانک دیئے۔ (صفحات ۷-۶)

کچھ اعلانات

آہنگ ——— میں "قطعی آہنگ" میں یقین رکھتا ہوں۔ یعنی ایسے آہنگ میں جو اظہار پانے والے جذبے اور جذبے کی

نفسِ وحسی کیفیت کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔ شاعر کو چاہیئے کہ آہنگ معنی کی وضاحت کے لئے استعمال کرے۔ اسی طرح نہ تو وہ خودکسی کا چربہ اُتارے گا نہ کوئی اور اس کی نقل کر پائے گا۔

علامتیں ——— میرا ایمان ہے کہ مخصوص قدرتی چیزیں ہی صحیح اور مکمل علامت بن سکتی ہیں اور یہ کہ اگر کوئی علامتیں استعمال کر رہا ہے تو ایسے کرے کہ علامتی اسلوب سے معنی خبط نہ ہو جائیں۔ تاکہ جو لوگ علامت کو علامت کے طور پر نہیں سمجھتے یعنی جن کے لئے شاہین محض شاہین ہے وہ بھی شعر کی فضا اور کیفیت سے لطف حاصل کر سکیں۔

ہیئت ——— میں سمجھتا ہوں کہ مواد "رواں" بھی ہوتا ہے اور "ٹھوس" بھی اور یہ کہ کچھ نظموں کی ہیئت ایسی ہوتی ہے جیسے طشت میں گرتا ہوا پانی اور کچھ کی ہیئت ایسی ہوتی ہے جیسے درخت کا تنا ہوتا ہے اور یہ کہ مقفیٰ اصناف کے بھی کچھ فائدے ہوتے ہیں اور یہ کہ بہت سے موضوعات ایسے بھی ہیں جو ان اصناف میں صحت کے ساتھ پیش نہیں کئے جا سکتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ شعر لکھنے والے کو چاہیئے کہ سارے اصناف اور بحور پر عبور حاصل کرے۔ میں نے خود یہ مہارت حاصل کرنے کی کوشش بڑی باقاعدگی سے کی ہے اور اُن ادوار کی تحقیق تو بالخصوص کی ہے جن میں کوئی مخصوص صنف ایجاد ہوئی ہو یا اپنے عروج کو پہنچی ہو۔ (صفحہ ۹) ؂۱

اچھی شاعری کبھی بیس برس پرانے اسلوب میں نہیں لکھی گئی کیونکہ ایسی طرز میں لکھنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ لکھنے والا اصل زندگی کے بجائے کتابوں، روائتی اسالیب اور گھسی پٹی اصطلاحوں کے حوالے سے سوچتا ہے۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ جب کوئی شخص اپنے فن کا رشتہ اصل زندگی سے ٹوٹتا ہوا محسوس کرے تو متروک اسالیب دریافت کر لائے بشرطیکہ ڈوبے ہوئے اس اسلوب میں کوئی خوبی ایسی ہو کہ فن اپنے اصل جوہر (یعنی زندگی) کے ساتھ دوبارہ مربوط ہو جائے۔ (صفحہ ۱۱)

اور جہاں تک چٹکلوں کا سوال ہے تو بات دراصل یہ ہے کہ ادب میں بیماریاں گنتی کی ہی ہوا کرتی ہیں اور ان دو چار بیماریوں کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا یہ بھی امکان ہے کہ آپس میں کسی قسم کے لین دین کے بغیر ہی الگ الگ اور دور افتادہ ممالک کے ادب میں ایک ہی قسم کے جراثیم پیدا ہو جائیں۔ اچھا طبیب جانے پہچانے مرض کی تشخیص فوراً کرے گا، چاہے اظہار کا طریقہ سطحی طور پر کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو۔ (صفحہ ۲۴)

آزاد نظم

میں سمجھتا ہوں کہ آزاد نظم صرف اس صورت میں لکھنی چاہیئے کہ جب ایسا کئے بغیر چارہ نہ ہو۔ یعنی صرف اس وقت جب نظم کا اپنا آہنگ مروجہ بحور کے آہنگ سے زیادہ خوبصورت، زیادہ سچا اور اظہار پانے والے جذبے سے قریب تر ہو ——— ایسا آہنگ جسے پڑھ کر قاری جانی پہچانی بحور سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگے۔

ایلیٹ نے بات بالکل ٹھیک کہی ہے کہ "جو شخص شعر سلیقے سے کہنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے کوئی نظم آزاد نہیں ہوا کرتی"۔ (صفحہ

؂۱ ہر بحر میں اشعار کہے عمر کو کھویا (میرؔ) اور ایک صنف میں لکھنے والے کو میر صاحب یک فنی کہتے تھے۔

(۳)

یاد رکھو کہ آدمی کا اصل کام وہ ہے جو وہ کرنے والا ہے نہ کہ وہ جو اب ماضی کا حصہ بن چکا۔ (خط نمبر۴ ۔ صفحہ ۴۴)

کیا تم یہ کہنے سے شاعر کو سمجھا سکتی ہو کہ شاعری ایک فن ہے، ایسا فن ہے جس کی اپنی حیثیت ہوتی ہے، اپنا اسلوب ہے۔ ایک ایسا فن جس کے امکانات ہمیشہ بڑھتے اور پھیلتے رہتے ہیں اور اگر یہ فن زندہ رہے گا تو بس اسی صورت سے کہ اظہار کے طریقے بدلتے رہیں؟ کیا تم اسے سمجھا سکتی ہو کہ شعر سے یہ مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ جو سماجی مسائل پچھلے سال کے رسالوں میں چھپ چکے ہیں وہ اب بحر اور قافیے کے ساتھ دوبارہ چھاپے جائیں۔ (خط نمبر۵ ۔ صفحہ ۴۲)

یاد رہے کہ معنی آواز کے نظام میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ (خط ۱۷۳ ۔ صفحہ ۲۲۶)

بڑا ادب وہ زبان ہے جس میں معنی کی بار دوکوٹ کوٹ کر بھری گئی ہو۔ ص[۱]

شاعری میں اچھی نثر کی سی سادگی اور ویسا ہی ٹھوس پن ضروری ہے۔ ص[۲]

شاعری بھی اتنی ہی محنت سے لکھی جانی چاہیئے جتنی محنت اچھی نثر کے لئے درکار ہے۔ شعر کی زبان نکھری ہوئی زبان ہونی چاہیئے اور برتنے میں شدت (یعنی سادگی) کے علاوہ اس میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہونی چاہیئے کہ بول چال کی زبان سے ممتاز ہو سکے۔ نہ کتابی الفاظ کی ضرورت ہے نہ جملے اُتارنے کی اور نہ زبان کی سادہ قواعد کو توڑنے مروڑنے کی۔ شعر کی زبان ایسی ہی سادہ ہونی چاہئیے جیسی موپساں کی بہترین نثر اور ویسا ہی ٹھوس پن ضروری ہے جیسا ستاں دال کی نثر میں ہوتا ہے ۔۔۔۔ ضروری ہے کہ شعر کا صوتی آہنگ معنی سے بھی مربوط ہو۔ (خط نمبر۶۰ صفحہ ۹۱)

اور تکنیک ۔۔۔۔۔ سے مراد یہ ہے کہ آدمی نہ صرف اپنی چھاتی کا بوجھ اُتار دے بلکہ وہی بوجھ جوں کا توں دوسرے کی چھاتی میں پیوست بھی کر دے۔ (خط ۲۴ ۔ صفحہ ۶۰)

بس وضاحتی تنقید نہیں چاہیے۔ ضرورت سلیقے سے انتخاب کئے ہوئے مجموعوں کی ہے۔ سینڈبرگ نے مجھے شکاگو سے ایک خط میں لکھا ہے کہ "جب ہم لکھنے والے ایک دوسرے کی تحریریں بھی خرید کے نہیں پڑھ سکتے تو یوں لگتا ہے جیسے جہنم میں سلگ رہے ہیں۔" ص[۳]

اگر کوئی شخص چھ مصرعے واقعی اچھے لکھ دے تو ادب میں اس کا نام دائم رہے گا —— کیا یہ اعزاز ایسا نہیں ہے کہ آدمی اسے حاصل کرنے کے لئے تھوڑی بہت محنت کرے؟ کیا کوئی نقاد ایسا نہیں مل سکتا جو کسی چیز کو اس وقت تک اچھا نہ کہے جب تک ایسا کہنے کے لئے وہ اپنی پوری شہرت خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار نہ ہو۔ (خط نمبر۹ ۔ صفحہ ۴۶)

اور اگر تم وہی خیالات چھاپ رہی ہو جس پر لوگ پہلے سے ہی متفق ہیں تو پھر یہ خیالات چھاپنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ (خط نمبر۱۰ ۔ صفحہ ۴۷)

ص[۱]، ص[۲]، ص[۳] یہ فقرے مجھے زبانی یاد تھے۔ اسی طرح ترجمہ کر دیئے۔ اب پاؤنڈ کے خطوط کا مجموعہ دیکھا تو وہ خطوط نظر نہیں آئے جن میں یہ فقرے ملتے ہیں۔

ڈھنگ کی تنقید اسی صورت سے پیدا ہو سکتی ہے کہ سمجھ بوجھ رکھنے والے کچھ لوگ مل بیٹھیں اور ایک دوسرے سے اختلافات ظاہر کریں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اس قسم کے گدھوں میں سے ہوں جو اجتماعی ذہانت میں یقین رکھتے ہیں ۔ (خط نمبر ۹ ۔ صفحہ ۴۶)

پڑھائی لکھائی کا اور مضمون سے واقفیت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی وہ تحریریں پہچاننے لگتا ہے جن میں سر کھپانے کی مطلق کوئی ضرورت نہیں ہوتی، وہ نقطہ سمجھ میں آجاتا ہے جہاں سے وہ خود اپنا کام شروع کر سکتا ہے ۔

(خط نمبر ۲۳۲ ۔ صفحہ ۲۹۸)

یا خدا، خدا ! کیا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اٹھارویں صدی کے گھسے ہوئے محاورے استعمال کرنے کے بجائے صاف اور سادہ بول چال کی زبان استعمال کر سکے ۔ (خط نمبر ۱۳ ۔ صفحہ ۵۰)

غزل :

مختار صدیقی
قیوم نظر
انجم رومانی
ناصر کاظمی
شہرت بخاری
احمد مشتاق
کشور ناہید

مختار صدیقی

نورِ سحر کہاں ہے اگر شامِ غم گئی
کب التفات تھا، کہ جو خوئے ستم گئی

پھیرا بہار کا تو برس، دو برس میں ہے
یہ چال ہے خزاں کی جو رک رک کے تھم گئی

شاید کوئی اسیر ابھی تک قفس میں ہے
پھر موجِ گل چمن سے جو باچشمِ نم گئی

قبضے میں جوشِ گل نہ خزاں دسترس میں ہے
راحت بھی کب ملی ہے اگر وجہِ غم گئی

ہاں طرحِ آشیاں بھی انہی خار و خس میں ہے
بجلی جہاں پہ خاص بہ رنگِ کرم گئی

کچھ شائبہ گریز کا بھی پیش و پس میں ہے
وہ بے رخی کہ نازکی تھی جو بھرم، گئی

جادو غزل کا جذبِ تمنا کے رس میں ہے
یعنی وہ دل کی بات دلوں میں جو رم گئی

قیوم نظر

○

ستاروں کی حد سے گزر کر چلے — یہ نالے تو شاید اثر کر چلے
حصارِ جنوں بھی نہ قائم رہا — وہ ہنگامہ شوریدہ سر کر چلے
دکھائیں گے ذرّے وہ جوہر کہ پھر — ہمیشہ نہ سورج ابھر کر چلے
قریبِ رگِ جاں تھا جو غم کبھی — کرم اس پہ بیداد گر کر چلے
زمیں کو فلک تک اٹھایا مگر — مکاں سے مکیں بے خبر کر چلے
وہ عالم میں تھا جس سے طولِ امل — وہ قصہ ہی اب مختصر کر چلے
جلانے تھے جو بوئے گل سے چراغ — وہ پتے چمن سے بکھر کر چلے
قیامت ہی لائیں گے آئینے جب — ترے در سے جو آہ بھر کر چلے

درِ دل سے اٹھے نہ آخر نظرؔ
کیا تھا نہ جو عمر بھر کر چلے

انجم رومانی

○

حلوہ مانڈا کھا کے خوب بنائے لاش　　اور پھر اُبھرا مولوی حوریں کرے تلاش
اُٹھتے اُٹھتے اُٹھ گیا سینوں سے قرآن　　گنبد اور محراب کے پتھر لیے تراش
باپ بچارا متّقی، ماتھے پر محراب　　بیٹا رسیا رنگ کا ٹیڈی اور اوباش
بی۔اے کر کے رہ گئے لونڈے کے دو کام　　تنہا بیٹھے ریڈیو، ساتھ ملے تو تاش
وارے نیارے ہو گئے بن کر محض کلرک　　آج پھرے ہے کار میں، کل تک تھا قلّاش
کوئی قارون وقت کا، مرے تو نسلیں کھائیں　　کوئی تن من بیچ کر پیدا کرے معاش
کتّے کا ہے مقبرہ جس کوٹھی کے پاس　　پڑی ہے واں دو روز سے لاوارث اک لاش
دل میں سب کے چور ہے، بدلیں روز نظام　　گھر میں سوئی گم ہوئی، باہر کریں تلاش
انجم میٹھے بول کے گُن گائے سنسار
تیرے کڑوے بول پر کون کہے شاباش

ناصر کاظمی

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کر گیا وہ

خوشی کی رت ہو کہ غم کا موسم، نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں، مرے تو دل میں اتر گیا وہ

بس ایک موتی سی چھب دکھا کر، بس ایک میٹھی سی دھن سنا کر
ستارۂ شام بن کے آیا، برنگِ خوابِ سحر گیا وہ

نہ اب وہ یادوں کا چڑھتا دریا، نہ فرصتوں کی اداس برکھا
یونہی ذرا سی کسک ہے دل میں، جو زخم گہرا تھا بھر گیا وہ

کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی، بدل گیا رنگِ آسماں بھی
جو رات بھاری تھی ٹل گئی ہے، جو دن کڑا تھا گزر گیا وہ

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں، گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہم سفر تھا، مثالِ گردِ سفر گیا وہ

ہوس کی بنیاد پر نہ ٹھہرا، کسی بھی امید کا گھروندا
چلی ذرا سی ہوا مخالف، غبار بن کر بکھر گیا وہ

بس ایک منزل ہے بوالہوس کی، ہزار رستے ہیں اہلِ دل کے
یہی تو ہے فرق مجھ میں اس میں، گزر گیا میں، ٹھہر گیا وہ

وہ میرے سے کو جگانے والا، وہ رات کی نیند اڑانے والا
یہ آج کیا اُس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ

وہ ہجر کی رات کا ستارہ، وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا سُنا ہے کل رات مر گیا وہ

مرا تو خوں ہو گیا ہے پانی، ستمگروں کی پلک نہ بھیگی
جو نالہ اُٹھا تھا رات دل سے نہ جانے کیوں بے اثر گیا وہ

وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تو نے منزلوں کا
تری گلی سے نہ جانے کیوں آج سر جھکائے گزر گیا وہ

وہ رات کا بے نوا مسافر، وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصرؔ
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

شہرت بخاری

دُنیا کو منا رہا ہُوں کب سے — آئینہ دِکھا رہا ہُوں کب سے
پَلّے نہ پڑا کسی کے اب تک — افسانہ بنا رہا ہُوں کب سے
خود اپنے نصیب کو سُلا کر — سوتوں کو جگا رہا ہُوں کب سے
غیروں کو سمجھ کے اپنا، خود کو — بیگانہ بنا رہا ہُوں کب سے
جس راہ پہ دُھول اُڑ رہی ہے — آنکھوں کو بچھا رہا ہُوں کب سے
دیوار کو در پہ رشک آئے — کس کو یہ بُلا رہا ہُوں کب سے
آ جا کہ متاعِ زندگی کو — رستے میں لُٹا رہا ہُوں کب سے
جو سر نہ جُھکا خدا کے آگے — اِس در پہ جُھکا رہا ہُوں کب سے
ہر بات پہ یاد کے ہیں پہرے — کس کس کو بُھلا رہا ہوں کب سے
بہتی نہیں راکھ زندگی کی — سَیلاب اُٹھا رہا ہُوں کب سے
اب تک نہ کُھلا کہ عشق کیا ہے — تصویر بنا رہا ہُوں کب سے
اے بادِ صبا اِدھر بھی اِک موج — اِک شمع جلا رہا ہوں کب سے

ہر مدّعیٔ خرد کو شہرت
دیوانہ بنا رہا ہوں کب سے

شہرت بخاری

بے نشہ بہک رہا ہوں کب سے
دوزخ ہوں بھڑک رہا ہوں کب سے

پتھر ہوئے کان موت کے بھی
سولی پہ لٹک رہا ہوں کب سے

چھٹتی نہیں جان آگہی سے
دامن کو جھٹک رہا ہوں کب سے

کانٹا نہیں پر چمن گروں کی
آنکھوں میں کھٹک رہا ہوں کب سے

لاہور کے کھنڈروں میں شہرت
بلبل سا چہک رہا ہوں کب سے

روشن نہ ہوئیں غزل کی شمعیں
بجلی سا چمک رہا ہوں کب سے

ٹوٹا نہ فسردگی کا جادو
غنچہ سا چٹک رہا ہوں کب سے

جلتا نہیں "خرمنِ اداسی"
شعلہ سا لپک رہا ہوں کب سے

سنسان ہے وادیٔ تکلم
بجلی سا کڑک رہا ہوں کب سے

اس حرص و ہوا کی تیرگی میں
سونا سا دمک رہا ہوں کب سے

بستی کوئی ہو تو مل بھی جائے
صحرا میں بھٹک رہا ہوں کب سے

گل چیں کوئی ہو تو قدر جانے
جنگل میں مہک رہا ہوں کب سے

ہاں اے غمِ عشق مجھ کو پہچان
دل بن کے دھڑک رہا ہوں کب سے

پیمانۂ عمر کی طرح سے
ہر لمحہ چھلک رہا ہوں کب سے

معلوم یہ اب ہوا کہ شہرت
دیوانہ ہوں بک رہا ہوں کب سے

احمد مشتاق

مسلسل یاد آتی ہے چمک چشمِ غزالاں کی
اکیلی ذات ہے اور رات ہے جنگل بیاباں کی

ذرا دیکھو ہوائے صبح کیسے کھینچ لائی ہے
اکیلی پنکھڑی میں دلکشی سارے گلستاں کی

انہی گلیوں میں کھلتے تھے ملاقاتوں کے دروازے
انہی گلیوں میں چلتی ہیں ہوائیں شامِ ہجراں کی

کوئی ذرّے کو ذرّہ ہی سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے
کسی کو سوجھتی ہے اس سے تعمیرِ بیاباں کی

یہ وہ موسم ہے جس میں کوئی پتّہ بھی نہیں ہلتا
دلِ تنہا اُٹھاتا ہے صعوبت شامِ ہجراں کی

یہی کافی ہے دل سے مدّتوں کا بوجھ تو اُترا
چلو اس چشمِ گریاں نے کوئی مشکل تو آساں کی

ستارے درد کی آواز سے غافل نہیں رہتے
دمِ آہو سے روشن مشعلیں ریگِ بیاباں کی

کشور ناہید

وہ اجنبی تھا، غیر تھا، کس نے کہا نہ تھا
دِل کو مگر یقین کسی پر ہُوا نہ تھا

ہم کو تو احتیاطِ غمِ دل عزیز تھی
کچھ اِس لیے بھی کم نگہی کا گلہ نہ تھا

دستِ خیالِ یار سے چھُوٹے شفق کے رنگ
نقشِ قدم بھی رنگِ حنا کے سِوا نہ تھا

ڈھونڈا اُسے بہت کہ بلایا تھا جس نے پاس
جلوہ مگر کہیں بھی صدا کے سوا نہ تھا

کچھ اِس قدر تھی گرمیِ بازارِ آرزو
دل جو خریدتا تھا اُسے دیکھتا نہ تھا

آنکھیں اُبل رہی ہیں بہ ایں ضبطِ دردِ غم
دل میں بجز جراحتِ غم کچھ رہا نہ تھا

کچھ یوں بھی زرد زرد سی ناہید آج تھی
کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھلتا ہُوا نہ تھا

مذاکرے :

نقادوں سے دس سوال

حصّہ لینے والے : سیّد حتشام حسین
ممتاز شیریں
ڈاکٹر محمد حسن
مظفر علی سیّد
ریاض احمد

تخلیقی لکھنے والوں سے سوال

حصّہ لینے والے : مختار صدیقی
خدیجہ مستور
سلیم احمد

موسیقی پر ایک گفتگو

حصّہ لینے والے : منیر خاقون بیگم
منیر احمد شیخ
انتظار حسین

دس سوال نقادوں سے

۱۔ تنقید نگاری سے آپ کا مقصد ادب کی تاریخ مرتب کرنا ہے یا معاصر ادب پر اثر انداز ہونا۔

۲۔ کیا آپ کی دانست میں آپ کی تنقید سے ہم عصر ادب کو کوئی فائدہ پہنچا ہے اور کیا ہم عصر لکھنے والوں نے کسی طور پر آپ کی تنقیدی فکر سے اثر قبول کیا ہے

۳۔ آپ گذشتہ ادب کے بارے میں کیوں لکھتے ہیں۔

۴۔ ہم عصروں پر لکھتے ہوئے کبھی جھجک محسوس ہوئی ہے۔ ہوئی ہے تو کیوں۔

۵۔ اگر تقسیم کے بعد اردو میں تنقید نہ لکھی جاتی تو اس سے ہمارے ادب کی تاریخ پر کیا فرق پڑتا۔

۶۔ کیا آپ کی دانست میں ہمارے ادب نے تقسیم کے بعد زوال کیا ہے؟ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو زوال کے اس عمل میں آپ اپنی تنقید نگاری کا مقام کیسے متعین کریں گے۔

۷۔ آپ ادب کو قاری کی حیثیت سے پڑھتے ہیں یا نقاد کی حیثیت سے۔

۸۔ تنقید لکھتے ہوئے آپ کا مخاطب ادب کا قاری ہوتا ہے یا ادیب۔

۹۔ کیا آپ نے شعر یا افسانہ بھی لکھا ہے۔ اس کام کو چھوڑ کر تنقید لکھنے میں کیا مصلحت ہوئی۔

۱۰۔ آپ کی تحریروں میں مغربی ادب کے حوالے کثرت سے کیوں آتے ہیں۔

میں جواب دیتا ہوں

سید احتشام حسین

جوابات مختصر ہیں لیکن میرے مافی الضمیر کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ سوال نامے میں اکثر سوال ایسے ہیں جن کے جواب میری گذشتہ تحریروں میں واضح شکل میں موجود ہیں۔ کسی کو دلچسپی ہو تو اسے ان کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہی سوالات محض دوسرے حضرات سے بھی پوچھے گئے ہوں گے۔ اگر ایسا ہے تو ادب لطیف کا یہ حصہ بہت دلچسپ ہوگا۔ بس ڈر یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے اسے دوسروں کو مطعون کرنے اور گالیاں دینے کا ذریعہ نہ بنا لیا ہو۔ یہ بات آج کل بہت عام ہے۔

سوالوں کے جواب سلسلہ وار ہیں

۱۔ تنقید نگاری سے میرا مقصد ادب کی حقیقت اور ماہیت پر غور کرنا، شاعر اور ادیب کو اس کی تخلیقی کاوش پر نقاد کو اس کے صحیح شعور

اور ادراک پر داد دینا اور ادب کو زندگی کے تہذیبی رشتہ میں دیکھنا ہے۔ اس سلسلہ میں تاریخ ادب کے بعض پہلو بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ اور ہم عصر ادب کے بارے میں بعض خیالات کا اظہار بھی اس طرح ہو جاتا ہے کہ سنجیدہ مطالعہ کرنے والے ان سے متاثر بھی ہو سکیں۔ میری یہ خواہش ضرور ہے کہ اگر میرے تنقیدی خیالات مدلل اور مفید معلوم ہوں تو میرے عہد کے ادیب ان پر نگاہ رکھیں۔ میں اپنے خیالات کو صحیح سمجھتا ہوں اس لئے پیش کرتا ہوں لیکن میرا یہ اصرار نہیں ہے کہ آپ بھی اسی طرح انہیں صحیح مان لیں جیسے میں مانتا ہوں۔

۲۔ یہ سوال کہ میری تنقید نگاری سے ہم عصر ادب کو کوئی فائدہ پہنچا ہے یا نہیں یا کسی نے میرا اثر قبول کیا ہے یا نہیں۔ مجھ سے پوچھنے کا نہیں ہے میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ایسا اثر کبھی بہت واضح نہیں ہوتا۔ ہمارے ادیب اتنے فراخ دل بھی نہیں ہیں کہ وہ اس کا اعتراف کریں میں اپنی یہ خوش فہمی کی امید پر لکھتا رہا ہوں کہ کچھ لوگوں کو ان سے ادب کے مسائل کو سمجھنے اور اچھے برے ادب کے پرکھنے میں مدد ملے گی۔ میں لوگوں کی کمزوریوں اور حماقتوں سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا۔ ان کے ذہن اور علم کو کریدتا ہوں۔

۳۔ میں گزشتہ ادب کے بارے میں اس لئے لکھتا ہوں کہ حال کے ادب کی طرح وہ بھی ادب ہے، وہ بھی پڑھا جاتا ہے اسے بھی پڑھا جانا چاہیے۔ میں بھی اسے پڑھتا ہوں، اسے سمجھتا اور اس سے لطف لینا چاہتا ہوں۔ میں ہر اچھے ادب کی طرح اسے بھی زندگی کی دستاویز سمجھ کر پڑھتا ہوں۔ اس کی مدد سے اس عہد کے مزاج، ذہن، تمدن، اسلوب، خیالات کی کشمکش اور زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر کبھی اس سے جذباتی یا جمالیاتی حظ نہیں حاصل ہوتا تو ذہنی حظ حاصل ہو جاتا ہے۔ ماضی کے اچھے ادب نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا ہے۔ جب اس کی دنیا سے لوٹتا ہوں دامن بھرا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق اظہار خیال کیوں نہ کروں۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ گزشتہ ادب کے مطالعہ کے بغیر جدید ادب کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ادب تہذیب کی طرح ایک ناقابل شکست تسلسل ہے

۴۔ جی ہاں ہم عصروں پر لکھتے ہیں اکثر جھجک محسوس ہوتی ہے۔ ممکن ہے یہ میری فطری کمزوری ہو۔ مجھے لوگوں کو قلعی لگانے میں لطف نہیں آتا۔ جہاں تک ہو سکتا ہے اس سے بچتا ہوں۔ نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کا دل دکھے کوشش کرتا ہوں کہ ہم عصروں کی تخلیقات کے زیادہ سے زیادہ اچھے پہلوؤں کا ذکر کروں، انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتا ہوں اور کمزوریوں پر ہمدردانہ نگاہ ڈالتا ہوں۔ اگر مجبوراً ایسی باتوں کا ذکر کرنا ہی پڑتا ہے جو مجھے درست نہیں معلوم ہوتیں تو ان کا اظہار بھی دلآزاری کے انداز میں نہیں کرتا۔ اب ایسے کیا کروں کہ ایک کی تعریف دوسرے کو ناگوار ہوتی ہے۔ ویسے انسان ہی ہوں ممکن ہے کبھی کبھی طنز کے پیرایہ میں کوئی سخت بات قلم سے نکل گئی ہو۔ احتیاط ضرور کرتا ہوں۔ ہم عصروں میں کچھ ایسے ہیں جن کی آزردگی بے سبب کا علاج میرے پاس نہیں ورنہ غالباً کوئی شخص مجھ سے اس بات پر خفا نہیں ہوگا کہ میں نے اس کے متعلق لکھتے ہوئے کینہ جوئی یا حسد پروری سے کام لیا ہے۔ میری تحریروں کی کم مائگی، خیالوں کی نارسائی اور ناپسندیدہ استدلالی روش سے کچھ لوگ نا آسودہ ہوں تو یہ دوسری بات ہے۔ اب رہا یہ کہ ہم عصروں پر لکھتے ہوئے جھجک محسوس ہونا چاہیے یا نہیں تو میرا خیال ہے کہ اگر نہ ہو تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ہمیں ایک دوسرے کے خلاف گندگی اچھالنے یا بھٹیاریوں کی طرح کوسنے کاٹنے کا حق حاصل ہے۔ علمی حدود کے اندر رہ کر یہ جھجک کم سے کم بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن چونکہ بہت سے دوست کسی جادو کے ذریعہ سے فوراً نیت کا پتہ بھی لگا لیتے ہیں۔ گروہ بندی کا مجرم بھی قرار دے دیتے ہیں، اس لئے جھجکنا پڑتا ہی کا ہے۔ لاعلمی، کند ذہنی اور کم بینی کا الزام اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا جتنا بدنیتی یا اندھی جانبداری کا۔ اس لئے میں احتیاط کرتا ہوں۔ مجھ میں زمانہ سازی کی زیادہ طاقت ہے نہ لڑنے کی۔ وہ پیغمبرانہ مزاج بھی نہیں ہے کہ اپنے کو خلق خدا کی اصلاح پر مامور سمجھ کر چھیڑ چھیڑ کر راہ راست پر لانے کی فکر کرتا رہوں۔ پھر بھی غالباً میں نے ہم عصروں کے متعلق ہمدردانہ بہت کچھ لکھا ہے۔

۵۔ "جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟" یہ طبع آزمائی محض ذہنی ورزش ہے۔ یہ بتانا ناممکن ہے کہ اگر تقسیم کے بعد تنقید نہ لکھی جاتی تو ہمارے ادب کی تاریخ میں سادہ سا پڑا ہوتا۔ یہ سوال تنقید ہی نہیں ہر صنف ادب کے متعلق پوچھا جا سکتا ہے۔ تقسیم سے پہلے کی تنقید کے متعلق بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ اگر افسانے، ناول، ڈرامے یا غزلیں نظمیں اس وقت نہ لکھے گئے ہوتے تو کیا ہوتا؟ معلوم نہیں کیا ہوتا۔ آج کل جو کچھ ادب کے نام پر لکھا جا رہا ہے اس سے کیا ہو رہا ہے؟ کچھ لوگوں کے لئے بہت کچھ ہو رہا ہے۔ کچھ کے لئے ادب کی تخلیق سے گردش ہفت آسماں میں کوئی فرق نہیں پڑ رہا ہے۔ ایسے سوالوں پر علمی حیثیت سے غور کرنا وقت ضائع کرنا ہے۔ دوستوں میں بیٹھ کر تھوڑی دیر کے لئے پہیلیاں بجھانے کے انداز میں قیاس آرائی کرتے رہنا دلچسپی کا مشغلہ ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر تنقید نہ لکھی گئی ہوتی تو آپ یہ سوال ہی نہ پوچھتے! تقسیم کے بعد تنقید تو سخت افراتفری کا شکار رہی ہے۔ کسی نے انشائیے اور ناول کا کیا سوال، یہ سوچئے کہ اگر ارسطو نہ ہوتا، شیکسپیئر نہ ہوتا، گوئٹے نہ ہوتا، ٹالسٹائی نہ ہوتا، فردوسی نہ ہوتا، بادلیئر، کافکا اور سارتر نہ ہوتے تو کیا ہوتا؟ میں سمجھتا ہوں اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ کچھ عقلی تکّے لگائے جا سکتے ہیں اور کچھ خیال بازی ہو سکتی ہے جسے تنقید سے کوئی واسطہ نہیں۔

۶۔ میرے خیال میں تو تقسیم کے بعد اردو ادب میں کوئی ایسا زوال رونما نہیں ہوا ہے، جس سے ہراساں ہونے کی ضرورت ہو۔ بعض موضوعات بدلے ہیں بعض خیالات آگے بڑھے ہیں بعض پیچھے ہٹے ہیں۔ کچھ پرانے لکھنے والوں نے کم لکھا ہے۔ کچھ نئے لکھنے والے میدان میں آئے ہیں۔ نئی اور پرانی نسل کے جھگڑے کھڑے کئے گئے ہیں، پاکستانی اور اسلامی ادب کی تحریکیں چلائی گئی ہیں۔ بڑھ چڑھ کر کچھ سمجھنے کی کوشش ہوئی ہے۔ بعض اصناف کی طرف توجہ کم ہو گئی ہے بعض کی جانب زیادہ، کچھ کامیاب اور کچھ ناکام تجربے بھی ہو رہے ہیں۔ بعض شخصیتوں کے گرد دائرے بنانے کی کوشش ہوئی ہے۔ کچھ لوگ ادب میں بے راہ روی کے خواہاں ہیں کچھ اعصاب کی پکار پر لبیک کہہ رہے ہیں۔ کچھ ادب کو عہد وسطیٰ میں واپس لے جانا چاہتے ہیں، کچھ ایٹم قسم کی چیزوں سے متاثر ہیں اور ادب کو اپنے عہد کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ کیا انہیں زوال کی نشانیاں کہہ سکتے ہیں؟!

اس لئے میں اپنی تنقید نگاری سے بھی زیادہ مایوس نہیں ہوں۔ رہا اس کا مقام، تو اس کے متعین کرنے کا حق دوسروں کو حاصل ہے۔ میں تو عرض کر چکا ہوں کہ اگر اپنے خیالات کے بامعنی اہم اور درست ہونے پر یقین نہ ہوتا تو انہیں پیش ہی نہ کرتا۔ جہاں میرے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی وہاں اپنی لاعلمی اور اپنے شک کا اظہار بھی کر دیتا ہوں۔

۷۔ نقاد الگ کوئی مخلوق نہیں ہے وہ بھی قاری ہے شاید کچھ باشعور، باعلم اور ہوش مند۔ شاید عام قاری کے مقابلے میں اس کا ذہن بے ترتیبی میں ترتیب اور انتشار میں وحدت تلاش کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اس فرق کے باوجود نقاد بھی قاری ہی رہتا ہے۔ اگر وہ قاری نہ ہو تو نقاد کیسے ہو گا!

۸۔ تنقید لکھتے وقت میں خود اپنے سے بھی مخاطب ہوتا ہوں، قاری سے بھی، ادیب سے بھی اور دوسرے تنقید نگاروں سے بھی۔ ہر وقت ایسا نہیں ہوتا کہ بیک وقت سب سے مخاطب ہوں۔ میں اس کی توضیح اپنے کئی مضامین میں کر چکا ہوں۔ مختصراً پھر عرض کرتا ہوں۔ باقاعدہ حد بندی نہ ہونے کی وجہ سے معمولی رائے زنی، تبصرہ نویسی، تشریح، اچھے برے ادب کی پرکھ، اصول سازی ساری باتیں تنقید ہی کے دائرے میں آ جاتی ہیں۔ اس لئے ہر جگہ گفتگو کی سطح یکساں نہیں ہو سکتی۔ سیدھی سادی وقتی رائے زنی تاثراتی ہوتی ہے۔ تبصرہ میں قاری کو کسی کتاب سے روشناس کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس میں ضمناً ادیب سے بھی تخاطب ہو جاتا ہے۔ تشریح صرف قاری کے لئے کی جاتی ہے۔ شعر و ادب کی ماہیت، تخلیقی عمل کی منازل، موضوع اور ہیئت کے رشتے، ادبی حسن و قبح کی پرکھ کے اصول، فنون لطیفہ کے باہمی ربط، ادب اور انسانی تہذیب کے تعلق کا تذکرہ کرتے وقت زیادہ تر ادب کے فلسفی اور نقاد نگاہ کے سامنے ہوتے ہیں۔ اس پردے میں ادیبوں اور

شاعروں سے بھی باتیں ہو جاتی ہیں۔ عام قاری سے گفتگو کی سطح دوسری ہوتی ہے۔

۴۔ جی ہاں میں نے متفرق افسانے بھی لکھے ہیں (افسانوں کا ایک مجموعہ دو تین بار چھپ بھی چکا ہے) تنقید کے علاوہ بعض اور اصناف سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ شعر اب بھی کبھی کسی وقت کہہ لیتا ہوں۔ شاعری یا افسانہ نگاری چھوڑنے اور تنقید نگاری اختیار کرنے کا سوال نہیں ممکن ہے پھر افسانے لکھنے لگوں، شاعری کی رفتار بڑھ جائے۔ ناول لکھنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ شروع میں کچھ ڈرامے بھی لکھے تھے اب بھی کبھی کسی وقت خواہش ہوتی ہے۔ تنقید کو خاص طور سے اپنانے کا سبب غالباً یہ ہوا کہ ۱۹۳۸ء میں جب سارے کام ایک وقت جاری تھے، ملازمت ملی یونیورسٹی میں پڑھانے کی، نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھانے کے لئے کچھ زیادہ باقاعدگی سے پڑھنا پڑا۔ طالب علموں پر محض اپنی رائے مسلط کرنے کے بجائے انہیں دوسروں کے خیالات سے واقف کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ بہت سی الجھنیں سامنے آئیں، بہت سے پہلوؤں پر سوچنا پڑا۔ اس کے لئے کچھ اصولوں کی تلاش شروع ہوئی۔ کسی طرح دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ادب کا مطالعہ مذہب، فلسفہ، نفسیات، تاریخ، سماجی علوم، دینیات اور دوسرے فنون لطیفہ کا مطالعہ کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح الجھنوں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ زندگی کی دوسری فکروں کے ساتھ جو وقت بچتا تھا وہ اس ایک کام کے لئے بھی کافی نہ ہوتا تھا۔ صحبت احباب، اخبار اور رسائل بھی تنقید کا مطالبہ کرنے لگے اور آہستہ آہستہ طلب و رسد کا اصول کام کرنے لگا۔

آپ تنقید لکھنے کی مصلحت تو پوچھتے ہیں مصلحت ہو کیا سکتی ہے؟ شاعری، افسانہ نگاری یا ناول نویسی میں شہرت جلد حاصل ہوتی ہے۔ شاید مادی حیثیت سے بھی یہ سودا نفع بخش رہتا ہے۔ اسی لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض حضرات شاعری اور افسانہ نگاری کی معمولی صلاحیت کے باوجود اس میں لگے رہتے ہیں۔ میں ان سے معذرت کیوں پسند کرتا؟ اپنا جائزہ لیتا ہوں تو کوئی نفسیاتی پہلو بھی سامنے نہیں آتا۔ نہ تو اپنے مزاج کو ظالمانہ، انتقام پسندانہ یا ایذا رسانی کا شائق پاتا ہوں کہ تنقید لکھ کر کسی سے انتقام لے رہا ہوں، کسی کو نیچا دکھاؤں، کسی کو خوفزدہ کر دوں، کسی کو تکلیف پہنچاؤں تاکہ آسودگی حاصل ہو اور نہ تنقید نگاری کو شاعری اور افسانہ نگاری سے بلند تر مقام دے کر کہتا ہوں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ تنقید زیادہ لکھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ اور بھی لکھوں ممکن ہے تنقید ہی لکھتا رہوں۔ میں اس خیال کو بھی صحیح نہیں سمجھتا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو ہوتا ہے اور بگڑا ادیب نقاد بن جاتا ہے۔ سب اپنا اپنا فرض ادا کرتے ہیں اور اپنی اپنی حدوں کے اندر اہم کام انجام دیتے ہیں تخلیق اور تنقید دونوں بقا اور ارتقائے ادب کے دو رخ ہیں۔

۶۔ یہ سوال شاید دوسرے نقادوں سے پوچھا جا سکتا ہو۔ مجھ سے نہیں پوچھا جا سکتا۔ میرے یہاں مغربی ادیبوں کے حوالے بہت کم ہیں یہ نہیں کہ میں مغربی ادیبوں اور نقادوں کو پڑھتا نہیں۔ میں نے ان سے بہت استفادہ کیا ہے۔ ان کے علم و فضل سے مرعوب ہوں لیکن میں ان کے خیالات کو اپنے خیالات کے دائرے میں سمونے کی کوشش کرتا ہوں۔ ان کے حوالے دے کر اپنے خیالوں کے جواز کی صورت نہیں پیدا کرتا۔ یہ اور ایسی دوسری غلط فہمیاں میرے متعلق اکثر اس لئے ہیں کہ بدقسمتی سے لوگ پڑھتے نہیں، ایک آدھ جملہ ادھر ادھر سے دیکھ کر یا سن کر آستین الٹ لیتے ہیں اور فتوے صادر کر دیتے ہیں۔ ایک صاحب نے لکھا کہ احتشام صاحب نے روسی ادیبوں پر بہت لکھا ہے۔ دوسرے نے کہا سارے خیالات مارکس سے ماخوذ ہیں۔ تیسرے نے کہا بیچارے کو ماضی کا شعور نہیں۔ چوتھے نے لکھا اخلاق کے مفہوم سے واقف نہیں، پانچویں کا ارشاد ہے کہ انسانی اقدار کا خیال نہیں رکھتے، چھٹے نے فتویٰ دیا صرف ایک خاص گروہ کے ادیبوں کے متعلق لکھتے ہیں، ساتویں نے آواز بلند کی ادب کی اعلیٰ اور دائمی قدروں کا علم نہیں۔ آٹھویں نے فرمایا بہت کچھ جانتے ہیں لیکن ادب اور جمالیات سے ناواقف ہیں۔ ان سب کی تہہ میں چند مفروضات ہیں جن کا علم سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ اس طرح یہ بات بھی میرے متعلق کہی جا سکتی ہے کہ مغربی ادیبوں کے حوالے کثرت سے دیتا ہوں۔ اگر لوگ میری تحریریں پڑھ کر ان سے بھی زیادہ سنگین الزام لگائیں تو مجھے دکھ نہ ہو۔

ممتاز شیریں

آپ نے نقادوں سے تنقید نگاری اور خصوصیت سے ان کی اپنی تنقید نگاری کے بارے میں ایسے سوال کئے ہیں جو "خود معائنہ" کی دعوت دیتے ہیں۔ ان

سوالات کا جواب دینے سے پہلے میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں اپنے آپ کو باقاعدہ نقاد نہیں، ادب کی طالب علم سمجھتی ہوں۔

۱۔ یوں تو ادب کی تاریخ مرتب کرنا، ادب کو Re-evaluate کرنا، ادبی رجحانات کا کھوج لگانا، اپنے دور کے ادب کی سمت متعین کرنا، طرزِ احساس کا پتہ لگانا، گذشتہ اور معاصر ادب کا جائزہ لینا یہ سب کچھ تنقید کے مقاصد میں شامل ہے مگر میں نے ہم عصر ادب کے جائزہ پر اکتفا کیا ہے۔ میں نے تنقید کے لئے اسی صنف ادب کا انتخاب لیا ہے جس سے میرا تخلیقی طور پر بھی تعلق رہا ہے یعنی فکشن۔ اس صنفِ ادب کی عمر ہی اتنی مختصر ہے کہ اس کی ہمارے ہاں ابھی کوئی تاریخ مرتب نہیں ہو سکتی۔

۲۔ معاصر ادب پہ اثر انداز ہونا اور اپنی تنقیدی فکر سے اپنے دور کے لکھنے والوں کو متاثر کرنا بڑی بات ہے۔ ہمارے نقادوں میں سوائے عسکری صاحب کے شاذ ہی کسی کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ایک دور کے لکھنے والوں نے ان کی تنقیدی فکر سے اثر قبول کیا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اپنی تنقید سے معاصر ادب کو کیا فائدہ پہنچا ہے! اگر اس تنقید سے ذوقِ ادب نکھارنے میں تھوڑی بہت مدد ملی ہو، فن کے مسائل پہ کچھ روشنی ڈالی گئی ہو، اور معاصر اور نئے ابھرتے ہوئے لکھنے والوں کی کچھ حوصلہ افزائی ہو تو یہ بھی غنیمت ہے۔

۳۔ گذشتہ ادب سے آپ کا مطلب ۱۹۳۶ء کی نئے ادب کی تحریک سے پہلے کا ادب ہے تو میں نے اس کے بارے میں نہیں لکھا۔ ویسے ہمیں اپنی روایت سے رشتہ جوڑنا ہے۔ تو گذشتہ ادب کا مطالعہ اور جائزہ اتنا ہی اہم ہے جتنا معاصر ادب کا مطالعہ۔ معاصر ادب کا فنی تعین شاید ۱۹۶۰ء کی دہائی کے نئے ادب سے کیا جا سکتا ہے۔ گو ہم عصر ادیبوں کا تعین کرنے میں مجھے ناصر کاظمی کی اس بات سے اتفاق ہے کہ زمان و مکاں کے حدود سے زیادہ اس میں مشترکہ احساس کو دخل ہے اور وہ ادیب صحیح معنوں میں ہمارے ہم عصر ہیں جو باطنی طور پہ ہم سے قریب ہیں اور جن سے ہم ایک یگانگت اور [illegible] محسوس کرتے ہیں۔ ہم عصر کے ایک معنی وہ ہیں جن معنوں میں کہ قرۃ العین حیدر میری معاصر ہیں۔ یعنی اصلی اور ادبی دونوں اعتبار سے میری ہم عمر اور ساتھی۔ ہماری ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۰ء کی دہائی کے وسط یعنی تقسیم سے کچھ پہلے کے تھوڑی دور سے ہوا لیکن وقت کو ذرا آگے پیچھے بڑھایا جائے تو ۱۹۳۶ء کے ادیب اور ۱۹۴۷ء کے بعد کے ادیب بھی اپنے معاصرین میں شامل ہو سکتے ہیں۔

۴۔ معاصر ادب پہ یا انفرادی طور پر کسی ہم عصر ادیب پہ لکھنے میں مجھے کبھی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔ ہم عصر ادیبوں پہ بلا جھجک لکھنا مشکل کام ہے میں نے ان پہ لکھتے ہوئے حتی الامکان معروضیت اور لاتعلقی اختیار کرنے کی کوشش کی ہے اور کسی کے نام سے زیادہ اس کی تحریر سے غرض رکھی ہے۔

۵۔ یہ سوال کہ تقسیم کے بعد تنقید نہ لکھی جاتی تو اس سے ہمارے ادب کی تاریخ میں کیا فرق پڑتا۔۔ عجیب نوعیت کا ہے۔ اول تو یہاں تقسیم سے پہلے اور بعد کی تقسیم ہی بے معنی ہے۔ دوسرے یہاں یہ مفروضہ نکلتا ہے کہ تخلیقی ادب کے مقابلہ میں تنقید کی کوئی اہمیت نہیں۔ حالانکہ ادب میں تخلیق اور تنقید دونوں کی برابر اہمیت ہے یہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ تنقید ایک سایہ سہی، ادب کے وجود سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

۶۔ اگر اس سوال کا تعلق اس دوسرے سوال سے ہے کہ تقسیم کے بعد ہمارے ادب نے زوال کیا ہے لہٰذا تقسیم کے بعد تنقید میں بھی کوئی قابلِ قدر کام نہیں ہوا ہے تو پھر اس سوال کی صرف تنقید کے ساتھ تخصیص نہیں ہو سکتی مجھے اس بات سے پوری طرح اتفاق نہیں کہ تقسیم کے بعد ہمارا ادب زوال پذیر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تقسیم کے بعد اتنے اچھے ادیب ایک ساتھ، ایک گروہ کے گروہ میں نہیں ابھرے، جیسا کہ ۱۹۳۶ء اور اس کے بعد کے دور میں ہوا تھا۔ صرف چند ادیب انفرادی طور پر ابھرے ہیں۔ اور بجائے ایک سطح کے اچھے ادب کی تخلیق کے انفرادی تخلیقات نمایاں ہوئی ہیں۔ لیکن اس دور کے لکھنے والے عہد کے ایک بڑے تجربے (ہجرت) سے گذرے ہیں، جس کا ان کی تحریروں پہ نمایاں اثر ہے۔

۷۔ گو پہلے دور کے لکھنے والوں میں سے چند نے یا لکھنا بند کر دیا ہے یا بالکل کم کر دیا ہے۔ چونکہ ان میں پایہ کے ادیب بھی تھے۔ اس سے ہمارے ادب

نقصان پہنچا ہے لیکن ان میں سے بعض نے تقسیم کے بعد بھی اسی دور میں لکھا اور پہلے سے بہتر لکھا چنانچہ منٹو کی ان تحریروں کی اہمیت جو تقسیم کے بعد کی ہیں۔ پہلے کی تحریروں سے نہیں زیادہ ہے منٹو کے فن اور رویہ میں تقسیم کے بعد ایک نمایاں ارتقا پایا جاتا ہے۔ جن ادیبوں نے تقسیم سے کچھ پہلے لکھنا شروع کیا تھا اور جن کو شاید ابھی سلجھاؤ اور ذہنی سنجیدگی ابھی نہیں آنے پائی تھی۔ وہ پہلے سے بہتر لکھ رہے ہیں۔ اور اس دور کی نئی فکر اور طرزِ احساس کا ساتھ دے رہے ہیں۔

تنقید کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مارکسی تنقید کی انتہا پسندانہ یکسانیت سے ہٹ کر ہمارے نقاد اپنے طور پر سوچنے سمجھنے لگے ہیں۔ اور ان میں ایک نیا شعور بیدار ہوا ہے۔ جہاں تک میری تنقید کا سوال ہے تو خود میری نظر میں ان تنقیدی مضامین کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ جو میں نے تقسیم سے پہلے لکھے تھے سوائے ایک مضمون "تکنیک کا تنوع" کے جو ۱۹۴۶ء میں لکھا گیا تھا۔ یہ مضامین اتنی چھوٹی عمر میں لکھے گئے تھے کہ ان میں سنجیدگی، سلجھاؤ اور توازن کا فقدان تھا۔ اب تنقید میں میں نے جو بہتر کام کیا ہے۔ وہ تقسیم کے بعد ہی کیا ہے چنانچہ منٹو کا مطالعہ جسے میں اپنی تنقیدی کاوشوں میں سب سے بہتر اور اہم سمجھتی ہوں۔

۸۔ تنقید لکھتے ہوئے ادیب اور قاری دونوں میرے مخاطب ہوتے ہیں۔ ادب کو میں عموماً قاری کی حیثیت سے پڑھتی ہوں۔ یوں پڑھنے میں آزادی سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ البتہ تنقیدی شعور غیر محسوس طور پر اپنا کام کرتا رہتا ہے اور شاید نقاد کی دوررس نگاہ کسی تحریر میں وہ کچھ دیکھ لیتی ہے۔ جو عام قاری کی نظر سے پوشیدہ ہوتا ہے عام قاری عموماً کسی تخلیق تک جذبہ کے ذریعہ پہنچتا ہے اور نقاد intellect کے ذریعہ۔ یوں جذبہ و احساس اور فہم و دانش دونوں شامل ہوں تو ادب کے مطالعے سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور ایک اچھے نقاد میں یہ دونوں ساتھ ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ تنقید میں "صاحبت" اور ایک صحیح sensibility کا ہونا بہت ضروری ہے۔

۹۔ نقاد کے ذہنِ رسا کو وہ باتیں سجھائی دیتی ہیں، جو خود مصنف کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتیں۔ یا غیر شعوری طور پر اس کی تخلیق میں شامل ہو جاتی ہیں۔ بہت کم ادیب اپنی تحریروں سے اس طرح آگاہ ہوتے ہیں۔ جیسے کہ ہنری جیمس۔ کوئی پایہ کی تہہ در تہہ تخلیق ہو تو نقاد اس پہ کتنے زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں جو ایسے نکتے اس میں نکالتے ہیں اور حقیقی تاویلیں کرتے ہیں۔ ان کا خود مصنف کو علم نہیں ہوتا۔ اس طرح تنقید میں دریافت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور تنقید بھی ایک لحاظ سے تخلیقی عمل بن جاتی ہے۔

۱۰۔ آپ کے آخری سوال کا جواب میں اپنی جانب سے نہیں، عسکری صاحب کے الفاظ میں دوں گی۔ "دونوں قسم کی تحریروں (یعنی تنقید اور افسانہ) کے پیچھے ایک ہی جذبہ اور دریافت کا وہی احساس کارفرما ہوتا تھا۔ نوجوانوں میں ایک ایسی ذہنی ہلچل تھی کہ ہر نئی تحریر ان کے لئے ایک نئے تجربے کا حکم رکھتی تھی۔ یا تجربے کی توسیع کا امکان پیدا کرتی تھی۔ اس ماحول میں ممتاز شیریں نے لکھنا شروع کیا۔

"آج سے پندرہ سال پہلے مغربی ادب کے بارے میں تجسس نوجوانوں کے لئے ایک شدید ذہنی ضرورت بن گیا تھا۔ اس سے پہلے ہمارے یہاں مغربی ادب کو اتنے اشتیاق اور اتنی وسعت کے ساتھ کبھی نہیں پڑھا گیا تھا (اس دور میں) نئے ادیبوں نے مغربی ادب کو اس طرح پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے یہ ان کی تخلیقی سرگرمیوں سے براہِ راست متعلق ہو۔ ان دنوں اردو والے دنیا بھر کے ادب کو اپنا سمجھ رہے تھے۔ یہ اندازِ نظر ممتاز شیریں کے مضمون "تکنیک کا تنوع" (اور ایک دوسرے مضامین میں بھی) موجود ہے۔ جس شوق سے یہ مضمون پڑھا گیا۔ وہ بھی اسی احساس کا کرشمہ ہے۔ اس میں جو تلاش اور جستجو کا عنصر ہے وہ ایک پورے دور کی نمائندگی کرتا ہے۔"

ڈاکٹر محمد حسن

۱۔ میری رائے میں یہ دونوں باتیں الگ الگ نہیں ہیں۔ ادب کی تاریخ صرف اسی وقت مرتب کی جا سکتی ہے۔ جب مرتب کا کوئی واضح نقطۂ نظر ہو۔ اس

نقطۂ نظر سے جب وہ عصری ادب کا مطالعہ کرتا ہے تو اس پر اثر انداز ہوتا ہے اور جب اس نقطۂ نظر سے روایت کی ترتیب نو کرتا ہے تو ادب کی تاریخ مرتب کرتا ہے۔ جو بالواسطہ عصری ادب کو متاثر کرتی ہے۔

۲۔ اس کا فیصلہ خود لکھنے والوں ہی کو کرنا ہے اور شاید ان کے لئے بھی ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ لیکن اگر یہ "خوش فہمی" نہ ہو کہ تنقید نگار کی تنقید کا کم معاصر لکھنے والوں پر اثر ساز ہوتی ہے تو پھر تنقید نگار تنقید لکھنے کی زحمت ہی کیوں کرے۔

۳۔ گذشتہ ادب کے بارے میں اس لئے لکھتا ہوں کہ روایت تو REVALUATION اور اس پر نئے محاکمے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ ابھی تک تنقید نے ہماری ادبی تاریخ کو اس کے صحیح سماجی اور عمرانی پس منظر میں نہیں پرکھا ہے۔ اور اس پرکھ کی ضرورت اس لئے ہے کہ اس سے عصری ادب کو صحیح نظر اور متوازن ذہن مل سکتا ہے۔

۴۔ ہم عصروں پر لکھنے میں جھجک محسوس ہوتی ہے لیکن اس جھجک سے میں نے شکست تسلیم نہیں کی ہے۔ جھجک اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ بعض ہم عصر دوں کو صرف تعریف سننا ہی پسند ہے۔ حتّی کہ تنقید بھی ذاتی مراسم کو خطرے میں ڈال دیتی ہے یا اسے غیر دیانت دارانہ سمجھ کر اس میں ذاتی نفع و نقصان کے پہلو تلاش کئے جاتے ہیں۔ دوسرے کبھی کبھی اس لئے بھی جھجک محسوس ہوتی ہے کہ شاید ہم عصروں پر رائے دینا قبل از وقت ہے۔ ممکن ہے جسے ہم میلان سمجھ رہے ہیں۔ وہ محض ایک معمولی سی لہر ہو جسے ہم اہمیت دے رہے ہیں۔ ممکن ہے روحِ عصر اسے تسلیم نہ کرے اور زمانہ نئے سرے سے تاج اتارے اور شہرتیں بخشے کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری رائے میں ذاتی مراسم، دوستی یا دشمنی، تعصبات و تاثرات شامل ہو گئے ہوں!

۵۔ یوں تو اگر فرق کی بات کی جائے تو شاید کسی بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا کرتا مثلاً ۱۹۴۷ء کے بعد از سر نو سے ادب ہی وجود میں نہ آتا تو کیا فرق پڑتا یا اگر تقسیم ہی نہ ہوتی تو کیا فرق پڑتا لیکن شاید تنقید کے بغیر ادبی شعور اس وقت سے بھی زیادہ تشنہ رہتا۔ ہر تخلیقی فن کار اپنے کمال کا اعتراف دوسروں کی زبانی چاہتا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ اس سے کیا مطالبے کئے جاتے ہیں۔ اور سنجیدہ قاری اس کی تخلیقات کے بارے میں کیا سوچتا ہے "تنقید نے کم سے کم اس ضرورت کو تو کچھ نہ کچھ پورا کیا ہے (لیکن یہاں تنقید سے میری مراد سنجیدہ تنقید سے ہے محض رائے زنی سے نہیں)

۶۔ جی ہاں۔ تقسیم کے بعد ہمارا ادب زوال آمادہ رہا ہے۔ اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ آدرش کی آگ بجھ گئی۔ نہ نصب العین رہا نہ انتزاکیت اور اس خلا میں چند بھٹکی ہوئی روحیں پر چھیڑ چھاڑ کرتی رہیں۔ اس وقت بھی کم و بیش یہی شکل ہے۔ اس کے بہت سے اور اسباب بھی ہیں۔ تنقید کے ذریعے سے آدرش اور شعور کی ضرورت اور اس زوال کے احساس کو عام کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ لیکن صرف دو ایک تنقید نگاروں کی تحریروں سے اس زوال کا مداوا پوری طرح ممکن نہیں۔ اس کے لئے زیادہ بڑے پیمانے پر کام کرنے کی ضرورت ہے جو شاید کسی ایک رسالے کے ذریعے ہی سے ہو سکتا ہے۔

۷۔ ہر نقاد بنیادی طور پر قاری ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ زیادہ حساس زیادہ باشعور اور زیادہ محتاط قاری ہوتا ہے۔

۸۔ یہاں بھی قاری اور ادیب میں مخاطب کے اعتبار سے کوئی حد فاصل نہیں ہے۔ میرا مخاطب ہر ذہین اور باشعور قاری سے ہوتا ہے۔ جو ادیب بھی ہو سکتا ہے۔

۹۔ میں نے شعر بھی کہے ہیں اور افسانے بھی لکھے ہیں۔ لیکن یہ دونوں عنفوانِ شباب کے مشغلے تھے اور وہ بھی چند روز کے۔ کیونکہ ان کی بنیاد وقتی اور داخلی ہیجانات پر تھی۔ انہیں میں نے ترسیل سے زیادہ اظہار کا ذریعہ بنانا چاہا تھا۔ میری شخصیت کا پورا اظہار تو مطالعے میں ہوا ہے۔ یا تنقید میں۔ کم سے کم میرا یہی خیال ہے اور یہ دونوں مشاغل ابھی تک جاری ہیں۔ اسی لئے میں نے اپنے اشعار اور افسانے عام طور پر چھپنے کے لئے نہیں بھیجے۔ شعر شاید ایک یا دو اور افسانے صرف دو چھپے ہیں اور یہ دونوں خالصتہً نجی تھے۔

۵۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں مغرب اور مشرق کی اصطلاحوں اور حد بندیوں میں رہ کر سوچنا نہیں چاہیے کہ یہ عہد ایک ہی تہذیب، ترقی یافتہ رہی ہوتی ہے جیسے اس زمانے میں ہو رہا modern کہا جاتا ہے کہ یہ وہ عالمگیر سطح پر انسانی تہذیب کی وہ اعلیٰ ترین منزل کی نشان دہی کرتی ہے۔ ایک زمانے میں اسلامی تہذیب کا بھی یہی حال تھا۔ آج مغربی تہذیب کا یہی حال ہے۔ یہ دراصل عالمی تہذیب کا خاصہ ہے کچھ نہیں۔ کیونکہ اس نے بہت زمانوں سے یونان، روم، وسطی اسلام، ہندوستان غرض سبھی تہذیبوں کے سرمائے سے استفادہ کیا ہے۔ آج ہمیں بھی یہی کرنا چاہیے۔ ہم عالمی تہذیب سے زیادہ دیر تک منہ موڑ کر بند نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ہمیں انہیں قبول کر کے اور کچھ سوچ کر آج کے عالمی ادب سے استفادہ کرنا چاہیے۔ عالمی تہذیب جو آج انسانی تہذیب کی اعلیٰ ترین سطح ہے اور جس کی عنان اس وقت اتفاق سے مغرب کے ہاتھوں میں ہے، اس کی تشکیل میں ہمارا بھی حصہ رہا ہے۔ ہمیں بزرگوں کے احساسِ کمتری کے سبب اس سے بہت کچھ لینا بھی چاہیے اور اسے بہت کچھ دینا بھی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ادب کے حوالے دیتے وقت مجھے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ حوالے کس ادب سے دیے جائیں، وہ مشرقی ادب کے ہوں یا مغربی ادب کے۔ میں بد مذاقی کی دلیل سمجھتا ہوں۔

مظفر علی سید

۱۔ یہ سوال کر کے شاید آپ "یا حیا لن یا جیتن لن" کی تبلیغ پر مصر ہیں جبکہ اچھے نقاد میں تاریخ کا شعور اپنے زمانے کے فہم سے پیوست ہوتا ہے ؎

یاد ما آں ما در دار ایں نیز ہم

تنقید کا بنیادی وظیفہ یہ ہے کہ معاصر ادب کو تاریخ کے تناظر میں دیکھے اور یہ بھی کہ قومی اور ادبی تاریخ کا ایک ایسا شعور پیدا کرے جو نئے زمانے کا شعور ہو۔

ہاں تاریخ دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ زندہ تاریخ اور مردہ تاریخ۔ مردہ تاریخ وہ ہے جو علمی ادبی کتابوں کی شکل میں سوانح عمریوں اور تذکروں کے نام پر پیش کی جاتی ہے۔ ساری تفصیلات اور معلومات مہیا کرنے کے باوجود یہ ہمیں ادب کی لذت اور ادیب کے شعور دونوں سے دور ماضی کے گورستان میں لے جاتی ہے اور فاتحہ پڑھوا کے واپس بھی نہیں لاتی۔

ایسی تاریخ لکھنا میرا مقصد نہیں صرف زندہ تاریخ جو قوم کے مزاج میں شامل ہو کر ادب اور زندگی کو نئے راستے پر ڈال دے، کسی نقاد کا دردِ سر بن سکتی ہے۔

۲۔ یہ سوال آپ کو ابھی اور مجھ سے نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ ان لوگوں کا سب میرے دوست ہیں اور جنہیں ہم عصروں نے کئی طرح سے میری تنقیدی فکر سے ہم آہنگ یا اثر قبول کیا ہے۔ پھر کیا آپ مان لیں گے

فائدے نقصان کی بات بھی بہت ٹیڑھی ہے۔ مرض بیماری سے علاج معالجہ جو آج کی عادی کوئی طریقہ اپنایا جاتا ہے، کارگر نہیں ہو رہا۔ ظاہر ہے فائدے کی بجائے الٹا نقصان ہی ہوا ہوگا۔

اتنا طے ہے کہ میری تنقید بے ضرر نہیں ہو سکتی۔ علاج لازم ہے اور شفا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں۔

۳۔ جی نہیں میں گذشتہ ادب کے بارے میں نہیں لکھتا۔ کسی زمانے کا ادب اگر ادب ہے تو وہ اتنا گیا گذرا کبھی نہیں ہو سکتا کہ تنقید کا موضوع نہ بن سکے۔ گذشتہ ادب سے اگر آپ کی مراد کلاسیکی ادب ہے تو وہ گذشتہ ادب نہیں، زندہ و پائندہ ادب کا نام ہے اور اگر گذشتہ ادب سے آپ

کی مزاحیانہ غزل کی وہ ادب نما تحریریں ہیں، جن کا آئندہ کوئی صاحبِ نظر نام بھی لینا پسند نہ کرے گا۔ تو کہنا پڑتا ہے کہ میں نے اس کے بارے میں لکھا ہے۔

ع خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم

۴۔ اپنے ہم عصروں کو تنقید کا موضوع بناتے ہوئے اکثر جھجک سی محسوس ہوتی ہے کہ یاروں کے آبگینے بہت نازک ہیں، پھر بھی ان کو چھوڑنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ چاہتا ہوں کہ انیس کے ساتھ مل کر کہہ سکوں ؎

اس عہد میں راستی کا کیونکر ہو رواج
مسطر کج ہے، قلم کی تقصیر نہیں

یہاں مسطر تو کج ہے ہی مگر قلم بھی بے تقصیر نہیں لگتا۔ پھر کیسے بھول جاؤں اور کیسے معاف کر دوں؟

نہ اتنا اندھا ہوں کہ ہم عصروں کو دیکھ نہ سکوں نہ اتنا داتا بنا کہ سب کو معاف کر دوں اس لئے ان پر لکھتا بھی ہوں اور جھجکتا بھی ہوں۔ یہ اپنی خوش قسمتی ہے کہ بعض کو لکھنا پسند نہیں آتا اور بعض کو جھجکنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

مگر میں تو جھجک جھجک کر بھی لکھے جاتا ہوں

۵۔ آزادی اور سرحدِ تقسیم کے بعد تنقید نہ لکھی جاتی تو ہند و پاکستان کے اخباروں رسالوں میں اب تک کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے جاری کردہ فرمان تنقید کے نام پر چھپا کرتے۔ اور اب تو آپ جانتے ہیں یہ فرمان بھی معذرتی اور ماتمیانہ انداز میں لکھے جانے لگے ہیں۔

۶۔ ادب کے سلسلے میں زوال اور ترقی کے الفاظ استعمال کرنا ڈارون کی روح کو ثواب پہنچانے سے زیادہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اپنی تنقید کا مقام متعین کرنے کی کوشش کرنا اس سے زیادہ بے معنی بات ہوگی۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں ادب نے نئی وسعتیں اور گہرائیاں ناپی ہیں۔ مگر جو موتی نکال کے لائے ہیں۔ ان کا آپس میں مقابلہ نہیں ہو سکتا اقبال غالب کی ترقی یافتہ شکل کا نام نہیں۔ نہ ناصر کاظمی فیض کی زوال خوردہ صورت ہے میری تنقید یہی کہنا چاہتی ہے۔ میں اس کا مقام متعین کرنے کی کوشش کرنے میں لگ جاؤں تو میرا کام کون کرے گا!

۷۔ بیک وقت دونوں طرح ادب پڑھتا ہوں اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس طرح زیادہ اور کس طرح کم۔

سمجھتا یہ ہوں کہ ہر اچھا قاری نقاد بھی ہوتا ہے چاہے تنقید لکھے نہ لکھے چونکہ اکثر پڑھی ہوئی چیزوں پر تنقید نہ لکھی جا سکتی ہے نہ چھپ سکتی ہے اس لئے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ زیادہ تر قرأت سے کام لیتا ہوں، نشی گیری سے بہت کم۔

۸۔ تخاطب کس سے ہوتا ہے! شاید عام ادب پڑھنے والوں سے بھی ہوتا ہوگا۔ اور ادیبوں سے بھی مگر لگتا یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے اور وہ لکھنے والے کہ میرے مخاطب ہیں ابھی نہیں آئے جو تھوڑے بہت موجود ہیں، چاہتا ہوں کہ وہ بھی آنے والوں کے ساتھ مل جائیں اور ریاکاری کے اس دور کی مصلحتوں سے اوپر اٹھ کر ہر بات کو سوچیں سمجھیں۔ ادیبوں میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ اس لئے اپیل مارتا ہوں عام آدمی کے ضمیر کو جو ادیبوں کے ضمیر کی طرح ابھی سویا مرا نہیں۔

۹۔ جی ہاں میں نے شعر بلکہ ایک آدھ افسانہ، ڈراما بھی لکھا ہے شاعری ابھی چھوڑی نہیں۔ اگرچہ ہوتی بہت کم ہے۔ خدا جانے کیوں تنقید کو کس مصلحت سے اختیار نہیں کیا۔ اگرچہ یہ ضرور محسوس کیا ہے کہ پیشہ ور نقادوں کی تنقید کا توڑ زبانی جمع خرچ سے نہیں ہو سکتا۔ تازہ اور نئی تنقید لکھ کے ہی ان خطرات سے بچا سکتا ہے۔ جو ان حضرات کی تنقید نے کھڑے کر دیئے ہیں۔

۱۰۔ میری تحریروں میں مغربی ادب کے حوالے کثرت سے کیا معنی شاذ و نادر ہی کبھی آئے ہوں تو آئے ہوں۔ شاید اس لئے کہ میں نے جب بھی کبھی مغربی ادب پڑھا ہے۔ ادب کی طرح پڑھا ہے نہ کہ حوالے دینے کی خاطر۔

ویسے کبھی ذہن میں ادھر کی کوئی بات کوند جائے تو اشاروں حوالوں کی بجائے جذب کرنا پسند کرتا ہوں۔

ریاض احمد

آپ کے سوال نامے نے مجھے ایک الجھن میں ڈال دیا ہے۔ کیونکہ میں اور ریاض احمد بہت کم اکٹھے ہو کر چلے ہیں۔ ریاض احمد کے بال "میں" بہت کم نظر آیا ہوگا۔ لیکن اس نامے کا تقاضہ یہ ہے کہ "میں" اور ریاض اکٹھے ایک دوسرے کی تعریفیں کرتے ہوئے سر بازار آبیٹھیں۔ اب میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں اپنے متعلق کچھ نہ لکھوں اور جو کچھ ریاض احمد کے متعلق جانتا ہوں۔ وہ کہہ دوں۔

۱۔ آپ کے سوال نامے کی پہلی شق کے متعلق میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ریاض احمد نے نہ تو اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے نہ ہم عصر ادب پر اثر انداز ہونے کی۔ اس کے انداز سے ایک طالب علمانہ ذہنیت جھلکتی ہے۔ وہ ادب اور فن کے متعلق بعض چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر کوئی چیز اس کی سمجھ میں آجائے تو اسے لکھ دیتا ہے۔ ان میں سے بعض چیزیں ہو سکتا ہے کہ ایسی ہوں جن سے آئندہ مورخ کچھ فائدہ اٹھا سکے یا ہم عصر ادیب کسی مسئلے کو بہتر طور سے سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔ یہ بات اس وجہ سے کہتا ہوں کہ بعض احباب نے جس میں موافق اور غیر موافق دونوں طرح کے لوگ شامل ہیں۔ اس کے مدلل ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

۲۔ مندرجہ بالا سطور کے پیش نظر یہ کہنا مشکل ہے کہ ریاض احمد کے تنقیدی مضامین ہم عصر ادب کے لئے مفید ثابت ہوئے ہیں یا نہیں۔ دراصل کچھ یوں نظر آتا ہے۔ جیسے یہ سوال یہ سوچ کر مرتب کیا گیا ہو کہ نقاد تنقید نگار کا کام ایک معلم کا سا ہے۔ جو اپنے شاگردوں کو راہ کی اونچ نیچ دکھاتا ہے۔ ریاض احمد نے نہ کبھی معلم بننے کی کوشش کی ہے۔ اور نہ کبھی لیڈر بننے کی۔ وہ سیدھا اپنی راہ چلتا ہے اور اگر اس کے نقش پا سے کسی کو کسی منزل کا سراغ مل جائے تو یہ اس کی اپنی سوجھ بوجھ کی خوبی ہوگی۔ یہی وجہ ہے اس نے کسی اعتراف کا تقاضہ نہ کیا۔ ریاض احمد نے مسلسل نئی اردو نظم کو سمجھنے کی سعی کی ہو سکتا ہے یہ ممکن ہے کہ ان کی تحریروں سے جدید نظم کی تفہیم بعض لوگوں کے لئے سہل ہو گئی ہو ادب پر اثر انداز ہونا اور آداب کو فائدہ پہنچانا یہ کچھ ایسی اصطلاحیں ہیں جن سے ذہن میں مصلح اور لیڈر کے تصورات پیدا ہوتے ہیں۔ اردو ادب میں اس قسم کی تحریکیں غالباً صرف دو تھیں۔ ایک سرسید کی تحریک اور دوسری ترقی پسند تحریک۔ ریاض احمد نہ تو سرسید کے رفقا میں سے تھا اور نہ ترقی پسندوں کی صف میں ہے۔ بعض لوگوں نے اسے نفسیاتی یا تجزیاتی دبستانِ تنقید کا نمائندہ کہنے کی صلاح دی ہے۔ لیکن مجھے یقین نہیں کہ اس میدان میں بھی اس نے کوئی خاص کارنامہ سر انجام دیا ہو۔ جیلانی کامران کا خیال ہے کہ یوم نظر کی نظم کے متعلق اس کی کتاب کے بعض حصے اس شاعر کے انداز نظر کو سمجھنے اور اس میں تسلسل اور ہم آہنگی کے تصور کو اجاگر کرنے میں ہیں۔ اگر یہ بات درست ہے تو ہو سکتا ہے کہ دوسرے ہم عصر شعرا کے متعلق اس کی تحریروں میں اس قسم کی کچھ روشنی موجود ہو۔ عام تنقید ادب کی رہبری نہیں کرتی۔ تخلیقی ادب اپنی راہیں خود متعین کرتا ہے۔ تنقید ان راہوں کی نشاندہی بعد میں کرتی ہے۔ جو تنقید ادب کی رہبری کا دعویٰ کرتی ہے۔ وہ تخلیق اور آزادیٔ اظہار کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ادب پر تنقید کا اثر بہت دیر بعد جا کر ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ نظریات اس وقت تک تخلیق کا جزو نہیں بنتے جب تک انہیں ایک نسل ہضم کر کے اپنے خون کا جزو نہ بنا چکی ہو۔ ابتدا میں ادب پر اثر انداز ہونے والی تنقید عموماً کم ہی مقبول ہوتی ہے اس لئے اگر ریاض احمد یہ دعویٰ کرے کہ وہ جدید ادب پر اثر انداز ہوا ہے تو میں اسے قبول نہیں کروں گا۔ حالی کے بعد ابھی تک اردو ادب میں ایسا کوئی نقاد پیدا نہیں ہوا۔ جس نے اپنی تنقید سے ادب کی راہ معین کرنے میں مدد دی ہو۔ تاریخ ادب میں بیشتر مثالیں ایسے نقادوں ہی کی ملتی ہیں۔ جو خود بڑے اچھے تخلیقی فن کار تھے۔ اور انہوں نے اپنی تخلیقات اور ساتھ ہی ساتھ

لیکن نئی تنقید [illegible] رچرڈز کی تنقید سے ادب کے متعلق کوتاہ تاثر کیا۔ انگریزی میں کالرج، ورڈز ورتھ وغیرہ اور اردو میں حالی اس کی بہترین دلیل ہیں۔ مجھے تو کوئی نیا نقاد بھی ایسا نظر نہیں آتا جس نے ترقی پسند کی تحریک منظم کی ہو۔ اس لئے میں پھر یہی کہوں گا کہ تخلیقی ادب اپنا راستہ خود مقرر کرتا ہے۔ تنقید کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ادب کی کسی نئی روش کو، کسی پرانے اسلوب کو بہتر طور پر سمجھ لینے میں مدد دے۔ اور بس۔

(۳) گذشتہ ادب کے بارے میں ریاض احمد نے بہت کم لکھا ہے۔

(۴) ہم عصروں پر لکھتے ہوئے ریاض احمد نے کبھی جھجک محسوس نہیں کی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ وہ اپنے ہم عصروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان کے حق میں ہمیشہ کلمۂ خیر ہی کہتا ہے۔ بعض جگہ اگر کوئی سخت گیر انداز اس کے قلم سے نکل گیا ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ترقی پسند حلقے والے البتہ اس سے خفا نظر آتے ہیں اور ان سے بھی بڑھ کر وہ لوگ جو محض گروہ پسندی کا دم نہیں بھرتے لیکن درپردہ وہ اس کے قائل ہیں۔

(۵) تقسیم کے بعد اردو تنقید میں جو ایک قابل قدر رجحان ابھرا ہے وہ اپنی پرانی روایت کو از سر نو جانچنے اور پرکھنے کا رجحان ہے۔ یہ رجحان اگر بروئے کار نہ آتا تو پاکستانی ادب اس عظیم ورثے سے اپنا تعلق استوار نہ کر سکتا جو دلی، لکھنؤ یا دکن کی سرزمین سے وابستہ ہے۔ یہ تحقیق اور اس تحقیق کے حوالے سے پرانے ادب کو نئے سرے سے سمجھنے کی کوششیں یقیناً قابل تحسین ہیں۔

(۶) آزادی کے بعد ہمارے ادب نے زوال پایا ہے یا نہیں، اس کا دارومدار زیادہ تر پڑھنے والے کی اپنی نیت، اپنی لگن یا اپنی عقل اور اکتاہٹ پر ہے۔ یہ البتہ ضرور نظر آتا ہے کہ آزادی کے بعد کے ادیب آزادی کے فوری بیشتر ادیبوں سے کچھ جھجک رکھتے ہیں۔ اور اس لئے یہ چاہتے ہیں کہ ان حدود کو پھلانگ جائیں جہاں تک اس دور کے ادیب پہنچ چکے تھے۔ یہ مسابقت کا جذبہ کچھ ایسا بے معنی یا غیر صحت مند نہیں کہ اس سے ڈر کر یا یہ سمجھ کر کہ ان حدود کو پھلانگنا سہل نہیں ہے۔ نئے ادب کو زوال پذیر کہہ دیا جائے۔ آزادی سے پہلے کے ادب میں جدت کی چمک دمک زیادہ تھی لیکن اس میں ہر جگہ گہرائی نہیں ملتی۔ اب شاید ہم رومانیت کو چھوڑ کر حقیقت پسندی کی طرف آ رہے ہیں اور یہ نسبتاً مشکل مقام ہے۔ یہاں رنگینئ تخیل کا اجالا کام نہیں آتا۔ لیکن یہ خیال رکھئے کہ حقیقت کا روپ سطح پر کم ہی جھلکتا ہے۔ جدید نثری نظم کے متعلق ریاض احمد کا رویہ کچھ واضح نہیں۔ لیکن افسانے اور بالخصوص تنقید میں وہ جدید عہد کو کسی طرح آزادی سے پہلے کے چند سالوں سے کمتر نہیں سمجھتا۔ یہ میں نے اس لئے نہیں کہا کہ آزادی کے بعد وہ خود بھی لکھتا رہا ہے۔ دراصل ان چالیس ادیبوں میں سے اکثر ابھی تک لکھ رہے ہیں۔

(۷) ریاض احمد ادب کو اکثر بحیثیت قاری کی حیثیت سے پڑھتا ہے۔ کیونکہ وہ کوئی پیشہ ور نقاد نہیں۔ جدید تر ادب کو سمجھنے میں اسے دقتیں ضرور محسوس ہوئی ہیں لیکن ان دقتوں کی وجہ وہ اپنا عجز فہم قرار دیتا ہے اور اس ٹوہ میں لگا رہتا ہے کہ کہیں سے اس در کو کھولنے کی کلید ہاتھ لگ جائے تو خوب اچھی طرح اندر جھانک کر دیکھ لے۔

(۸) تنقید لکھتے وقت ریاض احمد کا مخاطب "میں" ہوتا ہوں۔ کیونکہ وہ اکثر یہ چاہتا ہے کہ میں کچھ باتیں سمجھ لوں تاکہ میرے ادب کا مطالعہ سہل اور دلچسپ ہو جائے۔

(۹) ریاض احمد نے ابتدا میں شعر اور ہلکے پھلکے مضامین لکھنے کی کوشش کی تھی لیکن لاہور میں اتفاقاً اسے مختار صدیقی اور یوسف ظفر مل گئے۔ مختار صدیقی اسے ہاتھ پکڑ کر حلقے میں لے گئے اور یوسف ظفر نے مشورہ دیا کہ مضمون لکھا کرو۔ چنانچہ اس نے از راہِ امتثالِ امر مضمون لکھنے شروع کر دیئے۔ نظم، غزل اب بھی کبھی کبھی ہو جاتی ہے انشائیہ مضمون پھر نہیں لکھے گئے۔ لیکن اسے ریاض احمد کوئی محرومی نہیں سمجھتا۔ اس احساس میں مختار صدیقی اور یوسف ظفر کا احترام بھی شامل ہے۔ تنقید کا دھندا کسی مصلحت یا کسی امتیاز کی خاطر اختیار نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس سے بگڑے شاعر کی قسمت کا مداوا مقصود تھا کیونکہ تنقیدی مضامین لکھنے کا کام جس وقت شروع ہوا تھا اس وقت تک ریاض احمد کے سر میں شاعر ہونے کا سودا ابھی راسخ نہیں ہوا تھا۔

١٠١۔ ریاض احمد کی تحریروں میں مغربی ادب کے حوالے زیادہ نہیں آتے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کا مطالعہ بہت محدود ہے۔ دوسرے وہ مغربی ادب کو اچھی طرح سمجھنے کا اہل نہیں ہے۔ مغربی علم تنقید سے اس نے مزید فائدہ اٹھایا ہے لیکن اس تنقید کو اس نے علم معانی و بیان کو گروی رکھ کر حاصل نہیں کیا۔ دراصل ریاض احمد ذہنی طور پر کچھ سست رو واقع ہوا ہے۔ اس کی ذہنی عمر اس کی عمر کی باتوں کے مقابلے میں کم نظر آتی ہے۔ وہ باتوں کو سمجھنے میں کچھ دیر لگا دیتا ہے اور تیزی سے پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اس وجہ سے حلقے میں آنے والوں میں سے وہ بعض کے مطالعہ کی وسعت اور ذہن کی جودت سے بہت متاثر ہوتا رہا ہے مثلاً ڈاکٹر ... میر، صلاح الدین احمد، الطاف گوہر، انتظار حسین، عزیز الحق۔ یہ فہرست نامکمل ہے۔ میں تو اس میں عارف عبدالمتین کو بھی شامل کر لیتا لیکن ڈرتا ہوں کہ لوگ اس سارے قصے کو تعصب کا نتیجہ ہی نہ سمجھ لیں۔ حلقے سے باہر اور اساتذہ کے دائرے میں اسے سید عابد علی عابد، محمد احمد خاں اور ڈاکٹر سید عبداللہ سے اسی باعث ایک گونہ عقیدت رہی ہے اور مولانا صلاح الدین احمد کی وضعداری اور شفقت نے اس سے ہمیشہ بے حد احترام کا تقاضا کیا ہے۔ اس خیال نے اسے اکثر ستایا بھی ہے کہ اسے جو کچھ اور جتنا کچھ طالب علمی ہی کے زمانے میں پڑھ لینا چاہیے تھا۔ آج تک نہیں پڑھ سکا۔ اس مطالعہ کی کمی کا ایک فائدہ اسے یہ پہنچا ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں کی بات بڑے غور اور بڑی دلچسپی سے سنتا ہے۔ یہ باتیں اس کے لئے انکشافات کا درجہ رکھتی ہیں۔ وہ کسی سے خواہ مخواہ الجھتا نہیں۔ اگرچہ بعض معاملات میں وہ شروع سے ہی موقف پر قائم رہا ہے۔ جب بھی اگر کوئی بات اس کے موقف کے حق میں نہ جاتی ہو تو وہ فوراً اختلاف نہیں کرتا۔ بلکہ یہ سوچتا رہتا ہے کہ شاید اس نئی بات ہی سے کوئی الجھا ہوا مسئلہ حل ہو جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ جب اس نے غزل برائے غزل (خیال ابھی ہیں) ایک عجیب سا مضمون لکھا تھا تو مظفر علی سید نے یہ کہا تھا کہ اس مضمون سے ریاض احمد نے اپنے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا ہے۔ چنانچہ یہ بات سن کر وہ کئی دن تک سوچتا رہا۔ لیکن سید نے جو کچھ کہنا چاہا تھا وہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا اور نہ آیا۔ اس نے بعض لوگوں کے تنقیدی مضامین کے عنوانات کو بڑے رشک سے دیکھا ہے اسے یہ حسرت ہی رہی کہ اسے بھی کسی مضمون کے لئے کوئی بھڑکتا ہوا عنوان مل جائے۔ اس کا انداز نگارش بھی اس کے لئے بانکپن سے محروم ہے۔ جو بعض نقادوں کی تنقید کا بہت بڑا امتیاز ہے۔ اور جسے انہوں نے مغرب کے بعض خاص دبستانوں کی تنقید میں اختیار کیا ہے۔

تخلیقی لکھنے والوں سے سوال

۱۔ آپ جس صنف میں لکھتے ہیں، اس سے آپ کے تجربے کی نوعیت کا کیا تعلق ہے۔ یہ کیوں ہے کہ آپ کا تجربہ مخصوص طور پر اسی صنف میں اظہار پاتا ہے۔

۲۔ اساتذہ کے رنگ میں جو غزلیں آپ نے لکھی ہیں یا مغربی افسانے کی طرز میں جو افسانے یا ناول آپ نے لکھے ہیں، اس کا آپ کے اپنے تجربے سے کیا تعلق ہے۔

۳۔ جو زبان آپ استعمال کرتے ہیں کیا اس کا آپ کے تجربے سے کوئی مخصوص رشتہ ہے۔

۴۔ اپنے پرانے ادب کا مطالعہ آپ کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں یا کیوں نہیں کرتے۔

۵۔ باہر کے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں۔

۶۔ کیا آپ تنقید پڑھتے ہیں، کس قسم کی تنقید پڑھتے ہیں اور کیوں۔

۷۔ کیا کبھی لکھنے سے خوف آیا ہے اگر ایسا ہوا ہے تو کیا کبھی آپ نے اس احساس کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

۸۔ آخر آپ لکھتے کیوں ہیں۔

۹۔ کبھی قاری سے کسی طرح کے تعلق کا احساس ہوا۔ کیا قاری کی خاطر کبھی تحریر میں تبدیلیاں کی ہیں۔

۱۰۔ آپ کسی ادبی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے آپ کے ادبی تجربے کا کیا تعلق ہے۔

میں جواب دیتا ہوں

مختار صدیقی

یہ سوال نامہ میری کم فہمی اور اس سے زیادہ کم علمی کے لئے بہت زیادہ مشکل ہے اور بعض صورتوں میں تو آج کل کے طلباء کی طرح میں یہ بھی عرض کروں گا کہ میرے لئے اس کے کئی سوال "خارج از نصاب" ہیں۔

اس کے ساتھ ہی یہ عرض کرنا بھی مناسب ہوگا کہ مجھے طبعی طور پر اس قسم کے ذاتی سوالات اور ان کے جوابات سے مناسبت نہیں ان کے جوابات کے دوران "میں" اور "میرے نزدیک" اور "میری رائے" کا جو واسطۂ سخن لامحالا طور پر در آتا ہے میری افتادِ طبع کو وہ چنداں گوارا نہیں۔ علاوہ ازیں ان جوابات میں کچھ نہ کچھ اعترافات اور انکشافات بھی ہوا کرتے ہیں۔ اور یہ دونوں چیزیں اگر بحضورِ حق، بخشش کا وسیلہ ہیں تو انسانی سطح پر یہ کہنے والے اور سننے والے، دونوں کو پریشان اور پشیمان ضرور کرتے ہیں۔

۱۔ بنیادی طور پر آرٹ کے لئے اور آرٹسٹ کے لئے تجربے کی نوعیت شاعرانہ مختلف فیہ نہیں ہوتی۔ البتہ تجربے کے بعض پہلوؤں کو مختلف فنون کے لئے مختلف طور پر تقدم یا امتیاز حاصل ہو سکتا ہے۔ میں شعر کہتا ہوں تو شعر میرے تجربے (مشاہدہ، علم، احساس) کا ایک ظاہری وسیلہ ہے۔ مجھ پر صبح کی جہاں فروزی، مخلوق کا دکھ درد، حوادث کا اندوہ یا حسن کا تاثر۔ تجربے سے اعتبار سے ایک ساجیاتی رد عمل کرے گا۔ جس طرح کسی مصور اور آپ جیسے قدرت میں افسانہ نگار کے لئے ہے۔ مگر اس تجربے کے جو پہلو میرے ذہن کی مخصوص نہج اور میرے وسیلۂ اظہار (شعر) کے مخصوص تقاضوں کے مطابق اولیٰ اور اہم ہوں گے۔ وہ مصور اور افسانہ نگار کے ہوں گے۔

(ب) میرا تجربہ شعر (نظم و غزل) ہی میں کیوں اظہار پاتا ہے؟ (یعنی شعر شعار کیوں کر ہوا) یہ سوال اگر سوانحاتی ہے کہ میں نے شعر گوئی ہی کیوں شروع کی تھی تو اس کا جواب نہ جب کوئی تھا نہ اب ہے۔ اتنی یہ جواب کہ کوئی تشفی بخش صورت پیدا نہ کر سکے گا کہ شعر گوئی میرے ذوق و وجدان کے مطابق تھی اور ہے۔ اس لئے مجبوراً نوا ہی نہیں بلکہ اب اس رسمِ نوا کا پابند بھی ہوں۔

۳۔ میں نے پاکستان کے ابتدائی برسوں میں میرؔ کی ایک محبوب بحر میں چند غزلیں کہی تھیں۔ اور ان غزلوں کے سامنے نصب العین اور معیارِ حسن، میرؔ کا یہ قول تھا کہ

سعی و تلاش بہت سی رہے گی اس انداز کے کہنے کی

ان غزلوں میں میرؔ کے انداز میں کہی تھیں اس کا رنگِ سخن ہی نہیں اس کا زاویۂ نگاہ اور تجربات کو مخصوص اندازِ نظر سے دیکھنے کی خصوصیت تھی۔ ان دنوں ملک کے حالات میرؔ کے زمانے کے سے آشوبِ جہاں سوز سے دوچار تھے۔ اور میں بھی اس آشوب کا شکار تھا۔ میرؔ کو اپنے زمانے میں جو سماجی حیثیت بطورِ شاعر، سفارتی نمائندے اور وجاہتِ علمی کی بنا پر حاصل تھی وہ مجھے اس وقت تو کیا کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور میرؔ کے ذہن اور اس کے وجدانِ شعری کا اپنے آپ سے تقابل تو حد درجے کی گستاخی ہے۔ پھر بھی میں نے وہ غزلیں لکھیں اور وہ میری کتاب "منزلِ شب" میں شامل ہیں اور اپنے خیال کے مطابق میں نے ایک بہت ہی محدود پیمانے پر اپنے تجربے کو سماجی اور وجدانی اعتبار سے اس قسم کی غزلوں میں ظاہر کیا ہے۔

۳۔ میں اردو میں لکھتا ہوں۔ یہ میری زبان ہے۔ میرے تجربات اس کے بغیر اظہار نہیں پا سکتے۔

۴۔ میں نے اپنے "پرانے" ادب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ اور گزشتہ ۲۰ برس سے تو بیشتر ادبی ورثہ کئی بار پڑھا ہے۔ کیونکہ یہ میرے ادبی تجربے کی وہ روایت ہے جس کے بغیر نہ میں اپنے تجربے کی ادبی روایت بنا سکتا ہوں اور نہ اس سے بغاوت کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ یہ میری اس ثقافت کا تار و پود ہے جس کے بغیر میرا اردو میں لکھنا خارج از بحث قرار پائے گا۔

۵۔ غیر ملکی زبانوں میں سے مجھے انگریزی، عربی اور فارسی سے واقفیت ہے۔ میری تعلیم کا ذریعہ (او لیول و آخر میں) انگریزی ہی تھا۔ عربی مجھے درسی طور پر نصابِ قدیم کے مطابق پڑھائی گئی۔ اور اس کے ساتھ کچھ فارسی بھی۔ انگریزی اس لئے ایک سوالی عادت کی بدولت میری سب سے اہم معاملاتی زبان رہی ہے۔ میں نے روسی، فرانسیسی اور دیگر یورپین زبانوں کے ادب و تنقید و شعر سے جو واقفیت حاصل کی ہے وہ انگریزی تراجم کی بدولت ہے۔ خالص انگلستانی اور امریکن ادب میں، قدیم فکشن شاعری اور تنقید تو ضرورتاً پڑھتا رہا۔ اور شوق کے طور پر جدید انگریزی اور امریکن فکشن کا کافی مطالعہ کیا تھا۔ تنقید اور جدید شاعری اس کے علاوہ ہے۔ جس سے حتی المقدور استفادہ کرنا میں اپنی وسعتِ نظر اور فکر انگیزی کے علاوہ شعر گوئی کی تہذیب کے لئے ضروری سمجھتا رہا ہوں۔ جدید عربی ادب یہاں میسر ہی کیاب ہے۔ اور اس کو مصر، حجاز یا بیروت سے حاصل کرنا لاتعلق عراق سے تریاق حاصل کرنے کے مترادف ہے لیکن لائبریریوں اور بعض کرم فرماؤں کی بدولت جدید مصری ادب و تاریخ کی چند کتابیں

فکشن، مذہبیات، خصوصاً فقہ اور تاریخ و رجال) ملتی رہیں۔ ان کو دیکھتا رہا۔

۶ ۔ اردو، انگریزی اور عربی تنقید کا جو قدیم و جدید مضمون، کتاب، مقالہ [illegible] ملتا رہا ہے اسے پڑھتا رہا ہوں۔ نثر میں میرا ذریعۂ اظہار ریڈیو ڈرامے کے علاوہ تنقید بھی ہے اور اس لئے میں نے تنقید کی غایت، تنقید کے منصب، تنقید کے مراحل اور تنقید کے آلہ اور وسیلہ کے سلسلے میں معلومات بہم رکھنے کی کوشش کی ہے۔

[کس قسم کی تنقید پڑھتا ہوں اور کیوں ۔۔ یہ میرے لئے اپنے اشغال کی وجہ سے خارج از نصاب سمجھا جاتے ۔]

۷ اور ۸ ۔ پہلا سوال میرے لئے کبھی اسے خونناک صورت میں صرف آپ نے روبراہ کیا ہے۔ ورنہ ایسی صورت کبھی پیش نہیں آئی۔

۸ ۔ قرۃ العین نے لکھا تھا

سچ شو وکہ آتشِ حیرتے بزنی بہ قلعۂ طورِ دل!

اور کیا کہا جائے۔

۹ ۔ جی ہاں۔ قاری کوئی غیر محدود معاشرتی تصور نہیں۔ قاری "استادانِ فن" اور آپ جیسے سخت دل ممتحن بڑے کھرے دوست اور مخلص قدر دان بھی تو ہیں۔ ان کے مشوروں سے کچھ نہ سیکھنا تو بڑا ظلم ہوگا۔

۱۰ ۔ میں حلقۂ اربابِ ذوق سے منسلک رہا ہوں۔ اور اس کے علاوہ رائٹرز گلڈ کا ایک بنیادی ممبر ہوں۔ سوال کے دوسرے حصے کا جواب مجھے نہیں آتا۔

خدیجہ مستور

آپ کا یہ سوال ظاہر کرتا ہے کہ آپ تجربے سے فن کے تعلق کی تلاش میں ہیں۔ ایک ادیب کی حیثیت سے آپ کو بھی یقیناً اندازہ ہوگا کہ ذاتی تجربے مشاہدے اور مشق کے بغیر فن پنپ نہیں سکتا۔ تجربہ اور مشاہدہ ہی کسی تحریر کو فن پارے کا درجہ دلاتا ہے۔ بشرطیکہ اندازِ تحریر میں حسن اور جان ہو۔ تجربے سے صرف ذاتی تجربات مراد نہیں۔ اس میں دوسروں کے تجربات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اور ان میں غور و فکر اور زاویۂ نظر کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اسی طرح مشاہدے سے میری مراد محض مناظرِ فطرت یا لوگوں کی صورتیں ہی نہیں۔ بلکہ ان کے ذہنوں کا مطالعہ بھی ہے اور جب میں تجربے اور مشاہدے کے الفاظ استعمال کرتی ہوں تو ان کے معنے وسیع ہوتے ہیں۔

آپ کے اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کہ میں ایک خاص صنف کی پابند کیوں ہوں یعنی میں شعر کیوں نہیں کہتی۔ میں صرف افسانے اور ناول کیوں لکھتی ہوں۔ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ قدرت نے بخل سے کام لیا ہے اور مجھے موزوں طبیعت نہیں بخشی۔ نظم مجھے بے حد پسند ہے۔ مگر میرا ذاتی خیال یہ ہے اور ممکن ہے کہ یہ اعتراف عجز ہو) کہ افسانے اور ناول میں وہ کچھ کہا جا سکتا ہے جو نظم میں نہیں۔ نثر میرے مزاج اور قلم کو زیادہ راس آتی ہے۔

اگر دوسرے سوال کا مطلب یہ ہے کہ میں نے مغربی افسانے سے کوئی طرز اڑائی ہے یا اس کا اسلوب یا انداز اپنایا ہے تو اس کے لئے عرض ہے کہ غیر شعوری اثر سے انکار نہیں مگر شعوری طور پر میں نے مغربی افسانے یا ناول سے کوئی اثر نہیں لیا۔ میں نے خاصی چھوٹی عمر میں لکھنا شروع کیا اور اس وقت غیر ملکی ادب کا کیا ذکر ملکی ادیبوں کی تحریریں بھی بہت کم پڑھی تھیں۔ ویسے یہ بحث مجھے عموماً عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ اردو افسانہ مغربی افسانے سے متاثر ہے اور اسی کے رنگ میں رنگا ہے۔ اگر اسلوب اور تکنیک ہی اس خیال کی بنیاد ہے تو میں پوچھوں گی کہ دنیا بھر کی لوک کہانیوں میں اندازِ

بیان، تکنیک، موضوع بلکہ استعارے اور اشارے تک ایک جیسے ہیں! کس ملک کی لوک کہانیوں نے سب کو یہ راہ دکھائی ہے اور کس کے تتبع میں تمام ملکوں نے ایک سی کہانیاں کہیں!

آپ کا یہ سوال اچھی خاصی پہیلی ہے جسے بوجھنا مشکل معلوم ہو رہا ہے بہر حال جو زبان میں استعمال کرتی ہوں وہ میری زبان ہے اگر میرا کوئی کردار تو ۔ سے مختلف زبان میں بات کرتا ہے یا محاورے استعمال کرتا ہے جو عام طور پر مستعمل نہیں ہیں تو وہ اس کی زبان ہے اور اس نے اسی کی زبان سے سنی ہے۔ اس حد تک تجربے کا میرے انداز بیان میں دخل ضرور ہے۔ لیکن اس میں بھی میں اتنی محتاط ضرور رہتی ہوں کہ تصنع سے دامن بچاؤں۔

اپنے پرانے ادب کا مطالعہ میں بے حد ذوق و شوق سے کرتی ہوں اور اس سے بہت کچھ سیکھتی ہوں اپنے پرانے ادب پر فخر کرتی ہوں۔ اور اپنے ہم وطن ادیبوں کی طرح اپنے آپ کو ان کا وارث سمجھتی ہوں۔ اپنے ورثے سے کون انکار کر سکتا ہے میں ذرا جذباتی انداز سے کہوں گی کہ اگر میں نے اپنے ادب کا مطالعہ نہ کیا ہوتا تو میں اپنے آپ کو یتیم خانے میں پلا ہوا محسوس کرتی۔ اپنے باپ دادا کی شفقت سے محروم۔

میں غیر ملکی ادب کا مطالعہ کرتی ہوں اور میرے خیال میں ہر شخص کو اور خاص طور پر ادیب کو غیر ملکی ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے اس لئے کہ ہم غیر ملکی ادب سے صرف اس کے معیار ہی کا نہیں بلکہ اس کی معاشرت کا اور انسانوں کے مختلف گروہوں کا جائزہ لیتے ہیں اور انسانی سرشت کے انوکھے پہلو معلوم کرتے ہیں۔ غیر ملکی ادب سے بھی ہم اسی طرح لطف اندوز ہوتے ہیں جس طرح غیر ملکی تصویر سے۔ غیر ملکی فلم سے اور خود غیر ممالک سے۔

میں تنقید ضرور پڑھتی ہوں۔ اس لئے کہ وہ بھی ہمارے ادب کا ایک نہایت اہم حصہ ہے اگرچہ میں اپنے ہاں کے اکثر نقادوں سے مطمئن نہیں ہوں اور نہ ان کے معیار تنقید سے مجھے ان سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ بعض اوقات تنقید کی پہلی شرط کو فراموش کر دیتے ہیں میرا مطلب ہے کہ گہرا اور مکمل مطالعہ میں اس تنقید کو شوق سے پڑھتی ہوں جو ہمارے فن سے زیادہ قریب ہو۔ مگر تنقید صرف ادب ہی تک محدود نہیں معاشرت، سیاست، اقتصادیات، مصوری اور رقص اور دوسرے فنون لطیفہ پہ تنقید اگر دلچسپ ہو اور انداز تنقید بھی سہل ہو تو ضرور پڑھتی ہوں۔

لکھنے سے خوف تو کبھی نہیں آیا۔ اور نہ خوف زدہ ہونے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔

قاری سے تعلق کا سب سے بڑا اظہار تو یہی ہے کہ ادیب جو کچھ لکھتا ہے تو اپنے لئے نہیں قاری کے لئے۔ رہیں تبدیلیاں تو لکھتے وقت مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا ہے۔ کہ انداز تحریر اور زبان کو اتنا آسان رکھا جائے کہ ہر قسم کا قاری پڑھ اور سمجھ سکے۔

فی الحال تو پاکستان رائٹرز گلڈ کی ایک عام ممبر ہوں۔ اس ممبری سے میرے ادبی تجربے کا کیا تعلق ہے! ضروری نہیں کہ اس سوال کا جواب بھی دوں۔

سلیم احمد

۸ ۔ بھئی کیا کریں خارش ہوتی ہے۔ خارش اور خواہش کا ایک حال ہے۔ چین نہیں لینے دیتی خارش کیوں ہوتی ہے۔ یہ حکیم حضرات جانیں خواہش کا بھی یہ حال ہے کہ بس ہوتی ہے تو ہوتی ہے۔ نہیں ہوتی تو نہیں ہوتی۔ جانے حضرت آدم کو کیا خارش اٹھی کہ اچھی خاصی جنت کو چھوڑ کر اس دنیا میں آ گئے۔ لکھنے کی خواہش بھی کچھ ایسی ہی چیز ہے۔ میں جانتا ہوں مجھ میں لکھنے کی خواہش موجود ہے کیوں موجود ہے میں نہیں جانتا جاننے کی پروا بھی نہیں کرتا کھجلی اٹھ رہی ہے تو کھجا لوں گا۔ کھجلی کیوں اٹھ رہی ہے یہ کوئی صاحب بتائیں گے تو ممنون ہوں گا ممکن ہے کہ قصیدہ کی صورت میں ان کی فیس بھی ادا کر دوں۔ پتہ نہیں جامد مادے کو زندگی کی کھجلی کیوں اٹھی۔ یہ کیوں کا سوال ہی نامعقول ہے۔ سوائے اس صورت کے جب علاج درکار ہو۔ کل آپ مجھ سے پوچھیں گے۔ تم محبت کی خواہش کیوں رکھتے ہو۔

شاید آپ یہ بھی پوچھ بیٹھیں کہ زندگی کی خواہش کیوں رکھتے ہو۔ مجھے زندگی کی، محبت کی، لکھنے کی خارشیں عزیز ہیں۔ میں ان کا علاج نہیں چاہتا۔ پھر کیوں کا سوال بیدل ہے! میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھ میں جینے کی، محبت کرنے کی اور لکھنے کی خواہش موجود ہے جب تک مجھ میں یہ خواہش موجود ہے میں لکھوں گا محبت کروں گا اور جیوں گا۔ جب یہ خواہش ختم ہو جائے گی، میرا قصہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد تم چاہو تو ادب لطیف کا "سلیم نمبر" نکال دینا۔

خارش جھوٹی بھی ہوتی ہے اور سچی بھی۔ بعض لوگ خود کھجاتے ہیں بعض دوسروں کو کھجاتے دیکھ کر کھجانے لگتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ شاید اس میں مزا آتا ہوگا یا شاید اس کے ذریعے کوئی اور چیز مل جائے گی۔ جب مزا نہیں آتا یا کوئی اور چیز نہیں ملتی تو جھنجلاتے ہیں کہ میں کیوں کھجا رہا تھا۔ یہ کیا واہیات کام ہے؟ میں خود ان سب منزلوں سے گزرا ہوں اور جھوٹی سچی ہر طرح کی خارش مجھے ہوئی ہے۔ لکھنے کی خواہش کیوں ہے۔ یہ کوئی معقول سوال نہیں ہے۔ اس کے بجائے میں خود سے ہمیشہ یہ سوال پوچھتا ہوں کہ خواہش سچی ہے یا جھوٹی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی لکھ رہا ہوں۔ جواب ہمیشہ مختلف ملتے ہیں لیکن میں نے ایک کسوٹی بنائی ہے۔ جب دیکھتا ہوں کہ مزے کے بغیر بھی کھجاتا رہتا ہوں تو خود کو اطمینان دلاتا ہوں کہ شاید سچی خارش ہے — مگر کون جانے ہے۔ لکھنے سے خوف آیا ہے کئی برس پہلے اس زمانے میں میں نے بالکل نہیں لکھا۔ لیکن ساتھ ہی لکھنے کو زندگی کا بدل بھی سمجھتا رہا۔ میں سمجھتا تھا کہ لکھنا ہر چیز کا بدل ہے۔ زندگی کی ہر خوشی مجھے لکھنے سے مل جائے گی۔ میں دیکھتا تھا کہ لوگ زندگی کی مختلف چیزوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ ان کے لئے خدا جانے کیوں میرے اندر کوئی تڑپ نہیں پیدا ہوتی تھی۔ اور ساتھ ہی یہ غرور کہ میں نہیں بھاگتا۔ کیونکہ میں لکھتا ہوں یا خود کو لکھنے والا سمجھتا ہوں۔ لیکن رفتہ رفتہ میرے اندر یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز کسی چیز کا بدل نہیں ہے۔ عورت کی لذت ایک چیز ہے۔ یہ لذت مجھے لکھنے سے نہیں مل سکتی۔ لوگوں پر حکم چلانے یا ان کی عزت کا مستحق بننے یا ان کی تعریف حاصل کرنے کی لذت ایک چیز ہے۔ یہ لذت مجھے لکھنے سے کسی حد تک مل سکتی ہے۔ صرف کسی حد تک بشرطیکہ میں ویسا لکھوں جیسا لکھنا قابل تعریف سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ وہ بھی نہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے اندر وہ احساس پیدا ہوا جسے تم لکھنے کا خوف کہتے ہو۔ میں نے لکھنے کو جن چیزوں کا بدل سمجھا ہے۔ لکھنا ان کا بدل نہیں ہے میں لکھنے کے خبط میں ان چیزوں کو کھو رہا ہوں۔ اور یہ چیزیں قیمتی ہیں۔ زندگی کا مظہر ہیں، خود زندگی ہیں۔ لکھنا مجھے زندگی سے محروم کر رہا ہے۔ اس اندرونی خوف نے میری لکھنے کی صلاحیت بالکل سلب کر لی۔

لیکن مسئلہ کا سب سے عبرتناک پہلو یہ نہیں ہے۔ سب سے عبرتناک بات یہ ہے کہ میں اس کیفیت میں "معلق" ہو گیا تھا۔ میرے دل میں ایک طرف لکھنے کا خوف بیٹھ گیا تھا۔ اور دوسری طرف میں اپنے اس خیال کو بدلنا نہیں چاہتا تھا کہ لکھنا زندگی کا بدل ہے۔ پتہ نہیں یہ کیفیت مجھ پہ کتنے دنوں طاری رہی۔ لیکن میں اس پر سوچتا ضرور رہا۔ زندگی اگر مجھ سے ان لذتوں کے حصول کا تقاضہ کرتی ہے تو میں خود کو ان سے محروم کیوں رکھنا چاہتا ہوں۔ کیوں؟ کیونکہ میں لکھنا چاہتا ہوں۔ ہر بار یہی جواب میرے ذہن میں آتا تھا۔ شاید یہ کوئی بنا بنایا جواب تھا جو میں نے کہیں باہر سے اپنے اندر ڈال لیا تھا۔ میں اس جواب سے نفرت کرتا تھا۔ یہ میرا جواب نہیں تھا۔ یہ میرے اپنے وجود کی اولاد نہیں تھا۔ یہ میرے لئے حرام کی اولاد تھا۔

رفتہ رفتہ میں نے خود سے یہ کہنا سیکھا کہ میں لکھنا نہیں چاہتا۔ پہلے غصے سے، پھر طنز سے، پھر مایوسی سے، جواب طویل ہوتا جا رہا ہے۔ ورنہ میں تمہیں بہت کچھ لکھتا۔ خیر مختصراً یوں سمجھو کہ میں نے اپنے اندر اس خیال سے سمجھوتہ کر لیا کہ میں لکھنا نہیں چاہتا۔

بس جھگڑا ختم ہو گیا۔

اس فیصلے نے مجھے بڑا سکون دیا۔ تھوڑے دنوں میں ہی جذبے کے بغیر اس سوال پہ غور کرنے کے قابل ہو گیا کہ میں نے لکھنے کو زندگی کا بدل کیوں سمجھ لیا تھا۔ شاید بچپن سے میرے اندر یہ خوف موجود تھا کہ میں "زندگی" یا "زندگی کی خوشی" نہیں حاصل کر سکتا۔ مثلاً کوئی عورت مجھ سے محبت نہیں کر سکتی۔ مجھے کوئی اچھی ملازمت نہیں مل سکتی۔ دولت اور اقتدار کی دنیا سے میں کوئی حصہ نہیں حاصل کر سکتا وغیرہ وغیرہ اس اثنا میں میں نے اپنے اندر ایک صلاحیت ڈھونڈ کر نکال لی۔

لکھنے کی صلاحیت انسان کے نفسِ باطن کو خدا کے سوا اور کون جان سکتا ہے۔ اور انسان اپنی زندگی کے اہم ترین اور عمیق ترین نتیجے سوچ سمجھ کر نہیں کرتا۔ لیکن شاید ایسا ہوا کہ اس صلاحیت کی دریافت نے میرے اندر یہ اطمینان پیدا کیا کہ میں اس کی مدد سے "زندگی" حاصل کر سکتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی "زندگی" کی بھی ایک حد بندی قائم ہو گئی یعنی وہ زندگی جو اس صلاحیت کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس کے آگے اکثر "ایک سرہ موئے بیش نیم" والا معاملہ ہے۔

زندگی جو لکھنے کی صلاحیت کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے کتنی ہے . . . تعداد میں بھی اور کیفیت میں بھی!

(۱) مداحوں کی واہ واہ

(۲) رسالوں کے ایڈیٹروں کی تعریف، حوصلہ افزائی اور خطوط

(۳) گرلز کالج کے مشاعروں میں لڑکیوں کو دستخط دینا . . . . مسکراہٹوں کا تبادلہ ہی نہیں بلکہ دو چار آگے کی منزلیں بھی جہاں آپ کہہ سکیں کہ "پھنس گئی"۔

(۴) ریڈیو، رسالوں اور اخباروں میں لکھنے کا معاوضہ

(۵) کتابوں کی رائلٹی

میرا خیال ہے کہ ہمارے زمانہ میں کوئی شخص جو صرف لکھنے کی صلاحیت کے ذریعہ "زندگی" حاصل کرنا چاہتا ہے۔ شدید احساسِ کمتری سے نہیں بچ سکتا۔

میں بھی اس احساسِ کمتری کا شکار تھا۔

لکھنا میرے لئے "زندگی" کا بدل اس لئے تھا کہ میں بس اسی کی مدد سے "زندگی" حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن یہ زندگی مقدار اور کیفیت کے اعتبار سے بہت معمولی تھی۔ اور میں اپنے نفس میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ زندگی میرے لئے کافی نہیں ہے اس لئے دراصل میں "لکھنے سے خوف" نہیں کھاتا تھا بلکہ اپنی اس محدود صلاحیت سے جو مجھے پوری زندگی حاصل نہیں کرنے دیتی۔

لیکن میں اس بات پر کیوں مصر تھا کہ میں لکھنا چاہتا ہوں یا لکھنے والا ہوں؟

کیونکہ میں اپنے باطن میں اس حقیقت سے واقف تھا کہ اس صلاحیت کے سوا مجھ میں کوئی اور صلاحیت موجود نہیں ہے۔ یہی راز ہے اس معمہ کا جسے میں نے "معلق ہو جانے کی کیفیت" کہا ہے۔ ایک طرف میں یہ جانتا تھا کہ مجھے پوری زندگی نہیں مل رہی ہے۔ دوسری طرف میں یہ نہیں ماننا چاہتا تھا کہ مجھ میں پوری زندگی حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ لیکن اسے مانے بغیر میرا خوف ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ خوف کو ختم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ میں اسے جانوں اور مانوں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے خوف پر پورا قابو پا لیا ہے۔ یا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے آزاد ہو گیا ہوں۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ پہلے کی نسبت اب افاقہ ہے۔

۳۔ لکھنے کے کام میں قاری اور ادیب کا رشتہ بالکل ویسا ہے جیسے عورت اور مرد کا رشتہ۔ اس میں دونوں کو برابر کا حصہ لینا پڑتا ہے۔ کسی ایک فریق کو اگر دوسرے فریق کا احساس نہ ہو تو یہ استلذاذ بالنفس ہے۔ فریقین کی برابر کی شرکت اس وقت ممکن ہے جب دونوں میں برابر کی خواہش موجود ہو۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو فاعل کا فرض ہے کہ وہ مفعول کی خواہش بیدار کرے ـــــ یہی فن ہے۔

لکھنے کے کام میں ادیب کی حیثیت فاعل کی اور قاری کی مفعول کی ہوتی ہے۔ قاری اگر کسی ادیب کی تحریروں سے دلچسپی نہیں لے رہا ہے تو اسے اپنے طریقِ کار کا جائزہ لینا چاہیے۔ اور قاری کی ضرورت کے مطابق مناسب تبدیلیاں عمل میں لانی چاہییں۔ میرے اندر قاری کا احساس ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔ اور

میں یہ بھی نہیں بھولتا کہ کوئی شاستری کا فن ہر دور کے نوزائیدہ لوگوں کو سمانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

۱۰۔ میں کسی ادبی یا غیر ادبی جماعت سے تعلق نہیں رکھتا سوائے "اہل سنت والجماعت" کے۔ اس سے میرے ادبی تجربے کا کیا تعلق ہے اس بات کو زندگی بھر سمجھنے اور سمجھانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

۴۔ پرانے ادب کا مطالعہ کرتا ہوں تاکہ معلوم کروں کہ پرانے لوگ کیسے تھے ان کا مجھ سے کیا تعلق ہے۔ میں ان سے کتنا مختلف ہوں۔ اور کتنا مشابہ نیز یہ بھی دیکھتا ہوں کہ وہ زندگی یا زندگی کے ان پہلوؤں پر کس طرح غور کرتے ہیں جن پر میں غور کرتا ہوں۔ یا غور کرنا چاہتا ہوں اور مجھے ان سے کیا اختلاف ہے اور کیا اتفاق اور یہ کہ وہ اپنے حاصل کردہ نتائج کو کس طرح ظاہر کرتے ہیں اور ظاہر کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔

۵۔ سوال ۱۳ کا جواب ایک بار پھر پڑھ لیجئے۔

۶۔ تنقید پڑھتا ہوں۔ صرف ایک قسم کی تنقید پڑھتا ہوں جسے بعض لوگ "عسکری تنقید" کہتے ہیں۔ اس لئے پڑھتا ہوں کہ اس میں کچھ معقول باتیں پاتا ہوں۔

۳۔ ظاہر ہے

۱۔ معلوم نہیں۔

۲۔ وہی تعلق ہے جو جیب کاٹنے کے نقطۂ نظر سے ہوتا ہے۔ یعنی ہاتھ پھیرنے کے کام آتے ہیں۔ بعض اوقات ہاتھ پھیرتے پھیرتے ہاتھ کی صفائی بھی دکھا دیتا ہوں۔ یعنی دوسروں کا مال اپنی جیب میں۔

موسیقی پر ایک گفتگو

منیر خاتون بیگم ۔ منیر احمد شیخ ۔ انتظار حسین

الہ آباد کی دو چیزیں بہت مشہور رہی ہیں، الہ آبادی امرود اور اکبر الہ آبادی ۔ اب اس میں منیر خاتون کا اضافہ اور کر لیجئے ۔ منیر خاتون شادی شدہ خاتون ہیں ۔

" کہاں شادی ہوئی ہے ؟"

" طلبنوے سے "

طلبنوے سے بچپن ہی میں شادی ہو گئی تھی ۔ اس شادی سے وہ بہت خوش ہیں ۔ اس گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں جہاں مرغوں اور بکروں سے بھی پردہ کیا جاتا تھا ۔ سو الہ آباد میں اب بھی سخت پردہ کرتی ہیں ۔ الہ آباد سے باہر آتی ہیں تو روایت کے پردے سے بھی باہر نکل آتی ہیں انہیں گاتے دیکھیے تو احساس ہوتا ہے کہ روایت بدستور دامنگیر ہے ۔ گانے والیوں کے عام طور طریقے سرے سے برتتی ہی نہیں ۔

" آپ نے مجھے گاتے میں کبھی مسکراتے دیکھا ہے ؟"

" نہیں "

" نہ مسکرانے کی ایک وجہ ہے ۔ جھجک اور شرم خاندان سے ورثے میں ملی ہے ۔ گاتے وقت بھی وہ پیچھا نہیں چھوڑتی ہے "۔

اصل میں ہم نے گفتگو کی داغ بیل اس طرح ڈالی تھی کہ گفتگو اس منزل پر آ گئی ۔ گفتگو کچھ یوں شروع ہوئی تھی ۔

منیر احمد شیخ : یہ بتائیے کہ آپ گاتی کیوں ہیں ؟ ویسے آپ اس سوال کا برا نہ مانیں ۔ ہم لوگ آئے دن شاعروں اور افسانہ نگاروں سے سوال کرتے رہتے ہیں کہ صاحب آپ لکھتے کیوں ہیں ؟ یہی سوال آپ سے کرنے کو جی چاہتا ہے ۔ یعنی یہ کہ آپ آخر کیوں گاتی ہیں اور اگر آپ نہ گائیں تو کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا ؟ آخر گانا آپ کے کس جذبے کا اظہار ہے ؟

منیر خاتون : ہم اس لیے گاتے ہیں کہ ہمارا گانے کو جی چاہتا ہے ۔ اس میں لذت ملتی ہے ۔ سکون اور شانتی ملتی ہے ۔ اصل میں ہم نے گانا پیشہ کے طور پر تو سیکھا نہیں تھا، اپنی دلچسپی کے لیے سیکھا تھا ۔ اس وقت تو میرے گمان میں یہ بات نہیں تھی کہ مجھے کانفرنسوں میں شرکت کرنی پڑے گی اور ریڈیو پر جانا پڑے گا، مگر کیا کریں ۔ ہمارے ابا کی زمینداری ختم ہو گئی ۔ سو مجبوراً پبلک کے سامنے آنا پڑا ۔

منیر شیخ : مگر پبلک کے سامنے آنے کے بعد تو صورت حال مختلف ہو گئی ہے ۔ اپنے مزے کے لیے گھر بیٹھے گاتے جائیے تو وہ تو اپنے من کی موج ہوتی ۔ مگر جب فن کار پبلک کے سامنے آتا ہے تو ایک نیا رشتہ جنم لیتا ہے ۔ میں نے شاعروں اور افسانہ نگاروں کو دیکھا ہے کہ اپنے

قارئین سے سخت بیزار رہتے ہیں اور کبھی کبھی انھیں لکھنے کا سارا مشغلہ فضول نظر آتا ہے۔ کیا آپ پر بھی مایوسی کا ایسا دورہ کبھی پڑا ہے؟ اور کیا آپ کو پبلک سے بدمذاقی کی شکایت ہوئی ہے۔

منیر خاتون: ٹھیک کہا آپ نے۔ میں نے ابھی کہا نا کہ ہم نے اپنے شوق کے لیے گانا سیکھا تھا۔ لیکن اب پبلک سے سابقہ ہے لہٰذا اب میں کوشش کرتی ہوں کہ صرف مجھے ہی لذت نہ ملے پبلک بھی خوش ہو۔ بڑا جی چاہتا ہے کہ جب میں گاؤں تو لوگ داد دیں۔ اگر داد نہ ملے تو طبیعت کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ میں گاتی چلی جاؤں اور سامعین پر کوئی ردِعمل ہی نہ ہو تو سخت محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ افسوس ہوتا ہے کہ آخر ہم نے اس فن کے پیچھے زندگی کیوں ضائع کی۔ جیسے میں نے میٹرک کیا تھا اس کے بعد باقاعدہ تعلیم پاتی چلی جاتی اور ایم اے کر لیتی۔ ایم اے کرکے ہزار دھندے کیے جا سکتے ہیں۔ مگر میں نے تو یہ کیا کہ میٹرک کرنے کے فوراً بعد موسیقی کی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی اور آخر کو اسی کے لیے اپنے آپ کو تج دیا۔

منیر شیخ: اب ذرا دیکھیے کہ ہمارے سننے والوں میں مرد کے گانے اور عورت کے گانے کے بارے میں مختلف ردِعمل پیدا ہوتے ہیں۔ باوجود اس بات کے کہ مرد کی آواز زیادہ گھمبیر، رچی ہوئی اور تہ دار ہوتی ہے لیکن ایک طبقہ صرف عورت کے گانے سے زیادہ لطف اندوز ہوتا ہے کیا ایسا تو نہیں کہ عورت کے گانے میں کسی نہ کسی سطح پر جنسی جذبے کی غیر شعوری طور پر تسکین ہوتی ہے۔ یا یہ ہے کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ راگ رنگ عورت ذات ہی کا ایک روپ ہے؟

منیر خاتون: ہاں صاحب کچھ ہے ایسا قصہ۔ عورت بُرا بھی گائے تو داد مل جاتی ہے۔ مرد لاکھ اچھا گائے اسے ویسی داد نہیں ملتی۔ روشن آرا بیگم بہت اچھا گانے والی ہیں اور خوب داد پاتی ہیں۔ میں ان سے کم اچھا گاتی ہوں۔ مجھے بھی خوب داد ملتی ہے۔ مگر نزاکت علی سلامت علی بھی تو بہت اچھا گاتے ہیں۔ انھیں ویسی داد نہیں ملتی۔ اصل میں عورت اپنے عورت پن کی وجہ سے اس فن سے زیادہ گہرا رشتہ رکھتی ہے۔

انتظار حسین: یہ الگ بات ہے کہ بڑے موسیقار بالعموم مرد ہوئے ہیں۔

منیر خاتون: ہاں یہ بھی صحیح ہے۔

منیر شیخ: آپ نے ایک دفعہ بتلایا تھا کہ آپ دس برس کی تھیں تو گانا سیکھنا شروع کیا۔ اس لحاظ سے یہ فن آپ کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ مسلسل ریاض اور مشق سے آپ نے اس میں فنی پختگی بھی پیدا کر لی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس فن کی حیثیت آپ کے نزدیک کیا ہے کہ آپ اسے محض فن کے طور پر لیتی ہیں یا آپ کے نزدیک یہ آپ کے مذہب کا درجہ رکھتا ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جب فن مذہب کے درجے پر پہنچ جاتا ہے تو فن کار کی اپنی ذات اس کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ اس کی ذات اور اس کا فن دو الگ الگ چیزیں نہیں ہوتیں۔

منیر خاتون: میرے لیے موسیقی محض ایک فن ہے، مذہب نہیں۔ اب میری ذات اس کا حصہ بنتی ہے یا نہیں بنتی۔ یہ میں نہیں جانتی۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ میں گانے میں مصروف ہوں اور لاکھ اس میں گم ہو جاؤں لیکن اگر کان میں اذان کی آواز پڑ جائے تو پھر میں نہیں گا سکتی۔ ایک دفعہ ایک تقریب میں ایسا واقعہ ہو گیا تھا۔ میں گا رہی تھی کہ مغرب کا وقت ہو گیا۔ قریب کہیں مسجد میں اذان ہونے لگی، میں نے فوراً طنبورہ رکھ دیا۔ ہاں بلکہ مجھے تو یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ یہ جو میں گاتی واتی ہوں یہ اسلام کے خلاف کر رہی ہوں۔

منیر شیخ: پتہ نہیں آپ اس بات کو کوئی اہمیت دیتی ہیں یا نہیں کہ ہمارے گانے والے جدید دور کے تقاضوں کا احساس نہیں رکھتے۔ گانے والوں کو سننے والوں سے شکایت ہے کہ صاحب لوگ دن بدن بدمذاق ہوتے جا رہے ہیں۔ انھیں گانا سننے کا سلیقہ نہیں رہا۔ بڑے اچھے اچھے گویّے

میں پبلک کے ہاتھوں ان کا جادو نکل جاتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ بات صرف یہی نہیں کہ لوگ بدمذاق ہو گئے ہیں۔ اس میں کچھ قصور مجھے گانے والوں کا بھی لگتا ہے وہ اس طرح کہ کلاسیکی انداز کی گائیکی جس طرح غیر مقبول ہوتی جا رہی ہے تو سمجھے موسیقاروں کا فرض تھا کہ وہ اس تبدیلی کو محسوس کرتے اور کلاسیکل موسیقی کے اسالیب کو بدلنے کی کوشش کرتے۔ آپ شاید مجھ سے متفق ہوں کہ کلاسیکی انداز اپنی اپیل کھو رہا ہے، آپ کے نزدیک کیا یہ مسئلہ نہیں کہ اس انداز کو کس طرح پاپولر بنایا جا سکتا ہے ؟

منیر خاتون : ہاں کچھ گانے والے کوشش بھی کر رہے ہیں۔ بہرحال کر دیکھیں۔ ایک زمانہ تھا کہ لڑکیاں سر سے دوپٹہ نہیں اتارتی تھیں۔ اب سر اور سینہ دوپٹے کی پابندی سے آزاد ہے۔ یہ نئے فیشن بے حیثیت لباس فیشن بن رہے ہیں۔ کچھ گانے والے بھی اسی قسم کے فیشن کر رہے ہیں اور ان کے ہاتھوں کلاسیکی موسیقی میں بیٹھی ازم رواج پا رہا ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ جس طرح لڑکیوں کے نئے فیشنوں میں کوئی جمالیاتی پہلو نہیں مثلاً سوچئے کہ کٹے ہوئے بالوں میں کیا حسن ہے بس ایسے ہی راگوں میں جدت برتنے سے کوئی حسن پیدا نہیں ہوتا۔ اور جناب میرا معاملہ تو یہ ہے کہ میں ہونٹوں پر لپ اسٹک نہیں لگاتی تو موسیقی میں تجربے کیا کیا کرتی۔

منیر شیخ :۔ موسیقی میں تو آپ کسی تجربے کی قائل نہیں اور چست لباس بھی نہیں پہنتیں لیکن آپ کو یاد ہو گا کہ آپ نے ایک مرتبہ موٹر ڈرائیونگ سیکھنے کا شوق ظاہر کیا تھا، گویا زندگی میں تو آپ قدیم اور جدید میں سمجھوتے کی قائل ہو چکی ہیں۔ پھر کیا بات ہے کہ فن میں آپ اس کی قائل نہیں ہوئیں۔ آپ کی بات کا مطلب تو یہ ہوا کہ کلاسیکی موسیقی میں تجربے کی سرے سے گنجائش ہی نہیں ہے۔

منیر خاتون :۔ دیکھئے منہ کا زیادہ کھلنا، چہرے کا بگڑنا، بدن کا ہلنا پہلے موسیقی میں یہ سب عیب گنے جاتے تھے۔ اس وقت گانا ایک نہایت سنجیدہ شغل تھا۔ موسیقار عام سامعین کے مذاق پر اترنے کی کوشش نہیں کرتا تھا، بلکہ سامعین اسے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اب الٹا چکر چلا ہوا ہے تجربے کی گنجائش ہو یا نہ ہو مگر جدت بازی یہ رنگ تو نہ لائے کہ راگ کی شکل ہی بگڑ جائے۔ اور ساتھ میں صورت بھی بگڑ جائے۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ گانے والوں نے پبلک کے مذاق کو گرتے دیکھ کر اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کی . . . ، مذاق کو بدلنے کی کوشش نہیں کی اور مذاق ہے کہ گرتا چلا جا رہا ہے اور اب نوبت یہ آئی ہے کہ جیسی فلمی ایکٹرس ویسی ہم گانے والیاں۔ آخر ہم میں اور ان میں فرق کیا رہ گیا ہے۔

منیر شیخ : . آپ کو کبھی مغربی موسیقی سننے کا شوق ہوا ؟

منیر خاتون : کبھی نہیں، غلط کام کرنے کو میرا جی کبھی نہیں چاہا۔ چنانچہ لپ اسٹک بھی نہیں لگاتی۔ اصل میں میں خاصی قدامت پسند ہوں۔ میں کیا کروں میں ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی جہاں مردوں اور لڑکوں سے بھی پردہ کیا جاتا تھا۔ یہ تو میں الٰہ آباد سے نکل کر برقعہ الگ رکھ دیتی ہوں۔ الٰہ آباد میں تو میں گھر سے قدم باہر نہیں نکال سکتی۔ اور شاپنگ کرنے تو میں کبھی نہ جاؤں۔

منیر شیخ :۔ ایک بات آپ سے پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کی زندگی میں ایسے لمحے تو ضرور آتے ہوں گے جب آپ بہت اداس ہو جاتی ہوں گی۔ ایسی ویرانی کو بھرنے کے لیے آپ کونسا راگ گاتی ہیں ؟ پبلک کو تو آپ کو اب مجبوراً کچھ نہ کچھ سنانا ہی پڑتا ہے لیکن یہ بھی تو بتلایئے کہ آپ اپنے آپ کو کیا سناتی ہیں ؟

منیر خاتون :۔ ایسے میں مارو بہاگ اور بسنت سے اپنے جی کو رجھاتی ہوں۔

منیر شیخ :۔ راگ میں بول کی اہمیت آپ کے نزدیک کیا ہے ؟ بولوں سے جذبے کے اظہار میں معنے پیدا ہوتے ہیں یا نہیں ؟

منیر خاتون : جی ضرور، بولوں سے تو راگ میں معنی اور لہجہ پیدا ہوتا ہے بول میں جس جذبے کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے، ہم اسی کو سُر اور آواز کی

شکل دے دیتے ہیں اور پھر اس کو دہرا دہرا کر اسی بول کے مختلف روپ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ دیکھیے نا انتظار صاحب! ایک ٹھمری کے بول ہیں:-

"سیّاں گئے پردیس"

سے یوں گا کر سُناتی ہوں۔ سیّاں گئے —— پردیس ۔ یہاں سیّاں گئے —— دو لفظوں کو کھینچا گیا ہے اور پردیس کا لفظ وقفے کے بعد ادا کیا گیا ہے۔ اس میں ایسے سُر لگائے ہیں کہ جدائی کا اظہار ہے۔ اب انھیں بولوں کو اس طرح سنیے سیّاں —— گئے پردیس یہاں لفظ سیّاں کو لٹکا دیا ہے اور اس سے التجائی کیفیت پیدا ہوگئی۔ بول جذبے کے اظہار میں ادا کا ضروری حصہ ہیں۔

انتظار حسین :- آپ کبھی بھجن بھی گاتی ہیں؟

منیر خاتون : بہت۔

انتظار حسین :- اچھا؟ پھر تو ہم سے بہت خطا ہوئی۔ کل کی محفل میں آپ سے بھجن نہیں سنے۔

منیر خاتون : بھجن میں یہاں یوں نہیں سناتی کہ اس کی زبان یہاں لوگوں کے لیے اجنبی ہے۔

انتظار حسین : مگر کل تو سب میرا بائی کے عقیدت مند بیٹھے تھے۔ خیر میں بات اور کہہ رہا تھا۔ آپ کہتی ہیں کہ بول کو جب تک دل کی کیفیت سے ہم آہنگ نہ کیا جائے اسے اثر کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر آپ یہ بھی کہتی ہیں کہ میں تو قدامت پسند مسلمان ہوں اور پھر آپ بھجن بھی گاتی ہیں۔ مگر بھجن تو اپنی جگہ عبادت ہے۔ اگر گانے والا اپنے آپ کو اس جذبہ کے سپرد نہیں کرتا۔ اور عبادت کا عالم اس پر طاری نہیں ہوتا تو وہ بھجن کیسے گا سکتا ہے۔

منیر خاتون :- صحیح بات ہے اسی لیے بھجن میں واجبی واجبی گاتی ہوں۔

انتظار حسین : خیر یہ تو ہم طے کریں گے کہ آپ بھجن اچھا گا سکتی ہیں یا نہیں گا سکتیں۔ میرا بائی کا کوئی بھجن سُنا دیجیے۔

اور تب منیر خاتون چپ ہوگئیں اور پھر گنگنانے لگیں ؎

بالپوری میں تو رام رتن دھن پایو
ست کی ناؤ کھویا ست گرو۔
بھوں ساگر ترایو

—— اور جب وہ بھجن گا رہی تھیں تو رفتہ رفتہ ان پر ایک کیفیت طاری ہوتی گئی۔ ایسی کیفیت جیسے وہ عبادت کر رہی ہوں اور پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ چھالیوں کا بٹوہ اٹھایا۔ تھوڑی تھوڑی چھالیاں ہماری ہتھیلی پر رکھیں۔ ان چھالیوں کو ہم نے پرشاد جانا اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

طویل مختصر افسانہ:

یاد کی اِک دھنک جلے

قرۃُ العین حیدر

جب کبھی میں اگ بجھانے ، الااجن شہر کی سڑکوں پر سے گزرتا دیکھتی ہوں تو مجھے ناصر چچا یاد آجاتے ہیں۔ فائر بریگیڈ اور ناصر چچا بچپن سے میرے ذہن میں لازم و ملزوم ہیں۔

ناصر چچا مٹیا برج کلکتہ کے ایک ماضی پرست، خدمت پسند اور وضعدار خاندان کے ایک فرد تھے۔ وہ ابا جان کے بہت پرانے دوست تھے اور بیحد شگفتہ طبیعت اور بہت پڑھے لکھے انسان تھے۔ اردو، فارسی اور انگریزی ادبیات کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور فائر بریگیڈ کے محکمے میں ملازمت کرتے تھے۔

بمبئی میں فائر بریگیڈ کے ہیڈ کوارٹر پر (شاید وہ ہیڈ کوارٹرز ہی تھے) کے اوپر ان کا بہت لمبا چوڑا فلیٹ تھا جس طرح کے پرانی وضع کے فلیٹ گرا کر اب سیمنٹ کے جگمگاتے ہوئے دس منزلہ رہائشی بلاک تعمیر کیے جا رہے ہیں۔

اس فلیٹ میں یاد ہے سیاہ سفید ٹکڑوں کی پچی کاری کا فرش تھا، اونچی چھتوں والے لق و دق کمرے، اور لمبے لمبے برآمدے جن کے چوبی جنگلے سبز روغن کے تھے۔ سامنے کے رخ پر سمندر تھا جس میں رات کے وقت، دور لائٹ ہاؤس کی روشنی جھلملاتی تھی اور پانی سے ابھری ہوئی اکا دکا بھوری چٹانیں اور پہاڑیاں نظر آتی تھیں جن میں ایک زمانے میں پرتگال کے بحری قزاقوں کے اڈے تھے۔

ناصر چچا کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے اکلوتے بچے علی اصغر کی پرورش ایک گوآنی آیا کے سپرد تھی۔ سعیدہ چچی بچے کو تین سال کا چھوڑ کر اللہ میاں کے گھر سدھاری تھیں۔ اور مرتے وقت اسے گریسی کو سونپ گئی تھیں اور اس سے کہا تھا کہ اگر تم اسے چھوڑ کر چلی گئیں اور کہیں اور نوکری کر لی تو قیامت کے روز تم سے پوچھوں گی۔

گریسی گہری سانولی رنگت اور مضبوط کاٹھی کی اڑتیس سالہ محنتی اور وفادار عورت تھی۔ وہ بیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی اور دس برس تک ادھر ادھر ٹھوکریں کھانے کے بعد ناصر چچا کے یہاں نوکر ہو گئی تھی اور آٹھ سال قبل جب سعیدہ چچی کلکتے سے بمبئی آئی تھیں تب سے وہ ان کے پاس ملازم تھی۔ ان کی آخری بیماری میں گریسی نے دن رات ایک کر کے ان کی خدمت کی تھی اور ان کے انتقال کے بعد سے علی اصغر کو بے حد دلسوزی سے پال رہی تھی اور اس پر جان چھڑکتی تھی۔

میرے اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو ایک مرتبہ ابا جان چند ہفتے کے لیے مجھے اپنے ساتھ بمبئی لے آئے اور جب ہم لوگ اسٹیشن سے ناصر چچا کے گھر پہنچے تو گریسی نے انتہائی جوش و خروش سے لپک کر ہمارا استقبال کیا۔ اور دوسرے ملازمین کی موجودگی کے باوجود سوٹ کیس اور ہولڈال خود اٹھا اٹھا کر اندر لے گئی۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹ خوشی کے مارے کھلے ہوئے تھے۔ اس کے بے انتہا چمکیلے دانت تھے، اور چمکیلی آنکھیں۔ اس نے سبز کنارے والی اودے رنگ کی سوتی ساری پہن رکھی تھی اور پیڑے سے جوڑے میں بمبئی کے رواج کے مطابق سفید

سمودرا کا ٹکڑا بیٹھا ہوا تھا۔ اپنی طرف کی سفید لہنگے پہنے والی مرگلی اور بدمزاج آپاؤں کے مقابلے میں وہ مجھے بڑی شاندار اور ملنسار معلوم ہوئی۔

آپاجان اور ناصر چچا برآمدے کی آرام کرسیوں پر بیٹھ کر یونہی باتیں کرتے رہے۔ وہ تھکے تھے۔ میں جنگلے پر سے اُچک کر سمندر کو دیکھ رہی تھی اور مجھے لگا جیسے ان کے ہاتھ پر ہتھیلی دھر دینے کی ضرورت ہوئی۔ صاحب کھانا لگانے کا۔ اس نے مستعدی سے اعلان کیا۔

" بھئی بڑا دو کیک کھا دئے۔ گریس کھانا اس خوش ذائقہ پکاتی ہے کہ آدمی کی جی کا کمہ بھرے" ناصر چچا نے آپاجان سے کہا۔

" آرڈر ہے کہ وہ باورچی خانے کی سمت چلی گئی۔

چچا کا آٹھ سالہ لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے جا چکا تھا۔ میں سارے گھر میں گھومتی رہی۔ پھر اندر باورچی خانے میں جھانکا جہاں گریس ساری کا پلو کمر میں کھونسے کھانا تیار کرنے میں جٹی تھی اور دوسرے نوکروں پر حکم چلاتی جا رہی تھی۔

تیسرے پہر کو فراغت پاکر وہ پچھلے برآمدے میں اپنے کمرے کے سامنے چٹائی بچھا کر بیٹھ گئی اور مجھ سے باتیں کرنے لگی۔

وہ عجیب لے کی اور اوٹ پٹانگ قسم کی کھچڑی زبان میں بات کرتی تھی جس سے میرے کان اب تک ناآشنا تھے اور تب وہ مجھے اپنی طرف کی کھڑکھڑانے لچکے کے چوڑے گھیر والے لہنگوں اور سفید براق ململ کے دوپٹوں میں ملبوس مرگلی اور بدمزاج مگر نستعلیق آپاؤں سے اور بھی مختلف معلوم ہوئی جو اتنی شستہ گفتگو کرتی تھیں۔ گریس دراصل بمبئی کے بہت سے لوگوں کی مانند ایک ہفت زبان خاتون تھی۔ اس کی ماں کوکنی اور پاپا گوا کے باشندے تھے۔ وہ کونکنی اور گوانی زبانوں کے علاوہ مرہٹی اور گجراتی بھی بولتی تھی اور اردو اور انگریزی کا قتل عام بھی کرتی رہتی تھی۔ اس کا شوہر جس سے اس نے چرچ میں "لو میرج" کیا تھا" بمبئی کے ایک ہوٹل آرکسٹرا میں ڈرم بجاتا تھا اور شادی کے تیسرے سال ہی ایک حادثے میں مر گیا تھا۔ اس کے والدین کبھی عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ اس کا اکلوتا بھائی پی اینڈ او کے اسٹیم ہیڈ مور جہاز پر کیبن اسٹیورڈ تھا اور وہ بھی مر چکا تھا۔ بمبئی میں اس کی صرف ایک سگی والی تھی جو اس کی خالہ زاد بہن بھی تھی اور کبھی کبھی اس سے ملنے آ جاتی تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد گریس نے بمبئی میں مختلف جگہوں پر آیاگیری کی تھی۔ ایک اسکول بس پر بچوں کو لانے لے جانے پر مامور رہی تھی اور تاج محل ہوٹل میں لیڈیز کلوک روم کی اٹنڈنٹ کے فرائض انجام دیئے تھے "جب ہم ادھر اپنی میم صاحب کے پاس نوکری کیا تو ہم کو لگا جیسے ہم جنت میں آگیا ہے — ہمارا میم صاحب بالکل اینجل کی موافق تھا۔ اسی لیے جلدی سے ہیون (HEAVEN) کو چلا گیا۔" اس نے ساری کے کونے سے آنسو خشک کیے اور چٹائی پر اکڑوں بیٹھ کر کہتی رہی — ہم صاحب میم صاحب کے پاس نوکری کیا تو جوزف کی ڈیتھ کے بعد ہم کو زندگی میں پہلی بار عزت ملا اور ہم کو لگا کہ ہمارے سر پر بھی چھت ہے — صاحب ہمارا اب بھی بہت کھیال کرتا ہے — صاحب تمہارے ڈیڈی کا بہت ذکر کرتا تھا جس روز اس کے پاس تمہارا ڈیڈی کا تار آیا کہ تم لوگ اِدھر آتا ہے تو ہمارا صاحب خوشی کے مارے رات کو بہت دیر تک ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا اور اپنے سامنے سارا فلیٹ ہم سے ٹھیک کروایا — اب تم کو جس چیز کو دل چاہے ہم کو بول دینا۔ ادھر تمہارا آنٹی زندہ نہیں ہے مگر ہم ان کا سرونٹ تو ابھی زندہ ہے —"

ہم لوگ ناصر چچا کے وہاں کئی دن مقیم رہے۔ صبح سویرے آپاجان اور ناصر چچا سمندر کے رُخ والے برآمدے میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے، جو زیادہ تر میری سمجھ میں نہ آتیں، مگر میں بڑے ذوق و شوق سے ان دونوں کی گفتگو سنتی۔ پٹنہ اسکول کی شاعری۔ غالب کا فارسی کلام۔ عرفی اور نظیری۔ ملکی سیاست۔ نازی جرمنی کے مسائل۔ میونخ۔ واردھا آشرم اور جانے کیا کیا۔

ناصر چچا کے گھر کا بڑا باقاعدہ نظام تھا جسے گریسی کسی ماہر ایڈمنسٹریٹر کی مانند خاموشی اور ضابطے سے ڈائریکٹ کرتی تھی۔ صبح صبح کمروں کے گلدانوں میں تازہ پھول لگ جاتے۔ چچا کے سارے پائپ صاف کر کے مختلف میزوں پر راکھ دانیوں کے پاس رکھ دیئے جاتے۔ پالش کے بعد ان کے بوٹ پچھلے برآمدے میں ایک قطار میں موجود ہوتے۔ ناشتے کی میز پر تازہ اخبار رکھے ملتے۔ کمروں کا فرش صابن سے دھلتا۔ دروازوں اور دریچوں کی چٹخنیاں براسو سے صاف کی جاتیں۔ سارا گھر آئینے کی طرح پڑا چمکتا رہتا۔ کھانے کے کمرے کے وکٹورین سائیڈ بورڈ پر رنگ برنگے اچار، مربّوں اور چٹنیوں کے مرتبان موجود رہتے۔ گھر کا خرچ گریسی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بڑی جُزرسی سے کام لیتی اور پچھلے زینے پر کھڑے ہو کر سودے والوں سے الجھا کرتی۔ اور کسی گہرے رنگ کی سوتی ساڑی اور کہنیوں تک پھنسی ہوئی آستینوں والے کھٹ بلاؤز میں ملبوس، جوڑے میں پنیں سجائے۔ ننگے پیر، غلط سلط انگریزی یا بمبئی کی مخصوص اردو بولتی تندہی اور جانفشانی سے گھر سنبھالنے میں مصروف رہتی۔

وہ چچا کی آنکھیں دیکھتی تھی، اگر چچا کسی کو ناپسند کرتے تھے تو وہ بھی اسے منہ نہ لگاتی تھی اور فوراً روکھا سوکھا اور بعض اوقات تحقیر آمیز رویہ اختیار کر لیتی۔ چچا جن لوگوں کو پسند کرتے تھے ان کے لیے گریسی کی جان بھی حاضر تھی۔

اتوار کے دن میری کی عید ہوتی تھی، کیونکہ اس دن ڈھیروں باتصویر اخبار اور رسالے آتے تھے۔ برآمدے میں ایک لمبی میز پر اخبار اور رسالوں کے انبار سلیقے سے چنے ہوئے تھے۔ بمبئی کرانیکل، اور اسٹیٹسمین اور ٹائمز آف انڈیا، اور السٹریٹڈ ویکلی، ساقی کے سالنامے اور افسانہ نمبر۔ ان ہی دنوں ٹائمز آف انڈیا کی صد سالہ سالگرہ کا خاص نمبر آیا تھا جس میں سو سال قبل کے چرچ گیٹ کی بڑی سی رنگین تصویر تھی کہ انگریز لوگ گھوڑا گاڑیوں اور پالکیوں سے اتر رہے ہیں اور نیٹو لوگ ہاتھ باندھے چاروں طرف کھڑے ہیں۔ میں ان رسالوں کی ورق گردانی کرتی یا پھر سمندر کی لہریں گنا کرتی۔ ناصر چچا کا لڑکا مجھ سے تین چار سال چھوٹا تھا اور میری اس سے دوستی بالکل نہ ہو سکی۔ یوں بھی اپنی عمر سے بڑے لوگوں سے میری زیادہ نبھتی تھی۔ اصغر بہت بدتمیز اور شریر تھا وہ دن بھر گریسی کو تنگ کیا کرتا۔ پڑھائی میں اس کا جی بالکل نہیں لگتا تھا۔ گریسی اسے ڈانٹتی رہتی "اسکر — جاؤ اپنا لیسن سیکھو —" اور جواباً وہ اسے طرح طرح سے دق کرنے میں لگا رہتا۔ شاید وہ غیر شعوری طور پر گریسی کو پسند بھی نہ کرتا تھا اور اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ گریسی کے دل میں اس کے لیے جو شدید جذبۂ ملکیت تھا اصغر کا ننھا سا دماغ اس سے بغاوت پر آمادہ رہتا تھا۔

"اصغر کی تربیت بےحد غلط ہو رہی ہے" ناصر چچا افسوس سے اظہارِ خیال کرتے "گریسی کے بےجا لاڈ پیار نے اسے بالکل برباد کر دیا ہے مگر میں گریسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ بیگم مرحومہ اس سے اپنی چھوٹی بہن کی طرح محبت کرتی تھیں اب میں اس کے ساتھ کس دل سے سختی کروں؟"

جب اصغر "ہم جائیگا۔ ہم کھائیگا۔ ہم تم کو بولا" قسم کی زبان میں باتیں کرتا تو آپا جان بھی بڑے صدمے سے کہتے۔ یہ مٹیا برج اور عظیم آباد کے اس خاندان کا فرزند ہے جو اردو ادب کی تاریخ میں اپنا مقام رکھتا ہے۔

فلیٹ کے پچھواڑے کی عمارت میں فائرمین کے کوارٹرز تھے۔ فائرمین زیادہ تر مرہٹے تھے۔ اور ان میں سے ایک کی بڑی خوش شکل بیوی نوگزی ساری پہنے بالوں میں تازہ بینی سجائے نل کے پاس بیٹھی برتن مانجھا کرتی۔

دوپہر کو میں چپکے سے نیچے اتر جاتی جہاں نچلی منزل پر ناصر چچا کے اسسٹنٹ مسٹر جیکب ابراہام کا فلیٹ تھا۔ مسٹر ابراہام بنی اسرائیل یعنی ہندی نژاد یہودی تھے اور ان لوگوں کی مادری زبان مرہٹی تھی۔ جمعے کے روز مسز ربکا ابراہام پیتل کی زنجیر میں چھت سے لٹکتے ہوئے خوبصورت لیمپ کو روشن کر کے تین نصف دائروں کے سروں پر لگی ہوئی چھ موم بتیوں کا مخصوص عبرانی شمعدان جلاتیں اور تورات اور زبور کا

تلاوت کرتیں۔ ان کے ڈرائنگ روم کی دیوار پر حضرت موسیٰؑ کی ایک بڑی سی رنگین تصویر لگی تھی کہ وہ اپنی قوم کو دریائے نیل کے پار لیے جا رہے ہیں۔ میں اوپر واپس آ کر ابا جان یا ناصر چچا سے یہودیوں کے متعلق سوالات کرتی۔ ایک روز میں نے ایک انگریزی کتاب میں پڑھا —— موسیٰ کی مانند تم نے مجھے قید و بند سے نکالا۔ اور فرعون کی مانند میں تمہارا شکرگزار ہونے سے منکر رہا۔ اور لہٰذا صحرا میں نیست و نابود ہو گیا —— اس کا کیا مطلب ہے؟" میں نے ابا جان سے پوچھا۔

"اس کا مطلب آپ ابھی نہیں سمجھ سکتیں۔ جب بڑی ہو جائیں گی تو سمجھیں گی"۔ انھوں نے جواب دیا۔

شام کو میں ابا جان اور ناصر چچا کے ساتھ ساحل پر ٹہلتی ہوئی تاج محل ہوٹل اور گیٹ وے آف انڈیا تک جاتی اور منڈیر پر کھڑے ہو کر سامنے سے گذرنے والے پروقار سفید جہازوں کو دیکھا کرتی۔

سڑک پر سے گزرتے ہوئے پارسیوں کے آتش کدے کے آدھے بیل اور آدھے انسان والے مہیب ستون نظر آتے اور برستی بارش میں موٹر یا بس کے شیشوں میں سے مجھے وہ بہت پراسرار معلوم ہوتے۔ چوپو کے کنارے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ایک عقاب نما بوڑھا پارسی کاؤنٹر پر آئس کریم بیچتا تھا۔ وہ بھی بے حد پراسرار معلوم ہوتا۔ دنیا مجموعی طور پر بے حد پراسرار تھی۔

صبح کو اخبار پڑھتے پڑھتے ناصر چچا سر اٹھا کر مجھ سے کہتے "— اچھا صاحب! یہ بھی ہو گیا —!!"

کچھ بزرگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ بچوں سے ایک بے معنی سا فقرہ دہرا دیتے ہیں جو دوسروں کے لیے بے معنی ہوتا ہے مگر بزرگ اور بچے کے درمیان ایک خفیہ کوڈ کا درجہ رکھتا ہے۔ جن لوگوں کو بچوں سے بہت محبت ہوتی ہے ان کے اور بچوں کے درمیان دوستی کا ایک ان کہا رابطہ موجود رہتا ہے" اچھا صاحب — یہ بھی ہو گیا — وہ بھی گیا —— میرا اور ناصر چچا کا خفیہ کوڈ تھا۔

جب چچا میرے لیے کوئی پروگرام بناتے تو چپکے سے کہتے —" آج تمہیں جوہو لے جائیں گے۔ وہاں سمندر میں خوب مزے سے اپنے نہانا —— کیوں صاحب؟"

یا —" آج سینما چلیں گے "۔ (سینما سے ان کی مراد صرف انگریزی سینما ہوتی تھی جو وہ سال میں ایک آدھ بار دیکھ لیتے تھے)

یا —" آج ہم اور تم تاج چلیں گے۔ خوب مزے سے اپنے ڈٹ کر آئس کریم کھانا — سمجھے صاحب؟"

ناصر چچا سے میری دوستی دو سال پرانی تھی۔ دو سال قبل، سردیوں کے زمانے میں ناصر چچا ہمارے ہاں دہرہ دون آئے تھے۔ اور ابا جان کے دوسرے دوستوں کی مانند میری ان سے فوراً دوستی ہو گئی تھی۔ ابا جان کے ان گنت دوستوں میں سے علیگڑھ والے چچا ظفر عمر، چچا عبدالغفار[1]، چچا مشتاق زاہدی، چچا رضا علی[2] اور چچا عنایت اللہ[3] سے میری بہت گاڑھی چھنتی تھی اور اب ان شفیق چچاؤں میں ناصر چچا کا بھی اضافہ ہو گیا تھا جن کو اتنی دور بمبئی میں رہنے کی وجہ سے میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

شام کو میں ناصر چچا کو ڈالن والا کی خاموش اور معطر سڑکوں پر چہل قدمی کے لیے لے جاتی اور ایک مستعد گائیڈ کی طرح اپنے نزدیک سارے اہم لینڈ مارک، ان کو دکھلاتی جاتی۔ اپنے واقف کارکتوں، بلیوں اور پرندوں سے ان کا تعارف کراتی اور آس پاس کے مکانوں کے متعلق

---

[1] قاضی عبدالغفار مرحوم۔ [2] سید رضا علی مرحوم، مصنف اعمال نامہ

[3] مولوی عنایت اللہ دہلوی مرحوم۔

بچہ اہم اطلاعات انھیں فراہم کرتی۔ جیسے چچا وہ پولیس کے ہیڈ ہیں نا ان کے پیچھے ہماری دوست رہا کرتی ہے اور وہ سامنے عطیہ کا گھر ہے اور چچا وہ پلیا پر انا گرجا گھر ہے زیادہ سخت ہے۔ اور وہ سامنے مسز مکرجی رہتی ہیں۔ چچا معلوم ہے آپ کو یہ مسز مکرجی ان کے میاں پادری مکرجی کہتے ہیں کہ یہ پاگل ہیں اور یہ تو رات رات بھر باغوں میں گھوما کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ان کو نیند بالکل نہیں آتی۔ اور وہ سامنے ڈرائنگ روم میں گھوم کر بریک بانڈ کے خالی ڈبے جمع کیا کرتی ہیں۔

اور فریج کٹ داڑھی والے پادری مکرجی اپنے ایلشین کتے کے ساتھ سر جھکائے سامنے سے ٹہلتے ہوئے آتے۔ دو منٹ رک کر ہم لوگوں سے بات کرتے اور آگے چل دیتے۔ ناصر چچا پھر اپنی ہوا خوری شروع کر دیتے اور میں اچھلتی کودتی ان کے آگے آگے چلتی رہتی۔

چچا کو میں نے بڑے جوش و خروش سے اپنی خفیہ جائے پناہ دکھلائی تھی۔ یہ ہمارے گھر کے عقب میں سرخ رنگ کی ایک دو منزلہ عمارت تھی جس میں ان گنت برجیاں شہ نشین اور مینارے بنے ہوئے تھے۔ یہ دراصل مشرقی پنجاب کی کسی چھوٹی سی ریاست کے حکمران کی متروک حویلی تھی اور اس کا نام پری محل تھا۔ یہ بالکل سنسان پڑی رہتی اور عجیب بات تھی کہ اس کے کمروں کے دروازے کھلے رہتے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے عمر عیار کے طلسم والے کسی ساحر نے چھو منتر کہہ کر ایک بستی بستی محلسرا کو پل کے پل میں اجاڑ دیا ہو اور اس کے دروازے اسی طرح چلتے چلتے کھلے رہ گئے ہوں۔ میں اکثر اس کے زینوں اور برجیوں پہ چڑھ جاتی اور مجھے مطلق ڈر نہ لگتا۔ کیونکہ ویران ہونے کے باوجود اس مکان میں وحشت نہ تھی۔ پری محل واقعی قطعی پری محل تھا۔ ناصر چچا جس روز دوسرے دن آئے ہیں۔ تو میں نے اسی روز ان سے کہا "چلیے آپ کو پری محل دکھلائیں" اور ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی وہاں لے گئی۔ تیز سبز گھاس کے قطعے پر لیٹا وہ کرمسن لیک ایسا مکان سناٹے میں ڈوبا، ہمیشہ کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ یہاں میں کھیلا کرتی ہوں۔ میں نے اطلاع دی۔ ناصر چچا نے پھر دروازے پر ٹیک لگا کر اس پر نظر ڈالی — اور کہا — ہوں — یہ بھی خوب ہے۔

جب وہ چچا عنایت اللہ سے ملنے گئے تو میں مصر رہی کہ وہ چچا عنایت اللہ کے نجی چڑیا خانے کو زیادہ تفصیل سے دیکھیں۔ اس چڑیا خانے کے سارے جانوروں اور پرندوں سے میرے پرانے مراسم تھے۔ چچا عنایت اللہ حسب معمول بجری پر کرسی ڈالے دھوپ میں بیٹھے تھے اور ان کے سامنے میز پر بہت سارے کاغذات رکھے تھے اور انھوں نے ناصر چچا سے پوچھا تھا۔

"تم آج کل کہاں رہتے ہو؟"

"بمبئی میں —"

"بمبئی میں کیا کرتے ہو؟"

"آگ سے کھیلتے ہیں" — ناصر چچا نے جواب دیا تھا۔

اور بمبئی آکر میں نے دیکھا تھا کہ چچا کا کام واقعی بہت خطرناک تھا۔ اکثر رات کو فون کی گھنٹی بجتی اور انھیں آتشزدگی کی کسی بڑی واردات پر معائنے کے لیے جانا پڑتا۔ ان کے کمرے میں برقی گھنٹی لگی تھی جس کا تعلق فائر بریگیڈ کے دفتر سے تھا۔ وہ اکثر وقت بے وقت لگاتار بجے چلی جاتی۔ اور چچا پل کی پل میں غائب ہو جاتے۔ رات کو چچا اپنا یونیفارم، فل بوٹ اور آہنی خود پلنگ کے برابر کرسی پر رکھ کر سوتے تھے۔ تاکہ خطرے کی گھنٹی بجتے ہی تیار ہو کر فوراً موقع واردات پر پہنچ جائیں۔

ایک روز صبح ناصر چچا ناشتے کی میز پر آئے تو بہت اداس تھے۔

رات ایک سہ منزلہ عمارت میں آگ لگ گئی اور ایک مولوی صاحب مع اپنے خاندان کے جل کر ختم ہو گئے۔ انھوں نے ملول آواز میں کہا "میں ان مرحوم کو جانتا تھا۔ بے حد خدا ترس اور نیک بزرگ تھے اور بہت غریب۔ ساری زندگی فقر و فاقے میں، پیٹ کی آگ بجھانے کی تگ و دو میں گئی اور رات اس قہرناک آگ نے خاتمہ کر دیا — یہ خدا میاں کے ہاں کس قسم کا انصاف ہے [illegible]" انھوں نے آپا جان سے کہا "اسی عمارت میں ایک سیٹھ رہتا تھا جو شہر کا مشہور بدمعاش ہے اور سینکڑوں غریبوں اور مظلوموں کا خون چوس کر اس نے انبار دولت جمع کی ہے۔ وہ مع اپنے خاندان کے صحیح سلامت بچ گیا۔ اس پر طرہ [illegible] اور مولوی جمیل الدین اور ان کے فلاں زندہ بیوی بچے جل کر کوئلہ ہو گئے۔"

گریس اس وقت میز کے سرہانے کھڑی تھی۔ اس نے فوراً زیرلب کچھ بڑبڑانا شروع کیا اور کمرے سے غائب ہو گئی۔

گریس کی عادت تھی کہ ناصر چچا جب آگ بجھانے نکلتے تو وہ ان کی خیریت کی منت مان کر اپنے کمرے میں جناب مریمؑ کے چھوٹے سے مجسمے کے سامنے ایک موم بتی جلا دیتی۔ اور جب وہ صحیح سلامت واپس آ جاتے تو زیرلب جانے کیا کیا بڑبڑا کر دوسری موم بتی جلاتی۔ وہ عام رومن کیتھولک [illegible] کی مانند بے انتہا مذہبی اور خوش عقیدہ تھی۔ اتوار کو گرجا جاتی تھی لیکن اس کے علاوہ دن بھر جو چھوٹے چھوٹے مرحلے ان کی روزمرہ کی زندگی میں ہوتے ان کے سلسلے میں شکایت کرنے یا فوری امداد طلب کرنے کے لیے وہ بھاگی بھاگی جناب مریمؑ کے پاس جاتی اور موم بتی روشن کر کے با آواز بلند کونکنی زبان میں ایک کیتھولک دعا دہراتی اور اپنی مخصوص انگریزی یا اردو میں اس چینی کے مجسمے سے تیز تیز گفتگو کرنے کے بعد آ کر اپنے کام میں دوبارہ منہمک ہو جاتی۔

ایک روز صبح وہ سارے میں نعمت خانے کی کنجی تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ کنجی ڈھونڈنے میں لگ گئی۔ جب کنجی نہ ملی تو وہ فوراً اپنے کمرے میں پہنچی۔ موم بتی جلائی اور غصے سے کہنا شروع کیا —

"دیکھو ماں، اگر تم نے دس منٹ کے اندر اندر میری کنجی ڈھونڈ کر نہ دی تو آج سے میری تمہاری دوستی ختم — ہم تمہارے کو بتا دیتا ہے۔ صاحب کو لنچ میں دیری ہو جائے گا تو وہ ہماری جان نکال لے گا۔ تمہارا کیا بگڑے گا — تم نے کبھی آیا گیری نہیں کی۔"

اگر ناصر چچا کھانا کھاتے میں کسی روز گریس کی پکائی ہوئی کسی چیز کی تعریف کر دیتے تو وہ فوراً مجسمے کے سامنے شکرانے کی موم بتی جلاتی۔

ناصر چچا گریس یا دوسرے نوکروں سے شاذ و نادر ہی کوئی غیر ضروری بات کرتے تھے۔ گھر کے معاملات کے سلسلے میں وہ کافی کم سخن تھے۔ گریس کو خانہ داری کے سیاہ و سفید کا مالک بنا چکے تھے، اور یوں بھی ان کی متاہلانہ زندگی کو ختم ہوئے اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ انھیں اپنی تنہائی کی عادت ہو گئی تھی اور شاید انھوں نے اپنے خیالوں اور اپنی یادوں کی دنیا میں خاموشی سے زندہ رہنا سیکھ لیا تھا۔

ناصر چچا سرخ و سفید، بھاری بھرکم، بلند قامت اور کافی رعب داب والے انسان تھے۔ وہ مالی لحاظ سے بہت خوشحال تھے۔ سرکاری [illegible] کے علاوہ کلکتے میں ان کی خاصی جائداد بھی تھی اور گریس برابر اس فکر میں گھلتی رہتی تھی کہ صاحب بڑا فضول خرچی کرتا ہے۔

بمبئی کے مقتدر اور اہم مسلمانوں میں ان کا شمار کیا جاتا تھا۔ وہ متعدد اسلامی اداروں کے سرپرست اور اعزازی عہدیدار تھے اور اپنی [illegible] رکھ رکھاؤ اور وضعداری کے لیے مشہور تھے۔

ایک روز تینوں بھاری بھرکم بیبیاں دھم دھم کرتی زینہ چڑھ کر برآمدے میں آئیں اور بڑی تمکنت سے اُن کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئیں جب ناصر چچا کمرے میں آئے تو وہ تینوں اٹھیں اور بڑی تمکنت سے ان کے قریب پہنچیں۔ ان کی قائد خاتون کے ہاتھ میں دو ڈبّے تھے اور بھاری بھاری اطلسی غرارے پہنے فرش پر ایک قطار میں چلتے ہوئے انھیں دیکھ کر مجھے "مشرق کے تین مجوسی بادشاہوں" کا خیال آیا جو حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے متعلق تصاویر میں منقش بادوں میں ملبوس ہاتھ میں تحفے اٹھائے ایک قطار میں چلتے دکھائے جاتے ہیں۔ قائد خاتون نے ڈبہ کھول کر ایک تصویر چچا کے ملاحظہ کے لیے پیش کی)۔ انھوں نے تصویر کو سرسری نظر سے دیکھا اور میز پر رکھ دیا۔ ان بیویوں نے تقریباً یک زبان ہو کر بڑی کے سے انداز میں کہا کہ بات طے ہو گئی ہے اور کل شام کو وہ منگنی کی رسم ادا کرنے لڑکی والوں کے گھر جا رہی ہیں۔ پھر انھوں نے ڈبہ کھول کر ایک انگوٹھی نکالی اور کہا کہ یہ ہم نے جوہری کے ہاں سے خرید لی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے گریس کو آواز دی اور جب وہ کمرے میں آئی تو اس سے کہا کہ گیارہ سیر مٹھائی، گیارہ سیر پھل اور گیارہ سیر خشک میوہ خرید لاتے اور کل شام کے پانچ بجے تیار رہے۔ یہ حکم دے کر تینوں بیبیاں اسی طرح سرسراتی ہوئی زینے سے نیچے اتر گئیں۔

یہ تینوں بیبیاں ناصر چچا کے ایک مقامی دوست کی بیوی، بھاوج اور بہن تھیں اور ارجمند بھابی، سرفراز دلہن اور حمیدہ بہن کہلاتی تھیں اور کئی برس سے چچا سے مصر تھیں کہ اب ان کو اپنا گھر بسا لینا چاہیے۔ یہ تینوں چچا کی بہن اور بھاوج بنی ہوئی تھیں اور ان کے خاندان والیوں کی حیثیت سے انھوں نے لڑکی پسند بھی کر لی تھی۔ اور ناصر چچا کو محض یہ اطلاع دینے آئی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم نے اس طرح زبردستی سے کام نہ لیا تو ناصر بھائی تو ساری عمر اسی طرح گذار دیں گے۔ اور گھر کا گھروا ہو جائے گا اور دکھیا اصغر کی جورو بڑی تکلیف ہوگی، وہ الگ۔

ناصر چچا بہت دنوں تک شدت سے انکار کرتے رہے تھے مگر غالباً اصغر کی تربیت کا خیال کر کے انھوں نے اب آن کے حامی بھر لی تھی۔ کیونکہ لڑکی خاص الخاص لکھنؤ کے ایک ایرانی نژاد خاندان کی تھی اور کم از کم اس کی وجہ سے اصغر کا زبان اور لہجہ تو سدھر جائے گا۔

شام کو انھوں نے ابا جان سے کہا:

"حمیدہ بہن تو نسبت ہی طے کر آئی ہیں، مگر لڑکی والوں کی شرط یہ ہے کہ ساری رسمیں ادا کریں گے۔ یہ سخت چھچھورے پن کی بات ہے۔ لاحول ولاقوۃ ——" پھر انھوں نے مڑ کر مجھے دیکھا، جو حسب معمول جنگلے پر لٹک رہی تھی۔ اور کہا "کیوں صاحب —— یہ بھی ہو گیا"

دوسرے روز گریس بازار سے سارا سامان خرید لائی اور گودام میں جا کر دو بڑے صندوق کھولے جن میں سیٹھ جی کا سامان مقفل تھا۔ میں سائے کی طرح گریس کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور بڑے اشتیاق سے ساری تیاریوں کو دیکھ رہی تھی۔ گریس نے صندوق کھول کر گوٹے لچکے کے خوان پوش نکالے —— "یہ میم صاحب نے اپنے ہاتھ سے بنائے تھے۔" اس نے کہا اور آنسو کا ایک قطرہ پیٹ سے سرخ پونچھ کے ایک خوان پوش پر گر گیا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں جا کر تیار ہوئی۔ پھولدار جارجٹ کی ساری پہنی۔ بالوں میں بینی سجائی، اور سانولے چہرے پر سفید پاؤڈر لگا کر باہر نکلی۔

"بڑی پیاری ساری ہے گریس ——" میں نے کہا۔

"یہ ہمارا میم صاحب دیا تھا" اس نے نیچی آواز میں کہا۔ "میم صاحب ہمیشہ غرارہ پہنتا تھا۔ اپنا ساری ہم کو دے دیتا تھا۔ ہم نے سب پیٹی میں رکھ چھوڑا ہے۔"

میں بھی ایک گلابی اور گندمی کا پارٹی فراک پہن، بالوں میں ربن لگا، موزے جوتے ڈانٹ ڈپٹ سننے کے لیے مستعد ہو چکی تھی، اور دلہن کو دیکھنے کے اشتیاق میں مری جا رہی تھی۔

ارجمند بھابی کی بیوک میں سوار ہو کر قافلہ عمر پارک روانہ ہوا۔

لڑکی کے گھر پہنچ کر ہم لوگ ایک جلوس کی صورت میں زینے کی سمت بڑھے۔ جلوس کی قائد ارجمند بھابی تھیں پیچھے پیچھے گریس نے مٹھائی کا خوان اٹھا رکھا تھا اور جمیلہ بہن کی خادماؤں نے بقیہ کشتیاں اور سینیاں سنبھالی ہوئی تھیں۔ انگوٹھی کی سرخ ڈبیہ سرفراز دلہن کے پرس میں محفوظ تھی۔ دروازے پر کمخواب غراروں میں ملبوس بہت سی دلی اور یوپی بیبیوں نے ہمارا سواگت کیا اور اوپر لے گئیں۔

ان کے ذرا اندھیرے سے ڈرائنگ روم میں قسم قسم کا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ شیشے کی ایک بڑی سی الماری میں چاندی اور رائل البرٹ کے ظروف اور سیلولائیڈ کے بڑے اور چھوٹے کھلونے اور سیپیاں اور گھونگھے اور چھوٹا سا تاج محل اور خاندان کے سپوتوں کے جیتے ہوئے کپ اور ٹرافیاں اور دوسرا الم غلم اٹا لوٹ بھرا ہوا تھا۔ کارنس پر سگھڑ بیبیوں کے ہاتھ کے سیاہ مخمل پر کاڑھے ہوئے سارس اور طوطے فریموں میں مزین تھے۔ کرسیوں اور صوفوں کے ان گنت سائٹن کے کشنوں پر مزید سارس اور طوطے اور بڑا سا سایہ پہنے چھتری اٹھائے ہولی ہوکس کے پودے کے پاس کھڑی ہوئی میمیں کڑھی تھیں۔

ہم لوگ صوفوں پر بٹھا دیے گئے۔ گریس دوسری آیاؤں کے ساتھ گیلری میں کھڑی رہی۔ دروازے میں سے اس نے اس کمرے کو ذرا ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا۔ کیونکہ ناصر چچا کا جھلمل جھلمل کرتا ڈرائنگ روم بقول اس کے انگریز لوگ کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ سعیدہ چچی بے حد خوش ذوق تھیں اور ان کے ہاتھ کی سجائی ہوئی چیزیں گریس نے جوں کی توں اپنی اپنی جگہ پر رکھی رہنے دی تھیں اور اگر کوئی ملازم جھاڑ پونچھ کرتے میں کوئی چیز ایک انچ بھر اس کی جگہ سے سرکا دیتا تو وہ اسے کھانے کو دوڑتی تھی۔

تیکھی مگر دزدیدہ نگاہوں سے کمرے کا معائنہ کرنے کے بعد گریسی کواڑ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی)۔

ڈرائنگ روم سمدھیانے والیوں سے بھرنا شروع ہوا اور ہجوم کی وجہ سے دم گھٹنے لگا۔ گریسی کھڑے کھڑے تھک گئی ہوگی میں نے سوچا اور مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ اجنبیوں کے اس مجمع میں (اور اجنبیوں میں تینوں مجوسی بادشاہ یعنی ارجمند بھابی۔ سرفراز دلہن اور جمیلہ بہن بھی شامل تھیں) مجھے گریسی اچانک بہت اپنی معلوم ہوئی اور میرا جی چاہا کہ اس کی دوسراہٹ کے لیے جا کر اس کے پاس گیلری میں کھڑی ہو جاؤں۔ آخر میں نے اس سے کہا — "گریس ادھر آ کر بیٹھ جاؤ" وہ دروازے کے قریب ایک کرسی پر اس طرح ٹک گئی جیسے جلتی ہوئی انگیٹھی کے کنارے پر بیٹھی ہو اور اندر ہی اندر کھول رہی ہو۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ گریس کو اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے۔ اتنے میں بجلی فیل ہو گئی اور برقی پنکھا بند ہو جانے کی وجہ سے حبس بڑھ گیا۔ خواتین اصغر علی محمد علی کے وہاں کی خوشبوؤں سے مہک رہی تھیں۔ ان کی گودیوں میں ٹھنسے ہوئے بچے گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہے تھے۔ شور و غل اور گرمی کی وجہ سے جی لوٹا جا رہا تھا مگر ابھی چھم چھم کرتی دلہن آنے والی تھی اور اس کے بعد آئس کریم آئے گی۔ میں دونوں چیزوں کے انتظار میں صبر سے بیٹھی رہی۔ اتنے میں ایک دم ایک لمحے کے لیے سناٹا سا ہوا اور "لڑکی" (جو در اصل ایک بہت لمبی چوڑی، بھیم تحیم، گوری چٹی پینتیس سالہ مجرد خاتون تھیں) سر ذرا سا خم کیے اطمینان سے پٹر پٹر چلتی ہوئی آ کر دھم سے بیٹھ گئی اور صوفے کے اسپرنگ بج اٹھے۔

"ارے گریسی۔ ادھر آ —" جمیلہ بہن نے آواز دی "ذرا مصری کی تھالی تو لانا —"

گرلیس نے خاموشی سے ایک گنگا جمنی تھالی پیش کی اور اس پر سے مصری کی ڈلی اٹھا کر جمیلہ بہن نے مولا[۴] کا نام لیا اور پان اور ڈلی لڑکی کے منہ میں رکھی۔ امام ضامن باندھا اور انگوٹھی پہنائی۔ لڑکی ساری کارروائیاں ٹکر ٹکر دیکھا کی اور چند منٹ بعد اٹھ کر اسی طرح سپڑ سپڑ کرتی کمرے سے چلی گئی۔

مجھے بڑی سخت مایوسی ہوئی کیونکہ اپنے وہاں جتنی منگنیاں اور شادیاں میں نے دیکھی تھیں ان میں دلہنیں شرم کے مارے بالکل دوہری ہوئی جاتی تھیں۔

میزبان تو آمین چائے کے انتظامات میں مصروف ہوئیں اور تینوں مجوسی بادشاہ فوراً آپس میں کھسر پسر میں منہمک ہوگئے۔

"رنگت تو اُجلی ہے مگر ہے پھیکی تسلیم۔" ارجمند بھابی نے کہا۔

"اس غریب کی بیاہ کی عمر ہی نکل چکی ہے۔ میں کہے دیتی ہوں۔ چالیس کے پیٹے میں ہے۔" سرفراز دلہن نے کہا۔

"دلہن کی باتیں۔ چوبیس سال کی ہوگی حد سے حد دُلھیا۔"

"چونڈہ تو سفید ہو چلا ہے۔ رکھی ہے چوبیس سال کی" سرفراز دلہن نے کہا۔

"اے نہیں۔ نگوڑی اچھی خاصی ہے۔ نے ماں اور کیا — شریف لوگ ہیں۔ شیعہ۔ سید۔ دیکھیے بھابی۔" ارجمند بھابی نے کہا۔

"یہ تو سچ ہے اور پھر یہ کہ جو بندھ گیا سو موتی۔ راجہ کے گھر آئے رانی کہلائے۔" سرفراز دلہن نے کہا۔

چائے آئی۔ اور اب شرائط کا قضیہ شروع ہوا۔

"ہم نے نواب زادہ صاحب کو کہلوا دیا ہے۔ مہر ایک لاکھ سے کم نہیں بندھے گا" لڑکی کی ماں نے کہا۔

"اے بہن کیا غضب کرتی ہیں۔ ایک لاکھ —" ارجمند بھابی نے کہا۔

"ہمارے کے یہاں تو بہن شرعی مہر بندھتا ہے۔" سرفراز دلہن نے کہا۔

"اور پاندان کا خرچ پچاس روپے مہینہ —" لڑکی کی خالہ نے کہا۔

"ہمارے کے یہاں تو بہن شرطیں ہی نہیں ہوتیں —" ارجمند بھابی نے کہا۔

اب تمام حاضراتِ محفل نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا اور بڑا غل مچا۔ بچے اور زور زور سے رونے لگے، حبس بڑھتا گیا۔ اور مجھے اتنی گرمی اور حبس کی وجہ سے یکلخت چکر سا آگیا اور میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ میری سراسیمگی دیکھ کر گرلیس آگے بڑھی، اور اس نے اونچی آواز میں مضبوطی سے اعلان کیا —

"میم صاب — ہماری بابا گھر جانا مانگتا ہے۔"

تینوں مجوسی بادشاہ پاندان کے خرچ اور مہروں کے جھگڑے میں اس قدر پھنس چکے تھے کہ انھوں نے بھی فرار مناسب سمجھا۔ ارجمند بھابی دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اٹھیں "اچھا تو میں ان کو — جمیلہ کے بھائی کو — میرا مطلب ہے اپنے اُن کو — اپنے مسٹر کو بھیجوں گی۔ وہ آپ کے صاحب سے بات کریں گے — نوابزادہ صاحب نے — ہمارے ناصر بھائی نے تو سارا معاملہ ہم پر چھوڑ دیا ہے" ارجمند بھابی نے سمدھنوں سے کہا۔

جلوس زینہ اتر کر نیچے پہنچا۔

" اچھا بہن خدا حافظ "

" اللہ نگہبان "

" مہروں کا جو فیصلہ ہوا اطلاع جلد بھجوا دیجئے گا — اور بھی بچی کے لیے شمار پیغام تھے ، مگر ہم تو خاندان دیکھتے ہیں "

" اللہ حافظ — اللہ حافظ — "

جلوس ناصر چچا کے گھر واپس پہنچا ۔ ابا جان چند روز کے لیے کسی کام سے مدراس جا چکے تھے ۔ چچا برآمدے میں ٹہل رہے تھے اصغر ایک کونے میں بیٹھا میکینو سے کھیل رہا تھا ۔

" لے مبارک ہو ناصر بھائی — " ارجمند بھابی نے زینے ہی پر سے آواز دی ۔ " ماشاءاللہ سے چاند سی دلہن ملی ہے "

برآمدے میں پہنچ کر تینوں بیبیوں نے تقریباً یک زبان کہنا شروع کیا ۔

" سگھڑ ایسی کہ دسوں انگلیاں دسوں چراغ — اس کی کشیدہ کاری دیکھی تم نے دلہن ؟ میں کہتی ہوں اس اجڑے گھر میں چار چاند لگا دے گی ۔ کیوں دلہن ؟ " ارجمند بھابی نے کہا ۔

" یہ تو ہے ہی " سرفراز دلہن نے کہا ۔

" اور لڑکی کے باپ جہیز میں موٹر دینے کو کہہ رہے ہیں " جمیلہ بہن نے کہا ۔

" بس اب وہ جھٹ جم اس گھر میں آکر اترے — ہم تو اپنے بھائی کی خوشی چاہتے ہیں " ارجمند بھابی نے کہا ۔

" یہ تو ہی ہے — " سرفراز دلہن نے کہا ۔

ناصر چچا سگار کی راکھ جھاڑ کر مسکرائے ۔ اور تینوں بیبیوں کی اس گفتگو سے بہت محظوظ نظر آئے ۔ ناصر چچا شدید سنس آف ہیومر کے مالک تھے ۔

گریس خوان پوش اور سینیاں واپس رکھنے کے لیے گودام کی طرف جا چکی تھی ۔

اس رات چچا کہیں ملنے ملانے چلے گئے ۔ علی اصغر اپنے کمرے میں سو چکا تھا ۔ میں سارے گھر میں ادھر ادھر گھومتی پھری ۔ چچا کے البم کی ساری تصویریں دوبارہ دیکھ ڈالیں جن میں ایک بہت پیاری سی شکل کی سعیدہ چچی نفیس غراروں میں ملبوس ، گود میں علی اصغر کو اٹھائے کھڑی تھیں ۔ یا گریس علی اصغر کو بچہ گاڑی میں ٹھہا رہی تھی اور سعیدہ چچی پاس کھڑی ہنس رہی تھیں ۔ دارجیلنگ ۔ کلکتہ ۔ مہابلیشور ۔ پونا ، ہر جگہ ناصر چچا اور سعیدہ چچی اکٹھے اور کس قدر مسرور نظر آ رہے تھے ۔

دفعتاً گریس کے کمرے کی طرف سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی جانور غرّا رہا ہو ۔ عجیب غیر انسانی سی آواز ۔ میں جلدی سے پچھلے برآمدے میں سے نکل کر اُدھر گئی اور گریس کے کمرے کی کھڑکی میں جھانکا — حضرت مریمؑ کا مجسمہ گریس کے پلنگ کے سرہانے ایک چھوٹی سی میز پر رکھا رہتا تھا ۔ اس وقت گریس اس کے سامنے کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی اور ہل ہل کر راگ برساتی آواز میں کہہ رہی تھی ۔

" یو سو اینڈ سو — ہم تمہارے دیول میں اکھا نو ہفتے کا " نوونیا [1] بنایا ۔ تمہارا دیول کا چکر لگاتے لگاتے ہمارا پاؤں تھک گیا ۔ تمہاری

---

[1] NOVENA

پہاڑی کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ہمارا جان نکل گیا۔ روزیٹری کرتے کرتے ہمارا عقل چکرا گیا۔ ہمارا کھوپڑی پلپلا ہو گیا۔ ہمارا مگج گھوم گیا۔ اور تم نے ہمارے ساتھ تو ٹونٹی کیا۔ تم ایک ڈم کنڈم ہے ۔۔۔ تم اور تمہارا دلارا بیٹا دونوں کنڈم ۔۔ ڈیم فراڈ ۔۔ دیکھ لی تمہاری خدائی۔ " تو" اینڈ " بیٹی" اینڈ "مری" ۔۔۔ اس نے زور سے پھونک مار کر شمع بجھا دی اور بڑے استہزا اور حقارت سے منہ چڑا کر بولی ۔۔" بڑی درجن بیری بنتی ہے۔ ورجن میری۔ ورجن میری ۔۔" پھر اس نے اپنا سر میز کے کنارے پر رگڑنا شروع کر دیا۔

اس کا چہرہ بدلا ہوا تھا۔ جیسے وہ شدید اندرونی جسمانی کرب میں مبتلا ہو۔ میں ڈر ہی گئی۔ یہ کوئی دوسری گریس تھی۔ یہ وہ گریس نہیں تھی جو بڑے پیار سے میرے فراکوں پر استری کرتی تھی۔ مجھے اپنے ساتھ بازار لے جاتی تھی اور میرے لیے چاکلیٹ خریدتی تھی۔ جو رات کو مجھے گوا کی لوک کہانیاں، کونکنی گانے اور پرتگالی دُھن میں گوا کے لوک گیت سناتی تھی۔ یہ کوئی دیوانی تھی۔ یا کوئی ایسی بدروح جسے سخت ترین سزا دی گئی ہو اور جس کے جسم پر کوڑے لگائے جا رہے ہوں۔ مگر وہ کوڑے نظر نہ آتے ہوں۔

کوڑے مجھے بھی نظر نہ آئے۔ لیکن اتنا احساس ضرور ہوا کہ اسے بہت شدید تکلیف ہے۔ درد قولنج یا اپنڈی سائیٹس کا دورہ پڑا ہے، کیونکہ ایسا سُنا ہوا اور انتہائی اذیت میں مبتلا چہرہ میں نے لکھنؤ میں ایک مرتبہ اپنی ایک کزن کا دیکھا تھا جنھیں اپنڈی سائیٹس ہوا تھا۔

جناب مریمؑ سے اس کے جس قسم کے بے تکلف تعلقات تھے ان کو دیکھتے ہوئے اس کا یہ غصّہ تو جائز تھا مگر وہ تو جناب مریم کو باقاعدہ گالیاں دے رہی تھی ۔۔ مجھے اور زیادہ ڈر لگا۔ اب گریسی کے سر پر جھیت گر پڑے گی۔ وہ حضرت مریم علیہ السلام کی شان میں گستاخی کر رہی ہے۔

پھر مجھے فوراً خیال آیا کہ اس بے وقوف کو چاہیے کہ ڈاکٹر کو فون کرے۔ حضرت مریمؑ ڈاکٹر تو ہیں نہیں کہ میز پر گرد یا ایسی کھڑی کھڑی اسے نسخہ لکھ کر دے دیں گی۔

میں کھڑکی میں متحیر اور پریشان کھڑی رہی۔ دفعتاً مجھے نچلی منزل والی مسز ربیکا ابراہام کی بات یاد آئی جنھوں نے کل ہی مجھ سے کہا تھا کہ عیسائیوں کا یہ عیسیٰ و مریم کا چکر بڑا سخت گناہ ہے۔ عیسائیوں نے سچے دینِ موسوی کو مسخ کر دیا۔ خدائے واحد کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جو شدید کفر کی بات ہے اور شرک گناہِ عظیم ہے اور اسی وجہ سے یہ سارے مشرکین سیدھے جہنم میں جائیں گے۔

"گریسی بھی جہنم میں جائے گی؟" میں نے فکرمند ہو کر پوچھا تھا۔

" ہاں، اگر وہ راہِ راست پہ نہ آئی اور عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا اور خدا مانتی رہی تو دوزخ کے علاوہ اس کا ٹھکانہ اور کہیں نہیں ہے۔ خدا کے منتخب بندے صرف بنی اسرائیل ہیں۔"

میں گریس کے اس خوفناک مستقبل کے مسئلے پہ ابا جان یا ناصر چچا سے سوالات کرنے ہی والی تھی کہ ابا جان مدراس چلے گئے اور گھر میں منگنی کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔

میں دہشت زدہ سی دریچے کے باہر کھڑی رہی اور سمجھ میں نہ آیا کہ گریسی کی کس طرح مدد کروں۔

اب اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ رہا تھا اور وہ پُرسکون آواز میں آہستہ آہستہ انگریزی میں کہہ رہی تھی ۔۔۔ ماں ۔۔ تم

لے ROSARY (تسبیح)

منہ سے مسکرائے جا رہی ہو — تم تو بیس برس کی عمر میں بیوہ نہیں ہوئیں — تم تو جانتی ہی نہیں کہ آدمی کا پیار کیسا ہوتا ہے تم نے تو دس برس تک در در کی ٹھوکریں نہیں کھائیں۔ تم تو فٹ پاتھ پر کبھی نہیں سوئیں۔ تمہیں کیا پتہ کہ سیکیورٹی اور کمفرٹ اور پوزیشن کا کیا مطلب ہے۔

تمہارے اکلوتے بیٹے پر تو کوئی سوتیلی ماں نہیں آئی۔ تم کو پتہ بھی نہیں سوتیلی ماں کیسی ہوتی ہے — مدر — دیوا چے ماتے — دیوا چے ماتے ؂" اس نے اپنے ہاتھ میز پر پھیلا کر مجسمہ باہنوں کے حلقے میں لے لیا اور اس کے ننھے منے سفید پیروں پر سر رکھ کر چپ ہو گئی۔

میں کھڑکی میں سے ہٹ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ دنیا واقعی حد سے زیادہ پُراسرار تھی۔ پھر میں نے رابعہ آپا اور رضوان بھائی کے متعلق سوچنا شروع کیا جو میرے بڑے محبت والے اور دلچسپ کزن تھے، اور جن کے گھر میں صبح کو جانے والی تھی۔ خوش ہو ہو کر یہ سوچتے ہوئے کہ ماٹنگا میں کتنے مزے آئیں گے تھوڑی دیر بعد میں سو گئی۔

دوسرے روز صبح سویرے رابعہ آپا اور رضوان بھائی مجھے اپنے وہاں ماٹنگا لے گئے۔ یہ ایک نوجوان جوڑا تھا اور ان کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ ان کے وہاں ہر وقت ان کے ہم عمر دوستوں کا مجمع رہتا اور خوب ہُو حق ہوتی۔ ان کا چھوٹا سا فلیٹ ناصر چچا کے خاموش مکان کے مقابلے میں بہت پر رونق تھا۔ پڑوس میں ایک نامور فلمی اداکار کا گھر تھا جس کے دو موٹے موٹے لڑکے سامنے خاموش سڑک پر رولر اسکیٹنگ کیا کرتے اور ان کا پشاوری ملازم گل زینے میں کھاٹ پر لیٹا حقہ گڑگڑایا کرتا اور بچوں کو ڈانٹتا رہتا دوپہر کو سڑک کے آمنے سامنے ساری رہائشی عمارتوں میں ایک سد ریڈیو پر فلمی ریکارڈ بجتے۔

اور کانن دیوی کی سُریلی آواز سناٹے میں گونجتی "من میرے آندھی بن جا — اور "تم من موہن — تم سکھیں سنگ ہنس ہنس کھیلو پھاگ — میری دنیا سونی کر کے بستی نئی بسائی تو نے — اب میں جا کر کسے سناؤں اپنے من کا راگ —" اور برابر کے فلیٹ میں ایک سکھ لڑکی ان ریکارڈوں کے ساتھ ساتھ آواز ملا کر گایا کرتی۔

چند روز بعد ابا جان مدراس سے لوٹ کر ماٹنگا آ گئے اور اس کے اگلے ہفتے جب ہم ناصر چچا کے گھر واپس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں ایک کرائسس آ کر گذر چکا ہے۔

اس وقت شام کے پانچ بجے تھے۔ برآمدے میں ارجمند بھابی، سرفراز دلہن اور جمیلہ بہن بیدکی کرسیوں پر براجمان تھیں۔ کرسی ساری کا پلو کمرے کھونٹے دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ ناصر چچا حسبِ عادت پائپ ہاتھ میں لیے ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔

ارجمند بھابی کہہ رہی تھیں — "اے میں تو کہتی ہوں اللہ کا شکر ہے کہ ہزار پانچ سو ہی کے ماتھے گئی۔ اگر کہیں خدانخواستہ دو بول پڑھائے ہوتے اور پھر یہ معلوم ہوتا تو ناصر بھائی کیا کچہری چڑھتے خدانخواستہ الٹی آنتیں گلے پڑ جاتیں۔ شریفوں میں چھیتم چھیٹا، فارغ خطی، خلع طلاق کے ٹنٹوں کا کسے دماغ ہے —"

"جبھی تو میں کہوں کہ اس کی ماں ایک لاکھ مہر پر کیوں اڑی ہوئی تھیں — سرفراز دلہن نے کہا۔

ابا جان کو اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر ناصر چچا نے آواز دی — ارے بھئی — وہ شادی ہماری — الغط ہو گئی۔"

؂ خدا کی ماں

"ارے — کیوں؟ خیریت؟" ابا جان نے ٹھٹھک کر پوچھا۔

"لڑکی کو مالیخولیا ہے" ناصر چچا نے مختصر جواب دیا۔

"اوہو — بڑا افسوس ہوا —" ابا جان بولے۔

"لڑکی کو ہسٹریا کے دورے پڑنے ہیں بھائی صاحب —"

ارجمند بھابی نے سر پہ دوپٹہ سنوارتے ہوئے ابا جان سے وضاحت کی "ان لوگوں نے چھپا رکھا تھا۔ میں نے جو ٹوہ لگائی تو معتبر ذرائع سے پتہ چل گیا — بڑی اللہ قسم خیریت ہو گئی۔ میں تو ناصر بھائی سے کہہ رہی ہوں کہ شکرانے کی مجلس کروائیں۔"

"میرا تو پہلے ہی شادی کا ارادہ نہ تھا۔ یہی لوگ پیچھے پڑی تھیں۔ اب کہتی ہیں کہ لڑکی بالکل تیتا مزاج ہے۔ اور ہسٹریا کی مریض بھی ہے۔ تو بھائی ممکن ہے یہ اطلاع غلط ہی ہو مگر میں اس شہر میں آن کر یہ RISK نہیں لے سکتا — یہ میرے ساتھ بھی بے انصافی ہوگی اور اس لڑکی کے ساتھ بھی —"

ابا جان ہاتھ منہ دھونے کے لیے اندر چلے گئے۔

ارجمند بھابی نے سلسلہ گفتگو جاری رکھا — "میں بڑی چیز اٹھا کر آپ سے کہتی ہوں ناصر بھائی مجھے نہایت ہی معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہوا ہے —"

"جبھی تو میں کہوں کہ اس روز اس کی شکل پر کیسی وحشت برس رہی تھی بلکہ وحشت کیا ایک قسم کی نحوست — پھٹکار اک دم —" سرفراز دلہن نے کہا۔

"اور شکل بھی کیا تھی — بس رنگ ہی رنگ تھا۔ طباق البسا منہ، طبق الی بانقل" جمیلہ بہن نے کہا۔

"اور ڈیل دیکھا کیسا بے ہنگم تھا؟ بھاوڑا ایسے پاؤں۔ کھرپا ایسے ہاتھ۔ بے حیائی دیکھو کہ گھونگٹ تک نہ کاڑھا۔ بمبئی میں پڑ کر بالکل میم بن گئیں — ٹوکا لگاؤں ایسی عورت کو میں —" سرفراز دلہن نے کہا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اسی لڑکی کو یہ لوگ اس روز چندے آفتاب چندے ماہتاب بتا رہی تھیں جس کی دسوں انگلیاں دسوں چراغ تھے اور آج اس میں اتنے کیڑے کیسے پڑ گئے۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"مگر بھابی —" جمیلہ بہن کہہ رہی تھیں — "اس وقت تو منگنی کے وقت تو وہ بالکل اچھی بھلی بیٹھی تھی۔"

"اے دولی — تو کیا سب کے سامنے ایسے موقع پر رونے چلانے لگتی؟ ہسٹریا کے مریضوں کے سر پہ سینگ تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ کسی ایک ذری سی بات سے پتہ چل جاتا ہے۔ اب جب اسے معلوم ہوگا کہ نسبت ٹوٹ گئی تو زمین آسمان ایک کر دے گی — اللہ توبہ توبہ توبہ — خدا بری گھڑی سے بچائے بہن میرے آگے بھی لڑکیاں ہیں —" ارجمند بھابی نے جواب دیا۔

"یہ تو ہی ہے — اور اس کی اماں خالہ بھی اسی لیے یہ بات چھپائے تھیں۔ اس کی خوش مزاجی ہی کی تعریفیں کر رہی تھیں۔ سچ ہے بہن کنجڑن اپنے بیر کھٹے نہیں بتاتی۔" سرفراز دلہن نے کہا۔

"جھلسا لگاؤں میں تو —" جمیلہ بہن نے کہا۔

۱؎ قرآن شریف

"کبھی تو میں کہوں کہ اتنے دن شادی کیوں نہ ہوئی؟" سرفراز دلہن نے کہا۔

"ارے میں تو کبھی کھٹک گئی تھی کہ جو چھتیس سینتیس برس کی عمر ہوئی اور کنواری بیٹھی ہے۔ کوئی تو نئی ہوئی لڑکی ہیں۔ تو اب عقدہ کھل گیا۔ ورنہ اتنا دولت مند باپ اور اچھی خاصی صورت۔ تو کنوار کو ہاں یونہی چھپا رہا ہے؟" جمیلہ بہن نے کہا۔

"بڑا تعصب ہو جاتا ہے ان آدمی گھر لیتا ہے اپنے تسلسل بہن کے لیے نہ یہ بیٹے سے دیئے پڑ جاتے ہیں۔ نیم خبطی بیوی بچے پڑھے لکھے عمدہ تا روک سکے" ارجمند بھائی نے کہا۔

"ہاں ہاں بچ گئے ناصر بھائی" سرفراز دلہن نے کہا۔

"اچھا بھئی اب اس قصے کو یہیں ختم کرنا چاہیے۔ اب اس کے متعلق زیادہ تبادلہ خیالات کرنے کی ضرورت نہیں۔" ناصر چچا نے متانت سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

"اے بی گریس" ارجمند بھائی نے ذرا پراسرار انداز میں کھنکار کر آواز دی — "ذرا ایک گلاس پانی تو پلانا۔"

گریس پانی کا جگ اور گلاس لے کر آئی۔ خواتین ناصر چچا کی منگنی اور متعلقہ مسائل پر بدستور زور و شور سے اظہار خیال کرتی رہیں۔ اب وہ تین موٹی تازی لیگ ہارن مرغیوں کی مانند بڑی طمانیت سے کلک کلک کر رہی تھیں۔

شام کو میں ابا جان کے ساتھ گھومنے کے لیے چلی گئی۔ بوری بندر کی ایک بک اسٹال سے مکی ماؤس کے رسالے خریدے اور خوش خوش واپس ہوئی۔

رات کو، ابا جان اور ناصر چچا کہیں دعوت میں چلے گئے اور مجھ سے کہتے گئے کہ میں گریس کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لوں۔ مون سون کی جھڑی کئی دن سے لگی ہوئی تھی اور اس وقت باد و باراں کا شور زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ علی اصغر چچا کے کمرے میں سوتا تھا اور گریس اسے سلا کر اپنے کمرے کی طرف جا چکی تھی۔ میں مکی ماؤس کے رسالے پڑھنے میں محو تھی اور باہر برستی ہوئی بارش کے مقابلے میں اونچی دیواروں اور ملتانی پردوں والے اس وسیع اور آرام دہ کمرے میں، چمڑے کے گدیلوں والی آرام کرسی پر بیٹھی مکی ماؤس پڑھتی خود کو بے حد محفوظ محسوس کر رہی تھی۔

لیکن کچھ دیر بعد طوفان کا زور بڑھ گیا تو کھڑکیاں بند کروانے کے لیے میں نے گریس کو آواز دی۔

کوئی جواب نہ ملا تو پچھلے برآمدے سے گزرتی اس کے کمرے میں پہنچی۔ سمندر پر بجلی بار بار چمک رہی تھی۔

گریس کے مختصر سے کمرے میں داخل ہو کر دفعتاً ایسا لگا جیسے طوفان میں گھرے ہوئے جہاز کے ہچکولوں سے ہٹ کر پرسکون بند کیبن میں آ گئی ہوں۔ "ہیل میری فل آف گریس[1] —" کمرے میں گریس کی آواز گونجی۔ پھر اس نے کونکنی میں HAIL MARY شروع کیا —

"نمان موریے کرپی بھرولے سومی تجے سنگاتا استرام بتر تو سد یو فال تجے کُشی چے جیزس —"

وہ موم بتیاں جلاتی گئی اور ہل ہل کر کہتی گئی — "ماں تم ایک دم فرسٹ کلاس ہو ماں — تم نے ہمارا تو دنیا قبول کر لیا ماں — سنتا موریے دیواچے مائے اپیا پیا گیتر دناتی کر — آمین — ان آمنہ بابا پانی بترا اسپریتا سنتاچے — آمین — دسا ادی تسلیاتا ن رلا سرونا — آمین —"

میرے قدموں کی آہٹ پر وہ چونک کر پیچھے مڑی اور مجھے دیکھ کر ذرا گھبرا گئی اور غصے سے کہا — "تم اس ٹائم ادھر کیا کرنے

---

[1] HAIL MARY, FULL OF GRACE.

آیا ہے۔ جاکر سو جاؤ ــــ"

"سمندر میں طوفان آرہا ہے گریسی۔ میں تمہیں بلانے آئی تھی کہ چل کر میرے کمرے میں بیٹھو۔" میں نے لجاجت سے کہا۔
دفعتاً شفقت اور محبت کا سیلاب اس کی آنکھوں سے امنڈ پڑا۔

"کم ہیر ڈارلنگ ــ" اس نے خالص میموں والے لہجے میں کہا ــ اور مجھے بچکار کر میرے سر پر ہاتھ ۔" ٹافی مانگتا ــ ؟"

" یس پلیز۔ گریسی۔"

وہ اٹھی اور الماری میں سے "بلیک میجک" کا ڈبہ نکالا۔

ٹافی کی ڈلی منہ میں ڈالتے ہوئے میں نے سوال کیا ــ

" گریسی ــ نووینا کیا ہوتا ہے ؟"

" اوہ یو ڈیم نوزی پارکر ؎ ــ" اس نے مصنوعی خفگی سے کہا اور یکلخت بڑی پریشان نظر آئی۔

" نہیں ہمیں ضرور بتاؤ گریسی۔ ہم بھی نووینا کریں گے۔"

" اچھا، ہم تم کو بتائے گا۔ بٹ تم پرومیس کرو کہ کسی کو نہیں بولے گا۔"

" پرومس گریسی !"

" اچھا۔ ادھر باندرہ پر ماؤنٹ مری ہے نا۔ ادھر ہم لوگ کا بہت بڑا دیول ہے۔ ادھر جاکر پریئر کرو تو ورجن دعا سن لیتا ہے ــ اور ماہم میں ایک اور دیول ہے چرچ آف سینٹ مائیکل ــ اس میں ورجن کا ایک فوٹو ہے۔ اینڈ وہ فوٹو مریکل ؎ کرتا ہے۔"

" مریکل ــ گریسی ؟"

" یس ــ ادھر تم پورا نو بدھ وارز تک جاکر دعا مانگے تو تمہارا وش پورا ہو جائے گا۔ ہم نے نووینا چالو کیا اور نائن ویڈنس ڈے پورا کیا۔ پچھلے دن ہم ورجن سے گستہ ہو گیا تھا، مگر ورجن نے ہمارے لیے مریکل کر دیا۔"

" مریکل ــ گریسی ــ ؟"

" چلو ــ چلو ــ" اس نے سرعت سے کہا۔" اپنے پلنگ میں جاؤ ــ بہت لیٹ ہو گیا۔ پھر اس نے اپنی جناتی انگریزی شروع کر دی۔ جب وہ بہت غصے میں یا بہت زیادہ خوش ہوتی تھی تو اپنی بے نقط کی اڑنگ بڑنگ انگریزی بولتی تھی۔ اس وقت وہ بے انتہا مسرور اور مطمئن نظر آرہی تھی۔

" اچھا۔ مگر کل تم بتاؤ گی کہ مریکل کیسا ہوتا ہے ؟" میں نے پوچھا اس نے میری بات ٹال دی اور میرے ساتھ ساتھ بیڈ روم کی طرف چلنے لگی۔ کمرے میں آکر اس نے دریچے بند کیے۔ میرے صبح کے کپڑے نکال کر کرسی پر رکھے اور پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔

مجھے خیال آیا کہ اسے اس وقت اپنی ڈیوٹی بجا لانے کے لیے میرے پاس بیٹھنا پڑ رہا ہے۔ اور میں نے سوچا کہ ہم مسلمانوں کی نماز میں کوئی مخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں جا کر گریس کی نماز میں مخل ہو گئی تھی۔ اور یہ اس کی بعد اہم نماز تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس رات کی گستاخی کے بعد آج حضرت مریمؑ سے معافی چاہ رہی تھی۔

MIRACLE ؎ NOSEY PARKER ؎

جوتے اور موزے اتارتے ہوئے میں نے کہا۔ گریسی — اب مجھے بالکل ڈر نہیں لگ رہا۔ تم جا کر اپنی بیڈ پر کرو —"
"ٹو — ٹو —"
"گڈ نائٹ گریسی —" میں نے مسہری پر بیٹھ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔
"آر یو شیور — ؟ کین آئی گو —؟"
"گڈ نائٹ گریسی —"

اس رات ٹوٹ کر بارش ہوئی۔ اور سمندر کسی مہیب جانور کی طرح چنگھاڑتا رہا۔ سمندر کی آواز خوفناک تھی۔ میں نے چادر کو اچھی طرح اوڑھ لپیٹ لیا اور جب ابا جان دعوت سے واپس آئے میں گہری نیند سو چکی تھی۔

صبح کو ہر چیز دھلی دھلائی اور نکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ سمندر پُر سکون تھا اور بے حد نیلا۔ دور۔ پی اینڈ او کا ایک بے حد طویل اور بے حد سفید جہاز دو فاصلے سے تیرتا ہوا لہروں پر سے گزر رہا تھا۔ نیچے سڑک پر مچھلی والیوں نے آوازیں لگانی شروع کر دی تھیں۔ کوارٹروں میں ناظرین کی خوبصورت بیوی پانی کے نل کے پاس کھڑی آسمان پر پھیلی ہوئی مونسون کی گھٹاؤں کو دیکھ رہی تھی اور آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔ سامنے کے برآمدے میں تازہ اخبار آ گئے تھے۔ ابا جان اور ناصر چچا آرام کرسیوں پر بیٹھے چاء پی رہے تھے اور گریسی حسب معمول اطمینان اور مصروفیت سے کھانے کے کمرے میں سٹر پٹر کر رہی تھی اور ناصر چچا سے پوچھ رہی تھی کہ ٹرین میں ساتھ لے جانے کے لیے کیا ٹفن بنے گا — اگلے ہفتے میرا اسکول کھلنے والا تھا اور سہ پہر کی ٹرین سے ابا جان اور میں لکھنؤ واپس جا رہے تھے۔

میں تیار ہو کر برآمدے میں آئی تو ناصر چچا نے اخبار اپنے چہرے کے سامنے سے ہٹایا — عینک اتار کر میز پر رکھی اور شگفتگی سے پوچھا — "کہیے صاحب، یہ بھی ہو گیا — ؟"

پاکستان بنے ڈیڑھ سال گزر چکا تھا۔ سن ۴۹ء کے آخر میں میں لاہور گئی تو معلوم ہوا کہ ناصر چچا ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد بمبئی سے لاہور آ گئے ہیں۔ ایک روز میرے جائے قیام پر ان کا فون آیا کہ وہ علی اصغر کو کار لے کر بھیج دیں گے تاکہ وہ مجھے ان کے وہاں ماڈل ٹاؤن لے آئے۔

دوسرے روز صبح کو علی اصغر ایک لمبی چوڑی کار لے کر آ پہنچا۔ اب وہ اٹھارہ سالہ نوجوان تھا۔ جونیر کیمبرج کے بعد اس نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا تھا اور اب تفریح میں مصروف تھا۔

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے علی اصغر —" کار میں بیٹھتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔

"اب ہم بزنس کرے گا۔ یہ کار ہمارے جس فرینڈ کا ہے ہم اس کی پارٹنر شپ میں کام شروع کرنے والا ہے" اس نے جواب دیا۔
اس کے بعد وہ راستے بھر خاموش رہا۔ اسے شاید اچھی طرح معلوم نہ تھا، اور نہ شاید جاننے کی پرواہ تھی کہ میں کون تھی اور میرا اس سے کیا رشتہ تھا۔

ARE YOU SURE? CAN I GO

"چچا کیسے ہیں — ؟" میں نے کچھ دیر بعد دریافت کیا۔

"— ؟" اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"تمہارے والد" میں نے وضاحت کی۔

"اوہ — ڈیڈی — ہی از آل رائٹ آئی سپوز" اس نے جواب دیا اور بڑے اسٹائل سے اور نہایت زنانٹے کے ساتھ ڈرائیو کرنے اور آہستہ آہستہ سیٹی بجانے میں مصروف رہا۔

"تمہیں یاد ہے علی اصغر — ایک مرتبہ ہم لوگ تمہارے وہاں بمبئی آئے تھے۔ یاد ہے ؟" میں نے ایک بار پھر بات کرنے کی سعی کی۔

"اوہ — ؟ یا — یا — یا — (YA، YA، YA) آئی ریممبر — ناٹ ویٹ یوٹیل می — تھوڑا سا یاد ہے" اس نے جواب دیا اور انگریزی دھن کی سیٹی بجانے میں مشغول ہو گیا۔

ماڈل ٹاؤن کی ایک کچی سڑک پر پہنچ کر اس نے جھونک کے ساتھ اسٹرئنگ وہیل گھمائی اور دھچکے کے ساتھ کار ایک پھاٹک کے سامنے روک لی۔ اور مجھے اتار کر آگے چلا گیا۔

ایک چھوٹی سی کوٹھی کے احاطے میں آم اور پپیتے کے چند درخت کھڑے تھے اور برآمدے کے سامنے گھاس کے ذرا سے قطعے پر ناصر چچا کرسی بچھائے دسمبر کی مدھم دھوپ میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ گھٹنے پر ایک ہاتھ رکھ کر ذرا دقت کے ساتھ کرسی سے اٹھے اور میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ میں دوسری کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گئی۔

بمبئی کے اس قیام کے بعد میں ناصر چچا سے اب ملی تھی اور اس طویل وقفے میں دنیا بدل چکی تھی اور کیسی بدلی تھی۔

ناصر چچا چند منٹ تک بالکل خاموش رہے۔ اور پھر آہستہ سے بولے —" سجاد، ہمارا دوست، ہمیں چوٹ دے گیا۔ اس دغابازی کی ہمیں اس سے امید نہیں تھی" — چند لمحوں بعد انھوں نے کہا —" مگر وہ اچھا ہی رہا۔ انقلاب اور شکستہ دلی کا سامنا کرنے سے بچ گیا۔ جنت میں مزے سے بیٹھا ہوگا اپنے —"

"جنت —" میرے حلق میں کوئی چیز آ اٹکی —" مرنے کے بعد روح یا جو کچھ بھی وہ ہے — وہ زندہ رہتی ہے چچا — ؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

ناصر چچا نے عینک ماتھے پر چڑھائی اور بھویں اٹھا کر مجھے بغور دیکھا۔" سوالات کی عادت تمہاری اب تک نہیں گئی۔ کیوں صاحب ؟ سوال کرنے چھوڑ دو — سمجھے صاحب — ورنہ زندگی میں تمہیں بہت دکھ ملیں گے — اور خدا نہ کرے کہ تمہیں دکھ ملیں —" پھر وہ کلمے کی انگلی اٹھا کر ہوا میں کچھ لکھتے رہے اور دفعتاً بولے —" ارے بھائی ہم نے سنا ہے تم افسانہ نگار بن گئی ہو — یہ تو ہمیں یاد ہی نہ رہا تھا اور ایک دم تیوری پر بل ڈال کر خفگی سے کہا" تم تو وہ" دلفگار مینڈک والا ادب تخلیق نہیں کرتیں — ؟"

"دلفگار مینڈک — ؟" میں نے تعجب سے دہرایا۔

"دیکھو — دیکھو یہ کیا واہیات خرافات ہے جو ادب کے نام سے پیش کی جا رہی ہے" انھوں نے میز پر سے ایک رسالہ اٹھایا جو غالباً تازہ ادبِ لطیف یا ادبی دنیا تھا — اور ایک جدید نظم نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کیا بکواس ہے — ؟ ایں — ؟ تم بھی یہی سب لکھتی ہو ؟ سجاد کی بیٹی — اگر یہ مہمل خرافات لکھ رہی ہے تو — تو —" غم و غصے سے انھوں نے رسالہ میز پر

بج دیا۔ میں نے چونک کر انھیں دیکھا۔ ناصر چچا بوڑھے ہوگئے تھے اور ہمیشہ کی طرح بہت پیارے تھے اور اس نئی دنیا اور اجنبی شہر کے اس اداس اجڑے ہوئے "ماڈل ٹاؤن" کی ایک کاٹیج کے ویران احاطے میں بہت بے بس، بے یار و مددگار سے بیٹھے ہوئے، ترقی پسند ادب پر گرجتے ہوئے وہ مجھے بےحد پیارے لگے۔

"مگر چچا — " میں نے دبی زبان سے کہا "اوّل تو میں دلفگار مینڈک نہیں لکھتی۔ دوسرے یہ کہ آپا جان تو اردو کے اوّلین ترقی پسندوں میں سے تھے۔ آپ نئے ادب سے اتنے خفا کیوں ہیں؟"

"مگر سجاد دلفگار مینڈک نہیں لکھتا تھا" انھوں نے گرج کر کہا — "ارے گریسی — " انھوں نے اسی رو میں آواز دی — "ادھر آؤ۔ دیکھو کون آیا ہے؟"

دوسرے لمحے ایک کھچڑی بالوں والی بوڑھی سی عورت ساری کا پلو کمر میں کھونسے جھاڑن سے ہاتھ پونچھتی برآمدے میں نمودار ہوئی۔ ذرا ٹھٹھکی اور قریب آ کر مجھے ذرا جھک کے اور آنکھیں پھاڑ کے دیکھا۔

"اری احمق الذین — پہچانی نہیں یہ کون ہے؟" چچا نے کہا۔

"اوہ — اوہ — مائی ڈارلنگ ڈارلنگ لٹل سویٹ لٹل گرل — " گریس نے چلا کر کہا اور مجھ سے لپٹ گئی۔

"ابھی یہ سسکیوں سے رونا شروع کر دے گی — " ناصر چچا نے ذرا غصے سے کہا "لاحول ولا قوۃ — گریسی — جاؤ۔ بی بی کے لیے کھانے کا انتظام کرو — خوب مزیدار چیزیں پکاؤ — " انھوں نے ایک بہت پرانی آواز میں اضافہ کیا۔

"کم اِن — کم اِن — باؤ آر یو مائی چائلڈ — تم ایلوننگ — " گریس نے حسبِ عادت مارے خوشی کے اپنی بے نقط کی انگریزی شروع کی، اور مجھے کاٹیج کے اندر لے گئی۔

یہ ایک بہت بڑی کوٹھی کے احاطے کے اندر بنا ہوا کاٹیج تھا جو غالباً تقسیم سے قبل ہندو مالک مکان کا مہمان خانہ رہا ہوگا اور ناصر چچا نے بھاگ دوڑ کر کے اسے اپنے نام الاٹ کروا لیا تھا۔ انھیں یہاں آئے تقریباً ایک سال ہو گیا تھا مگر گھر کے انداز سے ایسا لگتا تھا جیسے مسافروں کی طرح بیٹھے ہیں۔ میں نے بمبئی کے فلیٹ کی مانوس چیزوں کی تلاش میں نظریں دوڑائیں مگر سعیدہ چچی کی بڑی روغنی تصویر کے علاوہ اور کوئی چیز اس جگہ پر ماضی سے منسلک نہ تھی۔ چچا پرانی زندگی سے سارے رشتے منقطع کر چکے تھے۔ مجھے دفعتاً ایک بھیانک سا خیال آیا۔ کہ شاید ناصر چچا اب زیادہ دن زندہ نہ رہیں گے۔ دوسرے لمحے مجھے اپنے اس خیال پر بڑا غصہ آیا کہ میں نے ایسی بدشگونی کی بات کیوں سوچی۔

گریسی تیز تیز بولتی ہوئی مجھے باورچی خانے میں لے گئی جو اس نے حسبِ معمول بہت صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔ کھڑکی میں تازہ پھولوں سے بھرا گلدان تک دھرا تھا۔ اس نے فوراً کھانے ریندھنے کا انتظام شروع کر دیا۔ میں ایک مونڈھے پر بیٹھ کر اسے دیکھتی رہی۔

"گریس — تم تو بوڑھی ہو گئیں — " میں نے تاسف سے کہا۔

وہ انگیٹھی دہکاتے ہوئے میری طرف مڑی اور آہستہ سے بولی "میرا نام مت لو — مجھے گریس چچی کہو۔"

"اوہ — اچھا — " میں نے جواب دیا۔ انگیٹھی کا دھواں میری آنکھوں میں گھسا تو میں نے آنکھیں میچ لیں اور مجھے دفعتاً بمبئی کی وہ طوفانی رات یاد آ گئی جب گریسی نے جناب مریم سے جھگڑا کرنے کے بعد صلح کر لی تھی اور مجھے مرکل کے متعلق بتانے سے منکر رہی تھی۔ "مبارک ہو گریس چچی، تم اس عزت کی مستحق تھیں — " میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

گریس چچی نے سرعت سے پیڑے کاٹنے شروع کیے۔

"گریس چچی! تم نے ملازم نہیں رکھا۔ سارا کام خود کرتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارا انکل کا پنشن ادھر بہت دیری میں ملتا ہے۔ ہم لوگ کا سارا روپیہ ادھر پھنسا ہے۔ ہم لوگ کا بہت مشکل سے گذر ہوتا ہے اور نوکر کا کیا ضرورت ہے۔ تمہارا انکل کی خدمت کے لیے کیا ہم نہیں ہے؟" بالوں کی ایک کھچڑی لٹ پیشانی پر سے ہٹا کر انھوں نے کہا۔

"ادھر ہمارا بچہ ضد کیا کہ پاکستان جائے گا۔ بزنس کرے گا۔ بمبئی میں اس نے کچھ اسٹڈی نہیں کیا، اسکول چھوڑ دیا پھر ادھر اس کو سروس کیسے ملتا؟ پنشن کے بعد صاحب کلکتہ جا کر رہنا مانگتا تھا مگر ہم لوگ بچے کے خیال سے ادھر آگیا۔ ادھر بھی سب ٹھیک ہے۔ گاڈ از گڈ۔"

"چچا کی طبیعت کیسی ہے گریس چچی۔ ان کے پاؤں میں کچھ تکلیف ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"تمہارا انکل بہت بیمار رہتا ہے۔ بمبئی میں ہندو مسلمان کی مارا ماری کے زمانے میں موالی لوگ جگہ جگہ آگ لگاتا تھا۔ تمہارا انکل اسے بجھانے کے لیے سارے میں بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ ایک ہندو فیملی کو آگ سے بچانے میں اپنی ٹانگ توڑ دیا۔ چھ مہینے بستر پر پڑا رہا اس کے بعد سے اس کا سینز گر گیا۔ گاوٹ کا تکلیف زیادہ ہو گیا۔ ہائی بلڈ پریشر ہو گیا۔ اب اس کا غصہ بہت تیز ہو گیا ہے۔ ہمارا اتنا شاندار صاحب ایک دم بوڑھا ہو گیا۔ ایک دم اولڈ مین بن گیا۔ پھر انھوں نے خالص بیویوں کے انداز میں شکایت کرتے ہوئے کہا "ہم کہتا ہے کہ پرہیزی کھانا کھائے، مگر وہ اگرم بگرم کھانا مانگتا ہے اور ہم سے لڑتا ہے۔

"جب چھ سات برس ادھر ہم تمہارے انکل سے شادی بنایا تو اس کو بول دیا تھا کہ اگر تم ہمارے ساتھ کوئی نان سنس کرے گا تو ہم تمہیں چھوڑ کر چلا جائے گا — انھوں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"اب بیماری سے وہ بہت چڑچڑا ہو گیا ہے۔ خالی ہم اس کی بات سمجھ سکتا ہے۔ خالی ہم اس کی خدمت کر سکتا ہے۔ دنیا میں اس کا اب اور کوئی ساتھی نہیں ہے۔ اور ہم خدا سے اب صرف یہی مانگتا ہے کہ اپنے آخری سانس تک اس کی خدمت کرتا رہے۔" شاید دھوئیں کی وجہ سے گریس چچی کی آنکھ میں پانی آگیا تھا انھوں نے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور توا چڑھا دیا۔

"چچا ڈاکٹر سے علاج تو باقاعدہ کروا رہے ہیں نا؟ علاج میں تو ضد نہیں کرتے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت ضد کرتا ہے،" گریس چچی نے چپاتی بیلتے ہوئے جواب دیا "ابھی محرم میں ہم ادھر نواب قزلباش کے امام باڑے میں جا کر چاندی کا بڑا ضریح سے کلاوہ باندھا۔ جب صاحب اچھا ہو جائے گا تو اگلے سال امام حسین کو چاندی کا کینڈل چڑھائے گا — ان شاء اللہ —"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی "گڈ اولڈ گریس چچی" "اب تم یہ سب بھی کرنے لگیں!"

"وائی ناٹ — ؟" انھوں نے چپاتی توے پر ڈالتے ہوئے کہا "جب ہم ادھر بمبئی میں شادی بنایا تو مولوی صاحب نے ہمارا نام کنیز زہرا رکھا اور ہمارے کو کلمہ پڑھایا۔ سناؤں — ؟"

"ضرور — !"

"اشہد ان لا الٰہ الا اللہ اشہد ان محمد الرسول اللہ۔ اشہد ان امیر المومنین امام المتقین علیؑ ولی اللہ وصی رسول اللہ خلیفۃ بلا فصل"

"ہیر — ہیر — ونڈرفل۔ گریس چچی کمال کر دیا۔ اتنا لمبا چوڑا کلمہ فرفر یاد ہے!"

اور اسی سانس میں انھوں نے پھکنی اٹھا کر دوسرے چولھے کی آگ تیز کرنا شروع کی اور بڑبڑائیں — "ڈیم ڈیم بلڈی کوئلہ —"

گریس چچی نے اپنے بیٹے کا مزید تذکرہ نہیں کیا۔ بیٹے نے شاید دونوں ماں باپ کو بہت مایوس کیا تھا۔

تین سال بعد اطلاع ملی کہ ناصر چچا کا انتقال ہو گیا۔ اور علی اصغر بزنس کے لیے ڈھاکے چلا گیا اور مشرقی پاکستان میں کراچی واپس آگئی۔ روانہ ہونے سے قبل اس نے گریس چچی سے کہا کہ بزنس کے سلسلے میں اسے جانے کہاں کہاں پھرنا ہوگا اور انھیں پردیس میں بہت زحمت ہوگی اس لیے وہ اپنے وطن واپس چلی جائیں۔ شاید وہ اپنے دوستوں کو یہ بتانے ہوئے جھجھکتا تھا کہ گریس چچی اس کی ماں ہیں۔

اگر علی اصغر گریس چچی کا سگا بیٹا ہوتا اور اسے ان سے دلی، فطری محبت ہوتی، تب بھی ممکن تھا اپنی شادی کے بعد وہ ان سے یہی برتاؤ کرتا۔ ماؤں کے ساتھ اکثر یہی کیا جاتا ہے اور گریس چچی ماں تھیں۔

گریس چچی جانے کہاں گئیں۔ بمبئی واپس آگئیں یا گوا چلی گئیں، یا کہیں غائب ہو گئیں۔ دنیا بہت بڑی ہے اور گریس چچی ایک بہت بے بضاعت، گمنام، غیر اہم بوڑھی عورت تھیں۔

بدھ کی شام کو ماہم کے چرچ آف سینٹ مائکل میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ گرجا کا ہال، تکونا صحن اور سامنے کی فٹ پاتھ عبادت گزاروں سے کھچا کھچ بھری ہوتی ہے۔ دور دور تک دکانیں لگتی ہیں جن میں موم کے بچے اور ہاتھ، پاؤں، ناک، کان بکتے ہیں اولاد کی متمنی عورتیں، غرضمند لوگ بیمار، روگی، اپاہج اپنی اپنی مراد کے مطابق موم کے بچے اور یہ اعضاء خرید کر مریم کے بڑے مجسمے کے سامنے چڑھاتے ہیں اور منت مانتے ہیں کہ مراد پوری ہونے پر یہی چیزیں چاندی کی چڑھائیں گے۔ ماہم کے بس اسٹاپ پر چھوٹے چھوٹے بچے بس کے مسافروں سے مصر رہتے ہیں کہ ان سے موم بتیاں اور پھول خریدے جائیں۔ گرجا کے اندر سنہرا تاج پہنے اور نیلے لبادے میں ملبوس بےحد پیاری شکل والی مریم کا بلند و بالا مجسمہ استادہ ہے، اس کے نیچے ایک چھوٹی سی بازنطینی تصویر مقدس ماں اور بیٹے کی ہے۔ ان ساری منتوں، مرادوں اور دعاؤں اور وظیفوں کا مرکز یہ چھوٹی سی تصویر ہے جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ معجز نما ہے۔ ہر مذہب اور ہر نسل کے لوگ آ کر اس تصویر سے اپنا دکھ درد کہتے ہیں۔

ماہم کا یہ چوراہا بہت مصروف جگہ ہے۔ اس کے ایک طرف بی ای ایس ٹی بسوں کا اسٹیشن ہے۔ اس کے سامنے شیخ اسماعیل عمر اور رحمت اللہ حاجی اسمٰعیل پٹیل کے بانسوں کے ٹال کھڑے ہیں اس سے ملحق ماہم کریک ہے جہاں پانی میں خالی ڈونگیاں تیرتی رہتی ہیں ماہی گیروں کی میلی کشتیاں کھڑی رہتی ہیں اور کریک میں سے گزرنے والی سڑک بمبئی کے جزیرے کو سیلسٹ کے جزیرے سے منسلک کرتی ہے۔ اس سڑک کے دونوں طرف مچھیروں کے سرخ کھپریل کے گھر اور ٹین کی جھگیاں سمندری پتوں میں ڈوبی ہوئی ہیں اس سڑک کے کنارے کنارے محرم کے زمانے میں سبیلیں لگائی جاتی ہیں جن پر چاند تارے والے سبز اسلامی جھنڈا سمندری ہوا میں لہراتے رہتے ہیں۔

یہیں کچھ فاصلے پر پانی کے کنارے مخدوم شاہ بابا کا مزار ہے جہاں ہر سال دھوم کا عرس ہوتا ہے اور جمعرات کے روز بر قعہ پوش عورتوں کے انبوہ جمع ہوتے ہیں۔

باندرہ، جوہو اور اندھیری جانے والی بسوں اور موٹروں کی لامتناہی قطاریں اس راستے پر سے گزرتی رہتی ہیں۔ یہیں پر ماہیم نالہ ہے اور پولیس کے سپاہی مضافات سے آنے والی ٹیکسیوں کو روک کر اسد جھانکتے ہیں کہ خانہ ساز ناجائز شراب تو سمگل کر کے شہر میں نہیں لائی جا رہی۔

اس سڑک کے دوسرے سرے پر باندرہ کی خوبصورت اور بیک نقش و نگار والی سنگ سفید کی مسجد ہے جو ماہ رمضان میں برقی

قمقموں کے چراغاں سے جگمگاتی رہتی ہے اور دن بھر اس کے شفاف فرش پر بیٹھے ہوئے نمازی اس کی نازک جالیوں کے اندر سے نظر آتے رہتے ہیں۔ اس مسجد کے آگے بڑھ کر مالابار اسلامی ہوٹل اور شان محمدی ریسٹوران اور چائے خانے ہیں۔

کریپ کی سڑک پر بہت ... تنگ پرکشش کی بھری ہوئی بہت زبان نظر آتی ہیں جن کے دائیں میں ساحلی جھیلیں اور کھاری پانی کے قطعے ہیں اور گاؤں جن میں موسموں کے رنگوں میں ندی نالے بہتے پھرتے ہیں۔ اس سڑک کے بائیں جانب ٹھیک آپ کے سر پر ناریل کے جھرمٹ اور گھنے درختوں سے ڈھکا ہوا باندرہ کا جزیرہ نما ہے۔ اور ان درختوں میں سے نکلے ہوئے ماؤنٹ میری کے گنبد دور سے نظر آتے ہیں۔ اسی جزیرہ نما پر بالی ہل ہے جس کے اوپر خوبصورت زندگی بسر کرنے والے فلمی ستارے رہتے ہیں جن کے گھر لعقول وہ ولی تیا پر ملک کے بلند نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے دلوں نے ... کو ... کا درجہ عطا کر رکھا ہے اور جن فلمی ستاروں اور ان کے نگار خانوں تک رسائی ہے ان کے ... چست پوش پرست ... سمجھے اپنا دامنا ہاتھ تک لے سکتے ہیں۔

اور آگے جا کر جوہو کا ساحل ہے۔ جہاں ناریل کے اونچے اونچے نظر ذب جھنڈ ہیں اور جہاں چوڑے پتوں اور بڑے بڑے سرخ پھولوں والے ٹرڈیکلی درختوں کے سائے میں بڑے رومینٹک اور فسانوی ناموں والے ہوٹل ... ریکا میں اور کاٹیج چھپے ہوئے ہیں۔

باندرہ کے جزیرہ نما پر ماؤنٹ میری ہے ۔۔ لیڈی آف دی ماؤنٹ ۔۔۔ پہاڑی کی خاتون مریم۔ ساڑھے تین سو برس قبل پرتگالیوں نے یہاں مریم کا ایک معبد تعمیر کیا تھا۔ اور پچھلی صدیوں میں باندرہ کے پرتگالی قلعہ داروں اور مرہٹہ قلعہ داروں کے مابین خونریز لڑائیاں اور گولہ باریاں ہوا کرتی تھیں۔

اس خوبصورت پہاڑی کے تین طرف سمندر ہے اور جیل اور ... کھجور اور رنگ برنگے درختوں میں چھپی ہل کھاتی ہوئی سڑکیں پہاڑی کی طرف جاتی ہیں اور ان درختوں کے نیچے لکڑی کے بنگلوں اور چھتوں ... دو منزلہ بنگلے کھڑے ہیں۔ قدیم پرتگالی گرجا کی جگہ پر ایک شاندار نیا چرچ ایستادہ ہے اور اس کے احاطے کی اشان پر حضرت مریم کے بت اور انسانی اعضاء بکتے ہیں اور ہر سال ۸ ستمبر کو یہاں بڑا بھاری میلہ لگتا ہے۔ گرجا کے مقابل میں درجن میری کی ایک اونچی مورتی ہے جس پر وہ سمندر کی طرف پشت کیے کھڑی ہیں اور دونوں جانب سے سیڑھیاں مجسمے کی سمت جاتی ہیں ۔۔ ان سیڑھیوں کے مختلف مقامات میں ۔۔۔ دعا۔ عفوئے نفس و کفارہ ۔۔۔ مراقبہ ۔۔۔ تسبیح ۔۔۔ اصلاح نفس و بخشش ۔۔۔ قربانی ۔۔۔ سچے اونچا مقام ۔۔۔ ثنا اور سکون قلب ۔۔۔ مقام مریم ۔۔۔ زائرین اپنے اپنے عذاب دل میں لیے گھٹنوں کے بل ان سیڑھیوں پر چڑھتے ہیں اور مریم کا دامن پکڑ کر رحم اور مدد کے طالب ہوتے ہیں۔ اور مریم مسکراتی رہتی ہیں اور ان کے پیچھے افق سے افق تک پھیلا ہوا سرمئی سمندر لہریں مارتا رہتا ہے۔

اسی سمندر میں ساحل کے کنارے کنارے تین میل دور جا کر دھاؤں کا ایک اور مرکز ہے جو پانی میں ایک چھوٹے سے ٹاپو پر کھڑا ہے۔ یہ حاجی علی کی درگاہ اور مسجد ہے اور ورلی کی سڑک سے اس درگاہ تک جانے والی پگڈنڈی جوار بھاٹے کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈوبتی اور ابھرتی رہتی ہے۔ جمعرات کے روز یہاں قوالیوں کا ہنگامہ رہتا ہے اور رات گئے تک بسیں آپ پر آتے اور عورتیں اگربتیاں اور چڑھاوے کے پھول بیچتی ہیں اور برقعہ پوش عورتوں کے ہجوم درگاہ کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں اور رات کی نیلی تاریکی میں درگاہ نیچے سے لائٹ ہاؤس کی طرح جھلملاتی ہے۔ حاجی علی سے چند فرلانگ کے فاصلے پر مہالکشمی کا مندر ہے۔ جہاں منگل کی شام کو رنگ برنگی ساریوں کے پلو آگے ڈالے۔ بالوں میں موگرے

سے مطرب لگائے ، بڑی بڑی آنکھوں اور ذہین چہروں والی بچوں کی عورتوں کی ٹولیاں ندی کے بہت گہرے ہوتی ہیں اور جب سُرخ رنگ کا مدھم مدھم دمکتا ہوا آفتاب سرعت سے پانی میں ڈوب جاتا ہے اور سمندر کی نیلاہٹ اور شفق کا سیندور ایک دوسرے میں حلیل ہوتے ہیں تو اس کاسنی سناٹے میں مندر کے گھنٹے کی آواز پانی کی لہروں کی طرح نرم روی سے پھیلتی چلی جاتی ہے۔

بدھ کی شام کو ہم مندر کے کمرے میں کلمے سے لکھوا تھیں ۔ کیونکہ یہ پوجا اور وظیفے کا دن ہے۔

ابھی دن میں سامنے سے گزرتے ہوئے اندر چلی گئی ۔ ابھی تو پوجا کا وقت شروع نہیں ہوا تھا ۔ ہال میں اکا دکا عورتیں بنچوں پر بیٹھی تھیں یا گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھیں ۔ ہال کا پلیٹ فارم سفید پھولوں کے انبار رکھے ہوئے تھے اور سنہری موم بتیاں جل رہی تھیں ۔ کتنی ان گنت بلصیبوں کی آرزوئیں ، مایوسیاں ، مجبوریاں ، تمنائیں ان لیلتی ہوئی رنگی رنگی موم بتیوں کا دھواں بن کر اس مجسمے کے قدموں میں منڈلاتی رہتی ہیں ۔ اور میں نے سوچا کہ یہ بات ہے کہ ہر جگہ مندروں اور عبادت گاہوں میں درگاہوں اور مزاروں کے سامنے گرجاؤں اور امام باڑوں اور گردواروں اور آتش کدوں میں عورتیں ہی جھک کر خدا سے فریاد کرتی ہیں اور دعائیں مانگتی ہیں ۔ مزاروں پر ہمیشہ معبدوں سے مرادیں مانگتی پھر عورتوں کے آنسوؤں سے دھلتے رہتے ہیں ۔ عورتوں نے ہمیشہ اپنے اپنے دیوتاؤں کے چرنوں پر سر رکھا اور کبھی یہ نہ جانا چاہا کہ آخر یہ پاؤں کس کے ہیں ۔

عورتیں اتنی پرستار ، اتنی پجارن کیوں ہیں ؟ کس لیے کہ وہ کمزور ہیں ؟ اور سہارے کی حاجتمند ہیں ؟ کس لیے کہ وہ اس مختصر سی زندگی میں اپنے بچوں سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں ؟ ماں باپ ، بھائی ، شوہر ، اولاد ، پوتے نواسے ان سب کے تحفظ اور ان کی سلامتی کے لیے فکرمند رہتی ہیں ؟ شوہر یا محبوب کے پیار اور محبت کی ضمانت کسی ان دیکھی طاقت سے چاہتی ہیں ؟ بچے بچوں کے مستقبل کے لیے سرگرداں رہتی ہیں ؟ آخر یہ کیا خدائی ان کا حصہ ہے ؟ سب عورتیں کمزور ہیں ۔ مگر یہ بیٹیاں کبھی تو تہجد میں اس وقت سلائے سوتے میں ۔ اور عورت کمزور نہیں ہے ؟

تمام مرد اپنے اپنے گھر وں کو ہوتے ہیں ۔ اگلی بنچ پر بیٹھی ہوئی ایک کمسن لڑکی نے اپنا بچہ گود سے اتار کر پاس بٹھایا اور جھک کر دعا شروع کی ۔

ذرا عورتوں کی ہمت دیکھئے ۔ یہ معاشرے کی تخلیق اور پرداخت کی ذمے داری سنبھالتی ہیں ۔ جب یہ دلہن بنتی ہیں تو انھیں ہزار برس کی بوڑھی بنا دیا جاتا ہے ۔ یہ موت کے منہ میں جا کر ایک نئی زندگی دنیا میں لاتی ہیں یہ تکلیفیں اٹھاتی ہیں ۔ افلاس اور تنگدستی کا مقابلہ کرتی ہیں شوہر کی بے وفائی کا سامنا کرتی ہیں ۔ سوت کا جلاپا سہتی ہیں لیکن امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں ۔

"— احترام تیرا تو — یہ فال تجھے کسی چیز بس ۔ دسادی تسانیئے ان سدا سہروتا — آمین —"

سوسائٹی میں جگمگانے والی "بیگم صاحبیں" لاکھوں روپیہ کمانے والی فلم ایکٹریسیں ، بین الاقوامی شہرت کی رقاصائیں ، کالج اسکول کی لڑکیاں ، یونیورسٹیوں کی ریسرچ اسکالرز ، حکومت کی اعلیٰ افسر ، ایئرکنڈیشنڈ بنگلوں میں رہنے والی سوشل ورکرز ، غلیظ کھولیوں میں رہنے والی شوہروں کی مار کھانے والی مزدورنیں ، دفتروں میں چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرکے بڑے بڑے کنبے پالنے والی کلرک لڑکیاں شاندار بلڈنگوں میں رہنے والی ، دولتمند تاجروں کی حسین داشتائیں ، کولابہ کی سڑکوں پر ٹہل کر گاہک تلاش کرنے والی فیشن ایبل طوائفیں ، سفید گلی میں دھندا کرنے والی بھکارنیاں ، بیویاں اور باندیاں ، رانیاں اور داسیاں بھولی بھالی اور تریا چرتر والی ، تعلیم یافتہ اور جاہل ، معصوم اور دنیادار

ملحد اور اوہام پرست ——— ان سب پر اپنی اپنی جگہ کیا گزرتی ہے ؟

" ان آنم نا پایہ۔ ان پترا، اپیرتیا۔ سنتا جے آمین ——" لڑکی نے بچے کو گود میں لے کر اپنے سے لپٹا لیا۔ اور روتی رہی۔ شاید اس کے شوہر نے کسی دوسری عورت کے پیچھے اسے چھوڑ دیا تھا۔ شاید وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ شاید اسے اس کے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ کون جانے وہ کس لیے یوں روتی تھی۔

" سنتا مورے دلوا جے ماتے امپا پاکیتز دناتی لرے۔ آمین ——"

وہ اٹھی۔ صلیب کا نشان بنایا۔ قربان گاہ کے آگے ایک گھٹنا ٹیک کر جھکی اور بچے کو گود میں لیے لیے باہر چلی گئی۔

مجھے گریس چچی یاد آگئیں۔ انھوں نے بھی اسی طرح شاید اسی بنچ پر بیٹھ کر گڑگڑا کر دعائیں مانگی ہوں گی۔

اور ورجن نے ان کی دعا سن لی —— ؟

یا یہ محض ایک اور اتفاق تھا —— ؟

فلسفی گریس چچی کے لیے کیا کہیں گے ؟ اور عقلیت پرست اور ملحد۔ ہر ایک کے پاس اپنا علیحدہ علیحدہ جواب موجود ہے۔ میں یہ کس سے پوچھنے جاؤں ؟ ابا جان مدتیں ہوئیں ختم ہو چکے۔ جن سے میں طرح طرح کے بچکانے سوالات کیا کرتی تھی اور ناصر چچا یعنی نواب زادہ سید علی ناصر خان ایم اے ایل ایل بی (علیگ) جن سے عرصہ ہوا اپنے دوست سے جا ملے۔ اب میں کس سے جا کر پوچھوں کہ کیا زندگی میں واقعی معجزے ہوتے ہیں ؟ اذیت اور افلاس اور بے انصافی اور بے رحمی اور تشدد سے بھری ہوئی اس دنیا میں معجزے ہوتے ہیں —— ؟

عبادت گزار اب آ آ کر ہال کی بنچوں پر بیٹھ رہے تھے۔ میں سوچا کی۔ گریس چچی اس وقت جانے کہاں ہوں گی۔ اس بڑھاپے میں کیا اسی بمبئی میں کہیں آیا گیری کر رہی ہوں گی ؟ (کیونکہ ان کے پاس زندگی گزارنے کے لیے ایک محبت بھرے دل کے علاوہ اور کوئی بھی کوالیفکیشن نہیں تھی) کیا اب بھی وہ اس بنچ پر آن کر بیٹھتی ہوں گی اور ورجن کو مخاطب کر کے کہتی ہوں گی ——

" دیکھو ماں —— ہم تمہارے کو ایک بات بولتا ہے۔ کان کھول کر سن لو ——— تم نے ہمارا وش پورا کیا۔ ہمارے بچے کے لیے گھر کا سیکورٹی بنائے رکھا۔ ہمارا صاحب ورلڈ کا گریٹسٹ، فائنیسٹ مین تھا۔ مگر وہ ہمیں اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ اب ہم پھر تمہارے پاس آیا ہے —— بتاؤ اب ہم کیا کرے۔ ایک دم جلدی بولو —— ورنہ ہمارا تمہارا دوستی ختم۔"

اور مجھے ایک لحظے کے لیے ایسا لگا جیسے گریس چچی سچ مچ میرے نزدیک بیٹھی عبادت میں مصروف ہیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا، مگر وہ میرا واہمہ تھا۔

گریس چچی کے بجائے میرے برابر میں موٹے موٹے ہونٹوں والی کوئی گوانی عورت اودے رنگ کی سبز کنارے والی ساری میں ملبوس بالوں میں سفید پھولوں کا گجرا پیٹے کہنیوں تک پھنسی پھنسی آستینوں کا کھن بلاؤز پہنے۔ سیاہ ریشمی جالی سے سر ڈھانپے خاموشی سے تسبیح پھیرنے میں مشغول تھی۔

میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ گرجا اب عقیدت مندوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ میں خاموشی سے اٹھی اور باہر آگئی۔

سڑک پر ٹریفک کا ہجوم تھا لیکن عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ سامنے کریک پر شام کا نیلگوں اندھیرا چھا رہا تھا اور سمندری ہوا میں دور کے زمانوں اور گم شدہ آوازوں کی گونج تھی۔ میں نے دور جزیرہ نما کے افق پر جھکے ہوئے سناٹے کو دیکھا اور مجھے ایک مرہٹی نظم

یاد آئی ——

نیلا آسمان تیری
تنہا ستارہ رادھا
کھوئی ہوئی
وہ دل کی تمنا ہے۔
سارے زمانوں میں۔
وسیع زمین گووندا
دھان کا کھیت رادھا
ازل سے ابد تک باوفا
وہ مدھر زبان والی ہے۔
سارے زمانوں میں۔
سیدھا بہتا ہوا دریا کرشن
کنارے پر جھکا جنگل رادھا
جو کوئی سوال نہیں کرتی۔
مجسم تسلیم و رضا۔
وہ ابدی راحت ہے۔
سارے زمانوں میں ——

سیاہ سمندر پر روشنیاں ٹمٹمانے لگیں۔ میں پھاٹک پر کھڑے ہوئے عبادت گذاروں کی بھیڑ میں سے نکلی، فٹ پاتھ پر آ گئی اور سڑک عبور کرنے کے لیے سرخ رنگ کے اس مہیب فائر انجن کے گزرنے کا انتظار کرنے لگی جو ٹن ٹن کرتا زناٹے سے باندرہ کی طرف نکلا جا رہا تھا۔

مختصر افسانے :

کرشن چندر
ممتاز مفتی
قدرت اللہ شہاب
ضمیر الدین احمد
مسعود مفتی
انور سجاد
رضیہ فصیح احمد
الطاف فاطمہ
خالدہ اصغر
ذکاء الرحمٰن
غلام محمد
نوید انجم
بلراج مینرا
انتظار حسین

کرشن چندر

کچرا بابا

جب وہ ہسپتال سے باہر نکلا، تو اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں، اور اُس کا سارا جسم بھیگی ہوئی روئی کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اُس کا جی چلنے کو نہیں چاہتا تھا۔ وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ جانے کو چاہتا تھا۔
قاعدے سے اُسے ابھی ایک ماہ اور ہسپتال میں رہنا چاہیے تھا، مگر ہسپتال والوں نے اُس کی چھٹی کر دی تھی۔ ساڑھے چار ماہ تک وہ ہسپتال کے پرائیوٹ وارڈ میں رہا تھا اور ڈیڑھ ماہ تک جنرل وارڈ میں۔ اس اثنا میں اس کا ایک گردہ نکال دیا گیا تھا اور اس کی آنتوں کا ایک حصہ کاٹ کے آنتوں کے فعل کو درست کیا گیا تھا۔ ابھی اُس کے کلیجے کا فعل راست نہیں ہوا تھا کہ اسے ہسپتال سے نکل جانا پڑا، کیونکہ دوسرے لوگ انتظار کر رہے تھے، جن کی حالت اُس سے بھی بدتر تھی۔

ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا نسخہ دے دیا۔ اور کہا "یہ ٹانک پیو اور مقوی غذا کھاؤ۔ بالکل تندرست ہو جاؤ گے۔ اب ہسپتال میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!"

"مگر مجھ سے چلا نہیں جاتا، ڈاکٹر صاحب"، اُس نے کمزور آواز میں احتجاج کیا۔

"گھر جاؤ، چند دن بیوی خدمت کرے گی، بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے!"

بہت ہی دھیرے دھیرے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اس نے سوچا، گھر؟ —— مگر میرا گھر ہے کہاں؟ چند ماہ پہلے میرا ایک گھر ضرور تھا۔ ایک بیوی بھی تھی، جس کے ایک بچہ ہونے والا تھا۔ وہ دونوں اُس آنے والے بچے کے تصور سے کس قدر خوش تھے۔ ہوگی دنیا میں زیادہ آبادی، مگر وہ تو اُن دونوں کا پہلا بچہ تھا۔ اور اُن کی حیرت اور مسرت سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بچہ دُنیا کا سب سے پہلا بچہ ہوگا۔

دُلاری نے اپنے بچے کے لئے بڑے خوبصورت کپڑے سیئے تھے، اور ہسپتال میں لاکر اُسے دکھائے تھے اور اُن کپڑوں کی نرم سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ اپنے بچے کو بانہوں میں لے کر اُس سے پیار کر رہا ہے۔

مگر پھر اگلے چند مہینوں میں بہت کچھ لُٹ گیا۔ جب اُس کے گُردے کا پہلا اپریشن ہوا۔ تو دُلاری نے اپنے زیور بیچ دیئے، کہ ایسے ہی موقعوں کے لئے ہوتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زیور عورت کے حُسن کی افزائش کے لئے ہوتے ہیں، وہ تو کسی دوسرے کے درد کا مداوا ہوتے ہیں، شوہر کا اپریشن، بچے کی تعلیم، لڑکی کی شادی، یہ بنک ایسے ہی موقعوں کے لئے کُھلتا ہے اور خالی کر دیا جاتا ہے۔ عورت تو اس زیور کی تحویل دار ہوتی ہے، اور زندگی میں مشکل سے پانچ چھ بار اسے اس زیور کو پہننے کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔

گُردے کے دوسرے اپریشن سے پہلے دُلاری کا بچہ ضائع ہو گیا۔ وہ تو ہونا ہی۔ دُلاری کو دن رات جو کڑی مشقت کرنا پڑ

تھی۔ اس میں یہ فطرہ سب سے پہلے موجود تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے دُلاری کا یہ چھریرا سُنہرا بدن اس قدر کڑی مشقت کے لئے نہیں بنایا گیا ہے، اس لئے وہ دانا و فرزانہ بچہ بیچ ہی میں سے کہیں سٹک گیا تھا۔ ناسازگار ماحول دیکھ کر اور ماں باپ کی پتلی حالت بھانپ کر اُس نے خود ہی پیدا ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ بعض بچے ایسے ہی عقلمند ہوتے ہیں! دُلاری کئی دنوں تک ہسپتال نہیں آ سکی، اور جب اس نے آ کے خبر دی تو وہ کس قدر رویا تھا۔ اگر اُسے معلوم ہوتا کہ آگے چل کے اُسے اس سے کہیں زیادہ رونا پڑے گا، تو وہ اس حادثے پر رونے کے بجائے خوشی کا اظہار کرتا

گردے کے دوسرے آپریشن کے بعد اُس کی نوکری جاتی رہی۔ طویل علالت میں یہی ہوتا ہے۔ کوئی کہاں تک انتظار کر سکتا ہے۔ بیماری انسان کا اپنا ذاتی معاملہ ہے، اس لئے اگر وہ چاہتا ہے کہ اس کی نوکری قائم رہے، تو اُسے زیادہ دیر تک بیمار نہیں پڑنا چاہیئے۔ انسان مشین کی طرح ہے۔ اگر ایک مشین طویل عرصے کے لئے بگڑی رہتی ہے، تو اُسے اُٹھا کے ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے، اور اُس کی جگہ نئی مشین آ جاتی ہے۔ کیونکہ کام رک نہیں سکتا، بزنس بند نہیں ہو سکتا، اور وقت تھم نہیں سکتا۔ اس لئے جب اُسے معلوم ہوا کہ اُس کی نوکری بھی جاتی رہی ہے۔ تو اُسے شدید دھچکا سا لگا۔ جیسے اُس کا دوسرا گردہ بھی نکال لیا گیا ہو۔ اس دھچکے سے اُس کے آنسو بھی خشک ہو گئے۔ اصلی اور بڑی مصیبت میں آنسو بھی نہیں آتے۔ اُس نے محسوس کیا، صرف دل کے اندر ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے زمین قدموں کے نیچے سے کھسکتی معلوم ہوتی ہے اور رگوں میں خون کے بجائے خوف دوڑتا ہُوا معلوم ہوتا ہے۔

کئی دن تک وہ آنے والی زندگی کے خوف اور دہشت سے سو نہیں سکا تھا۔ طویل علالت کے خرچے بھی طویل ہوتے ہیں۔ اور ریر بار کرنے والے۔ ہولے ہولے گھر کی سب قیمتی چیزیں چلی گئیں۔ مگر دُلاری نے ہمت نہیں ہاری۔ اُس نے ساڑھے چار ماہ تک اپنے شوہر کو پرائیویٹ وارڈ میں رکھا۔ اس کا بہترین علاج کیا، اپنے گھر کی ایک ایک چیز بیچ دی اور آخر میں نوکری بھی کر لی۔ وہ ایک فرم میں ملازم ہو گئی تھی۔ اور ایک روز اپنی فرم کے مالک کو لے کر ہسپتال بھی آئی تھی، وہ ایک دُبلا پتلا، کوتاہ قد، ادھیڑ عمر کا شرمیلا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ کم گو، اور میٹھی مُسکراہٹ والا۔ صورت شکل سے وہ کسی بڑی فرم کا مالک ہونے کے بجائے کتابوں کی کسی دکان کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ دُلاری اُس کی فرم میں دو سو روپیے مہینے پر نوکر ہو گئی تھی۔ چونکہ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی، اس لئے اُس کا کام لفافوں پر ٹکٹیں لگانا تھا۔

"یہ تو بہت آسان کام ہے"، دُلاری کے شوہر نے کہا۔

فرم کا باس بولا "کام تو آسان ہے، مگر جب دن میں پانچ چھ سو خطوں پر ٹکٹیں لگانا پڑیں تو اسی طرح کا بہت آسان کام بھی بہت مشکل معلوم ہوتا ہے!"

دُلاری نے مُسکرا کر کہا، "واقعی بہت تھک جاتی ہوں!"

اور فرم کے باس نے اُس سے کہا، "اچھے ہو جاؤ، تو تم اپنی بیوی کے بجائے ٹکٹیں لگایا کرنا۔ میں یہ کام تمہیں سونپ دونگا!"

جب فرم کا باس جانے لگا، تو دلاری بھی اُس کے ساتھ چلی گئی۔ اس نے محسوس کیا، کہ آج دُلاری کے قدموں کی چاپ میں ایک عجب خود اعتمادی سی ہے۔ اُس کا جسم کسی پھولدار شاخ کی طرح لچک رہا ہے۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے باس نے دُلاری کے لئے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا اور پھر وہ مؤدب ہو کر دُلاری کو دروازے سے باہر جانے کی دعوت دیتے ہوئے ذرا سا جُھکا اور ایک

لمحے کے لئے اُس کا دوسرا ہاتھ دلاری کی کمر پر ایک ثانیے کے لئے رُکا۔ اور دُلاری کے شوہر کو فرم کے باس کے پہلے ہاتھ کی حرکت تو پسند آئی، لیکن دوسرے ہاتھ کی حرکت پسند نہیں آئی۔ لیکن پھر اُس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ کبھی کبھی ایک ہاتھ جو کرتا ہے وہ دوسرے ہاتھ کو معلوم نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی آنکھوں کو دھوکا ہوا ہو۔ محض اک واہمہ۔ اس لئے اس نے اطمینان سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور نرم نرم تکیوں پر سر ٹکا کر گلوکوز کے انجکشن کا انتظار کرنے لگا۔

اس کا تیسرا آپریشن ہسپتال کے جنرل وارڈ میں ہوا تھا۔ اس وقت تک دُلاری فرم کے باس کے ساتھ دارجلنگ جا چکی تھی۔ آخر کوئی کب تک صبر کر سکتا ہے۔ زندگی مختصر ہے۔ اور زندگی کی بہار اُس سے بھی مختصر ہوتی ہے۔ جب جذبے بُلاتے ہیں، اور آنکھوں میں چاند اتر آتے ہیں۔ جب انگلیوں میں شعلوں کا سا لمس محسوس ہوتا ہے اور سینے میں میٹھا میٹھا سا درد ہوتا ہے۔ جب بوسے بھنوروں کی طرح لبوں کی پنکھڑیوں پر گرتے ہیں اور گردن کے صراحی دار خم کسی کی گرم گرم سانس کی مدھم مدھم آنچ کو ترستے ہیں ایسے میں کوئی کب تک فینائل اور پیشاب کی بُو سونگھے، تھوک اور پیپ اور لہو کا رنگ دیکھے اور موت کے دروازے تک جاتی ہوئی اور لوٹ کر آتی ہوئی سسکیاں سُنے؟ آخر قوّت برداشت کی ایک حد ہوتی ہے، اور بیس برس کی لڑکی کی قوّتِ برداشت بھی کیا؟ جس کی شادی کو ابھی دو سال بھی نہ ہوئے تھے اور جس نے اپنے شوہر کے ساتھ مُصیبتوں کے سوا اور کچھ دیکھا ہی نہ تھا وہ اگر اپنے سپنوں کی ڈور سے بندھی دارجلنگ چلی جائے، تو اس میں کسی کا کیا قصور ہے؟

اور وہ اُس منزل سے گزر چکا تھا جب وہ کسی کو قصوروار ٹھہرا سکتا تھا۔ اتنی چوٹیں پے در پے اس پر پڑی تھیں کہ وہ بالکل لولا گیا، بالکل سنّاٹے میں آ گیا۔ وہ بالکل دم بخود تھا، اب اُس کی مُصیبت اور تکلیف میں کسی طرح کا کوئی جذبہ یا آنسو نہیں رہ گیا تھا۔ بار بار ہتھوڑے کی ضربیں کھا کھا کر اُس کا دل دھات کے ایک پترے کی طرح بے حس ہو گیا۔ اسی لئے آج جب اُسے ہسپتال سے نکالا گیا تو اُس نے ڈاکٹر سے کسی ذہنی تکلیف کی شکایت نہیں کی تھی۔ اُس نے اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ اب وہ اِس ہسپتال سے نکل کر کہاں جائے؟ اب اُس کا کوئی گھر نہیں تھا، کوئی بیوی نہیں، کوئی بچّہ نہیں، کوئی نوکری نہیں، اُس کا دل خالی تھا۔ اُس کی جیب خالی تھی۔ اور اُس کے سامنے ایک خالی اور سپاٹ مستقبل تھا۔

مگر اُس نے یہ سب کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے صرف یہ کہا تھا، ”ڈاکٹر صاحب مجھ سے چلا نہیں جاتا!“

بس یہی ایک حقیقت تھی جو اُسے اس وقت یاد تھی۔ باقی ہر بات اس کے دل سے محو ہو چکی تھی۔ اِس وقت چلتے چلتے وہ صرف یہ محسوس کر سکتا تھا، کہ اس کا جسم گیلی روئی کا بنا ہوُا ہے، اس کی ریڑھ کی ہڈّی کسی پُرانی شکستہ چارپائی کی طرح چیخ رہی ہے۔ دھوپ بہت تیز ہے، روشنی نشتر کی طرح چبھتی ہے، آسمان پر ایک میلے اور پیلے رنگ کا وارنش پھیرا ہوا ہے اور فضا میں تاریک نُر کرتے اور چیتیاں سی غلیظ مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی ہیں، اور لوگوں کی نگاہیں بھی کہ گندے لہو اور پیپ کی طرح اُس کے جسم سے چپچپا کر رہ جاتیں۔ اُسے بھاگ جانا چاہیئے، کہیں پر ان لمبے اُلجھے بجلی کے تاروں والے کھمبوں اور اُن کے درمیان گڈمڈ ہونے والے راستوں سے کہیں دور بھاگ جانا چاہیے، اور اُسے اپنی ماں کی یاد آئی جو مر چکی تھی۔ اپنا باپ یاد آیا جو مر چکا تھا۔ اپنا بھائی یاد آیا جو افریقہ میں تھا۔ سن، سن، سن ایک ٹرام اس کے قریب سے گزرنے لگی۔ ٹرام کی برقی چھڑی بجلی کے تار سے گھسٹتی ہوئی گویا اُس کے جسم کے اندر گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ وہ پوری ٹرام کو اپنے جسم کے اندر چلتا ہوُا محسوس کر سکتا تھا۔ اُسے ایسا

محسوس ہوا، جیسے وہ کوئی انسان نہیں ہے ایک گھسا پٹا راستہ ہے!

دیر تک وہ چلتا رہا۔ چلتا رہا اور چلتا رہا۔ اندازے سے ایک موہوم سمت کی طرف چلتا رہا۔ جدھر کبھی اس کا گھر تھا۔ حالانکہ اُسے معلوم تھا کہ اب اس کا کوئی گھر نہیں ہے مگر وہ یہ جانتے ہوئے بھی ادھر ہی چلتا رہا۔ گھر جانے کی عادت سے مجبور ہو کر۔ ٹھنڈ عجب بہت تیز تھی اور اس کے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ اور وہ راستہ بھی بھول گیا۔ اور اب اُس کے جسم میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ کسی مسافر سے راستہ ہی پوچھ لے۔ معلوم کرلے یہ شہر کا کونسا حصہ ہے۔ ہولے ہولے اُس کے کانوں میں ٹراموں اور بسوں کا شور بڑھنے لگا۔ نگاہوں میں دیواریں تیز تیز گھومنے لگیں، عمارتیں گرنے لگیں، بجلی کے کھمبے گڈمڈ ہونے لگے۔ پھر اُس کی آنکھوں تلے اندھیرا اور قدموں تلے اک بھونچال سا آیا، اور وہ یکایک زمین پر گر پڑا۔

جب وہ ہوش میں آیا۔ تو رات ہو چکی تھی، ایک نیم خنک سا اندھیرا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ جس جگہ پر وہ گرا تھا اب تک وہ وہیں پر لیٹا ہوا ہے۔ یہ فٹ پاتھ ایک ایسا موڑ تھا جس کے عقب میں دو طرفہ دو دیواریں کھنچی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار فٹ پاتھ سے لگی لگی سیدھی شمال سے جنوب کو چلی گئی تھی۔ دوسری شمال سے مغرب کو، اور وہ دونوں دیواروں کے اتصال پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ دونوں دیواریں کوئی چار فٹ کے قریب بلند تھیں۔ یہاں پر امرود اور جامن کے پیڑ تھے۔ اور اُن پیڑوں کے پیچھے کیا تھا وہ اُسے اُس وقت نظر نہیں آتا تھا۔ دوسری طرف مغربی دیوار کے سامنے پچیس تیس فٹ کا فاصلہ چھوڑ کر ایک پرانی عمارت کا عقب تھا۔ سہ منزلہ عمارت تھی اور ہر منزل میں پیچھے کی طرف صرف ایک کھڑکی تھی۔ اور چھ بڑے بڑے عقبی پائپ تھے۔ عقبی پائپ اور مغربی دیوار کے بیچ میں پچیس تیس فٹ چوڑی ایک اندھی گلی بن گئی تھی۔ جس کے تین طرف دیوار تھی اور چوتھی طرف سڑک تھی۔ کہیں دور کسی گرجے کے گھنٹے نے رات کے تین بجائے اور وہ فٹ پاتھ پر لیٹا لیٹا اپنی کہنیوں پر زور دے کر ذرا سا اوپر اُٹھا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سڑک بالکل خالی تھی۔ سامنے کی دوکانیں بند تھیں اور فٹ پاتھ کے اندھے سالوں میں کہیں کہیں بجلی کے کمزور بلب جھلملا رہے تھے۔ چند لمحوں کے لئے اُسے یہ ٹھنڈی تاریکی بہت بھلی معلوم ہوئی۔ چند لمحوں کے لئے اس نے اپنی آنکھیں بند کرکے سوچا۔ شاید وہ کسی مہرباں سمندر کے پانیوں میں ڈوب رہا ہے۔

مگر اس احساس سے وہ اپنے آپ کو صرف چند لمحوں تک دھوکا دے سکا۔ کیونکہ اب اس پر شدید بھوک طاری ہو چکی تھی۔ چند لمحوں کی خوشگوار خنکی کے بعد اُس نے محسوس کر لیا کہ وہ شدید طور پر بھوکا ہے۔ جب سے اُس کی آنتوں کا اپریشن ہوا تھا اُسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ اور اس نے سوچا کہ ڈاکٹروں نے اس کی آنتوں کے فعل کو بیدار کرکے اُس کے ساتھ کسی طرح کی بھلائی نہیں کی ہے۔ اس کے معدے کے اندر عجب اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ اور آنتیں اندر ہی اندر تڑپ تڑپ کر روٹی کا سوال کر رہی تھیں۔ اور اس وقت اس کے نتھنے کسی شہری انسان کے نتھنوں کی طرح نہیں بلکہ کسی جنگلی جانور کے نتھنوں کی طرح کام کر رہے تھے۔ عجیب عجیب سی بوئیں اس کی ناک میں آرہی تھیں۔ بوؤں کی ایک سمفنی تھی جو اس کے احساس پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اس سمفنی کے ایک ایک سُر کا الگ الگ وجود پہچان سکتا تھا۔ یہ جامن کی خوشبو ہے۔ یہ امرود کی، یہ رات کی رانی کے پھولوں کی، یہ تیل میں تلی ہوئی پوریوں کی، یہ پیاز اور لہسن میں بھگارتے ہوئے آلوؤں کی، یہ مولی کی، یہ ٹماٹر کی، یہ کسی سڑے ہوئے پھل کی، یہ پیشاب کی، یہ پانی میں بھیگی ہوئی مٹی کی جو غالباً بانسوں کے جھنڈ سے آرہی تھی۔ وہ ہر بو کی نوعیت، شدت، سمت اور فاصلے تک کا اندازہ کر سکتا ہے۔ یکایک اُسے یہ احساس بھی ہوا،

اور وہ اِس بات پر چونکا بھی کہ کس طرح بھوک نے اس کی مخفی قوتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ مگر اس امر پر زیادہ غور کئے بغیر اس نے اُس طرف گھسٹنا شروع کر دیا، جدھر سے اُسے تیل میں تلی پوریوں اور لہسن سے بگھارے ہوئے آلوؤں کی بُو آئی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اندھی گلی کے اندر گھسٹنے لگا۔ کیونکہ وہ اپنے جسم میں چلنے کی سکت بالکل نہیں پاتا تھا۔ ہر لحظہ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ گہرے پانیوں میں ڈوب رہا ہے۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی دھوبی اس کی آنتوں کو پکڑ کر مروڑ رہا ہے۔ پھر اس کے نتھنے میں پوریوں اور آلو کی اشتہا آمیز بُو آئی اور وہ بے قرار ہو کر ادھ مندھی آنکھوں سے اپنے تقریباً بے جان سے جسم کو ادھر گھسیٹنے کی کوشش کرتا۔ جدھر سے آلو، پوری کی بُو آ رہی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد جب وہ اُس جگہ پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ مغربی دیوار اور اس کے سامنے کی عمارت کے پچھواڑے کے پائیوں کے درمیان پچیس تیس فٹ کے فاصلے میں مستطیل نما کمرے کا ایک بہت بڑا کھلا آہنی ٹب رکھا ہے۔ یہ ٹب کوئی پندرہ فٹ چوڑا ہوگا اور تیس فٹ لمبا۔ اور اس میں طرح طرح کا کوڑا کرکٹ بھرا ہے۔ گلے سڑے پھلوں کے چھلکے اور ڈبل روٹیوں کے غلیظ ٹکڑے اور چائے کی پتیاں اور ایک پرانی جیکٹ اور بچوں کے گندے پوتڑے اور انڈے کے چھلکے اور اخبار کے ٹکڑے اور رسالوں کے پھٹے اوراق اور روئی کے ٹکڑے اور لوہے کی لوٹیاں اور پلاسٹک کے ٹوٹے ہوئے کھلونے اور مٹر کے چھلکے اور پودینے کے پتے اور کیلے کی پتّل پر چند ادھ کھائی پوریاں اور آدھ کھائی پوریاں اور آلو کی بھاجی، پوریوں اور آلو کی بھاجی کو دیکھ کر گویا اس کی آنتیں اُبل پڑیں۔ اُس نے چند لمحوں کے لئے اپنے بے قرار ہاتھ روک لئے۔ مگر دوسری بدبوؤں کے مقابلے میں اس کے نتھنوں میں اگلے چند ثانیوں تک پوری اور بھاجی کی اشتہا آمیز خوشبو اسی طرح تیز تر ہوتی گئی جیسے کسی سمفنی میں یکایک کوئی خاص سُر ایک دم اونچے ہو جاتے ہیں اور یکایک تہذیب کی آخری دیواریں ڈھے گئیں اور اُس کے کانپتے ہوئے بے قرار ہاتھوں نے کیلے کے اُس پتّل کو دبوچ لیا۔ اور وہ اک وحشیانہ گرسنگی سے متاثر ہو کر ان پوریوں پر ٹوٹ پڑا۔ پوری بھاجی کھا کے اُس نے کیلے کے پتے کو بار بار چاٹا اور اُسے شفّاف کر کے چھوڑ دیا جیسے قدرت نے اسے بنایا تھا۔ پتّل چاٹنے کے بعد اُس نے اپنی انگلیاں چاٹیں اور لمبے لمبے ناخنوں میں بھری ہوئی آلو کی بھاجی زبان کی نوک سے نکال کے کھائی۔ اور جب اس سے بھی اُس کی تسلّی نہ ہوئی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر کوڑے کے ڈھیر کو گھنگھولتے ہوئے اس میں سے پودینے کے پتّے نکال کے کھائے اور مولی کے دو ٹکڑے اور ایک آدھا ٹماٹر اپنے مُنہ میں ڈال کر مزے سے اس کا رس پیا۔ اور جب وہ سب کچھ کھا چُکا تو اُس کے سارے جسم میں نیم گرم غنودگی کی اک لہر سی اُٹھی اور وہ وہیں ٹب کے کنارے گر کر سو گیا۔

آٹھ دس روز اسی نیم غنودگی اور نیم بے ہوشی کے عالم میں گزرے۔ وہ گھسٹ گھسٹ کر ٹب کے قریب جاتا اور جو کھانے کو ملتا کھا لیتا۔ اور جب اشتہا آمیز بوؤں کی تسکین ہو جاتی اور دوسری گندی بوئیں اُبھرنے لگتیں، تو وہ گھسٹ گھسٹ کر ٹب سے فٹ پاتھ کے نکڑ پر چلا جاتا۔ اور عقبی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا یا سو جاتا۔

پندرہ بیس روز کے بعد ہولے ہولے اس کے جسم میں طاقت اُبھرنے لگی۔ ہولے ہولے وہ اپنے ماحول سے مانوس ہونے لگا۔ یہ جگہ کتنی اچھی تھی، یہاں دھوپ نہیں تھی۔ یہاں درختوں کا سایہ تھا، اندھی گلی سُنسان اور ویران تھی۔ یہاں کوئی نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی عقبی عمارت سے کوئی کھڑکی کھلتی تھی اور کوئی ہاتھ پھیلا کر نیچے کے ٹب میں روزمرّہ کا کوڑا پھینک دیتا۔ یہ کوڑا جو اس کا روزی رساں تھا۔ اُس کے شب و روز کا رازق تھا۔ اُس کی زندگی کا محافظ تھا۔ دن میں سڑک چلتی تھی، دوکانیں کھلتی تھیں، لوگ باگ گھومتے تھے، بچّے

بابلوں کی طرح چہلتے ہوئے سڑک سے گزر جاتے تھے۔ عورتیں رنگین تتلیوں کی طرح ڈولتی ہوئی گزر جاتی تھیں، لیکن یہ ایک دوسری دُنیا تھی۔ اس دُنیا سے اس کا کوئی علاقہ نہ تھا۔ اس دُنیا میں اب اُس کا کوئی نہ تھا۔ اور وہ کسی کا نہ تھا۔ اس دُنیا سے اسے نفرت تھی اور اس دُنیا سے اس نے مُنہ موڑ لیا تھا۔ شہر کی گلیاں اور بازار اور سڑکیں اس کے لئے موہوم سائے بن گئے۔ اور اُس سے باہر کے میدان اور کھیت اور کھلا آسمان ایک بے معنی تصویر، گھر، کام کاج، زندگی، سماج، جد و جہد بے معنی الفاظ جو گل سڑ کر اس کوڑے کچرے کے ڈھیر میں مل کر غتر بود ہوگئے تھے۔ اس دُنیا سے اس نے مُنہ موڑ لیا تھا۔ اور اب یہی اس کی دُنیا تھی۔ پندرہ فٹ لمبی اور بیس فٹ چوڑی!

ماہ و سال گزرتے گئے۔ اور وہ اس ٹکڑے پر بیٹھا بیٹھا ایک پرانے کھنڈر کی طرح اور کسی پرانی یادگار کی طرح سب کی نظروں میں مانوس ہوتا گیا۔ وہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا، کسی کو فیض نہیں پہنچاتا تھا، کسی سے بھیک نہیں مانگتا تھا، لیکن اگر وہ کسی دن وہاں سے اُٹھ کر چلا جاتا تو اُس علاقے کے ہر فرد کو اس امر پر حیرت ہوتی اور شاید کسی قدر تکلیف بھی ہوتی۔

سب لوگ اُسے کچرا بابا کہتے تھے، کیونکہ یہ سب کو معلوم تھا کہ وہ صرف کچرے کے ٹب میں سے اپنی خوراک نکال کے کھاتا ہے اور جس دن اُسے وہاں سے کچھ نہ ملتا، وہ بھوکا ہی سو جاتا تھا۔ ہوٹلوں سے راہگیر اور ایرانی رسٹوران والے اس کی عادت کو پہچان گئے تھے اور اکثر اُنہیں جو کچھ ڈالنا ہوتا اس کے لئے وہ اسے کچرے کے ڈھیر میں پھینک دیتے تھے اور اکثر عمارت کی عقبی کھڑکیوں سے اب کوڑے کچرے کے علاوہ خورد و نوش کی دوسری چیزیں بھی پھینکی جاتیں، صحیح و سالم پوریاں اور بہت سی بھاجی اور گوشت کے ٹکڑے اور ادھ چوسے ہوئے آم اور چٹنی اور کباب کے ٹکڑے اور کھیر میں لتھڑے ہوئے پتل۔ نادُ و نوش کی ہر نعمت کچرا بابا کو اس ٹب میں سے مل جاتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پھٹا ہوا پاجامہ، کوئی اُدھڑی ہوئی نیکر، کوئی تار تار شکستہ قمیض، پلاسٹک کا گلاس، یہ کچرے کا ٹب کیا تھا، اس کے لئے ایک کھلا بازار تھا، جہاں وہ دن دہاڑے سب کی آنکھوں کے سامنے گشت کیا کرتا تھا۔ جس دکان سے جو سودا چاہے مُفت لیتا تھا۔ وہ اس بازار کا اس نعمت غیر مرقبہ کا واحد مالک تھا۔ شروع شروع میں چند گرسنہ بلیوں اور خارش زدہ کتوں نے شدید مزاحمت کی تھی، مگر اُس نے مار مار کر سب باہر نکال دیا تھا۔ اور اب وہ اس کچرے کے ٹب کا واحد مالک تھا۔ اور اُس کے حق کو سب نے تسلیم کر لیا تھا۔ مہینے میں ایک بار میونسپلٹی والے آتے تھے اور اس ٹب کو خالی کر کے چلے جاتے تھے اور کچرا بابا اُن سے کسی طرح کی مزاحمت نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا، دوسرے دن سے ٹب پھر اسی طرح بھرنا شروع ہو جائے گا۔ اور اس کا اعتقاد تھا کہ اس دنیا سے نیکی ختم ہو سکتی ہے، وفا ختم ہو سکتی ہے، رفاقت ختم ہو سکتی ہے، لیکن غلاظت اور گندگی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ ساری دُنیا سے مُنہ موڑ کر اس نے جینے کا آخری طریقہ سیکھ لیا تھا۔

مگر یہ بات نہیں ہے، کہ اُسے باہر کی دُنیا کی خبر نہ تھی، جب شہر میں چینی مہنگی ہو جاتی تو مہینوں کچرے کے ٹب میں مٹھائی کے ٹکڑے کی صورت نظر نہیں آتی۔ جب گندم مہنگی ہو جاتی تو ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا تک نہ ملتا۔ جب سگریٹ مہنگے ہو جاتے تو سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے اتنے چھوٹے ملتے کہ وہ انہیں سُلگا کر پی نہیں سکتا تھا۔ جب بھنگیوں نے ہڑتال کی تھی، تو دو مہینے تک اس کے ٹب کی کسی نے صفائی نہیں کی تھی۔ اور کسی روز اُسے ٹب میں اتنا گوشت نہیں ملتا تھا۔ جتنا بقر عید کے روز اور دیوالی کے دن تو ٹب کے مختلف کونوں سے مٹھائی کے بہت سے ٹکڑے مل جاتے تھے۔ باہر کی دنیا کا کوئی حادثہ یا واقعہ ایسا نہ تھا جس کا سراغ وہ کچرے کے ٹب سے دریافت نہ کر سکتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم سے لے کر عورتوں کے خفیہ امراض تک! مگر باہر کی دُنیا سے

اب اسے کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی۔ پچیس سال تک وہ اس کچرے کے ٹب کے کنارے بیٹھا بیٹھا اپنی عمر گزارتا رہا۔ شب و روز، ماہ و سال، اس کے سر سے ہوا کی لہروں کی طرح گزرتے گئے۔ اور اس کے سر کے بال سوکھ سوکھ کر بڑ کی شاخوں کی طرح لٹکنے لگے۔ اس کی کالی داڑھی کھچڑی ہو گئی۔ اس کے جسم کا رنگ ملگجا مٹ میلا اور سبزی مائل ہوتا گیا۔ اور وہ اپنے مضبوط بالوں، پھٹے چیتھڑوں، اور بدبودار جسم سے راہ چلتے لوگوں کو خود بھی کچرے کا ایک ٹب نظر آنے لگا۔ ایک ایسا ٹب جو کبھی کبھی حرکت کرتا تھا، اور بولتا تھا کسی دوسرے سے نہیں، صرف اپنے آپ سے، یا زیادہ سے زیادہ کچرے کے ٹب سے!

لوگ کچرا بابا کو کچرے کے ٹب سے گفتگو کرتے دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ حالانکہ اس میں حیران ہونے کی بات کونسی ہے؟ کچرا بابا اُن لوگوں سے کچھ کہتا نہیں تھا، مگر ان کی حیرت کو دیکھ کر دل میں ضرور سوچتا ہوگا کہ اس دنیا میں کون ہے جو کسی دوسرے سے گفتگو کرتا ہے، اس دنیا میں جتنی گفتگو ہوتی ہے، انسانوں کے درمیان نہیں ہوتی ہے بلکہ صرف اپنی ذات اور اُس کی کسی غرض کے درمیان ہوتی ہے، دو دوستوں کے درمیان بھی جو گفتگو ہوتی ہے وہ دراصل ایک طرح کی خود کلامی ہوتی ہے۔ یہ دُنیا ایک بہت بڑا کچرے کا ڈھیر ہے جس میں سے ہر شخص اپنی غرض کا کوئی ٹکڑا، فائدے کا کوئی چھلکا یا منافع کا کوئی چیتھڑا دبوچنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اور کہو۔ یہ لوگ جو مجھے حقیر، فقیر یا ذلیل سمجھتے ہیں۔ ذرا اپنی روح کے پچھواڑے میں تو جھانک کر دیکھیں۔ وہاں اتنی غلاظت بھری ہے جسے صرف موت کا فرشتہ ہی اُٹھا کر لے جائے گا!

اسی طرح دن پر دن گزرتے گئے، ملک آزاد ہوئے، ملک غلام ہوئے، حکومتیں آئیں، حکومتیں چلی گئیں، مگر یہ کچرے کا ٹب وہیں کا وہیں رہا اور اس کے کنارے بیٹھنے والا کچرا بابا اُسی طرح نیم غنودگی نیم بے ہوشی کے عالم میں دنیا سے مُنہ موڑے ہوئے زیرِ لب کچھ بُدبُداتا رہا اور کچرے کے ٹب کو گھنگھولتا رہا۔

تب ایک رات اندھی گلی میں جب وہ ٹب سے چند فٹ کے فاصلے پر دیوار سے پیٹھ لگائے اپنے پھٹے چیتھڑوں میں دُبکا ہوا سو رہا تھا، اُس نے رات کے سنّاٹے میں ایک خوفناک چیخ سُنی۔ اور وہ ہڑبڑا کر نیند سے جاگا، پھر اُس نے ایک زور کی تیز چیخ سُنی اور وہ گھبرا کر کچرے کے ٹب کی طرف بھاگا، جدھر سے یہ چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

کچرے کے ٹب کے پاس جا کر اس نے ٹٹولا، تو اس کا ہاتھ کسی نرم نرم لوتھڑے سے جا ٹکرایا اور پھر اک زور کی چیخ بلند ہوئی۔ کچرا بابا نے دیکھا، کہ ٹب کے اندر ڈبل روٹی کے ٹکڑوں، چچوڑی ہوئی ہڈیوں، پُرانے جوتوں، کانچ کے ٹکڑوں، آم کے چھلکوں، باسی ڈبیوں اور ٹھرے کی ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے درمیان ایک نوزائیدہ بچہ ننگا پڑا ہے اور اپنے ہاتھ پاؤں ہلا ہلا کر زور زور سے چیخ رہا ہے۔

چند لمحوں تک کچرا بابا حیرت میں ڈوبا ہوا جامد و ساکت اُس ننھے انسان کو دیکھتا رہا جو اپنے چھوٹے سے سینے کی پوری قوّت سے اپنی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ چپ چاپ، پریشان، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھتا رہا پھر اس نے تیزی سے آگے جھک کر کچرے کے ٹب سے اُس بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور جلدی سے اُسے اپنے پھٹے چیتھڑوں میں چھپا لیا۔

مگر بچہ اُس کی گود میں جا کر بھی کسی طرح چپ نہ رہا۔ وہ اس زندگی میں نیا نیا آیا تھا۔ اور بلک بلک کر اپنی بھوک کا اعلان کر رہا تھا۔ ابھی اُسے معلوم نہ تھا کہ غریبی کیا ہوتی ہے، ممتا کس طرح بزدل ہو جاتی ہے، زندگی کیسے حرامی بن جاتی ہے۔ وہ کس طرح میلے پیکٹ اور غلیظ بنا کر کچرے کے ٹب میں ڈال دی جاتی ہے۔ ابھی اسے یہ سب کچھ معلوم نہ تھا۔ ابھی وہ صرف بھوکا تھا اور رو رو کر اپنے

پیٹ پر ہاتھ مار رہا تھا اور ٹانگیں چلا رہا تھا۔

کچرا بابا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیسے اس بچے کو چپ کرائے۔ اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ نہ دودھ نہ چسنی۔ اُسے تو کوئی لوری بھی یاد نہ تھی۔ وہ بے قرار ہو کر بچے کو گود میں لے کر تھپتھپانے لگا اور گہری ناامیدی سے رات کے اندھیرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا کہ اسے اس وقت بچے کے لئے دودھ کہاں سے مل سکتا ہے، لیکن جب اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے جلدی سے کچرے کا ٹب سے آم کی ایک گٹھلی نکال لی اور اُس کا سرا بچے کے منہ میں دے دیا۔

آدھ کھائے ہوئے آم کا میٹھا میٹھا رس جب بچے کے منہ میں جانے لگا تو وہ روتا روتا چپ ہو گیا اور چپ ہوتے ہوتے کچرا بابا کی بانہوں میں سو گیا۔ آم کی گٹھلی کھسک کر زمین پر جا گری اور اب بچہ اس کی بانہوں میں بے خبر سو رہا تھا۔ آم کا پیلا پیلا رس ابھی تک اُس کے نازک لبوں پر تھا اور اُس کے ننھے سے ہاتھ نے کچرا بابا کا انگوٹھا بڑے زور سے پکڑ رکھا تھا۔

ایک لمحے کے لئے کچرا بابا کے دل میں خیال آیا کہ وہ بچے کو یہیں پھینک کر کہیں بھاگ جائے۔ دھیرے سے کچرا بابا نے اُس ننھے کے ہاتھ سے اپنے انگوٹھے کو چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر بچے کی گرفت بڑی مضبوط تھی اور کچرا بابا کو ایسے محسوس ہوا جیسے زندگی نے اُسے پھر سے پکڑ لیا ہے اور دھیرے دھیرے جھٹکوں سے اُسے اپنے پاس بلا رہی ہے۔ یکایک اُسے دُلاری کی یاد آئی۔ اور وہ بچہ جو اُس کی کوکھ میں کہیں ضائع ہو گیا تھا۔ اور یکایک کچرا بابا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آج سمندر کے پانیوں میں اتنے قطرے نہ تھے جتنے آنسو اس کی آنکھوں میں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گذشتہ پچیس برسوں میں جتنی میل اور غلاظت اس کی روح پر جم چکی ہے وہ اس طوفان کے ایک ہی ریلے میں صاف ہو جائے گی۔

رات بھر کچرا بابا اس نوزائیدہ بچے کو اپنی گود میں لئے بے چین اور بے قرار ہو کر فٹ پاتھ پر ٹہلتا رہا اور جب صبح ہوئی اور سورج نکلا تو لوگوں نے دیکھا کہ کچرا بابا آج کچرے کے ٹب کے قریب کہیں نہیں بیٹھا ہے۔ بلکہ سڑک کے پار نئی تعمیر ہونے والی عمارت کے نیچے کھڑا ہو کر اینٹیں ڈھو رہا ہے۔ اور اُس عمارت کے قریب گل مہر کے ایک پیڑ کی چھاؤں میں ایک پھولدار کپڑے میں لپٹا ہوا ایک ننھا بچہ منہ میں دودھ کی چسنی لئے مسکرا رہا ہے!

ممتاز مفتی
93

ایک بات

ایک بات۔ ایک بات دور کوئی چیل ہونک رہی تھی
ایک بات منڈیر پر کوا اس کا منہ چڑا رہا تھا
اس ایک بات نے گویا سب کچھ ہی بدل دیا تھا

نمّی نے اپنے ریشمی کپڑے اتار کر پھینک دیئے تھے اور ان کی جگہ موٹے کپڑے پہن لئے تھے ریشمی کپڑے اس کے جسم کو سہلاتے تھے اور وہ محسوس کرتی تھی جیسے وہ ننگی ہو۔ موٹے کپڑے پہنتے ہی اس کے جسم کے ابھار اس کی طرف جھانکتے تھے۔ اس نے لٹھے کی چادر اٹھا کر بکل مار لی۔ پھر وہ رنگین پلنگ اور ریشمی تکیے اس کی طرف گھور رہے تھے۔ وہ اٹھ کر موڑھے پر جا بیٹھی۔

اس روز گھر کو سارا سامان اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور وہ صحن میں دھوپ میں بیٹھی تھی پاس ہی باورچی خانے میں اس کا خاوند غلام محمد ہنڈیا پکانے میں مصروف تھا۔ کمرے میں ریڈیو پر فرمائشی گانے ہو رہے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ نہ جانے کیوں ساری زندگی ہی چوپٹ ہو گئی تھی۔ وہ بیٹھی سوچ رہی تھی۔ اس سے پہلے نہ اس نے کبھی سوچا تھا نہ فکر کرنے کی اسے عادت تھی اسے کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ زندگی میں کوئی کمی ہے۔ کمی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کس بات کی کمی تھی۔ گھر میں سبھی کچھ تھا، روپیہ تھا، آرام تھا، خاوند تھا، بچی تھی اور خاوند بھی ایسا جو اس کے اشاروں پر چلتا تھا۔ پکا پکایا کھانا اس کے سامنے رکھتا، بچی کو سنبھالتا، اسے کپڑے پہناتا اور اپنے ساتھ سلاتا۔

نمّی ایک مٹیار عورت تھی۔ اور پھر صحت مند۔ اسے کبھی سر درد بھی نہ ہوا تھا، کبھی تھکاوٹ تک محسوس نہ ہوئی تھی۔ اس کا جسم بھرا بھرا تھا۔ بھرا بھرا اور سنہرا۔ اس کی سنہری جھلک دیکھ کر لوگ ٹھٹھک جاتے۔ ان کو ٹھٹھکتے دیکھ کر نمّی میں کبھی چھچھورا پن پیدا نہ ہوا تھا۔ ازلی طور پر نمّی میں ایک وقار تھا۔ ایک ٹھہراؤ جیسے کوئی شہزادی ہو۔ دیکھنے والا سہم جاتا۔ یا مسحور ہو کر اس کے قدموں میں گر پڑتا۔ لیکن نمّی نے کبھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا تھا کہ وہ سما ہوا ہے یا قدموں میں گرا ہوا ہے۔ اس نے کبھی گرے ہوئے کو اٹھانے کی کوشش نہ کی تھی اور نہ کبھی کسی کو گرانے کی۔ وہ ایک ہنس مکھ اور مگن عورت تھی خوش رہتی تھی اور دوسرے کو خوش رکھتی تھی۔ اس میں رواداری تھی۔ ساتھی بننے کی صلاحیت تھی۔ اس کی زندگی آرام اور خوشی سے بھرپور تھی۔ لیکن اس روز۔ اس روز نہ جانے کیا ہوا تھا۔ سب کچھ چوپٹ ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیوں گھر میں اک ویرانی آ گھسی تھی۔ زندگی کٹ کے رہ گئی تھی اور یہ سب اس ایک بات پر۔ اور پھر اس شخص کی بات۔ کتنی بھونڈی شکل تھی اس کی۔ گھونسہ سا تنا ہوا منہ، سرخ چیونٹوں سی رینگتی ہوئی آنکھیں اور کانٹے سے کھڑے بال۔

وہ ایک تانگے والے کی بیٹی تھی۔ ان دنوں اس کا نام شبنم نہیں بلکہ نذیراں تھا اور گھر والے پیار سے اسے نمّی کہتے تھے۔ گھر میں صرف تین افراد تھے۔ اس کا باپ محمد علی، ماں، اور وہ خود۔ اس کی ماں سوات کی رہنے والی تھی جسے اس کا باپ اغوا کر کے لایا تھا۔ باپ اسے بہت پیار کرتا تھا۔ اسے سکول میں داخل کر رکھا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ نمّی کو کالج میں پڑھائے۔ اور وہ استانی بنے۔ اور اسے اچھے کپڑے پہناتا۔ خود سینما دکھانے لے جاتا۔

نمّی آٹھویں جماعت میں ہی جوان ہو گئی۔ اس کا جسم خم و چم سے بھر گیا۔ قد بڑا سا نکل آیا۔ لوگ نظریں چرا چرا کر دیکھنے لگے۔ جماعت کی لڑکیاں

حیرت اور حسرت سے دیکھنے لگیں۔ چار ایک تو اس پہ جان دیتی تھیں۔ مس اس کی طرف دیکھ کر چونکتی اور پھر سوچ میں پڑ جاتی۔

سکول میں لڑکیاں سج دھج والی مسوں پہ جان چھڑکتی ہیں۔ بجی کی مس میں بھی خاص سج دھج تھی۔ لیکن بجی نے کبھی اس میں خصوصی دلچسپی محسوس نہ کی تھی۔ مس ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ خدوخال اچھے تھے، جسم بھی برا نہ تھا۔ بناؤ سنگار کی شوقین تھی۔ بھڑکیلے کپڑے پہنتی، ناخون رنگتی، پاؤڈر سرخی کا خاص اہتمام کرتی۔ لیکن جیسے پڑی پڑی باسی ہو گئی ہو۔ مس پر جان چھڑکنا سکولوں میں عام رواج ہوتا ہے اس لئے بجی بھی اس کی طرف متوجہ رہتی تھی۔

پہلے تو مس دیر تک بجی کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اسے دیکھ کر مسکرانا شروع کر دیا اور یہ مسکراہٹ روز بروز معنی خیز ہوتی گئی۔ جماعت میں یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ "ہے اس کی طرف دیکھ کر مس مسکرائی تھی" لڑکیوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ پھر انھوں نے خصوصی نگاہوں سے بجی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اسے محسوس کر کے خوشی ہوتی۔ بجی کے لئے مس کی مسکراہٹ میں خاص بات نہ تھی لیکن لڑکیوں کی نگاہوں میں بڑی بات تھی۔ اس لئے وہ بے حد مسرور رہتی۔

پھر مس نے بجی کو راہ لگا کے بلانا شروع کر دیا۔ بجی کیسی ہو۔ خوش تو ہو نا بجی۔ ہے کیسی پیاری قمیض پہنی ہے تم نے۔ مس کا یہ التفات بجی کے لئے کوئی معنے نہیں رکھتا تھا۔ مسرور کن تھا تو صرف اس لئے کہ اسی وجہ سے لڑکیاں اسے نگاہوں پہ اٹھا لیتی تھیں اور وہ محسوس کرتی جیسے ہوا میں اڑ رہی ہو۔

ایک روز مس نے چپکے سے اس کے ہاتھ میں کیپ سیک دے دیا۔ یہ ایک سبز ہنگی تھا جس کا بارڈر زرد دھاگے سے کاڑھا ہوا تھا۔ اور جس کے ایک کونے پر "این" لکھا ہوا تھا اور دوسرے پر "بجی"۔

بجی کو کیا خبر تھی کہ ایسی پرائیویٹ باتیں عام نہیں کی جاتیں۔ اس نے وہ رومال سہیلیوں کو دکھا دیا۔ یوں کیپ سیک کی بات جماعت میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ زنانہ سکولوں میں ایسی پرائیویٹ باتیں عام ہوتی ہیں اور عام ہو جانے کے باوجود پرائیویٹ رہتی ہیں۔

پھر ایک روز مس نے بجی کو اپنے گھر انوائیٹ کر لیا۔ اس کے بعد وہ اکثر مس کے گھر جانے لگی۔

مس اسے بڑے التفات سے ملتی۔ پاس بٹھاتی ہنس ہنس کر باتیں کرتی۔ بڑے پیار سے اس نے بجی کے جسم کے مختلف اعضا کو بیتدریج "تھپتھپایا" سہلایا۔ لیکن بجی میں کوئی خصوصی کیفیت پیدا نہ ہوئی۔ خام سے شرارے چھوٹے۔ دبی دبی ادھوری پھلجھڑیاں سی چلیں اور بس۔ جوابا بجی کے ہاتھ اور بازو حرکت میں نہ آتے۔ جو کچھ تھا۔ خالی مس ہی سہی۔ مس کی ساری زندگی محرومی اور تنہائی میں کٹ گئی تھی۔ لمس کی محرومی کی وجہ سے وہ پڑا پڑی باسی ہو گئی تھی۔ لمس کی محرومی کی وجہ سے اسے جانے کیا کیا آزمانا پڑا تھا تنہائی نے اسے صحرا بنا رکھا تھا۔

ادھر بجی کے لئے مس کے قرب کے سوا ان "تھپتھپیوں" میں کچھ بھی نہ تھا لیکن مس کے قرب کا توجب مزا تھا کہ سکول کی لڑکیوں کو پتہ چلتا۔ اور وہ چلاتیں۔ ہے اللہ اور پھر حسرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتیں۔

پھر مس کے گھر اس کا ایک رشتہ دار انور جو مقامی کالج میں پڑھتا تھا آنے جانے لگا۔ پہلے چند ایک روز تو وہ دور کے رشتہ دار کی طرح شرماتا لجاتا رہا بڑے ادب اور اخلاق سے بات کرتا۔ پھر دفعتاً وہ مس کا بہت ہی قریبی رشتہ دار بن گیا۔ اس کی جھجک اور شرماہٹ دور ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں شرارے پھوٹنے لگے اور آنکھیں نبا نبا کر مس کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کے بعد مس کو بجی کو گھر بلانے میں وقفے پڑنے لگے اور اس کا التفات "کیسی ہو بجی" "خوش تو ہو" تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ایک روز بجی کو آپ سے آپ مس کے گھر کام سے جانا پڑا۔ اس کے بیٹھے ہوتے انور آ گیا اور انور کی نگاہیں مس سے اچھل کر پیچھے بیٹھی ہوئی بجی پر پڑنے لگیں حتیٰ کہ

مس نے نجمی سے کہا۔

"نجمی اب تم گھر جاؤ گھر والے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

آٹھ ایک دن کے بعد سکول میں مس نجمی کو ایک طرف لے گئی۔ "نجمی تم اتنی دیر سے آئی ہی نہیں گھر۔ کیا بات ہے۔ ناراض ہو گیا۔ آج میرے ساتھ گھر چلو"۔ مس کی مسکراہٹ میں وہ بات نہ تھی۔ اس کی آواز میں تلخی سی تھی۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

اس روز جب انور آیا تو مس کو دفعتاً ایک ضروری کام کے لئے چند منٹوں کے لئے باہر جانا پڑا۔ کبھی کبھار انسان کو ایسے ضروری کام پڑ جاتے ہیں جن میں کام نہیں ہوتا صرف ضرورت کی شدت ہوتی ہے۔

تو بس ان چند منٹوں میں نجمی کے لئے کس قدر شدت پیدا ہو گئی۔ کمرے کی دیواریں گھوم گئیں دور بازار میں بجنے والے ریکارڈ قریب تر آ گئے۔ اور قریب جیسے دھنیں بجانے لگے، ناچنے لگے۔ پھر وہ شدت تکلیف میں بدل گئی اور بالآخر طوفان نے نجمی کو گویا ایک ویران ساحل پر پھینک دیا۔

مس کو صرف دو ایک بار ضروری کام کے لئے جانا پڑا۔ پھر ضروری کام سے جانے کی گویا ضرورت ہی نہ رہی اور وہ اس طوفان میں نجمی کی ساتھی بن گئی۔

چند ایک دن تو نجمی اکھڑی اکھڑی رہی، ہڈیاں چلچلاتی رہیں۔ بند بند دکھتا رہا۔ طوفان کا دھارا لکڑی کو پٹختا رہا۔ پھر دفعتاً لکڑی ناؤ بن گئی۔ ہڈیوں کی چلچلاہٹ میں لے پیدا ہو گئی۔ طوفان جھولے میں بدل گیا۔

اس پر نجمی کے دل سے اپنا گھر اور سکول دونوں ہی اتر گئے۔ وہ صبح سویرے سکول کی بجائے مس کے گھر آ جاتی اور شام پڑے لوٹتی۔

اس کے ماں باپ خوش تھے کہ بیٹی اتنی محنت کرتی ہے کیوں نہ کرتی، امتحان سر پہ آ رہا تھا۔

انہی دنوں انور کا ایک دوست کراچی سے آ گیا اور وہ دونوں اکٹھے مس کے گھر آنے جانے لگے۔

ایک روز صبح سویرے جب وہ مس کے گھر کی طرف جا رہی تھی تو ایک ٹیکسی سے ظہیر نکلا۔ اس نے نجمی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ٹیکسی میں کھینچ لیا۔ دو ایک دن وہ ہوٹل کے کمرے میں مقیم رہے۔ پھر ظہیر اسے اپنے ساتھ کراچی لے گیا۔

کراچی پہنچ کر دو ایک بار اسے ماں باپ کا خیال آیا۔ لیکن جلد ہی ظہیر نے اس کی توجہ کسی اور کی طرف منعطف کر دی۔ وہ نئی دلچسپی نجمی کے لئے اتنی بھرپور تھی کہ کسی اور بات کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔

جب چھٹی ختم ہو گئی اور ظہیر نے دفتر جانا شروع کیا تو نجمی کے لئے مشکل پیدا ہو گئی۔ دن کاٹنا مشکل ہو گیا۔ دل بہلانے کے لئے اس نے دروازے سے باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ظہیر کا ایک پڑوسی افضل نجمی کی نگاہوں کی شہ پا کر ایک روز اندر آ گیا اس کے بعد یہ معمول ہو گیا۔ دن بھر افضل اس کا ساتھ دیتا، رات کو ظہیر آ جاتا۔

افضل ایک بے کار اوباش اور لالچی شخص تھا۔ اس نے نجمی کو کمائی کا ذریعہ بنانے کی ٹھان لی۔ ایک روز سینما کا بہانہ بنا کر وہ نجمی کو ایک سیٹھ کے گھر لے گیا اس کا خیال تھا کہ واپسی پر نجمی غصے کا اظہار کرے گی۔ لیکن نجمی نے نہ شکوہ کیا نہ شکایت۔ یہ دیکھ کر افضل کی خوشی کی انتہا نہ رہی گھر بیٹھے بٹھائے سونے کی کان مل گئی۔ اب وہ سوچنے لگا کہ جلد اسے ظہیر کے گھر سے نکال لے۔ سو ایک روز موقعہ پا کر اس نے نجمی کو ناظم آباد کے ایک مکان میں منتقل کر دیا اور اسے باقاعدہ چلانے لگا۔

نجمی میں کچھ ایک خصوصی اوصاف تھے وہ زیادہ باتیں کرنے کی عادی نہ تھی اسے دکھاوے سے دلچسپی نہ تھی اور کسبیوں سے ناز نخرے کرنا پسند نہ کرتی تھی

البتہ یہ ضرور تھا کہ جب لوگ اس کے سنہرے جسم کو دیکھ کر ٹھٹکتے تو اس کے دل پر نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔

بحیثیت عورت اس میں دو ایسی خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے جلدی کراچی کے تماش بین حلقوں میں اس کی شہرت ہو گئی۔ ایک تو یہ کہ وہ اکتاہٹ یا تھکاوٹ سے ناآشنا تھی۔ دوسری یہ کہ اس میں ایک عجیب قسم کی سپردگی تھی۔ تو وانی حساب کم و بیش راتوں کی سپردگی جس کی وجہ سے ہر شخص محسوس کرتا جیسے وہ اس سنہری مگر گیلی مٹی کو جس سانچے میں چاہے ڈھال سکتا ہے۔ اس کا اپنا مطالبہ یا تقاضا گویا تھا ہی نہیں۔ جیسے دوسروں کے تقاضے اور مطالبات کو پورا کرنا ہی کا مقصد حیات ہو۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے اس کی مانگ میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔

نجی کو سوچنے کی عادت نہ تھی۔ اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے، کیوں کر رہی ہے اور یہ بات کب تک چلے گی۔ یا کل کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ اسے روپے کا لالچ نہ تھا۔ کل کا فکر نہ تھا۔ اچھا پہننے کو ملتا تھا، اچھا کھانے کو پھر فکر کس بات کی۔

جہاں تک دھندے کا تعلق تھا وہ فکسڈ ریٹ کی قایل تھی، نہ کم نہ زیادہ۔ سودا بازی سے اسے نفرت تھی۔ اسی وجہ سے وہ افضل سے بہت جلد متنفر ہو گئی اس لئے کہ وہ بہت لالچی اور سودا باز تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے افضل سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کر لیا اور ایک روز چپکے سے کراچی چھوڑ کر لاہور آ گئی۔

لاہور پہنچتے ہی اسے کراچی کے دو ایک پرانے آشنا مل گئے۔ اس لئے اسے خاص دقت محسوس نہ ہوئی۔ پھر چند ایک ماہ میں وہ لاہور کے حلقوں میں بھی مقبول ہو گئی۔ کسبی ہونے کے باوجود اس کے برتاؤ کی کسی تفصیل سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسبی ہے۔

پھر وہ تانگے والا غلام محمد جو اسے لے کر جایا کرتا تھا نجی کی محبت میں گرفتار ہو گیا اس نے نجی سے میل کیلئے اپنا تانگہ گھوڑا بیچ دیا اور پھر تلاش ہو کر اسی کی دہلیز پر آ بیٹھا اور اس کا کام کاج کر کے روٹی کھانے لگا۔ غلام محمد کے آنسو دیکھ کر نجی کا دل پسیج گیا اس نے مستقل طور پر اسے اپنا کارندہ بنا لیا۔ کبھی کبھار اس کی دلجوئی کر دیتی۔ پھر علاقے کا اے ایس آئی نجی سے بگڑ گیا اور اس کے گھر پولیس نے چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ حفظ ماتقدم کے خیال سے اس نے غلام محمد سے نکاح پڑھوا لیا تاکہ اس کا یوں اکیلے کسی ولی کے بغیر رہنا قابل اعتراض نہ گردانا جائے

اس پر غلام محمد کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ لیکن نجی نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ اس پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ یہ سن کر غلام محمد پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ کہنے لگا۔ " تو جہاں چاہے گی تجھے لے جایا کروں گا۔ جو چاہے گی کروں گا۔ تیری خدمت کروں گا۔ نوکر بن کر رہوں گا۔ تیری اجازت بغیر تیرے قریب نہیں آؤں گا۔ تو کچھ روز آزما کر دیکھ تو سہی۔" دراصل غلام محمد کا عشق نجی کے سنہرے جسم سے بے نیاز ہو چکا تھا اس کا صرف ایک مطالبہ تھا کہ نجی اس کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس کے بعد نجی نے غلام محمد کو ایک ٹیکسی خرید دی تاکہ دکھانے کو کوئی کاروبار رہے۔

ان سب باتوں کے باوجود اسے ایس آئی کا بیر رنگ لائے بغیر نہ رہا اور مجبوراً اسے لاہور چھوڑ کر لائلپور منتقل ہونا پڑا۔

لائل پور کی کسبیوں اور ان کے دلالوں میں مرزا کی دھوم تھی۔ مرزا کی شکل و صورت یا رہن سہن میں مغلوں کی کوئی جھلک نہ تھی۔ اس کے خدوخال جاہ و جلال یا رعب و داب سے یکسر خالی تھے۔ سلوٹوں بھرا منہ، سرخ چیونٹیوں سی رینگتی آنکھیں اور کانٹے سے کھڑے بال، اس کے چہرے کی سلوٹیں عمر کی جھریاں دکھائی نہ دیتی تھیں۔ ان میں جان تھی شدت تھی تندی تھی جیسے جھریاں نہ ہوں۔ بلکہ توڑ پھوڑ دینے کی دھونس بل کھاتے ہوتے ہو۔ اور اس کا منہ جیسے کسی نے قوت مردی کا مکا تان رکھا ہو۔ اس کی سرخ جھریوں سی آنکھیں۔ رینگتی تھیں کاٹتی تھیں۔ شک و شبہ سے ٹٹولتی تھیں۔ مرزا کا قد چھوٹا تھا اور جسم دبلا پتلا۔ بے شک مرزا میں دو اوصاف ایسے تھے جن میں مغلیہ شاہوں کا رنگ تھا۔ ایک یہ کہ وہ کوئی کام کاج نہ کرتا تھا۔ اور عیاشی کے بغیر جی نہ سکتا تھا۔ دوسری یہ کہ اس کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا

تھا کہ فلاں حالات میں وہ کیا رویہ اختیار کرے گا۔ اور فلاں میں کیا۔ کبھی گالی دینے پہ فرطِ محبت سے بغل گیر ہو جاتا کبھی تعریف سن کر بھڑ جاتا کبھی کسبی کے بازوؤں کو جھٹک کر جاتے نماز پر جا بیٹھتا۔ کبھی نماز توڑ کر پڑوسن کو تاڑنے لگتا۔

مرزا کی بیوی عرصہ دراز سے فوت ہو چکی تھی۔ پہلے اس نے دوسری شادی اس لئے نہ کی کہ بچے چھوٹے تھے۔ اب وہ شادی اس لئے نہ کر سکتا تھا کہ بچے جوان ہو چکے تھے اور اسے شرم آتی تھی۔

ضرورت کے تحت مرزا کو دھندے والوں سے میل جول پیدا کرنا پڑا تھا۔ شروع شروع میں ایک حاجت مند خاوند اسے اپنی بیوی کے پاس لے گیا اور چونکہ ان کے پاس صرف ایک کوٹھڑی تھی اور بارش ہو رہی تھی۔ لہٰذا اسی کوٹھڑی میں دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا تھا۔ اس پر وہ اپنے مقصد کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے مرزا نے خاوند کو پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں بیٹھتے ہوئے شرم نہیں آتی تجھے پھر وہ اپنے دوستوں سے کہتا پھرا تھا۔ یار یہ لوگ کتنے بے شرم ہوتے ہیں۔

پھر وہ ان کے پڑوس میں کلرک کی بیوی تھی جس کے پاس خاوند کی غیر حاضری میں وہ اکثر جایا کرتا۔ ایک روز موقعہ پاکر خاوند آگیا اور گھبرا کر آئی ام ساری کہہ کر مڑا۔ مرزا کو اس پہ اسقدر ترس آیا کہ جاتے ہوئے اس نے دو روپے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

اب تو خیر کسبیوں اور دلالوں کے حلقے میں اسے سبھی جانتے تھے۔ کسبیاں اسے سلام کرنے آتیں۔ دلال اپنی مشکلات کے متعلق اس سے مشورہ لیتے اور ضمانتیں کراتے مرزا کی مقبولیت غالباً اس کے کردار کے انوکھے پہلوؤں کی وجہ سے تھی۔ اس کی تماش بینی میں معصومیت کی جھلک تھی۔ مثلاً جب اس نے نسیم کو پہلی مرتبہ بک کیا تو اسے دیکھ کر پٹ پڑا۔

"اری تجھے تو ابھی سکول میں پڑھنا چاہیئے"

ابھی سے کس نے چلا دیا تجھے۔

"ماں نے" وہ بولی۔

"بڑی بے وقوف ہے تیری ماں۔ اسے اتنی سمجھ نہیں کہ تیرا ریٹ تو دگنا ہونا چاہیئے۔ حرامزادی مفت میں لٹا رہی ہے۔ تجھے حرام کا مال سمجھا ہے کیا" غصے میں وہ نسیم کو وہیں چھوڑ کر خود اس کی ماں سے لڑنے ان کے گھر پہنچ گیا اور دروازے پر کھڑا ہو کر چیخنے لگا: "او حرامزادی باہر نکل۔ اپنی پیٹ جائی سے ناانصافی کر رہی ہے تو۔"

مرزا ان تماش بینوں میں سے ہے جو دور سے تماش بین دکھائی دیتے ہیں مگر موقعہ پر خود تماشہ بن جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ مرزا میں ایک جیتی جاگتی سادھو بھی ہے جو نہایت ناموزوں مواقع پہ سر نکالتا ہے اور غیر متوقعہ مقامات پہ آسن جما آنکھیں موند گیان دھیان میں کھو جاتا ہے۔ دراصل مرزا میں تین افراد گڈمڈ ہو رہے ہیں۔ جٹا دھاری سادھو، تماش بین اور معصوم مگر طفیل بچہ۔

مرزا نے لاہور کے دوستوں سے بجی کی تعریف سنی تھی۔ اور وہ کئی بار اس سنہری گیلی مٹی کو اپنے من کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے لاہور جانے کو تیار ہوا تھا۔ لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ پھر اس کے ایک دوست کا خط ملا جس میں تحریر تھا کہ بجی لاہور چھوڑ کر لائل پور مقیم ہونے کے لئے آ رہی ہے۔

خط پڑھتے ہی اس نے کسبیوں اور دلالوں کو اکٹھا کیا اور ان کو خبردار کر دیا کہ بجی آئے تو سب سے پہلی بکنگ اس کی ہو گی۔

بجی لائل پور پہنچی تو کسبیوں اور دلالوں نے بجی کو مرزا کا نام دیا اور ہر ایک نے مرزا کی رنگا رنگی کی بات کی۔ بجی سوچنے لگی یہ مرزا کون ہے۔

جیسے بلی جانتے ہیں۔

چار ایک دن کے بعد بجنہ کے کہنے پر غلام محمد خود مرزا کے گھر گیا۔ کہنے لگا "بجنہ نے آج رات کام شروع کرنا ہے۔ اب جو حکم ہو۔"

"رات کا کیا لیتی ہے۔" مرزا نے پوچھا۔

"ستر روپے"

مرزا نے ستر روپے غلام محمد کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ اور بولا۔ اس سے کہنا میں وہیں آ جاؤں گا۔ دس بجے کے قریب۔" پھر اس نے دو روپے غلام محمد کی طرف بڑھا دیئے "یہ تمہارے پان سگرٹ کے لئے ہیں۔" غلام محمد نے ہاتھ پیچھے ہٹا لئے۔ " وہ برا مانتی ہے۔ منع کرتی ہے" وہ بولا۔

دفعتاً مرزا کا منہ گھونسا سا تن گیا۔ سرخ چیونٹوں نے منہ کھولے "وہ کون ہے منع کرنے والی۔ میں دے رہا ہوں میں۔"

رات کو ساڑھے دس بجے کے قریب وہ پلنگ پر بیٹھی ٹننگ کر رہی تھی۔ دروازہ بجا۔ — السلام علیکم۔

بجی نے سر اٹھایا۔ ایک منحنی سا آدمی دروازے پر کھڑا تھا۔ گھونسہ سا چہرہ، رینگتی ہوئی سرخ آنکھیں۔ کانٹے سے کھڑے بال۔ بجی نے محسوس کیا جیسے اس گھونسے تلے سارا جسم گانٹھ گٹھیلا ہو۔

وہ پلنگ کے پاس صوفے پر آ بیٹھا اور میز پر رکھے ہوئے رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔

" یہ کیسا مرد ہے جو اتنی دور بیٹھ کر رسالہ دیکھنے لگا ہے۔ بجی نے سوچا۔

کچھ دیر کے بعد مرزا نے رسالہ بند کر دیا اور بغور بجی کی طرف دیکھنے لگا۔ سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ جانچا۔ جیسے سوداگر گھوڑے کو جانچتا ہے۔

"ہوں" وہ گویا اپنے آپ سے کہنے لگا۔ کھری ہے۔"

بجی کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی لیکن وہ خاموش رہی۔

"جسم گٹھیلا ہے۔ سنہرا ہے" وہ گنگنایا۔ پھر اسے مخاطب کر کے بولا۔

"میں تیرے ریشمیں کپڑے تو دیکھنے تو دیکھنے نہیں آیا۔"

عجیب تمہید تھی۔ بجی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

"بہری ہے کیا" وہ بولا۔ سرخ چیونٹے بجی کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں پیوست ہو گئے "چھپا کر کیوں بیٹھی ہے اسے"۔

وہ چپ چاپ اٹھ بیٹھی۔ نہایت اطمینان اور وقار سے اس نے ایک ایک کپڑا اتار دیا۔ پھر کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

لیکن وہ رسالے میں ایک تصویر دیکھنے میں محو تھا۔

وہ پھر پلنگ پر بیٹھ کر ٹننگ کرنے لگی۔

"ہوں اب ٹھیک ہے" کچھ دیر کے بعد مرزا بولا۔ "کھرا ہے بہت کھرا ہے۔" اس نے اس کے جسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات کر" وہ بولا۔

"کیا بات کروں" اس نے جواب دیا۔

"کب سے چل رہی ہے تو؟"

وہ خاموش رہی

"بولتی نہیں!"

"تو چھوڑ اس بات کو" وہ بولی "مطلب کی بات کر"

"مطلب کی بات کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا تجھے"

وہ خاموش رہی۔

"کون چلاتا ہے تجھے" کچھ دیر کے بعد مرزا نے پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔

"یہ غلام محمد کون ہے؟"

"میاں ہے میرا" وہ بولی

"زبردستی چلاتا ہے یا تیری مرضی سے؟"

وہ خاموش رہی۔

"زبردستی چلاتا ہے تو بتا دے مجھے۔ میں اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا"

"تو جس خاطر آیا ہے اس کی بات کر" وہ بولی

"تیری ہڈیاں تو ہیں ہی نہیں" وہ اٹھ کر پلنگ پر آبیٹھا۔ دودھ پی پی کر پی ہے کیا وہ رینگتے ہوئے سرخ چیونٹے بیر بہوٹیاں بن کر اس کے جسم پر رینگنے لگے۔

"بڑی شہرت سنی تھی تیری"

"اچھا" وہ بولی۔

"میں تو لاہور آنے والا تھا تیری خاطر۔ اچھا ہوا جو تو یہاں آگئی"

وہ خاموش رہی۔

"پر ستر روپے بہت رقم ہے۔ ستر میں تو مہنگی نہیں، پر رقم بہت بڑی ہے۔ روز کوئی کہاں سے لائے ستر روپے"

"تو دیسے آجایا کر" وہ بولی۔

"کیوں" گھونسہ پھر سے تن گیا "میں کیا بھکاری ہوں"

بجی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور خاموش رہی۔

مرزا نے پھر کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔

بجی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "لڑ نہ اب مجھ سے" وہ بولی شاید اس کے ہاتھوں کی گرمی یا ریشمیں مس کی وجہ سے سرخ چیونٹے بلوں میں گھس گئے اور بیر بہوٹیاں پھر سے رینگنے لگیں۔

"سو روپے بھی مانگے تو۔" وہ بولا۔ "تو مہنگی نہیں۔ کھری ہے کھری۔"
ابھی سے کیا پتہ تجھے! وہ بولی
"اچھا" بچہ تالی مار کر ہنسا اور فرط انبساط سے گرد کی طرف لپکا۔ ساتھ والے کمرے سے رونے کی آواز سن کر وہ ٹھٹھکا اور پیچھے ہٹ گیا "کون ہے یہ؟"
"بچی ہے" وہ بولی۔
"بچی — کس کی بچی؟"
"میری —" وہ بولی۔
"تیری بچی؟"
"ہاں۔ اس کا جی اچھا نہیں۔"
وہ اٹھ بیٹھا اور بات کئے بغیر ساتھ والے کمرے کی طرف چل پڑا۔
کمرے میں ایک پلنگ پر غلام محمد خراٹے لے رہا تھا۔ قریب ہی دوسری چارپائی پر بچی کراہ رہی تھی۔
"ارے" وہ چلایا۔ "یہ تو بخار سے پھنک رہی ہے۔" وہ اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔
"ایک سو چار ہوگا" ہرنا بچی کی نبض ٹٹولتے ہوئے بولا۔
"اچھا" بچی نے کہا۔
وہ اُٹھ بیٹھا۔ میں ڈاکٹر کو ابھی لاتا ہوں۔ ابھی آیا۔
بیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتی وہ باہر نکل گیا۔
آدھ گھنٹے کے بعد دروازہ بجا۔ بیگ اٹھائے وہ داخل ہوا۔
"تو ادھر چلی جا" اس نے بچی سے کہا۔ "جا۔ ڈاکٹر آ رہا ہے۔"
ڈاکٹر کو دکھا کر اس سے ہدایات لینے کے بعد وہ اسے گھر پہنچانے چلا گیا۔
ڈیڑھ بجے کے قریب وہ دوائے کر لوٹا۔
پہلے بچی کو دوا پلائی۔ پھر اس کے سرہانے بیٹھ کر سر پہ ٹھنڈے پانی کی پٹی کرنے لگا۔
کچھ دیر تو وہ اس کے پیچھے جسم سے جسم ملا کر کھڑی رہی۔ لیکن وہ گویا اس کھرے جسم کو بالکل ہی بھول چکا تھا۔
"تو چھوڑ غلام محمد کرے گا" وہ بولی۔
دفعتاً گھونسہ بھر پڑا۔ "اسے کیا پتہ۔"
"میں کرتی ہوں۔" وہ بولی۔
"تو —" اس کی آواز میں تحقیر تھی۔
وہ چپ چاپ اس کے پاس بیٹھ گئی اس کے گرم اور سنہری جسم نے بڑی سرگوشیاں کیں لیکن وہ اپنی دھن میں لگا تھا۔

گھڑی نے چار بجا دیئے۔ بخار کم ہو گیا تھا۔ بچی کی آنکھ لگ گئی تھی۔

"سو گئی ہے" وہ بولی۔ "چل اب" نجی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔

"آ اب" نجی نے اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔

دفعتاً مرزا نے جھٹکا دے کر اس کے بازو پرے پھینک دیئے۔ گھونسہ پھر تن گیا "تجھے ایک بات کے سوا کچھ نہیں سوجھتا کیا" اس کی آواز میں نفرت کی دھار تھی۔

نجی نے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا ہو۔ وہ بھونچکی رہ گئی۔ ایسی بات تو اس سے کبھی کسی نے نہ کہی تھی۔ اور وہ اسے وہاں کسی اپنے مقصد کے لئے تو نہ لائی تھی بلکہ اس کے خیال سے۔ ہمدردی کے پرزور جذبے سے وہ مجبور ہو گئی تھی کہ اس پر مہربانیوں کی بوچھاڑ کر دے

"تجھے اور کچھ نہیں سوجھتا کیا۔ کیسی ماں ہے تو" مرزا نے کہا۔ وہ گھونسہ بنا ہوا اس کے روبرو کھڑا تھا۔ سرخ چیونٹوں سے شرارے نکل رہے تھے

"تیرے لئے کیا زندگی میں صرف ایک ہی بات ہے"

نجی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ کیا کرے۔ وہ ہکا بکا کھڑی تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے کسی نے چابک مار کر اسے زخمی کر دیا ہو۔

شرم سے اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ زندگی میں پہلی بار اس نے محسوس کیا کہ وہ ننگی ہے پہلے تو وہ کپڑے اتار کے سنہری ہو جایا کرتی تھی، لیکن اس وقت وہ سنہری نہیں تھی۔ کھری نہیں تھی بلکہ ننگی تھی۔ ننگی۔

کچھ دیر کمرے میں بھیانک خاموشی طاری رہی۔ پھر وہ گھونسہ ڈھیلا پڑ گیا اور جھریاں ابھر آئیں۔

"اچھا میں چلتا ہوں" وہ بولا۔ "دو دو گھنٹے کے بعد دوائی دیتی رہو"

"ذرا ٹھہر" وہ بولی۔ الماری سے نوٹ نکال کر اس نے مرزا کی طرف بڑھا دیئے "یہ لے جا"

گھونسہ ایک بار پھر تن گیا سرخ چیونٹوں کے منہ سے تھوک کی پھوار نکلی۔

"ہم کسبیوں کو دنیا جانتے ہیں ان سے لیا نہیں کرتے" وہ بولا

"لیکن تم ایسے ہی جا رہے ہو نا اس لئے۔ ستر دو اور آٹھ ڈاکٹر کی فیس کے"

"ایسے جا رہا ہوں تو اپنی مرضی سے ایسے جا رہا ہوں"

"اچھا یہ ڈاکٹر کے تو لے لو" وہ بولی۔

"تجھے کیا پتہ بچی کیا ہوتی ہے" مرزا نے ٹھنڈے غصے سے کہا۔ "تجھے تو زندگی میں صرف ایک بات سوجھتی ہے صرف ایک بات" اس کے ہونٹ نفرت سے بٹوہ بن گئے۔

صرف ایک بات۔ دروازہ زور سے بجا۔

ایک بات۔ ایک بات۔ نجی کے کولھوں میں ٹنگی ہوئی گھڑی ٹک ٹک کرنے لگی۔

صرف ایک بات۔ جسم کے ابھاروں نے ابھر ابھر کر اس کی طرف دیکھا۔

ایک بات۔ اللہ اکبر۔ مسجد کا ملا چیخنے لگا۔

نجی نے لپک کر چادر اٹھائی اور اپنا جسم ڈھانپ لیا — لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ پھر بھی ننگی ہے۔ ننگی،

قدرت اللہ شہاب

سرودِ رفتہ

سہسرام کا شہر کئی لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک تو یہاں شیر شاہ سوری کا مقبرہ ہے۔ دوسرے یہاں آغاجانی کا بازار ہے۔ اور تیسرے اسی شہر میں ایک بار رانو کی موٹر کار کے دو ٹائر پنکچر ہو گئے تھے۔

جس طرح شیر شاہ سوری کی عظمت آغاجانی کے بازار کے پس منظر کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے، اسی طرح رانو کی کار کے پنکچروں کے بغیر سہسرام کا شہر بھی اپنی تاریخی اہمیت کھو بیٹھتا ہے۔ آغاجانی کے بازار کا قصہ یوں ہے کہ کسی زمانے میں اس مقام پر ایک قصبہ آباد تھا۔ یہاں کے سردار کا لقب آغاجان تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی جسے لوگ جانی کہتے تھے۔ غالباً جانی اس کا نام نہ تھا۔ بلکہ اس کی دلفریب شان محبوبیت سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ بے حد خوبصورت اور حسین لڑکی تھی جس پر بہت سے لوگ دل و جان سے فریفتہ تھے۔ ان میں سے ایک فریدخان بھی تھا۔

فریدخان خواب دیکھنے کا شوقین تھا۔ خوبصورت خواب، بھیانک خواب۔ جنگ و جدال کے خواب۔ ہندوستان کی بادشاہت کے خواب۔ جانی کی آنکھوں، جانی کے بالوں، جانی کی مسکراہٹوں کے دلفریب سپنے۔ اور جب اس کے خوابوں کی تعبیر نکلی اور شیر شاہ نے ہندوستان کی بادشاہت کا تاج پہنا، تو ایک تیز رفتار قاصد ایک پیغام لایا، کہ "جانی میرا انتظار کرنا۔ میں بہت جلد اپنی ملکہ عالم کے حضور میں آرہا ہوں"۔ شیر شاہ بادشاہت کرتا رہا اور جانی انتظار۔ انجام کار، شیر شاہ پر ایک سنگلاخ تاریخی مقبرہ تعمیر ہو گیا، اور جانی کے نام پر جانی بازار کی بنیاد پڑ گئی۔ جہاں ہر روز اس شہیدِ وفا کی یاد میں بیسیوں جانیاں بن سنور کر، سولہ سنگار کر کے سو سو کینڈل پاور کے برقی قمقموں کے عین نیچے کرسیاں جما کر.... خیر، یہ تو ایک دوسری کہانی ہے، یہاں پر تو ایک قصہ رانو کی موٹر کار کا تھا جسے پنکچر بھی ہونا تھا، تو سہسرام میں اب اگر وہ شیر شاہ کے مقبرے یا جانی کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اسے کون روک سکتا تھا؟ اگر وہ شیر شاہ کے مزار پر چلی جاتی، تو شاید وہاں پر سوئی ہوئی خاک کی چٹکی میں ایک لمحے کے لیے آگ سی بھڑک اٹھتی۔ اور اگر وہ جانی کے بازار کی طرف جا نکلتی تو.... خیر، یہ بھی حسن اتفاق تھا، کہ وہ شیر شاہ کے مقبرے یا جانی کے بازار کی طرف جانے کی بجائے کچہریوں کی طرف چلی آئی۔

اس وقت عدالت کے سامنے چوری کا کوئی معمولی سا مقدمہ زیرِ سماعت تھا۔ پنڈت کیسری ناتھ شرما بڑے جوش و خروش سے ایک گواہ پر جرح فرما رہے تھے۔ وہ مقامی عدالتوں کے سب سے سربرآوردہ خرانٹ اور کہنہ مشق وکیل تھے۔ جب وہ گواہ سے کوئی مفید مطلب بات کہلوا لیتے تو بصد ادب و احترام، جھک کر چرب زبانی سے فرماتے تھے۔ کہ "عالیجناب عدالت اس فقرے کو نوٹ کرے" لیکن ان کی ایک بھینگی آنکھ جو مدعی، مدعا علیہ، گواہ اور مجسٹریٹ کو ایک ہی ترچھے زاویے سے دیکھنے کی عادی تھی، پکار پکار کر کہتی تھی کہ "اے وہ مجسٹریٹ کے بچے، اس فقرے کو یاد رکھنا" گواہ کی جرح پورے طور پر ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ عدالت نے اچانک مقدمے کی سماعت اگلی پیشی تک ملتوی کر دی۔ پنڈت کیسری ناتھ شرما نے کہا کہ "حضور ابھی صفائی کے دو گواہ اور موجود ہیں۔ جناب عالی وہ بڑی مشکل سے کلکتہ سے بلائے گئے ہیں۔ سرکار والا وہ آج رات کی گاڑی سے واپس

جانے پر مصر ہیں .... ان کی بھنگی انھوں نے بھی ہی مخصوص زبان میں بہت سے الٹے سیدھے وار کیے لیکن عدالت کا فیصلہ اٹل تھا ابھی ابھی عدالت نے ملاحظہ فرمایا تھا کہ آج اس کی سرزمین پر سرخ حاشیے کے سینڈلوں والے دو خوبصورت اور نازک پاؤں یوں محو خرام تھے جیسے کسی ستار پر دو حنائی انگلیاں مدھر مدھر سروں میں درباری کا الاپ بجا رہی ہوں۔ کچہری کے احاطہ میں اچانک ایک مدہوش سی شمیم بس گئی تھی۔ اور سفید جارجٹ پر بڑے بڑے گلابی پھولوں والی ایک ساڑی نے ساری فضا کو گلنار کر دیا۔ چاروں طرف ایک سناٹا سا چھا گیا، جیسے کمشنر صاحب اچانک کسی ہنگامی معائنے پر نمودار ہو گئے ہوں۔ عدالت کو ایک حسین مقدمے کے تخیل نے سرشار کر دیا۔ عبدالوہاب پیشکار کچھ عرصے کے لیے پان کی پیک نگلنا بھول گیا اور اس کے چند قطرے سامنے پڑی ہوئی تعزیرات ہند کی جلد پر ٹپک گئے، جو اس نے نظر بچا کر اپنے کرتے کے دامن سے پونچھ ڈالے۔ پنڈت کیسری ناتھ نے بھی اپنی آنکھ کا زاویہ بدلا ورالی دھڑکتی ہوئی خاموشی میں ساری دنیا نے سنا کہ ایک موسیقار کسی اردلی سے پوچھ رہی ہے کیا یہاں کسی کے پاس موٹر کار ہے؟

یوں تو سہسرام کے مقدمہ بازوں، وکیلوں، مجسٹریٹوں، کلرکوں اور چپراسیوں کو اکثر یہ خیال آیا ہوگا کہ دنیا میں موٹر کار بھی ایک نعمت ہے۔ لیکن اس وقت انھیں یہ احساس نہایت شدت سے ہونے لگا کہ موٹر کار کا نہ ہونا بھی ایک ناقابل عفو جرم اور ناقابل تلافی گناہ ہے۔ اس جنس نایاب کے فقدان نے کچہری کے احاطے میں ایک حیرانی اور پشیمانی کا ماحول سا پیدا کر دیا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ ایک زبردست احساس بے مائگی سے آب آب ہونے لگا۔ "ہائے عجب جنگلی شہر ہے یہ۔ ارے کچھ بھی اگر موٹر نہیں تو پنکچر لگانے کا سامان تو ہوگا۔ کسی کے پاس ٹائر ایریز، جیک، ربڑ سلیوشن وغیرہ وغیرہ" رانو بات تو اردلی سے کہہ رہی تھی لیکن ہر شخص محسوس کر رہا تھا، کہ وہ خاص اس سے مخاطب ہے۔ اور ان کے پشیمان چہرے، زبان حال سے فریاد کر رہے تھے کہ میری جان، یہ ایک موٹر ہی ہمارے بس کا روگ نہیں ورنہ تم کہو تو ہم آسمان سے تارے نوچ لائیں۔ چاند اتار کر تمہارے پاؤں پر رکھ دیں۔ کالی گھٹاؤں کو تمہارے گیسوؤں سے لڑا دیں۔ شیر شاہ سوری کا مقبرہ تمہاری ٹھوکر میں لا گرائیں۔ جانی کا بازار تمہارے آگے پیچھے بسا دیں۔ لیکن اے جان یہ موٹر کار کا جوتا ہمارے منہ پر نہ مارو۔ ہم روسیاہ......

رانو جلدی میں تھی، اس لیے وہ اپنے آگے پیچھے، دائیں بائیں، لہلاتے ہوئے، کسمساتے ہوئے فریادی چہروں کی آواز نہ سن سکی۔ ورنہ اس کے پاس، شرمندگی اور بے بسی کا وہ امتزاج دیکھا جو الیشر داس سائیکل ڈیلر کے منہ پر گرم گرم کول تار کی طرح تہہ بہ تہہ بچھا جا رہا تھا۔ وہ دن بھر مقدمہ بازوں، منشیوں اور مختاروں کے سائیکلوں کے پنکچر درست کیا کرتا تھا، لیکن اے وائے کہ زندگی عزیز کے اس انمول لمحے اس کا سارا کمال بے کار، بے سود رائگاں تھا۔ اگر خالی ربڑ کی بات ہوتی تو خیر وہ تو اپنی کھال تک کھینچ لیتا، لیکن اس کے پاس نہ کوئی بڑا رینچ تھا، اور نہ جیک، چنانچہ اب وہ اپنی ماڈل سائیکل ورکشاپ کے سامنے ایک بے یار و مددگار راہگیر کی طرح کھڑا تھا جس کا مال و متاع اس کے سامنے لوٹا جا رہا ہو۔ اب قسمت سے یہاں آ گئی ہو تو اپنا نور پھیلاتی جاؤ۔ تمہارے نور میں تو کوئی کمی نہ ہوگی، لیکن یہ یہاں غیر فانی ہو جائیں گی۔ یہ کھنڈر آباد ہو جائیں گے۔ آنے والی نسلیں تمہارے گیت بھی اسی شوق، اسی سوز اسی حسرت سے گائیں گی جس طرح اب جانی کے نغمے گائے جاتے ہیں......

کوئی ہوٹل، کوئی ڈاک بنگلہ، کوئی ریسٹ ہاؤس؟ ہائے یہ بھی کیا مجبوری ہے، اس نگوڑی کار کو بھی اسی جنگل میں پنکچر ہونا تھا۔ پھر ایک بھی نہیں بیک وقت دو ٹائر پنکچر ہو گئے ہیں۔ شاید ایک ٹیوب بالکل ہی پھٹ گئی ہو۔ اب اس اجاڑ بیابان میں نئی ٹیوب کہاں سے ملے گی بھلا؟ ہائے دن بھی ڈھلتا جا رہا ہے۔ بنارس یہاں سے کوئی پچاس ساٹھ میل ہی تو ہوگا۔ اگر یہ کمبخت کار پنکچر نہ ہوتی، تو اب تو وہاں پہنچ بھی گئی ہوتی۔ بنارس پہنچ کر ابھی کتنے کام کرنے تھے۔ ایک بادشاہ کا مقبرہ۔ ہماری آغوش میں آج بھی ایک جلیل القدر بادشاہ محو استراحت ہے لیکن یہ قدر ناشناس لوگ بھر بھی

کے لیے کتنے ہزار برس انتظار کرنا پڑے گا۔ دیکھو پرنس نے اس موقع پر خاص طور پر اہتمام کیا تھا۔ ہر جانب اس کا منتظر تھا۔ ہر جیلا ٹوٹ پڑا ہے
خوش دل جوان تھا۔ اور ناچتا بھی کیا خوب تھا۔ خصوصاً آج کی رات جب گرینڈ ہوٹل کا آرکسٹرا کی سریلی دھنیں بجائے گا۔ جب ہال میں مدہم
سی فضا میں عطر اور لیونڈر کی خوشبوئیں مہکیں گی اور خوبصورت اور نازک اندام حسینوں کے جسم ایک نئے خمار کی طرح چھا جائیں گے۔ جب رات کے بارہ بجے
ہزاروں سال کے انتظار کے بعد آزادی کی دیوی دبے پاؤں شیمپین کے گلاسوں کی خوشنما جھنکار کے ساتھ زمین پر اترے گی، تو پرنس کے رقص میں
کیا کیا رنگ نہ ناچے گی۔ اس کے ہلکے قدم رقص گاہ کے شفاف اور چکیلے فرش پر یوں پڑیں گے جیسے کسی جھیل کی لہروں میں کنول کے پھول تیرتے
پھر رہے ہوں اور اس کے گرم سانس بے قرار ہو کر رانو کو ایک شعلہ بے قرار کی طرح اپنی لپیٹ میں لے ناچ کر اس کے گھنگھرو میں یوں رقصاں
جیسے دیا سلائی کو بھڑکتی ہوئی آگ جو ایک دم سے تیز تیز گھمایا جائے اور اسے آگ نہ لگنے پائے، لیکن تقدیر کا نوشتہ کس نے مٹایا ہے اور
در کون مٹائے گا؟ عین اس وقت جب کلکتہ میں پرنس اپنے ڈنر سوٹ کے کالر میں لگانے کے لیے سفید گلاب کے ایک بڑے سے پھول میں
پیلائن پیرس کا عطر "پیشنٹ" شیشیوں سے چھڑک رہا تھا۔ رانو گرینڈ ٹرنک روڈ پر ایک خیراتی سرائے کی طرح بسے ہوئے چھوٹے شہر
سہسرام میں سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے چھوٹے سے تاریک سے بنگلے میں ایک ناقابل بیان بے کسی، بیزاری اور مایوسی کے عالم میں اپنا سامان اتروا
رہی تھی۔ لیکن اس مہمان کی آمد پر صدیوں سے سویا ہوا بنگلہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ اس کی اداس فضا میں بے جان دیواروں میں زندگی کے
آثار ابھرنے لگے۔ جمی ہوئی کھڑکیاں اور فرسودہ دریچے نودمیدہ کلیوں کی طرح کھلنے لگے۔ تاریک چھتوں پر جیسے چاند اور تارے طلوع ہو گئے
اور جب رانو نے اپنے لاجواب ہاتھوں سے ڈرائنگ روم کی کرسیوں اور میزوں پر بکھری ہوئی کتابوں کو الماری میں رکھ کے صوفے کا
رخ قرینے سے بدل کر رکھا تو اس بھدے بسرے پریشان حال کمرے میں نشاط اور شادمانی کی گلپوش روشیں آراستہ ہو گئیں۔ اور پھر آج کی
تاریخی رات کلکتہ نہ پہنچ سکنے کا غم غلط کرنے کے لیے رانو نے اپنے پکنک بکس سے جن، رم، اور وہسکی نکال کے چند تیز شرابی "کاک ٹیل"
بنا کے نوش جاں فرمائے۔ ان کا خمار گلابی ڈوروں کی صورت میں اس کی سبز آنکھوں میں جھلک آیا۔ اور اس کے کانوں پر آتش بازی
کی مہتابیاں انار سے چھوٹنے لگے۔ آدھی رات کے قریب جب ہم شیر شاہ کے مقبرے کی چھت پر جا بیٹھے، تاکہ سہسرام کے گلی کوچوں
میں آزادی کا لطف خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں، تو اس وقت وہ ویران مقبرہ گرینڈ ہوٹل سے زیادہ منور اور بارونق محسوس ہونے لگا اور
اس کے سناٹے میں ایک عجیب سہانی سی آرکسٹرا سا بجنے لگا۔ سہسرام کی سرزمین پر ایک نئے شیر شاہ نے جنم لیا جس پر تاریخ کبھی کوئی یادگار
تعمیر نہ کر سکے گی اور ایک نئی جانی نے ظلمت شب کو اپنے گیسوئے عنبریں سے تابانی عطا فرمائی۔ لیکن اس کے نام پر غالباً کوئی بازار قائم
نہیں ہوا... گھڑی کی سوئی بارہ بجنے سے کچھ منٹ ادھر دھیمے دھیمے لرز رہی تھی، جیسے کسی حسینہ کے دھڑکتے ہوئے ہونٹ انکار اور اقرار
کے مابین تھرتھرا رہے ہوں۔ شیر شاہ سوری کے مقبرے کے گرد جو تالاب ہے اس کی سیڑھیوں پر بہت سے ننھے خوشی اور جوش سے کلکاریاں
مارتے ہوئے انار، مہتابیاں، پھلجھڑیاں اور پٹاخے جمع کر رہے تھے اور انھیں تالاب کے گرد اس خوبی اور کوشش سے سجا رہے تھے جس طرح رانو
نے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اپنے پیچیدہ کاکلوں کو آراستہ کیا تھا۔ کلکتہ کے گرینڈ ہوٹل میں بال روم اپنے جوبن پر تھا۔ پرنس انو
کی آمد سے مایوس ہو کر مس پرمیلا کو اپنی باہوں کے حلقہ میں لیے آزادی کا رقص ناچ رہا تھا۔ "ڈارلنگ مجھے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی
کے ساتھ تھامے رکھو۔" رانو اپنی مخمور موسیقار آواز میں کہہ رہی تھی "بائی گاڈ۔ میں اس مقدس رات کو آسانی سے برداشت نہیں کر سکتی۔ بائی گاڈ
میں وفور جذبات سے مر جاؤں گی۔" آزادی کے انتظار میں رانو بھی ان بچوں کی طرح بے خود اور بے قرار ہو رہی تھی جو نیچے تالاب کی سیڑھیوں پر

ہمیں سہسرام ہی کہے جاتے ہیں۔ جاہل۔ پاگل۔ احسان فراموش۔ دیکھو تو سہی۔ تمہاری کار کے پنکچر تک نہیں جوڑ سکتے۔ گنوار۔ نالائق۔ نکمے۔۔۔

"کیا یہاں پر رات گزارنے کے لیے کوئی اچھا ہوٹل ہے؟"

ارے ہوٹل میری جان تجھے ہوٹل کی کیا حاجت ہے؟ یہ دل دیکھو یہ سینہ دیکھو۔ یہ آنکھیں دیکھو۔ یہ سارے پٹ تمہارے ہی لیے وا ہیں۔ آؤ یہ کاشانے تمہارے ہی منتظر تھے۔ اب تم کہاں جاؤ گی؟ یہ سب تمہارے ہی گھر ہیں۔ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔۔۔۔

"ہائے نہیں میں کسی کے پاس نہیں ٹھہرنا چاہتی۔ کیا یہاں کوئی ڈاک بنگلہ بھی نہیں؟ کوئی ریسٹ ہاؤس؟"

سہسرام کچہری کے احاطے میں جتنے دل دھڑک رہے تھے، وہ سب اپنی اپنی جگہ ہوٹل یا ڈاک بنگلہ یا ریسٹ ہاؤس کا رتبہ حاصل کرنے کی پرزور کوشش کرنے لگے۔ اور ان کے کواڑ بے قراری سے بار بار کھلنے تھے اور دامن پھیلا پھیلا کر فریاد کرتے تھے، کہ آؤ گھڑی دو گھڑی کے لیے ان ویرانوں کو آباد کرتی جاؤ۔ اگر یہ لاجواب ساعت بیت گئی تو کون جانتا ہے کہ پھر دوبارہ واپس آئے نہ آئے اگر تم یونہی چلی گئیں تو تاریک دھڑ انگلی تک نہ ہلا سکے گا۔

"خاک" رانو جھلا گئی ــــ "کیا نام ہے اس شہر کا؟"

سہسرام کا ذرہ ذرہ پکارنے لگا، کہ ہمیں سہسرام کہتے ہیں۔ پہلے ہمارا نام شہ سرام تھا۔ بادشاہوں کے آرام فرمانے کی جگہ۔ وہ دیکھو سامنے جو ایک سنگلاخ عمارت نظر آرہی ہے وہ ایک مقبرہ ہے۔

اس روز موٹر سائیکل کو بار بار اچانک دھکے لگتے تھے۔ اس رفیل رہ رہ کے اپنا صور پھونکتا تھا، جیسے پہاڑ ٹکرا گئے تھے۔ زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ اور اس نفسانفسی کے عالم میں رانو کے مرمریں بازو میری کائنات پر ایک مرغولہ نور کی طرح آویزاں ہو رہے تھے۔ لیکن پھر وہ بگڑنے لگی۔ سنپیلی ناگنوں کی طرح بل کھاتی ہوئی تیوریاں اس کی پیشانی پر یوں تلملانے لگیں جیسے برفانی بادلوں کے آنچل میں بجلیاں تڑپ رہی ہوں جیسے مرمر کی سلوں پر چاندی کے تار سیلاب کی طرح جھلملا رہے ہوں۔ غصے میں بھی ایک کیف ہوتا ہے۔ کیسی رعنائی، چنانچہ اگر اس روز قدم قدم پہ ٹھوکروں اور ہچکولوں نے ہمارا استقبال کیا تو اس میں نہ میرا قصور تھا نہ موٹر سائیکل کا، نہ سڑک کا، بلکہ ساری کائنات اس شہابی غبار کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھی جو غصے کی تمازت میں رانو کے گالوں پر قوس و قزح کی طرح چھا جاتا تھا۔ اور بخدا وہ کیا ہی لاجواب، لافانی، انمول لمحہ تھا جب اس کے ڈرائیور نے قطعی طور پر کہہ دیا کہ "میم صاحب پنکچر لگانے کا سامان نہیں مل سکا۔ جب تک یہ سامان نہ ملے، گاڑی بے کار ہے۔"

رانو کی کار سڑک کے کنارے اس خاموش گائے کی طرح کھڑی تھی جس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہو اور بیس بیس کوس تک کسی ڈھور ڈنگر کا ہسپتال ملنا محال ہو۔ ڈرائیور کا فیصلہ سن کر رانو کے گالوں کا شہابی غبار آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح اس کی آنکھوں میں جوالا مکھی کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اور اس کے نازک پاؤں سہسرام کی اس خوش نصیب سرزمین کو غصے سے یوں پیٹنے لگے کہ جیسے فرید خاں ہندوستان کا تخت پانے کے خواب بن بن کر بے چینی سے ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر پاؤں مارتا تھا۔ اور جیسے جانی انتظار کی گھڑیوں میں بے بس، پریشان، مجبور ایڑیاں رگڑتی تھی۔ آج شام تک رانو کا کلکتہ پہنچنا لازمی تھا۔ اس کا احساس نہ ڈرائیور کو تھا نہ موٹر کار کو جو ایک بانجھ گائے کی طرح سڑک کے کنارے دم توڑے پڑی تھی۔ حالانکہ یہ اشد ضروری تھا کہ وہ شام تک کلکتے ضرور پہنچ جائے۔ کیونکہ آج رات جشن آزادی کی رات تھی اور رات کے عین بارہ بجے جب آزادی کی دیوی آکاش سے اتر کر اس دھرتی پر آئے گی اس وقت گرینڈ ہوٹل کا بال روم اپنے پورے جوبن کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا۔ یوں تو گرینڈ ہوٹل کا بال روم ہر شب، شبِ برات مناتا ہے لیکن آزادی کی رات کبھی کوئی روز روز آتی ہے۔ اگر رانو نے یہ زریں موقع کھو دیا تو نہ جانے اسے یہ جشن دوبارہ منانے

آتش بازی کی قطاریں بجا رہے تھے۔ اف ایک بچہ دھڑام سے پھسل کر سنگلاخ فرش پر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ کا تار تڑاخ سے چھٹ گیا۔ اس کا چہرہ گرم گرم دھوئیں کے غبار میں لپٹ گیا۔ اس کی آنکھیں جھلس کر مند گئیں اب وہ اپنی آنکھوں سے اس دیوی کی شان نزول دیکھ سکے گا جس کا استقبال کرنے کے لیے اس نے اپنی توتلی زبان سے انقلاب زندہ باد کے نعرے لگانے سیکھے تھے۔ آسمان پر ایک تارا ٹوٹا۔ اور دور تک ایک خط نور کھنچتا ہوا غائب ہو گیا۔ جالی کے بازار میں طبلے پر زور کی تھاپ پڑی گھنگرو ناچے۔ شیر شاہ کے مقبرے کے پتھر سنگ مرمر بن گئے۔ چھت کے اندھیرے میں ایک شمع فروزاں بھڑکی آزادی کی دیوی سوا نیزے پر اتر آئی تھی اور میرے کانوں میں ایک نازک سی مترنم سی آواز کہہ رہی تھی "چاکلیٹ سر!"

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ہلکے نیلے فراک والی ایر ہوسٹس بسکٹوں، چاکلیٹوں، چوسنے والی مٹھائیوں کی ٹرے لیے میری سیٹ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے احمریں بالوں کی ایک لٹ بڑے بے پروائی سے لہرا رہی تھی اور اس کے یاسمین کے سنٹ کی ہلکی ہلکی سی مہیم بو آ رہی تھی جیسے پھولوں کے کنج سے ٹھنڈی ٹھنڈی نسیم کے جھونکے چھن رہے ہوں۔

بی۔او۔اے۔سی کا ایک طیارہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر اپنے چار انجنوں کی طاقت سے پوری رفتار پر پرواز کر رہا تھا۔ راوی گزر چکی تھی، اور اس کے رومان بھی۔ اب ہم دریائے سندھ کے پاس پرواز کر رہے تھے جس پر فقط سکھر براج ہی تعمیر ہو سکتے ہیں۔ اور گنگا اور جمنا اور سون اور ہگلی کے مرغزار بہت پیچھے رہ گئے تھے جہاں کے صنم خانوں میں رانی ازل تک راج کرے گی لیکن آزادی کی دیوی اب کبھی دھرتی پر نہ اترے گی۔ سہسرام کی سڑک پر کسی کار کے پنکچر نہ ہوں گے۔ شیر شاہ کا مقبرہ اب پھر آباد نہ ہوگا۔ اس کے سنگلاخ پتھر مرمر نہ بن سکیں گے۔ اس کی چھت پہ کوئی شمع فروزاں نہ بھڑکے گی۔ سرود رفتہ باز آید کہ ناید۔

ضمیرالدین احمد

اے محبّت زندہ باد

کیوں نہ کرداروں کا تعارف کرانے سے پہلے راوی کا تعارف کرادوں - راوی میں ہوں - میں ایک پرانے شریف، کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہوں مگر اب اس آنکھ کی بینائی کم ہوگئی ہے اور اس دیئے کی روشنی مدھم - یعنی میں جو فارسی کا ایم اے ہوں ایک تیل کے کارخانے میں چار سو روپیہ ماہوار پر ملازم ہوں - میری شریکِ حیات کپڑے دھوتی ہے - گھر کی صفائی کرتی ہے اور کھانا پکاتی ہے - اور میں نوکری کرنے کے علاوہ بازار سے سودا سلف لاتا ہوں یہ سب باتیں ـــ یہ نوکری کرنا، کپڑے دھونا، جھاڑو دینا، کھانا پکانا اور سودا سلف لانا ـــ میری عظیم خاندانی روایات کے برخلاف ہیں - اس خاندان میں آج تک کسی نے ـ میرا مطلب ہے مجھ سے قبل ـــ نوکری نہیں کی - اور اس خاندان کی کسی خاتون نے آج تک نہ کپڑے دھوئے، نہ جھاڑو لگائی اور نہ کھانا پکایا -

میرا بچپن اور لڑکپن ایک بہت بڑی حویلی میں گزرا جہاں خاندان کے افراد سے زیادہ نوکر چاکر ہوا کرتے تھے - لڑکے - لڑکیاں مرد - عورتیں - بڈھے بڑھیاں - پشتہا پشت سے یہ لوگ ہمارے گھرانے کی خدمت کرتے آئے تھے - شاید اسی لئے ان کے ساتھ نوکروں کا سا سلوک نہیں کیا جاتا تھا بلکہ انھیں خاندان کے غریب افراد کا رتبہ حاصل تھا - ایک بڑی بی تھیں جن کا پوپلا منہ ہر وقت چلتا رہتا تھا اور جو بیٹھے بیٹھے سو جانے کی عادی تھیں - میں انھیں دادی اماں کہا کرتا تھا کیونکہ انھوں نے میرے والد صاحب کو پالا تھا - وہ انھیں بیٹا کہا کرتی تھیں اور والد صاحب ہمیشہ انھیں بُوا کہا کرتے تھے گھر کے ہر اہم معاملے میں میری والدہ اُن سے مشورہ لیا کرتی تھیں - بڑا رعب تھا ان کا سارے خدمتگاروں پر - ایک دفعہ ڈانٹ دیتیں تو ڈانٹ کھانے والا نوکر کئی کئی دن تک ان کے سامنے آنے سے کتراتا - بیٹھے بیٹھے سو جاتی تھیں مگر نظریں ابھی تک عقاب کی سی تھیں - کیا مجال تھی کہ کوئی نوکر یا نوکرانی کوئی ایسی ویسی حرکت کر جائے اور انھیں پتہ نہ چلے - ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک نوجوان نوکرانی کی کوٹھری کے سامنے سے پچھلے پہر ایک سایہ سا لہرا کر گزر گیا - میرا مطلب ہے کہ بقول ان کے انھوں نے ایک سائے کو نوکرانی کی کوٹھری کے سامنے سے لہرا کر گزرتے دیکھ لیا - خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ بڑی بی کی آنکھوں یا ان کے ذہن کا قصور تھا یا واقعی کوئی سایہ کوٹھری کے سامنے لہرایا تھا - مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوکرانی کو کھڑے کھڑے نکال دیا گیا - اور گھر کے بزرگ بہت عرصے تک ایک قبول صورت نوکر کو مشکوک نظروں سے دیکھتے رہے - میری والدہ کہا کرتی تھیں کہ شادی کے بعد جب تک میں پیدا نہیں ہوا تھا ان کی اتنی ہمت نہ پڑتی تھی کہ بغیر لمبا سا گھونگھٹ نکالے بڑی بی کی موجودگی میں اپنے شوہر یعنی میرے والد صاحب کے سامنے آجائیں -

مگر یہ سب تو اب بھولی بسری باتیں ہوگئیں - اب نہ وہ حویلی ہے نہ وہ نوکر چاکر اور نہ وہ بڑی بی کی عقابی نظریں - اب میں اس اتنے بڑے شہر میں ایک گنجان آباد علاقے میں ایک دو کمروں کے فلیٹ میں اپنی شریکِ حیات اور تین بچوں کے ساتھ رہتا ہوں سب سے بڑی لڑکی ہے جو جوانی کی طرف بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور جس کو دیکھ کر ہم اکثر خاموشی سے ایک دوسرے کی نظروں میں جھانکنے

لگتے ہیں۔ میرا مطلب ہے میں اور میری شیک بخت۔

جس بلڈنگ میں ہم رہتے ہیں اس میں تیس فلیٹ ہیں اور تین منزلیں۔ میں بیچ والی منزل میں سڑک کے رُخ رہتا ہوں۔ جو فلیٹ ہمارے فلیٹ کے نیچے ہے اس میں ایک بمبئی کے تاجر رہتے ہیں جن کے گھر سے ہمہ وقت ریڈیو کی آواز آتی رہتی ہے اتنی بلند کہ مجھے اپنے گھر میں ریڈیو کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ جو فلیٹ میرے فلیٹ کے اوپر ہے اس میں ایک انگریزی دوا فروش رہتے ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکی بڑی ہے اور لڑکا چھوٹا۔ لڑکی جوان ہے سولہ سترہ حد سے حد اٹھارہ برس کی ہوگی۔ میرے ہاں آتی جاتی ہے۔ میری لڑکی سے اس کی دوستی ہے۔ گہری یا سطحی۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ یہ لڑکی بہت شرماتی ہے اور کبھی کھل کر میرے سامنے بات نہیں کرتی۔ بس "اچھا ابا جی" "بہت بہتر ابا جی" "نہیں ابا جی"۔ میں اس کی شرم و حیا کا لحاظ کرتا ہوں اور کبھی اس سے زیادہ باتیں نہیں کرتا۔

میری بلڈنگ کے سامنے یعنی سڑک کے اس پار ایک اور رہائشی بلڈنگ ہے۔ یہ بلڈنگ بھی سہ منزلہ ہے۔ اس بلڈنگ میں جو فلیٹ دوا فروش کے فلیٹ کے بالکل سامنے ہے اس میں ایک دفتری سپرنٹنڈنٹ رہتے ہیں۔ ان کے کئی بچے ہیں سب سے بڑا لڑکا ہے۔ بائیس تئیس برس کا ہوگا۔ کالج میں پڑھتا ہے۔ اکثر کالی تنگ پتلون، پھولدار چوخانے والی قمیص اور کالا نوکدار جوتا پہنتا ہے۔ اس کے بال لمبے ہیں جن میں وہ کافی تیل لگاتا ہے۔ سامنے سے بال کچھ اس طرح بناتا ہے کہ چڑھتی ہوئی موج یاد آجائے۔

یہ سب کے سب شریف اور نیک لوگ ہیں۔ میری مراد ہے ان لوگوں سے جو میری بلڈنگ میں، سامنے والی بلڈنگ میں اور آس پاس کی بلڈنگوں میں رہتے ہیں۔ نہ جانے کیوں یہ سب لوگ میری بہت عزت کرتے ہیں یا یوں کہئے کہ میرا انھیں بہت لحاظ ہے۔ ان میں سے اکثر عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ اور کئی تو اتنے عمر ہیں کہ ان کی بھویں تک سپید ہوگئی ہیں مگر یہ سب مجھے بھائی جان کہتے ہیں حالانکہ میری عمر صرف بیالیس برس کی ہے اور یہ طرزِ تکلم اب اتنا رواج پاگیا ہے کہ میں سارے محلے کا بھائی جان بن گیا ہوں۔ یعنی چھوٹے سے لیکر بڑے تک سب مجھے بھائی جان کہتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ایک حضرت جنھوں نے ابھی چند مہینے ہوئے اپنی زبان کا استعمال برائے گفتگو سیکھا ہے وہ بھی مجھے "بائیدان" کہہ کر پکارتے ہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیسا راوی ہے جو اپنی تعریفوں کا پٹارہ کھول کر بیٹھ گیا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا مقصد خودستائی ہرگز نہیں۔ ہماری حویلی میں خودستائی کو بہت بُری چیز سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے خودستائی کی مجھے بالکل عادت نہیں۔ ہاں۔ یہ ممکن ہے کہ ناتجربہ کار ہونے کی وجہ سے میں ایسی باتیں کہہ گیا ہوں جن کا کہانی سے کوئی خاص تعلق نہیں یا جن سے خودستائی کی بو آتی ہو۔ اگر ایسا ہوا ہے تو میں معافی کا خواستگار ہوں اور اُمید ہے کہ آپ یہ مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ میں افسانہ نگار نہیں، میری ان باتوں کو نظرانداز کردیں گے۔

اگر آپ نے مجھے معاف کردیا ہو تو ایک بات اور کہہ دوں۔ وہ یہ ہے کہ محلے والے نہ صرف مجھے بھائی جان کہتے ہیں بلکہ اکثر معاملات میں مجھ سے مشورہ بھی کرتے ہیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے خالص نجی قسم کے معاملات میں بھی مجھ سے رائے لینے سے یہ لوگ نہیں جھجکتے۔ میرے اور ان کے درمیان ایک رشتۂ اعتماد قائم ہوگیا ہے۔ اس کا عمر اور بزرگی سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ نئی پود بھی اکثر بلا جھجک مجھ سے اس طرح صلاح مشورہ کرتی ہے گویا میں بھی اسی پود کا ایک فرد ہوں۔ حد تو یہ ہے کہ معاملاتِ قلب و نظر میں بھی یہ لوگ۔ میرا مطلب ہے نئی پود کے لوگ میری رائے لینے سے نہیں جھجکتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں ان کی اس دل کی مشکلوں کا حل ڈھونڈھنے سے قاصر رہتا ہوں۔ کیونکہ ان معاملات

میں میرا تجربہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یعنی صفر ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ میری طبیعت خراب تھی اس لئے دفتر نہیں گیا تھا۔ میری شریکِ حیات غسل خانے میں کپڑے دھو رہی تھیں بچے سکول جا چکے تھے۔ محلّے میں نسبتاً امن تھا۔ کام پر جانے والے کام پر اور سکول اور کالج جانے والے سکول اور کالج جا چکے تھے۔ صبح کا وقت تھا میں بالکونی میں ایک آرام کرسی پر نیم دراز اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک پتھر آ کر میرے سر پر لگا اور اتنی زور سے لگا کہ اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ پتھر اگر ننگا ہوتا تو یقیناً میرے سخت چوٹ آتی۔ آپ کہیں گے ننگا پتھر اور ملبوس پتھر کیا بات ہوئی۔ مگر بات کچھ ایسی ہی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ پتھر ایک کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔ پتھر پر بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کاغذ پر جس میں پتھر ملبوس تھا۔ ایک نظر ڈال کر میں نے فوراً سڑک کے اس پار دیکھا کیونکہ پتھر اسی سمت سے آسکتا تھا مگر وہاں پتھر پھینکنے والے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ میں نے پتھر اٹھایا اور وہ کاغذ کھول کر جس میں وہ لپٹا ہوا تھا پڑھنے لگا۔ القاب و آداب کچھ اس قسم کے تھے۔ "میری جین سینسفیلڈ۔ میری میریلن منرو۔ جیجو" القاب و آداب پر نظر پڑتے ہی اندازہ ہو گیا کہ مکتوب الیہ میں نہیں ہوں بلکہ نامہ راستہ بھول گیا ہے۔ مگر فوراً ہی خیال آیا کہ خدانا خواستہ یہ خط میری بیٹی کو تو نہیں لکھا گیا ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ میں دوسروں کا خط پڑھنے والی نصیحت جو مجھے بار بار حویلی میں کی گئی تھی یکسر بھول گیا اور جلدی جلدی خط پڑھنے لگا۔

"مجھے تمہارے بھائی نے بتا دیا تھا کہ آج تم سکول نہیں جاؤ گی۔ اس لئے میں بھی آج کالج نہیں گیا درد سر کا بہانہ کر دیا۔ ویسے یہ سچ بھی ہے۔ میرے سر میں سچ مچ درد ہو رہا ہے۔ پوچھو۔ کیوں؟ میری سرکار اس لئے کہ میں رات بھر نہیں سو پایا۔ پھر پوچھو۔ کیوں؟ میری جان اس لئے کہ رات بھر تم۔ نہ پوچھو۔ کس کس طرح سے یاد آتی رہیں اور میں کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند نہیں آئی۔ آنکھوں میں کانٹے اُگ آئے تھے۔ ہائے کیا عالم ہو جاتا ہے جب میں اپنی ڈورس ڈے سے دو تین دن تک نہیں مل پاتا ــــ"

خط کے اس حصے پر پہنچ کر میں ٹھٹھک گیا۔ میں فلم نہیں دیکھتا۔ اس لئے نہیں کہ میں فلموں کے خلاف ہوں بلکہ اس لئے کہ گھر کے بجٹ میں اس خواہش کو پوری کرنے کی گنجائش یا تو نکلتی نہیں یا بہت کم نکلتی ہے۔ لیکن پھر بھی میں میریلن منرو کے نام سے واقف ہوں اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ جین مینسفیلڈ بھی میریلن منرو قسم کی کوئی شخصیت ہے۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے یا تھا لیکن جب مسماۃ ڈورس ڈے کا ذکر آیا تو میں ٹھٹھک گیا کیونکہ یہ نام میں نے اس سے قبل کبھی نہیں سنا تھا۔

لیکن یہ ٹھٹھکنا مجھے بہت مہنگا پڑا کیونکہ پھر میں آگے نہیں پڑھ سکا۔ اس ایک لمحہ توقف میں انگریزی دوا فروش صاحب کی صاحبزادی جن کا نام نسیمہ انجم جاوید ہے اور جنھیں ان کے گھر والے اور میرے گھر والے مع میرے صرف نسی کہہ کر پکارتے ہیں آن دھمکیں۔

اگر میں کہانی کو اس مقام پر چھوڑ کر آپ سے یا کسی افسانہ نگار سے کہوں کہ میرے بھائی اب تم اسے آگے بڑھاؤ تو مجھے یقین ہے کہ آپ یا اور افسانہ نگار صاحب سلسلہ یوں جاری رکھیں گے کہ نسی بیٹی کو دیکھتے ہی میں نے خط کو چھپا لیا، اس پر بیٹھ گیا یا اس کی پڑیا بنا کر یا اسے اپنی جیب میں رکھ کر، یا منہ میں ڈال کر، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ نسی بیٹی بس ایک لمحے بھر کے لئے جھجکیں۔ یعنی انھوں نے دو ایک بار پلکیں جھپکائیں۔ گردن کو ایک بہت ہی خفیف سا خم دیا جو جھک جانے کی بہت ہی ابتدائی شکل تھی۔ ایک ہاتھ کو ذرا سا اوپر اٹھایا اس انداز سے کہ دیکھنے والا اگر ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ تجربہ کار بھی ہو تو وہ اندازہ لگا لے کہ اگر یہ حرکت درجۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو

دانتوں سے بلا وجہ ناخون کاٹنے کی حرکت بن سکتی ہے۔

اور پھر بولیں " ہائے اللہ! بھائی جان آپ میرا خط پڑھ رہے ہیں "

سچ تو یہ ہے کہ اگر نسیّ بیٹی خط پر اپنا حق نہ جتاتیں تو مجھے ہرگز پتہ نہ چلتا۔ کم از کم اندازہ تو ہوتا کہ مکتوب الیہ وہ ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ لکھنے والا کون ہے کیونکہ خط کے اختتام پہ لکھنے والے کا نام درج نہیں تھا۔ جی ہاں! آپ کا قیاس درست ہے میں نے القاب و آداب کے بعد سب سے پہلے خط کے اختتام پر نظر ڈالی تھی۔ لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ مجھے اسی وقت لکھنے والے کا نام معلوم ہو گیا۔ نہیں۔ یہ تو بعد کی بات ہے۔

میں نے کہا " تمہارا خط!" میرے لہجے میں حیرت کا شائبہ تھا۔

" کہہ جو دیا میرا خط ہے " وہ اٹھلائیں۔

اور قبل اس کے کہ میں یہ سوچتے ہوئے کہ حق بحقدار رسد خط ان کی طرف بڑھاؤں انھوں نے جھپٹ کر خط میرے ہاتھ سے لے لیا بلکہ چھین لیا اور یہ جا وہ جا۔ مگر یہ جا وہ جا کا فعل مکمل کرنے سے قبل انھوں نے رُک کر میری طرف دیکھا اور بولیں " کسی سے کہئے گا نہیں۔ میرے اچھے بھائی جان!"

میں نے کسی سے نہیں کہا۔ مگر اس واقعے کے کئی ماہ بعد ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ میری خاموشی بے سود ثابت ہوئی۔

ایک رات جبکہ محلے کا شور و غل قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ یعنی سب لوگ بستروں میں گھسنے والے تھے یا گھس چکے تھے اچانک کچھ ایسی آوازیں میرے کان میں آئیں جن پر نہ کسی ریڈیو پروگرام کا شبہ ہو سکتا تھا۔ نہ سودا بیچنے والوں کے نعروں کا۔ نہ میاں بیوی کے جھگڑے کا۔ نہ پڑوسیوں کی لڑائی کا اور نہ آوارہ لڑکوں کی تفریح کا۔ کئی آوازیں تھیں، ایک مرد کی۔ ایک عورت کی، ایک لڑکی کی۔ آہستہ آہستہ میرے ذہن نے نہ صرف ان آوازوں کی سمت کا تعین کر لیا بلکہ یہ اندازہ بھی لگا لیا کہ ان کے خالق کون ہیں۔ آوازیں نسیّ کے فلیٹ سے آ رہی تھیں۔ اور یہ آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس کے والد صاحب، اس کی والدہ اور اس کے چھوٹے بھائی کے حلق سے۔

میرے فلیٹ کی بالکونی کے سرے پر کھڑے ہو کر اگر اوپر کی طرف دیکھا جائے تو نسیّ کے فلیٹ کی بالکونی کا منظر بخوبی نظر آ جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے اگر وہاں کوئی منظر ہو تو۔ اس لئے میں دوڑ کر اپنی بالکونی میں آ گیا۔ اور اوپر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس خاندان کے تین افراد نسیّ، اس کے والد صاحب اور اس کی والدہ — بالکونی میں تھے۔ نسیّ کو دوا فروش صاحب اور ان کی اہلیہ پکڑے ہوئے تھیں اور وہ چلّا چلّا کر کہہ رہی تھی " مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔" جہاں میں آسمانی بلاؤں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والے کتے کی طرح منہ اوپر کئے کھڑا تھا وہاں سے نسیّ کا بھائی نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس کی آواز صاف آ رہی تھی وہ رو رہا تھا زور زور سے۔ جیسے ڈر گیا ہو۔ سہم گیا ہو۔ آس پاس اور دوسری بلڈنگ کے فلیٹوں میں سے بھی لوگ اس منظر کو کھڑکیوں میں سے جھانک کر یا کھلے عام بالکنیوں میں کھڑے ہو کر دیکھ رہے تھے۔ ایک بار جو نسیّ نے زور لگایا تو تقریباً اپنے والد اور والدہ کی گرفت سے آزاد ہو گئی اور میرے پیروں تلے سے بالکنی کا فرش کھسک گیا۔ کیونکہ مجھے ایسا لگا گویا وہ بالکنی میں سے چھلانگ لگا کر نیچے سڑک پر گرا چاہتی ہے۔ مگر فوراً ہی دوا فروش صاحب اور ان کی اہلیہ نے دوبارہ اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ لگا کر — یہ میں ٹھیک نہیں دیکھ پایا کہ طمانچہ ماں

نے مارا تھا یا باپ نے۔ اسے گھسیٹتے ہوئے فلیٹ میں لے گئے۔ تھوڑی دیر تک لستی کے چیخنے اور چلّانے اور اس کے بھائی کے رونے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر وہ بھی بند ہوگئیں اور بلڈنگوں کی کھڑکیاں ایک ایک کرکے بند ہونے لگیں۔ میں بھی آکر بستر پر لیٹ گیا اور اپنی شریکِ حیات سے اس مسئلے پر تبادلۂ خیالات کرنے لگا کہ آیا مجھے اس وقت لستی کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیئے یا نہیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ یہ مناسب وقت نہیں ہے۔ اس لئے میں تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو کے زرّیں مقولے پر عمل پیرا ہوا اور لمبی تان کر سو گیا۔

مگر دوسرے دن لمبیٔ والے صاحب مجھے زینے پر مل گئے۔ سلام دعا کے بعد یوں گویا ہوئے۔

"رات کا تماشہ دیکھا آپ نے بھائی جان؟"

"کیسا تماشہ؟" میں نے ان کے سوال کا مفہوم کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے اظہارِ لاعلمی کیا۔

"وہی جو اوپر والے مالے میں ہوا تھا۔" ان کے تعلقات انگریزی دوا فروش صاحب سے کشیدہ تھے۔ اس لئے وہ ان کا نام لینے سے حتی المقدور گریز کرتے تھے اور اگر ان کا ذکر آ ہی جاتا تو "اوپر والا مالا" قسم کے اشاروں سے کام چلاتے تھے۔

"جی ہاں۔" میں نے کہا "کچھ شور و غل ہو رہا تھا۔"

"آپ سو رہے ہوں گے تو سن لیتے ہیں۔" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ساری بلڈنگ نہیں سارا محلہ جاگ پڑا تھا۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ آواز تو ہم نے بھی سُنی تھی۔"

"خود کشی ہوگی۔" انھوں نے مسکراہٹ کو چہرے کے بقیہ حصوں پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ "بائی بچ گئی۔" ان کی مراد لستی سے تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ ان کی گفتگو میں دلچسپی کا اظہار کیا۔

"کیوں۔ اسے کیا ہو گیا تھا؟"

"کھُدکسی کر رہی تھی۔"

"سچ!"

"اور کیا۔ بالکنی پر سے کود رہی تھی۔ میں نے کھُد دیکھا تھا۔ آدھی سے جیاستی لٹک گئی تھی۔"

"مگر کیوں؟"

"یہ اپن کو ٹھیک سے نہیں معلوم۔ سُنا ہے کہ عاشکی والی بات ہے۔"

میں نے انھیں زیادہ نہیں کریدا کیونکہ اول تو یہ میری فطرت نہیں اور دوسرے مجھے دفتر جانے کی جلدی تھی۔ لیکن سورج ڈھلے لستی کے والد صاحب نے میرے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پریشان اور متفکر نظر آرہے تھے۔ کہنے لگے "آپ سے ایک معاملے میں مشورہ کرنا ہے۔"

میں نے کہا "فرمائیے"

بولے۔ "کل رات لستی خودکشی کا اقدام کر بیٹھی تھی۔"

میں چپ رہا۔

"یہ جو سامنے والا بلڈنگ ہے نا" انھوں نے بلڈنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس میں وہ جو سپرنٹنڈنٹ صاحب رہتے ہیں ان کے صاحبزادے ہے اسے . . . "

یہاں پہنچ کر وہ ٹھٹھک سے گئے اس لئے میں نے کہا "جی میں سمجھ گیا۔"

میری بات نے وہ مرحلہ طے کرا دیا جس پر وہ ٹھٹھک گئے تھے۔ بولے: بھائی جان۔ آپ ہی بتائیے۔ یہ رشتہ کس طرح ممکن ہوسکتا ہے "

جب تک میں اس رشتے کے ناممکن ہونے کی توجیہہ نہ سن لیتا کیا کہتا۔ اس لئے چپ رہا۔

"وہ لوگ پٹھان ہیں اور اگر سید بھی ہوتے تب بھی ہمیں ان کے طور طریقے پسند نہ آتے اور بھائی جان سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ لڑکا ہمیں بالکل پسند نہیں۔ آوارہ ہے۔"

میں "ہوں" کر کے تھوڑی دیر چپ رہا پھر بولا "مگر ظاہر ہے کہ نسی بیٹی کو اس سے بہت گہرا اور بہت مخلصانہ لگاؤ ہے ورنہ وہ اتنا بڑا اقدام کیسے اٹھاتی "

"یہی تو مشکل ہے۔ ابھی کم عمر ہے۔ برے بھلے کی تمیز نہیں۔ جذبات سے مغلوب ہوگئی ہے اگر آپ اسے سمجھائیں تو ۔"

"آپ نے سمجھایا؟"

"ہم لوگ تو کئی دن سے سمجھا رہے تھے۔ اسی دن سے جس دن اس نے بلا جھجک اپنی والدہ سے کہہ دیا تھا کہ اس کی شادی اس لڑکے سے کردی جائے۔ ہمارے تو وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ وہ اتنی جرأت کرے گی۔ اور وہ بھی اس عمر میں۔ کل رات یہی سلسلہ جاری تھا کہ یہ اقدام کر بیٹھی۔ اب آپ ہی بتائیے ہم کیا کرسکتے ہیں۔ نہ جانے کونسی الو کی لکڑی پھیر دی ہے اس لونڈے نے میری معصوم بچی پر شاید آپ کے سمجھانے سے مان جائے۔"

میں حامی نہ بھرتا تو کرتا۔ میں نے کہا "آپ اس پر زیادتی نہ کریں۔ میں موقع دیکھ کر اس سے گفتگو کروں گا" زیادتی نہ کرنے کی بات میں نے اس لئے کی تھی کہ وہ دورانِ گفتگو میں مجھے بتا چکے تھے کہ کل رات سے انھوں نے نسی کو ایک کمرے میں بند کر رکھا ہے۔

نسی سے گفتگو کرنے کا موقع مجھے تین چار دن بعد ہی مل گیا۔ موقع خود اسی نے فراہم کیا۔ یعنی اس بار وہ مجھ سے صلاح دینے کو نہ آن دھمکی۔ ترشے ہوئے بال، تنگ شلوار، تنگ قمیص، آنکھوں میں سرمہ، ہونٹوں پہ ہلکی سی لپ اسٹک، پہلے تو ذرا جھجکی پھر بولی "بھائی جان آپ ہمارا ایک کام کردیں تو ہم آپ کی غلامی لکھ دیں۔"

"فرمائیے" میں اسے چھیڑنے کے لئے ہمیشہ اس سے نیم سنجیدہ لہجے میں گفتگو کرتا ہوں۔ آخر میری بیٹی سے صرف چند سال ہی تو بڑی ہے "میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

"ہٹائیے بھی بھائی جان آپ کو تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے۔"

"ارے بھئی۔ اس میں مذاق کی کیا بات ہے۔ میں خدمت کے لئے حاضر ہوں۔"

"جائیے ہم آپ سے نہیں بولتے" اور اس نے سچ مچ منہ پھلا لیا۔

"ارے پگلی ناراض ہوگئی" میں نے اس کے رخسار پر ہلکے سے تھپڑ لگاتے ہوئے کہا

وہ مسکرا دی "آپ بابا سے بات کیجئے" وہ اپنے باپ کو بابا کہتی ہے۔

"میں تمہارے بابا سے اکثر بات کرتا ہوں"

اس کا منہ پھر پھولنے لگا تو میں نے فوراً لہجہ بدل کر کہا۔ "اچھا بھئی مذاق بند۔ کہو۔ کیا کہنا چاہتی ہو"

اس کی فرمائش صرف اتنی تھی کہ میں اس کے باپ پر اپنا اثر ڈال کر ان سے اس رشتے کی منظوری حاصل کر لوں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور اس کا دلکش چہرہ بے حد سنجیدہ ہو گیا تھا۔ مجھے اچانک احساس ہوا کہ میرے سامنے ایک رس سے بھری لچکیلی شاخ نہیں بلکہ ایک خشک ٹہنی ہے جسے اگر زیادہ جھکانے کی کوشش کی گئی تو ٹوٹ جائے گی جھکے گی نہیں اس کی آواز میں ارادے کی پختگی تھی اور اس کے لہجے میں تکمیل کا کرب تھا۔ اس لڑکی کو سچی محبت ہے۔ میں نے سوچا اور یکلخت اس وعدے کو بھول گیا جو میں نے اس کے باپ سے کیا تھا۔ اس نے مجھے جیت لیا تھا۔ وہ اب میں سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس کے باپ سے بات کروں کہ وہ مان جائیں

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "تم فکر نہ کرو نسی۔ میں ضرور تمہارے والد سے بات کروں گا"

"وعدہ؟" وہ ابھی تک سنجیدہ تھی

"پکا وعدہ" میں بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

وہ مسکرائی۔ پھر ہنسنے لگی "میرے اچھے بھائی جان!"

"میرے اچھے بھائی جان" میں نے اس کی نقل کی۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور مٹک کر چل دی۔

"مگر . . . ."

وہ رک گئی اور مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"مجھے کیا دو گی؟"

"کیا دوں گی؟"

"ہاں بھئی۔ حق محنت"

اس نے لمحے بھر رک کر سوچ کر کہا "منہ مانگا انعام" اور یہ جا وہ جا۔

اتفاق ایسا ہوا کہ نسی سے وعدہ کرنے کے بعد کئی دن تک میں اس کے باپ سے بات نہ کر سکا۔ کسی دن مجھے دفتر سے آنے میں دیر ہو گئی، کسی دن انھیں۔ کسی دن ان کے ہاں مہمان آ گئے، کسی دن میرے ہاں۔ کسی دن وہ باہر چلے گئے، کسی دن میں۔ اس عرصے میں کئی مرتبہ نسی سے مڈبھیڑ ہوئی اور ہر دفعہ اس نے مجھے میرا وعدہ یاد دلایا۔ شروع شروع میں تو وہ شاید میرے وعدہ پورا نہ کر سکنے کے اسباب کو قبول کرتی رہی مگر بعد میں مجھے کئی بار شبہ ہوا کہ وہ مجھے جھوٹا سمجھ رہی ہے۔ یا یہ سمجھ رہی ہے کہ میں اسے ٹال رہا ہوں۔

"دیکھئے بھائی جان۔ آپ وعدہ خلافی کر رہے ہیں" اس نے ایک دن منہ پھلا کر کہا۔

"نہیں نسی۔ موقع نہیں ملا۔ بس کچھ دن اور انتظار کرو"

اس کا منہ بدستور پھولا رہا اور اس کے ماتھے پر فکر کی شکنیں بدستور پڑی رہیں تو میں نے اسے چھیڑا "اور میرا انعام؟"

پھر ایک دن جبکہ میری شریکِ حیات مع میرے بچوں کے اپنی بہن کے گھر گئی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے چھٹی کا دن تھا۔ وہ سنی میرے فلیٹ میں آن دھمکی۔ میں لیٹا ہوا تھا۔ آ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔

میں نے کہا "بیٹھ جاؤ"

وہ پلنگ پر میرے پاس بیٹھ گئی۔ چپ تھی اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اس کی طرف کروٹ بدلتے ہوئے کہا "مجھے ایسے کیوں گھور رہی ہو"۔

وہ پھر بھی چپ رہی۔

"کیا چپ کا روزہ رکھا ہے؟"

اس کا سکوت پھر بھی نہیں ٹوٹا

"مجھ پر رعب ڈال رہی ہو کیا؟"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ نے انعام مانگا ہے۔ حقِ محنت!"

"مانگا تو ہے"

"اور جب تک آپ کو انعام نہیں مل جائے گا۔ آپ میرا کام نہیں کریں گے؟"

ظاہر ہے کہ اس کا خیال بالکل غلط تھا مگر میں نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا۔ "بالکل درست!"

"اسی لئے آپ ٹال مٹول کر رہے ہیں؟"

"بالکل اسی لئے"

"ہوں۔"

اس طویل "ہوں" کے بعد لمحے بھر خاموش رہی اور پھر ہنستی ہنستی بولی "میرے پاس آپ کو دینے کے لئے اور تو کچھ نہیں سوائے" وہ رکی اور اس لمحۂ توقف میں اس کا دایاں ہاتھ اس کی پوشاک کے ایک گرہ دار بند کی طرف بڑھا اور پھر اس نے جملہ مکمل کیا "۔ سوائے اس کے۔"

اور بمبئی والے صاحب کے فلیٹ سے کسی نئے فلمی گانے کی فلک شگاف آواز آ رہی تھی

"اے محبت زندہ باد!"

مسعود مفتی

نام

ایم اے کے امتحان میں چند روز باقی تھے ۔ میں یونیورسٹی لائبریری میں کتابیں ڈھونڈ رہا تھا کہ میری نظر اُس پر پڑی ۔ وہ میز پر بیٹھی کسی کتاب میں سے کچھ نقل کر رہی تھی ۔ جب میں نے دیکھا تو اُس نے بھی سر اٹھا کر مجھے یوں ہی دیکھا ۔ کمرے کی دھندلی روشنی میں وہ بڑی دلکش نظر آئی ۔ پھر جب کتاب درج کرانے کے لیے میں کاؤنٹر پر لائن میں کھڑا تھا تو اُس کی پشت میری طرف تھی ۔ لمبی گردن میں ہلکا سا خم تھا ۔ اور باریک چنا ہوا سفید دوپٹہ مور کے پروں کی طرح گردن اور سر کی پشت پر پھیلا تھا ۔ یہ انداز اتنا اچھا لگا کہ کتاب لینے کے بعد بھی میں نے دو تین بار دروازے میں سے جھانک کر اُسے دیکھا ۔

ہمارا امتحان شروع ہو گیا ۔ میں روزانہ پرچہ دینے یونیورسٹی ہال میں جاتا ۔ ایک دن پرچہ ختم کرکے باہر نکلا ۔ پورچ میں چند ہم جماعتوں سے سوالات پر بات کر رہا تھا ۔ کہ وہ انیقہ کے ساتھ ادھر آتی نظر آئی ۔ دوپہر کا وقت تھا اور وہ دھوپ میں آ رہی تھی ۔

" ارے اس کی شکل تو کوئی خاص نہیں " ۔ میں نے دل میں سوچا ۔ " اس روز تو بڑی اچھی لگ رہی تھی ۔

انیقہ نے جیسے ہی مجھے دیکھا وہ بڑھ آئی ۔ " آپ کے لیے ایک پیغام ہے ——— ہمارے پروفیسر صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ اُن سے آج ضرور مل لیں ۔ "

اتنے میں چند قدم آگے جا کر وہ کھڑی ہو چکی تھی ۔ میں نے انیقہ کا شکریہ ادا کرتے کرتے اس کی طرف ایک پھسلتی ہوئی نگاہ ڈالی تو اس نے فوراً پلکیں جھکا لیں ۔ اتنے میں انیقہ اُس تک پہنچ گئی اور وہ دونوں چل دیں ۔ آج وہ اتنی اچھی نہ لگی تھی ۔ اس لیے میں نے بھی دوسری دفعہ نہ دیکھا ۔

مجھے بالکل علم نہ تھا کہ یہ لڑکی کون ہے ، کس مضمون میں ایم اے کر رہی ہے ۔ آیا پہلے سال میں ہے یا دوسرے میں ' یا اس کا نام کیا ہے ۔ نہ ہی میں اتنا دلدادہ ہوا تھا کہ یہ سب کچھ پتہ کرتا پھرتا ۔ میرا امتحان ختم ہو گیا تھا ۔ اور میں کبھی کبھار پبلک لائبریری کتاب لینے یا رسالہ وغیرہ دیکھنے چلا جایا کرتا تھا ۔ یا شام کو تھوڑی سیر کر لیتا تھا ۔

کوئی دو ماہ بعد میں صبح کے وقت پبلک لائبریری کے ریکارڈ روم میں جانے لگا تو سیڑھیوں کے پاس آکر اُس نے اپنی سائیکل روکی ۔ اور تالا لگانے لگی ۔ میں کچھ خیال کیے بغیر اندر چلا گیا اور ٹائمز کے پرانے پرچے اٹھا کر میز پر بیٹھ گیا ۔

اتنے میں وہ بھی آ گئی اور کاؤنٹر پر کلرک سے باتیں کرنے لگی ۔ آپ نے تو پبلک لائبریری کا ریکارڈ روم دیکھا ہوگا اُس کے صرف ایک طرف دروازہ ہے ۔ درمیان میں ایک بڑی سی گول میز ہے جس کے گرد خالی کرسیاں پڑی ہیں اور دوسری طرف ایک کاریڈور سی ہے جس کے منہ پر جالی ہے ۔ ادھر سے کچھ روشنی آتی رہتی ہے ۔ مجموعی طور پر کمرہ کافی تاریک ہے ۔ جس میں دن کی روشنی یا تو دروازے سے آتی ہے یا جالی سے اور باقی تاریکی دور کرنے کو بلب جلتے رہتے ہیں ۔

وہ دروازے کے قریب ہی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی ۔ میں اندھیرے میں تھا اور دروازے میں سے داخل ہونے والی تیز روشنی کے چوکور فریم میں اس کا تاریک خاکہ نظر آتا تھا ۔ نقوش کی تفصیل تو نظر نہ آتی تھی مگر آؤٹ لائن بڑی دلفریب تھی ۔ ننھی سی ناک اور تھوڑی

کی گولائی دوپٹے کی جالی میں سے نظر آتی تھی۔ نیچے سیدھی گردن دوپٹے کے روشن اور تاریک گڑھوں میں گھری ہوئی۔ اس سے آگے کالا کالا جس سے ذرا پرے کندھے سے امنڈنے والا آبشار کی طرح لٹک رہا تھا ——— میں بار بار دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔

استنے میں وہ کلرک کے ساتھ اندر آگئی۔ کلرک کوئی کتاب ڈھونڈنے لگا اور وہ ساتھ ہی پھر رہی تھی۔ وہ سیڑھی لگا کر اُوپر والے شیلف پر جاتا تو وہ ننھی سی ناک اور ٹھوڑی اپنی سیدھی گردن پر اُٹھائے اُوپر دیکھنے لگتی اور کمرے کی نیم تاریکی میں بڑی اچھی لگتی۔ تھوڑی دیر بعد اسے کتاب مل گئی اور وہ میرے سامنے میز پر بیٹھ کر پڑھنے لگی۔

ہم کوئی گھنٹہ بھر بیٹھ کر پڑھتے رہے۔ کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ مگر میں کبھی کبھی اُسے چوری چوری دیکھ لیتا۔ جالی میں سے آنے والی مدھم روشنی میں اس کے چہرے کے بعض حصے روشن تھے اور بعض تاریک۔ مجھے پہلی دفعہ غور سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اُس کا رنگ کھلا ہُوا تھا۔ چہرہ چاندنی کی طرح گول تھا۔ چھوٹی سی چپٹی ناک تھی۔ آنکھیں لمبی اور بڑی تھیں جن پر پلکوں کا گھنا سایہ تھا۔ چہرے کی جلد زیادہ صاف نہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کبھی زمانے میں اس کے بہت زیادہ مہاسے نکلے تھے۔ گو اب نہ تھے۔ اس کے نقوش کو ہم فرداً فرداً خوب صورت نہیں کہہ سکتے تھے۔ مگر لمبی گردن کے ہلکے خم۔ باریک ہونٹوں کی ہلکی سی مسکراہٹ اور دونوں گالوں میں ننھے ننھے گڑھوں کی وجہ سے وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ ویسے بھی گول چہرہ میری کمزوری ہے۔

تھوڑی دیر بعد اسے بھی احساس ہوگیا کہ میں اُس سے متاثر ہو رہا ہوں اور اُس کی مسکراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ وہ ایک دفعہ اس نے میری طرف دیکھا بھی۔ تب ایک اور پیاری چیز کا پتہ چلا۔ گردن کے خم کی وجہ سے وہ آنکھوں کے کونوں کا استعمال زیادہ کرتی تھی۔ اور اس کی پلکیں اُٹھنے اور جھکنے میں کانپتی تھیں جیسے ابابیل کے پَر ہوں۔ کچھ دیر بعد وہ اُٹھ کر چل دی۔ میں بھی برائے نام ہی پڑھ رہا تھا اِس لیے اُٹھ کر باہر نکلا۔ مگر وہ سائیکل پر جا رہی تھی اور میں پیدل ہونے کی وجہ سے پیچھے رہ گیا۔

چند دن تک وہ وقتاً فوقتاً یاد آتی رہی۔ دِل کرتا کہ اُسے دیکھوں مگر کہاں ؟ ؟ ؟ نہ مجھے اُس کا گھر معلوم تھا۔ نہ نام۔ نہ کلاس۔ آہستہ آہستہ خود ہی خیال محو ہونے لگا۔

تین ماہ گزر گئے۔ چھٹیوں کے بعد یونیورسٹی کھُل گئی۔ لاہور پھر سے جوبن پر آگیا۔ ہر طرف خوش باش جوان چہرے نظر آنے لگے۔ ایک دن میں یونیورسٹی میں سے گزر رہا تھا کہ وہ ایک ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہو رہی تھی۔

"شاید یہ یہاں پڑھتی ہے"۔ میرے دِل میں کرید ہوئی اور میں بھی اندر چلا گیا اس ڈیپارٹمنٹ میں صبح کے وقت ایم اے کی کلاس ہوتی تھی اور شام کے وقت ایک ڈپلوما کورس پڑھایا جاتا تھا۔ میں دو سال پیشتر ڈپلوما کا امتحان پاس کر چکا تھا اور وہاں کے پروفیسر کلرک اور چپراسی میرے واقف تھے میں بلا جھجک اندر جا سکتا تھا۔ وہاں کی لائبریری اور ریڈنگ روم کے استعمال کی بھی مجھے اجازت تھی۔ اندر جا کر میرا شبہ درست ثابت ہوا اور وہ کلاس روم میں چلی گئی۔ میں دفتر میں کلرک کے ساتھ کچھ گپ لگانے کے بعد باہر نکل آیا

اکتوبر کے مہینہ میں میرا ایم اے کا نتیجہ نکل آیا۔ میں فیل ہو گیا تھا۔ ہمیشہ فرسٹ کلاس لینے کے بعد یہ زندگی کی پہلی ناکامی تھی۔ اور گو میں جانتا تھا کہ یہ ایک حادثے کی وجہ سے ہے پھر بھی اپنے پر اعتماد اُٹھ سا گیا۔ کالج میں داخلہ لے تو لیا۔ مگر کسی سے ملنے سے گھبراتا تھا۔ خصوصاً یونیورسٹی جانے سے بہت کتراتا تھا۔ حالانکہ میری اس لڑکی سے راہ رسم نہ تھی اور شاید اسے پتہ بھی نہ ہو کہ میں نے ایم اے کا امتحان دیا تھا۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے ساری دُنیا سے مجموعی طور پر اتنی شرم نہ آتی تھی جتنی اکیلی اُس سے آتی تھی اور مجھے یوں لگتا کہ اس

کے سامنے سے بھی نہ گزرو ں گا تو وہ میرے ماتھے سے پڑھ لے گی کہ میں فیل ہو گیا ہوں اس لیے تین چار ماہ تک میں یونیورسٹی نہ گیا ۔ جنوری میں جاکر کچھ درست ہُوا تو پھر میرا یہ معمول بن گیا کہ کالج سے فارغ ہو کر تیسرے چوتھے روز یونیورسٹی کا چکر ضرور لگاتا ۔ کسی بہانے اس ڈیپارٹمنٹ میں چلا جاتا وہ اکثر وہاں ہوتی کبھی ریڈنگ روم میں کبھی لائبریری میں ، کبھی کاریڈور میں سہیلیوں یا لڑکوں کے ساتھ ۔ بس دو ایک بار گزرتا کہ اُسے دیکھ سکوں ۔ یا قریب کے نوٹس بورڈ سے جھوٹ موٹ نوٹس دیکھنے کھڑا ہو جاتا ۔ لائبریری میں البتہ زیادہ دیکھنے کا موقع ملتا ۔

اُسے بھی میری دلچسپی کا اندازہ تھا اور وہ برزتی ہوئی پلکوں کو جھپکا کر آنکھوں کے کونوں سے مجھے دیکھا کرتی ۔ اُس کا ردِعمل کافی حوصلہ افزا ہوتا تھا ۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چوکنی سی ہو جایا کرتی ۔ ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر پہن لیتی اور آنکھوں کے کونوں کا استعمال زیادہ کرتی شروع شروع میں ہمارے دیکھنے میں چوری کا انداز ہوتا تھا ۔ مگر آہستہ آہستہ یہ چیز کم ہو گئی ۔ گو ٹکٹکی باندھ کر نہ میں نے اُسے دیکھا تھا ۔ نہ اُس نے مجھے ——— اتنا البتہ ضرور تھا کہ اگر کبھی اور طرف منہ کیے میں بیٹھا یا کھڑا ہوتا ، تو وہ مجھے دیکھتی رہتی اور ایسا ہی موقعہ پا کر میں بھی اسی طرح کرتا ۔ کئی دفعہ اچانک مُڑ کر دیکھنے میں ہم دونوں ایک دوسرے کا جرم پکڑ چکے تھے ۔ لائبریری میں بیٹھے ہوئے تو وہ پڑھنے میں بار بار دوپٹہ کھول کر پھر سے درست کرتی ۔ بلا مقصد کتابیں ایک طرف سے اُٹھا کر دوسری طرف پٹخ دیتی ۔ ادھ کھلی انگڑائی توڑ دیتی ۔ زور زور سے کتاب کے ورق اُلٹتی ۔ آنکھوں کے کونوں سے ٹیڑھا ٹیڑھا تکا کرتی اور کئی ایسی چھوٹی چھوٹی حرکتیں کرتی ، جو خود نمائی کے لیے مخصوص ہیں ۔ اور ہر لڑکی فطرتاً جان کر ادا کرتی ہے ۔ اور ہر لڑکا بیان کیے بغیر پہچان جاتا ہے ۔ اسی انداز میں قریباً دو مہینے گزر گئے ۔ مگر ہماری بات چیت نہ ہوئی ۔ آپ جانتے ہیں ۔ لڑکے اور لڑکی کی فوری بات چیت تو افسانوں یا فلموں میں ہوتی ہے ۔ اصل زندگی میں تو سو دشواریاں ہوتی ہیں ۔

مارچ کی ایک خوشگوار دوپہر تھی ۔ جب میں کالج سے فارغ ہُوا ۔ تو دل میں گدگدی سی ہوئی ۔ اور میں اُس ڈیپارٹمنٹ کے ریڈنگ روم میں چلا گیا ۔ لیکچر ختم ہو چکے تھے ۔ طلبا دجا چکے تھے ۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح ریڈنگ روم میں بیٹھی تھی اور اکیلی تھی ۔ یہ تو میں آپ کو بتانا بھول ہی گیا کہ وہ بہت محنتی تھی ۔ کلاس میں بہت لائق تھی ۔ اور اس کے کپڑے پہننے کا ذوق بہت اچھا تھا اُس روز بھی وہ ریڈنگ روم میں بیٹھی اکیلی پڑھ رہی تھی ۔ اور پوری آستین والے کھلتے ہوئے پیلے سویٹر اور ہلکے نیلے دوپٹے میں بہت پیاری لگ رہی تھی ۔ ہم دونوں کچھ دیر بیٹھے پڑھنے کا ڈرامہ سا کرتے رہے ۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس خاموش رشتہ سے تنگ آ گیا تھا اور اس سے بات چیت کرنا چاہتا تھا ۔ مگر کوئی طریقہ نہ سوجھتا تھا ۔ اتنے میں وہاں کا چپراسی اندر آ گیا ۔ میں نے اُس سے پانی مانگا اور پھر اپنے زمانے کی باتیں چھیڑ دیں ۔ وہ بھی باتونی تھا ۔ بات پر بات کیے گیا اور میں دل میں خوش ہوتا رہا کہ اس طرح کم از کم میرا تعارف ہو رہا ہے ۔ پھر مجھے اچانک ایک چیز سوجھی ۔ ریڈنگ روم میں ایک رجسٹر رکھا تھا جس پر ڈیپارٹمنٹ کے ہر طالب علم کو اپنا نام لکھنا ہوتا تھا ۔ تاکہ اُن کی حاضری کی پڑتال ہو سکے ۔ میں چونکہ ان دنوں وہاں کا طالب علم نہ تھا اس لیے کبھی نام نہیں درج کرتا تھا ۔ مگر اس روز میں نے اپنی کتابیں اُٹھائیں اور چپراسی سے مخاطب ہو کر کہا ۔ " لاؤ بھئی آج تمہارے رجسٹر میں ہم بھی حاضری لگا دیں ۔" پھر میں نے بڑے صاف حروف میں اپنا نام لکھا اور آ گیا ۔ اُس روز کی تاریخ میں صرف میرا ہی نام درج تھا ۔

دوسرے دن میں پھر وہاں گیا ۔ جاتے ہی رجسٹر کھولا ——— میری توقع درست تھی ۔ میرے نام کے بالکل نیچے اُس نے بھی اپنا نام بڑے صاف حروف میں لکھ دیا تھا ——— (معاف کریں میں آپ کو اس کا نام نہیں بتاؤں گا ۔ ایسا نہ ہو وہ یہ تحریر

پڑھنے اور بُرا ماننے) ـــــــــــ اس طریقے سے ہمارا آپس میں تعارف ہوا۔ میں سارا دن خوشی سے بے خود ہو کر گھومتا رہا اور پروگرام بناتا رہا کہ اب جا کر اس سے بات چیت شروع کرنا چاہیے۔ اس کے سارے رویے سے مجھے یقین تھا کہ وہ بھی مجھ سے اتنی ہی دلچسپی لے رہی ہے جتنی میں اس میں لیتا ہوں۔ اور بات چیت کر کے معاملہ آگے چلانا کافی آسان ہوگا۔

مگر جب خوشی دھیمی ہوئی اور رات کو پڑھنے بیٹھا تو سوچا کہ امتحان قریب آ رہا ہے۔ لگے ہاتھوں پچھلے سال کے پرچے ہی دیکھ ڈالو۔ اب جناب پرچے جو دیکھے تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ خیال ہوا کہ تیاری تو ہوئی نہیں۔ کچھ دنوں کا حساب لگایا۔ کچھ کتابوں کا حساب لگایا۔ کچھ مجوزہ ملاقاتوں کا حساب لگایا تو کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ نہ بابا پہلے پچھلے سال فیل ہوئے ہیں۔ اگر اب بھی اس لڑکی کے چکر میں پھنس گئے تو پھر فیل ہوں گے اور دو دفعہ فیل ہونے سے اعتماد اتنا چکنا چور ہوگا کہ پھر کبھی پاس نہ ہو سکیں گے۔ چنانچہ رات کو بجلی گُل کر کے جب لیٹا تو عہد لیا کہ فی الحال بات ٹل جائے اور پہلے کی طرح وقتاً فوقتاً گونگے نظارے کیے جائیں۔ چنانچہ اگلے تین مہینے اسی طرح گزارے۔ اس دوران میں کبھی دوسرے چوتھے روز ڈیپارٹمنٹ میں چلا جاتا تھا۔ اگر باہر فلپس کی لیڈی فریم والی سائیکل نظر آتی جس کے پچھلے مڈگارڈ پر مارکر کے نشان میں تیر بیٹھا ہوتا تو میں اندر چلا جاتا اور تھوڑا وقت لائبریری میں گزار لیتا۔ اس کا خاموش ردِعمل ہمیشہ حوصلہ افزا اور گرمجوشی کا تھا۔ مگر اُس نے بات چیت کی کبھی کوشش نہ کی۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی امتحان کی وجہ سے محتاط ہے۔

امتحان کے پہلے پرچے کے روز میں بہت گھبرایا ہوا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی، بال پریشان، رنگ فق، منہ پر ہوائیاں اُڑی ہوئیں۔ یونیورسٹی ہال کے باہر لان میں کھڑا اپنی کاپی پر آخری نظر دیکھ رہا تھا۔ اچانک نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ وہ مجھ سے پندرہ بیس گز دور ایک پودے کے ساتھ کھڑی ہے اور بڑی واضح مسکراہٹ سے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے۔ میں ایک دم ٹھٹک گیا۔ اور غالباً پہلی دفعہ ہم کافی ثانیوں تک ایک دوسرے کو سیدھے دیکھتے رہے۔ اُس کی آنکھوں میں ایسی التماس اور شفقت تھی جیسے کہہ رہی ہو "پگلے۔ کچھ حوصلہ کرو۔"

میں نے ہڑبڑا کر کاپی بند کر دی اور شاید ایک چھوٹا سا قدم بھی اُس کی طرف بڑھایا۔ مگر وہ ایک دم جلدی سے مڑ کر چل دی۔ اس کے بعد میں نے کاپی نہیں کھولی۔ لیکن اللہ قسم وہ پرچہ اتنا شاندار ہوا کہ شاید زندگی میں ایسا امتحان نہیں دیا۔ حالانکہ اس پرچے میں میری تیاری ناقص تھی۔

امتحان ختم ہونے کے اگلے دن میں ڈیپارٹمنٹ میں گیا۔ وہاں صرف پہلے سال کے طلبا تھے۔ مگر وہ نہ تھی۔ میں دفتر میں جا بیٹھا۔ وقت کاٹنے اور بیٹھنے کے بہانے بار بار کلرک کو چائے پلائی۔ مگر وہ نہ آئی۔ کلرک اپنا کام کر رہا تھا۔ کبھی ایک چٹھی ٹائپ کرتا کبھی دوسری۔ میں بھی کسی پر سرسری نظر ڈال لیتا۔ ایک چٹھی جو اٹھائی تو دیکھا کہ وہ اُس لڑکی کے بارے میں تھی۔ اُس کے پروفیسر نے وائس چانسلر کو لکھا تھا کہ اُس لڑکی نے فلاں موضوع پر بہت اچھا (THESIS) لکھا ہے اور بڑی محنت کی ہے۔ چند کتابوں کے نہ ملنے کی وجہ سے وہ وقت پر پورا نہیں کر سکی۔ اب کتابیں مل گئی ہیں۔ اس لیے پندرہ دن کی اور مہلت دی جائے۔

میں بڑا خوش ہوا کہ چلو اب وہ پندرہ دن تو ضرور آئے گی۔ کسی روز آ کر مل لیں گے اور پھر بات کرنے کو موضوع بھی مل گیا تھا۔ میں خوشی خوشی واپس آگیا۔

مگر وائے قسمت اگلے روز جو ملیریا ہوا تو ہفتہ بھر چارپائی سے نہ اٹھ سکا۔ ہر وقت لیٹا ہوا قسمت کو گالیاں دیتا رہتا۔ خدا خدا کر کے چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو سیدھا ڈیپارٹمنٹ گیا۔ چپڑاسی کے لیے بیڑیوں کا بنڈل لے کر ہی گیا تھا۔ وہاں اسے چائے کے لیے پیسے بھی دیئے۔ مگر اس نے بُری خبر یہ سنائی کہ وہ تو چھٹیوں میں باہر چلی گئی ہے۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ کیونکہ چھٹیوں میں ہم دونوں کے ایم اے کے نتیجہ کا اعلان ہو جانا تھا اور بعد ازاں مجھے تو کہیں ملازمت پر جانا ہی تھا۔ وہ بھی شاید کہیں چلی جاتی۔ میں پریشان سا ہو کر رہ گیا۔ اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ چپڑاسی کو رشوت دی کہ جب بھی اس کا کچھ پتہ چلے مجھے بتائے۔ پھر میں دل برداشتہ سا گھر آ گیا۔ سچ کہتا ہوں جتنی بدمزہ وہ چھٹیاں گزریں، شاید ہی کوئی گزری ہو۔

چھٹیوں میں ہی ایک روز اس کا نتیجہ اخبار میں دیکھا۔ وہ پاس ہو گئی تھی۔ اب میری رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔

یونیورسٹی کھلنے کے دس پندرہ دن بعد میں ڈیپارٹمنٹ گیا۔ وہاں چپڑاسی نے بتایا کہ اس لڑکی کو اس ڈیپارٹمنٹ میں بطور ریسرچ سکالر ایک سال کے لیے جگہ مل گئی ہے۔ اور اس کے علاوہ اس نے شام کے ڈپلوما کورس میں بھی داخلہ لے لیا ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اگلے روز میرا نتیجہ بھی آ گیا۔ میں بھی پاس ہو گیا تھا۔ لاہور سے باہر ایک دو اچھی سرکاری ملازمتیں ہاتھ میں تھیں۔ مگر میں نے فوراً ہی لاہور میں ایک غیر سرکاری کالج میں بطور لکچرار کام شروع کر دیا۔ اب میں تلا ہوا تھا کہ اس سے راہ و رسم بڑھا کر دو چار ماہ تک شادی کر لی جائے۔ مجھے ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا کہ اسے شادی میں کوئی اعتراض ہو گا۔

مجھے علم تھا کہ ڈپلوما کی کلاس شام پانچ بجے ہوتی ہے۔ چنانچہ میں ایک روز عین پانچ بجے یونیورسٹی پہنچا۔ ابھی ڈیپارٹمنٹ سے چند قدم دور ہی تھا کہ سائیکل کی آواز سن کر پیچھے جو دیکھا تو میرے بالکل پیچھے سائیکل کے پیڈل الٹے گھماتی ہوئی وہ مجھے میٹھی نظروں سے تک رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی اس نے سائیکل تیز کی اور آگے نکل گئی۔ مگر ابھی وہ سٹینڈ پر رکھ کر تالا لگا رہی تھی کہ میں بھی پہنچ گیا۔

"معاف کریں" میں نے قریب جا کر پوچھا۔ "وہ فلاں موضوع پر THESIS آپ نے ہی لکھا ہے؟"

"جی ہاں" وہ مسکراہٹیں برساتی ہوئی بولی۔ اس کی لرزتی ہوئی پلکیں اٹھ اٹھ کر گرتیں اور گر گر کر اٹھتیں۔ دونوں گالوں میں گڑھے ناچ رہے تھے۔

"میں بھی اس موضوع پہ کچھ کام کر رہا ہوں" میں نے صاف جھوٹ گھڑا "اور مجھے ذرا اس کے بارے میں آپ سے پوچھنا ہے"۔

"پوچھئے" وہ میری طرف سیدھی دیکھتی ہوئی بولی۔

"اب تو آپ نے کلاس میں جانا ہو گا۔ اگر کل کوئی وقت دے سکیں تو ...... شاید اطمینان سے بات کر سکوں"

"ہاں ہاں۔ آپ دس بجے آ جائیں"

"آپ کا ایم اے کا نتیجہ اخبار میں دیکھا تھا مجھے تھوڑا رنج ہوا تھا کہ آپ اول نہیں آئیں"

اس نے شرما کر سر جھکا لیا اور پھر سائیکل کی چابی انگوٹھے کے گرد گھماتی ہوئی بولی "دراصل دو پرچے کچھ کمزور رہ گئے تھے۔ ان میں تیاری نہ ہو سکی"

"بہر حال مجھے بڑا رنج ہوا تھا۔ کچھ یقین سا تھا کہ آپ ضرور اول آئیں گی"

اتنے میں اُس کا پروفیسر دروازے میں نمودار ہو گیا اور وہ وہیں سے " گڈ ایوننگ سر " کہہ کر اس کی طرف لپکی ۔
اس کے اس طرح اچانک جانے پر مجھے حیرت تو ہوئی ۔ مگر میں اپنی پہلی کامیابی پر اتنا سرشار تھا ۔ کہ زیادہ اہمیت نہ دی ۔ میرا رُواں رُواں ناچ رہا تھا ۔ اور اس کی گفتگو کے فقرے دل ہی دل میں دہراتا کئی گھنٹے سڑکوں پہ اکیلا گھومتا رہا ۔

اگلے دن کالج میں دس بجے کلاس لینا تھی ۔ مگر میں نے جاتے ہی حاضری لگا کر لڑکوں کو چھٹی دے دی اور سائیکل لے کر مارا مار کرتا یونیورسٹی پہونچا ۔ مجھے یقین تھا کہ پچھلے ڈیڑھ سال کی بے قراری کو آج سکون آ جائے گا اور میں آئندہ اتوار کا کوئی رنگین سا پروگرام بنانے کے بارے میں سوچتا ہوا یونیورسٹی پہنچ گیا ۔

میں نے لائبریری میں جھانکا ۔ وہ ایک علیحدہ میز پہ بیٹھی ہوتی تھی ۔ مگر کمرے میں بہت لوگ تھے ۔ اس لیے میں برآمدے میں نوٹس بورڈ دیکھتا رہا ۔ تھوڑی دیر بعد موقعہ دیکھ کر اندر چلا گیا ۔

مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں چمک سی آئی ۔ اور جب میں نے بات شروع کی تو اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے جواب دیے ساتھ ساتھ وہ اپنی لرزتی پلکیں اُٹھا کر میری طرف دیکھتی رہی ۔ میں THESIS کے بارے میں بات کرتا رہا ۔ کچھ گفتگو اس کے علاوہ بھی ہوئی ۔ مگر دوسرے لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے بات چیت رسمی ہی رہی ۔ اب مجھے اطمینان تھا کہ بول چال شروع تو ہو ہی گئی ہے ۔ یعنی سب سے مشکل مرحلہ طے ہو گیا ہے ۔ جس کے پیچھے ڈیڑھ برس کی خاموش باتیں ہیں ۔ اس لیے اب پھر کسی دن دیکھا جائے گا ۔ اور میں کوئی آدھا گھنٹہ بات کرنے کے بعد واپس آ گیا ۔

میں اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا ۔ مگر میری حساس طبیعت رہ رہ کر مجھے احساس دلا رہی تھی کہ ایک کرسی پر وہ بیٹھی تھی ۔ دوسری پاس خالی پڑی تھی ۔ میں سارا وقت کھڑا ہوا اُس سے بات کرتا رہا ۔ مگر اس نے مجھے بیٹھنے کو نہیں کہا ۔" بہرحال دیکھا جائیگا ۔ لڑکیوں کو تھوڑا سا نخرہ بھی تو جائز ہے ۔

خوشی سے میں رات بھر سو نہ سکا بڑے بڑے میٹھے بول لبوں تک آتے جو میں اُسے کہنا چاہتا تھا ۔ مگر کہہ نہ سکا تھا ۔ جب آدھی رات کے بعد تک کروٹیں لیتے لیتے جسم دُکھنے لگا تو ارادہ کیا کہ کل پھر اسے جا کر لائبریری میں ملا جائے ۔ چنانچہ اگلے دن پھر اپنی کلاس کو چھٹی دے کر میں یونیورسٹی پہنچ گیا ۔

وہ سیڑھیوں کے پاس اپنی سائیکل کا تالا کھول رہی تھی ۔ شاید کہیں جا رہی تھی ۔ میں اس کی طرف بڑھا مگر اس کا چہرہ تاثرات سے خالی تھا ۔ جیسے وہ مجھے پہچانتی ہی نہ ہو ۔ میں قریب جا کر رکا ۔ مگر وہ تالا کھولتی رہی ۔ میں بہت کچھ سوچ کر آیا تھا کہ ایسے بات شروع کروں گا ۔ اس طرح اُس کے ڈمپل کی تعریف کر دوں گا ۔ ایسی تشبیہوں سے گردن کے خم کو سراہوں گا ۔ مگر کل والی کرسی کی بات پھر ذہن میں ابھری اور آج کے رویے کی وجہ سے تمام خیالات بھک سے اُڑ گئے ۔ اتنے میں وہ سائیکل لے کر چلنے کو تیار تھی ۔ جلدی میں اور تو کچھ نہ بن پڑا ۔ میں نے ویسے ہی بات چلانے کو پوچھا ۔

" مس ——— کل میں آپ کے پاس اپنی ایک کتاب تو نہیں چھوڑ گیا "

" کہاں ؟ " اُس نے لاتعلقی سے پوچھا ۔

" جہاں میں آپ سے آدھا گھنٹہ بات کرتا رہا "

"پتہ نہیں" اس نے لاپرواہی اور درشتی سے کہا اور پیٹھ موڑ کر چل دی۔ میں حیران کھڑا دیکھتا رہا۔ مگر اس نے میری طرف دیکھے بغیر سائیکل کے پیڈل پر پاؤں رکھا اور چل گئی۔

سائیکل کے ڈولتے ہوئے ہینڈل کو سنبھالے رکھنے کی کوشش میں میں تھکے تھکے پیڈل چلا رہا تھا اور میں اس کے رویے کے بارہ میں سوچ رہا تھا۔ کیا اسے کل میری کوئی حرکت ناپسند آئی تھی؟؟ یا شاید اپنی قیمت بڑھا رہی ہے۔ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے مجھ سے دلچسپی ہی نہیں مگر میں تمام ہی بالکل سوچ رہا ہوں کہ اس کے التفات کو ایک تلخیے کی بے رخی سے مٹا رہی ہو۔ بہرحال اسی ادھیڑ بن میں میں کالج واپس چلا گیا۔ وہاں جا کر کوئی کلاس نہ پڑھائی۔ بلکہ سٹاف روم میں بیٹھا پریشان ہوتا رہا۔

کافی سوچ بچار کے بعد ایک اور طریقہ ڈھونڈا۔ شام کو پیدل سیر پر نکلتا تو اس طرح پروگرام بناتا کہ عین پانچ بجے یونیورسٹی کے سامنے سے فٹ پاتھ پر ہوتا۔ کیونکہ وہ اسی وقت آیا کرتی تھی۔ خیال تھا کہ اس طرح اتفاقیہ سی ملاقات نظر آئے گی اور میں اسے ہلو کہہ کر یا سلام کر کے ردعمل دیکھوں گا۔

پہلے دن میں آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چل رہا تھا کہ سامنے اس کی سائیکل دکھائی دی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں سلام کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے بھی مجھے دور سے دیکھا اور آگے بڑھتی آئی۔ مگر میرے قریب آ کر اس نے بڑے مزے سے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور مجھے "ہلو" کہنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ میں بے مروتی اور غصہ سے تڑپ اٹھا۔ مگر کچھ نہ کر سکتا تھا۔

دوسرے دن اور پھر تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے وہ رات انگاروں پر کاٹی۔ چوتھے دن میں اسے دور سے آتا دیکھ کر ایک درخت کی اوٹ میں رک گیا۔ اور چھپ کر دیکھنے لگا۔ یقین کریں وہ بے چینی سے سر ادھر ادھر گھما مجھے ڈھونڈ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میرے سارے گلے ایک دم دھل گئے اور میں کھانس کر اوٹ سے باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بے اختیار مسکرا پڑی۔ وہ اس وقت کوئی پچاس ساٹھ گز دور ہو گی۔ میں فٹ پاتھ کے کنارے رک گیا۔ مگر قریب آ کر مڑنے کے لیے ہاتھ کا اشارہ دینے میں اس نے مجھے پھر نظر انداز کر دیا۔

میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن سے میں اپنی مایوسی بیان کر سکوں۔ لڑکی کے لیے نخرہ اور ناز یقیناً جائز ہے۔ مگر دوسرے کی بے عزتی تو جائز نہیں۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا واپس آ گیا اور پھر یونیورسٹی جانا ترک کر دیا۔

کوئی دو ماہ اسی طرح گزر گئے۔ میں یونیورسٹی نہیں گیا۔ مگر ہر وقت ایک الجھن میں پڑا رہتا۔ کہ اس لڑکی کی کانپتی پلکوں اور مسکراہٹوں نے مجھے ڈیڑھ سال سہارا دیے رکھا۔ مگر جب میں نے قدم ذرا آگے بڑھایا تو اس نے چلن کیوں بدل لیا۔ رہ رہ کر دل میں خیال اٹھتا تھا کہ شاید اب کسی اور کی طرف مائل ہو گئی ہے۔ مگر وہ کون ہو سکتا تھا۔ میں نے آج تک اسے کسی لڑکے سے گھل مل کر بات کرتے یا سینما جاتے یا ملک شاپ میں بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ پھر وجہ کیا تھی؟؟؟ ساری سوچ کا نتیجہ یہی نکلتا کہ تھوڑا التفات۔ تھوڑا گریز لڑکیوں کی مخصوص تکنیک ہے۔ جھلک دکھا کر چھپ جانا ان کی فطرت میں شامل ہے۔ ممکن ہے وہ بھی پہلی حوصلہ افزائی کے بعد وقتی کھچاؤ برت رہی ہو۔ اس لیے ایک کوشش اور کر دیکھو۔

چنانچہ وہ بھی کر ڈالی اور ایک شام یونیورسٹی پہنچ گئے۔ خوش قسمتی سے وہ بھی اسی وقت آئی۔ اور آتے ہی کلاس روم میں گھس گئی۔ میں نے جھانکا تو وہ اکیلی تھی۔ میں حوصلہ کر کے اندر چلا گیا۔ پھر کسی قسم کی شکایت کیے بغیر میں نے اسے

یاد دلایا کہ اس کے THESIS کے بارے میں پہلے بات کر چکا ہوں اور اب ذرا اُسے سیکھنا چاہتا ہوں ۔ وہ سپاٹ انداز میں بولی ۔

"میں نے اُس کی ایک کاپی پروفیسر صاحب کو دے دی ہے جو انہوں نے لائبریری میں رکھ لی ہے آپ وہاں سے دیکھ لیں"

"جی نہیں ۔ وہاں نہیں ہے" میں نے ویسے ہی جھوٹ بول دیا "آپ کی کاپی دو دن میں واپس کر دوں گا"

مگر وہ مسکرا کر بولی "جی نہیں ——— وہ وہیں ہے"

بخدا اس کی مسکراہٹ نے پھر مجھے مبہوت کر دیا اور میں نظر نہ ہٹا سکا ۔ میرے اس طرح بد تمیزی سے دیکھنے پر وہ کچھ گھبرا سی گئی ۔

"آپ دیکھئے تو سہی" اس نے ذرا سختی سے کہا ۔ میں چونکا ۔ اتنے میں ایک لڑکا بھی اندر آ گیا اور میں باہر نکل آیا ۔ یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی ۔ میں کئی دن کڑھتا رہا ۔ اور "آپ دیکھئے تو سہی" میرے کانوں میں گونجتا رہا ——— بلکہ اتنے برس گزر جانے کے بعد اب بھی گونج رہا ہے ۔

ایک ماہ بعد ہمیں یونیورسٹی سے ڈگری ملنا تھی ۔ مجھے دھڑکتے دل سے کانووکیشن کا انتظار تھا کہ اُسے ایک نظر دیکھ سکوں گا ۔ مگر انتظار سے زیادہ اپنی بے بسی پر غصہ آتا تھا میں بار بار اپنے طرزِ عمل پر نظر دوڑاتا ۔ مگر کوئی بات قابلِ اعتراض نہ لگتی تھی ۔ اور مجھے آہستہ آہستہ یقین آنے لگا کہ وہ کسی اور کی طرف مائل ہو چکی ہے

پھر کانووکیشن کا دن بھی آ گیا ۔ یونیورسٹی ہال جھنڈیوں، قناتوں ۔ پھولوں اور سرخ بنات سے دلہن بنا تھا ۔ لڑکے اور لڑکیاں کالے کالے گاؤن پہنے ادھر اُدھر گھوم رہے تھے ۔ پرانے ہم جماعت کئی ماہ بعد ملے تھے ۔ اپنی پرانی یادوں اور نئی ملازمتوں کا ذکر ہنس ہنس کر سنا رہے تھے ۔ کئی ایک اپنی منگنی کی خبر دے رہے تھے ۔ ہر طرف عجب چہل پہل تھی ۔ مگر میں اپنے آپ کو سارے ماحول سے بیگانہ محسوس کر رہا تھا اور پرانے دوستوں کی بجائے نظریں اُس کو ڈھونڈ رہی تھیں

تھوڑی دیر بعد ہمیں ہدایت ملی کہ اپنے اپنے مضمون کے لحاظ سے گروپ بنا لیں اور باری باری ہال میں داخل ہوں ۔ ہمارا گروپ مختصر سا تھا ۔ کیونکہ انگریزی کے ایم اے میں صرف چودہ لڑکے پاس ہوئے تھے ۔ اس لیے ہمارے ساتھ ہی لڑکیوں کا گروپ بھی آگے بڑھا اور اس میں وہ نظر آئی

اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا ۔ سفید شلوار، سفید قمیض، سفید دوپٹہ، کانوں میں سفید ٹاپس، اس کے اوپر کالے گاؤن کی سلوٹیں کسی ملکہ کی پوشاک کی طرح اس کی شخصیت ابھار رہی تھیں ۔ ہم دونوں دروازے میں اکٹھے پہنچے اور اس نے میری طرف دیکھا یا خدا !! میں کانپ سا گیا اُس کی نظر میں وہی التفات، شیرینی اور مٹھاس تھی جس نے مجھے ڈیڑھ سال غلط فہمی میں مبتلا رکھا تھا ۔ میری کنپٹیاں ایک دم جلنے لگیں اور جب طلباء کے ریلے میں اپنی سیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا تو ذہن میں کھوج یہ تھا کہ آخر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے ۔

کانووکیشن پر ایم اے کی ڈگری ملنا طالب علم کی زندگی کی معراج ہے ۔ لڑکے سینکڑوں میلوں کا سفر کر کے آتے ہیں ۔ اور بشاش چہروں سے کارروائی میں شرکت کرتے ہیں ۔ مگر میں مشین کی طرح دوسروں کے ساتھ کھڑا رہا ۔ ڈگری وصول کی ۔ سر جھکایا ۔ اور پھر بیٹھ گیا ۔ نہ وائس چانسلر کی تقریر کا کوئی حصہ سنا اور نہ صاحبِ صدر کی تقریر کا ۔

جلسہ برخواست ہوا تو میں ہال کے باہر پورچ کے نکڑ پر کھڑا تھا۔ لان میں بینڈ بج رہا تھا اور وہ برآمدے میں کھڑی سن رہی تھی۔ میں سخت اداس تھا۔ آتے مسرت سے تک رہا تھا۔ وہ اپنے سفید لباس، کالے گاؤن اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی سفید ڈگری سے کوئی حور معلوم ہوتی تھی۔ دو چار دفعہ اس نے بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میٹھی نظروں سے مجھے دیکھا اور آنکھوں کے کونوں سے تو کئی بار دیکھا۔ مگر میری انسانیت اتنی مجروح تھی میں بات کرنے کو تیار نہ تھا۔ اگر اب میں نے بات کی اور وہ نہ بولی یا بے رخی برتی تو اتنے لوگوں میں میری بے عزتی ہو جائے گی۔ مگر ساتھ ہی مصیبت یہ تھی کہ اس کی نظروں میں نئی دعوت تھی، جس نے میرے ذہن میں کھلبلی ڈال دی چنانچہ اب میں نے سوچا کہ اسے کہیں ایسی جگہ ملنا چاہیے جہاں وہ بالکل اکیلی ہو تاکہ اس سے ان پہیلیوں کا مطلب پوچھ سکوں۔

خوش قسمتی سے یہ موقع بھی جلد ہی مل گیا۔ چند روز بعد کسی سیاسی مسئلے پر تمام کالجوں کے طلباء نے ہڑتال کی تھی اور بہت بڑا جلوس نکالا تھا۔ میں بھی جلوس کے پیچھے چلتا چلتا مال روڈ سے گزر رہا تھا۔ مگر جب یونیورسٹی پہنچا تو دور سے اس کی سائیکل ڈیپارٹمنٹ کے آگے کھڑی نظر آئی۔ دل نے کہا اس وقت یقیناً اکیلی ہوگی اور میں جلوس گزرنے کے بعد ڈیپارٹمنٹ میں چلا آیا۔

میرا قیاس درست تھا۔ وہ اندر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مگر ایک لڑکا اور بھی تھا۔ اس کے جانے کے انتظار میں میں نے الماری سے ایک کتاب نکلوائی اور کھول کر سامنے رکھ لی۔ میرا دماغ تیزی سے پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اس سے کس قسم کی بات کی جائے جو جلد ختم نہ ہو۔ کئی موضوع سوچے مگر تسلی نہ ہوئی۔ اتنے میں وہ لڑکا چلا گیا اور ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔

میرا حلق سوکھنے لگا۔ ٹانگیں کانپنے لگیں۔ جسم میں ہلکی ہلکی لرزش چھا گئی۔ مگر میں نے اپنے آپ پر قابو پاکر پوچھ ہی ڈالا۔

"دیکھئے۔ آپ نے تو ایم اے میں فلاں موضوع پر بہت کچھ پڑھا ہوگا۔ کسی مصنف کی کوئی اچھی سی کتاب بتا سکتی ہیں؟"

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور باہر کی طرف اشارہ کرکے بولی "باہر نوٹس بورڈ پر کتابوں کی مکمل فہرست لگی ہے۔ وہاں سے دیکھ لیں"۔

میرا سارا جسم اس خشک جواب سے ایک دم سن ہو گیا۔ ظاہر تھا وہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بھرپور سردی میں بھی مجھے پسینہ آ گیا۔ مگر میں خفت چھپانے کو ڈھٹائی سے بولا۔

"آج آپ نے سٹرائیک نہیں کی"

اس نے سر جھکا لیا اور پڑھنے لگی۔ شرمندگی سے مجھے کمرے کی تمام چیزیں گھومتی نظر آئیں اور میں نے ڈوبتے آدمی کی طرح میز کے کنارے کو پکڑ لیا۔ مگر دو منٹ بعد اس نے سر اٹھایا۔

"سٹرائیک سے کیا مل جائے گا۔"

آج میں دیانتداری سے محسوس کرتا ہوں کہ اس نے یہ جملہ بات چلانے کو کہا تھا اور اس دن وہ خود بھی بات کرنا چاہتی تھی۔ مگر میری حالت اس کے پہلے رویے سے اتنی دگرگوں تھی کہ مجھے محسوس نہ ہو سکا اور میں نے بھی درشتی سے یہ کہہ کر کہ "جو دوسروں کو ملتا ہے آپ کو بھی مل جاتا"۔ سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر بعد میں قسمت کو برا بھلا کہتا اور اپنے آپ کو کوستا اٹھ آیا۔

دو چار روز بعد ہوش آیا اور اس کے آخری جملہ کا صحیح اندازہ ہوا تو میں نے اپنے آپ کو بڑی گالیاں دیں کہ وہ بےچاری تو بات آگے چلانا چاہتی تھی مگر میں حواس باختہ ہونے کی وجہ سے مطلب ہی نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ از سر نو غصہ چڑھنے لگا۔ مگر یہ اپنے اوپر تھا۔

اور کئی دن تک رہا۔ بالآخر ایک دن ٹھنڈے دل سے سوچ کر فیصلہ کیا کہ آخری کوشش کی جائے۔

کئی دن کی منصوبہ بندی کے بعد میں شام سات بجے یونیورسٹی کے گیٹ کے پاس چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے علم تھا کہ ڈپلوما کی کلاس سات بجے ختم ہوتی ہے اور وہ قدرے دیر سے باہر آیا کرتی ہے۔ اتنے میں اکا دکا بچے باہر نکل گئے اور میں گیٹ سے نکل کر اندر کی طرف چلا۔

اس روز سترہ فروری تھی۔ سات بجے رات گہری ہو گئی تھی اور ساڑھے سات بجے اے۔آر۔پی یا سول ڈیفنس والوں کی ایک مشق تھی، جس میں دو گھنٹہ کے لیے کرفیو اور بلیک آؤٹ ہونا تھا۔ یہ دن میں نے جان بوجھ کر چنا تھا کہ اسے باتوں میں لگاؤں گا اتنے میں کرفیو لگ جائے گا اور پھر ہم دو گھنٹہ کے لیے اکٹھے ہوں گے۔ آج میں تلا ہوا تھا کہ اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دوں گا اور صاف صاف کہہ دوں گا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

میں جب یونیورسٹی ہال کے پورچ میں پہنچا تو عین اس وقت وہ بھی وہاں آئی۔ وہ سائیکل ہاتھ میں لیے پیدل آ رہی تھی اور بجلی کی روشنی کے نیچے ہم دونوں ملے ——— میں رک گیا — — — اور اس سے کہا

"معاف کریں۔ ایک منٹ کے لیے کچھ بات کر سکتا ہوں"۔

وہ رکے بغیر آگے بڑھتی گئی

"سنئے ——— میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لوں گا"

مگر وہ انکار کے طور پر سر ہلا کر آگے چلی گئی۔

میری حالت اس مسافر کی سی تھی۔ جو کئی دن کے سفر کے بعد جہاز پکڑنے کو سمندر کے کنارے پہنچے۔ مگر بندرگاہ میں داخل ہونے سے پہلے اس کی نظروں کے سامنے جہاز چل پڑا ہو۔ میں نے انتہائی بے بسی اور بے چارگی سے اسے ایک دفعہ پھر آواز دی۔ وہ اس وقت تک پندرہ بیس گز آگے جا چکی تھی۔ چلتے چلتے اس نے بغیر پیچھے مڑے کچھ کہا۔ مگر میری حالت اتنی غیر ہو چکی تھی کہ میں سمجھ نہ سکا۔

اور وہ چلی گئی ———

میں نے جھکرا کر دیوار کا سہارا لیا اور نہ جانے کتنی دیر گم سم کھڑا رہا۔ اتنے میں بجلی ایک دم گل ہو گئی اور فضا میں سائرن گونجنے لگے۔ میں اپنے جسم کو گھسیٹ کر ہال کی سیڑھیوں تک لے گیا۔ اور وہاں بیٹھ کر اندھیرے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اگلے دن بستر پر آنکھ کھلی تو سب سے پہلا خیال دماغ میں یہ آیا کہ اس نے جاتے جاتے کیا کہا تھا؟ کئی اندازے لگائے۔ مگر قرین قیاس یہی تھا کہ کرفیو کی وجہ سے وہ جلد از جلد گھر جانا چاہتی تھی۔ اس لیے اس وقت رک نہ سکتی تھی۔ مگر اس کی تصدیق کیسے ہو؟ یہ کیسے پتہ چلے کہ وہ بے رخی نہیں برت رہی بلکہ کرفیو سے پہلے گھر پہنچنے کی مجبوری تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد طے یہ کیا کہ آج لائبریری میں بیٹھا جائے۔ اور اس سے کوئی بات نہ کی جائے۔ اگر تو وہ بات کے رویے کی معذرت کر دے یا صرف اتنا ہی پوچھ ڈالے کہ کیا بات کرنا چاہتا تھا، تو میں عمر بھر کا غلام ہو جاؤں گا۔

یہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ وہ لائبریری میں بیٹھی تھی۔ میں بھی وہیں تھا۔ کتاب میرے سامنے تھی سر جھکا تھا کبھی اس کی گردن

کا ظم یا ڈمپل کے بجنور۔ کوئی ایک گھنٹہ وہ بھی بیٹھی رہی۔ میں بھی بیٹھا رہا۔ دو ایک مواقع ایسے بھی آئے جب ہم دونوں اکیلے تھے۔ مگر اُس نے کوئی بات چیت نہ کی۔ البتہ بے چین بہت نظر آتی تھی۔ بار بار پہلو بدلتی۔ کتاب کے ورق اُلٹتی رہتی۔ کاپی اور پنسل سے کھیلتی رہتی صاف ظاہر تھا کہ اس کی توجہ پڑھائی کی طرف نہیں۔ مگر میرا مقصد اس کی بے چینی سے پورا نہ ہوتا تھا۔ اس لیے میں بھاری دل سے اُٹھ آیا۔

کالج جاتے ہی میں نے استعفیٰ لکھ کر دے دیا کہ قواعد کے مطابق مجھے ایک ماہ بعد فارغ کر دیا جائے۔ جس مقصد کے لیے لاہور بیٹھا تھا جب اس میں ہی ناکام ہو گئے تو یہاں رہنے سے کیا حاصل۔

دو چار روز بعد میں یونیورسٹی سے گزر رہا تھا کہ وہ ہال کے پورچ میں سے میری طرف آتی نظر آئی۔ اس نے بھی مجھے دیکھا۔ مگر میں راستہ تبدیل کر کے دوسری طرف سے نکل گیا۔

کچھ عرصہ بعد میں نے اسے انارکلی میں دیکھا۔ وہ ایک معمر خاتون کے ساتھ جا رہی تھی۔ جب میری نظر اس پر پڑی تو وہ پہلے سے مجھے دیکھ رہی تھی اور جب میں نے دیکھ کر آنکھیں ہٹا لیں تو پھر بھی دیکھتی رہی۔ آپ شاید سمجھیں گے کہ میں جذباتی ہو کر بات کر رہا ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی نظر میں اتنی واضح شکایت اور حسرت تھی کہ میں چکرا گیا۔ مگر میں مزید کوشش کرنے کو تیار نہ تھا اگر وہ اپنی قیمت اس طریقے سے بڑھانا چاہتی تھی تو میں خود اس سے زیادہ نہیں گر سکتا تھا۔ عورت کا گریز حقیقت ہے۔ مگر مرد کی انا اس سے بڑی حقیقت ہے۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد مجھے ایک فرم میں بڑی اچھی ملازمت مل گئی۔ قریباً ایک ہزار روپے تنخواہ تھی۔ میں نے جھٹ سے کار خرید ڈالی اور کئی روز یونیورسٹی کے گرد و نواح میں کار پر گھومتا رہا۔ اُس نے مجھے کئی دفعہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ اب اُس میں ایک تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ مجھے جہاں بھی دیکھتی ٹکٹکی باندھ کر گھورنے لگتی اور اس کی آنکھوں میں اتنی واضح دعوت ہوتی تھی کہ اِس ساری کہانی سے لاعلم آدمی بھی چلّا اُٹھتا کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں آزمودہ را، آزمودن جہل است۔ ڈیڑھ سال اِن نظروں نے میری امنگوں کو پالا۔ اور پھر چھ ماہ میں ہی لڑکی نے مجھے روند ڈالا۔ اب میں اِن آنکھوں پر کیا یقین کر سکتا تھا۔ اور اگر اب بالفرض وہ مائل بھی ہے تو میں نے سوچا کہ کار کی وجہ سے ہو گی اُسے لگاؤ میری کار سے ہے مجھ سے نہیں ہے۔ چنانچہ وہ جہاں بھی ملی۔ میں نے بڑی رکھائی سے اسے نظر انداز کر دیا۔ بلکہ ایک دفعہ تو میں پیدل جا رہا تھا۔ اور وہ اینٹھ کے ساتھ بس سٹاپ پر کھڑی تھی۔ میں نے رُک کر اینٹھ سے دو چار منٹ بات کی۔ اس دوران میں وہ آنکھیں گاڑ کر مجھے دیکھتی رہی۔ وہ متوقع تھی کہ میں اس سے بھی بات کروں گا۔ مگر میں نے ایک نظر ڈال کر بے رُخی سے آنکھیں نیچی کر لیں اور آگے بڑھ گیا۔ میرا رویہ بظاہر سرد ہوتا تھا۔ مگر میں ہمیشہ منتظر رہتا تھا کہ وہ مجھ سے بات کرے۔ بار بار ناکامیوں سے میری خودداری اتنی مجروح ہوتی تھی کہ اب میں کسی حالت میں بات شروع کرنے کو تیار نہ تھا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ ایک دفعہ بھی بات کر لیتی یا اشارے سے روک ہی لیتی تو واللہ قسم وہیں اُس کے قدم پکڑ لیتا اور دوسرے دِن شادی رچا لیتا۔

میں اپنی طرف سے یہ قصہ ختم کر چکا تھا۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس قصہ سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا گیا اور اس کی یاد دن بدن شدت اختیار کرتی گئی اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ میں سڑک پر جا رہا ہوں کہ میرے مُنہ سے اس کے کہے ہوئے جملے لاشعوری طور

پر نکل جاتے۔ راہ گیر حیران ہو کر مجھے دیکھتے تو میں شرمندہ سا ہو کر رہ جاتا۔ اسی طرح کئی دفعہ اس کا نام زیرِ لب پکارتا رہتا۔ جس سے بعض اوقات بڑی پریشان کُن صورتِ حال پیدا ہو جاتی۔ کئی دفعہ لوگوں نے سنا اور پوچھا بھی ——— مگر میں ٹال گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ہر وقت محتاط رہنا پڑتا۔ اور میری شخصیت میں اپنے آپ سے ایک عجیب قسم کا خوف پیدا ہو گیا۔ وہ تو بالآخر قدرت نے مدد کی کہ جب کچھ عرصہ بعد شادی ہوئی تو خوش قسمتی سے میری بیوی کا نام بھی وہی تھا جو اس لڑکی کا تھا۔ اس لیے اب عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اپنی بیوی پر بہت فریفتہ ہوں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میری بیوی کو مجھ سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے۔ کہ میں اُسے پورا پیار نہیں دے سکا۔

کوئی دو سال پہلے کی بات ہے کہ میں رحیم اور سلطان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یہ دونوں اب ہماری فرم میں ملازم ہیں اور حسنِ اتفاق سے دونوں یونیورسٹی میں اسی لڑکی کے ہم جماعت تھے۔ ان دنوں تو میرے واقف نہ تھے۔ مگر اب گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں میری عمر کے ہیں اور ہم سب کے بچے کالجوں میں پڑھ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں اُس لڑکی کا ذکر چھڑ گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب رحیم نے اس کے عاشق ہونے کا دعویٰ کیا۔ مگر ساتھ ہی ناکام عاشق ہونے کا اعتراف بھی کیا۔ بات نے طول پکڑا تو اس نے ہمیں اپنی داستان سنائی۔ حیرت والی بات یہ تھی کہ اس کی اور میری داستان قریباً قریباً ایک تھی۔ اُس لڑکی نے اس کو اپنی طرف لبھایا تھا۔ حوصلہ افزائی کی تھی۔ اپنی حرکات سے محبت کا رنگ دکھلایا تھا۔ مگر اس کی ہر عملی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا اور مزا یہ کہ یہ سارا قصہ بھی اُسی زمانے کا تھا۔ جب میں بھی اِسی چکر میں سرگرداں تھا۔ رحیم میری طرح حساس نہ تھا۔ وہ اس کو قبول کیا تھا۔ اور اب اسے مکار، چالباز، فلرٹ اور لومڑی جیسے خطابات سے یاد کرتا تھا۔ رحیم کی کہانی میرے قصے سے اتنی مطابقت رکھتی تھی۔ کہ میں نے بھی محض حیرت کی بنا پر اپنا ادھورا رومانس سنا دیا۔ کافی بحث کے بعد ہم دونوں کی متفقہ رائے یہ تھی کہ اس لڑکی کو لڑکوں کے جذبات سے کھیلنے میں مزا ملتا تھا۔ جیسے بلی چوہے کو اچھال اچھال کر ادھ موا کر کے مزا لیتی ہے۔

سلطان خاموش بیٹھا ہماری باتیں سنتا رہا۔ جب ہم اپنا غبار نکال چکے تو وہ بولا "تم دونوں بے وقوف ہو اور اس لڑکی کو قطعاً غلط سمجھے ہو۔"

"وہ کیسے؟؟؟"

"وہ ایسے کہ تم دونوں میں سے جو چاہتا اُس سے شادی کر سکتا تھا۔ بلکہ یوں کہئیے کہ جتنی محبت وہ کر سکتی تھی کہ وہ تم دونوں سے کرتی رہی ہے۔"

"بالکل بکواس" رحیم چلایا۔ "یہ محبت کا نرالا ہی طریقہ ہے کہ دُور سے ترساؤ اور قریب نہ آؤ۔"

"تم لوگوں کو شاید تعجب ہو گا سُن کر۔ کہ میں بھی اس پر فریفتہ ہُوا تھا۔" سلطان نے کہا۔

"ہا ہا ہا" رحیم ہنسا۔ "ابے اُلّو کے پٹھے تو بھی کسی لڑکی پہ فریفتہ ہو سکتا ہے۔ تُو تو ہر لڑکی کو پان سمجھ کر چبایا کرتا تھا۔ یونیورسٹی کا راجہ اندر تھا تُو۔ تیرے جیسے فلرٹ کو محبت کرنے کی فرصت ہی کہاں ہے"

اور یہ حقیقت تھی کہ سلطان اپنے زمانے میں بہت تیز لڑکا تھا۔ اور یونیورسٹی کی سترفی صدی لڑکیوں سے کامیاب رومانس لڑا چکا تھا۔

"ارے سن تو سہی" سلطان بولا۔ "میں نے کب کہا تھا کہ تم دونوں کی طرح میں اُس کے پیچھے مجنوں بن گیا تھا۔ میرا تو مطلب یہ تھا کہ چند لمحے اچھے گزر جائیں اور بس۔ مگر وہ قابو میں نہیں آئی۔"

"مگر ہُوا کیا تھا؟ کچھ بولو گے بھی یا تمہید ہی بناتے جاؤ گے۔"

"تم سنو تو! ہونا کیا تھا۔ بس ایک روز اُس کے پیلے سویٹر پر اپنا دل آ گیا۔ ہم نے ذرا ہاتھ پاؤں چلائے تو اس نے بھی ایسی غلط فہمی کرا دی کہ ہم نے کہا کہ میاں یہاں تو پکوان پہلے ہی تیار ہے۔ مگر ایک دن میں نے ٹک شاپ میں چلنے کو کہا تو اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اب اپنے پاس اتنا وقت تو تھا نہیں کہ اُس کے پیچھے پاگل ہو کر گھومتے رہتے۔ ابھی یونیورسٹی میں کئی لڑکیاں ایسی تھیں جن کو باقی حصے میں بھگتانا تھا۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ پہلے ہی ترپ چال چلی جائے۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ یوں کہ کلرک تو اپنے ہی ہاتھ میں تھا۔ اُس سے لڑکی کے گھر کا پتہ لیا اور ایک شام جا دروازہ کھٹکھٹایا۔"

"ارے" رحیم چونکا۔

"اُس کا چھوٹا بھائی باہر نکلا۔ میں نے کہا تمہاری باجی سے ملنا ہے۔ تو باہر آ کر کہنے لگا۔ کہ وہ نام پوچھتی ہیں۔ میں نے کہا کہ اُن ہی کو نام بتاؤں گا۔ باہر آجائیں تو عرض کر دوں گا۔ خیر مجھے اندر بلا لیا گیا۔ مگر یار مشکل یہ پڑی کہ بھائی بھی اسی کمرے میں تھا۔ اور غالباً آخر تک رہتا۔ اگر میں قینچی نہ چلاتا۔"

"کون سی قینچی؟"

"یہی کہ اُسے بھگایا جائے۔ ہُوا یوں کہ وہ اندر سے شربت لانے گیا۔ تو میں نے کہا کہ دیکھو تمہارے ساتھ چند ایسی باتیں کرنے آیا ہوں جن کو تمہارے گھر والے قابلِ اعتراض سمجھیں گے۔ میں نے وہ باتیں ضرور کرنا ہیں۔ خواہ تمہارا بھائی یہاں بیٹھا رہے یا چلا جائے۔"

ہم بے اختیار ہنس دیے۔

"لڑکی سمجھدار تھی۔ اُس نے اپنے بھائی کو اندر بھیج دیا۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟" رحیم کرسی سے آگے جھک آیا۔

"کرنا کیا تھا۔ میں نے اُسے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ پھر اس کے حسن کی تعریف کی اور وہ سارے گُر آزمائے جن سے پہلے کئی لڑکیاں فتح کی تھیں۔"

"کیا بولی وہ؟" میں رشک سے جل رہا تھا۔

"جانتے ہو کیا کہا اُس نے؟"

"کیا؟" ہم دونوں ایک ساتھ بولے۔

"کہنے لگی اگر تم مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے ہو تو شادی کر لو۔ میں نے دل میں سوچا مارے گئے یہ تو۔ نماز بخشوانے آئے تو روزے بھی گلے پڑ گئے۔"

"پھر؟"

سلطان سگریٹ سلگانے لگا۔ کم بخت کو ہمارے جذبات کا بھی خیال نہ تھا۔

"پھر ؟" اس نے لمبا کش کھینچا " میں نے کہا کہ میں تیار ہوں۔ لیکن بہتر ہے کہ پہلے چند روز ہم اکٹھے گزار لیں تاکہ تم میری طبیعت سمجھ جاؤ۔ مگر وہ نہ مانی کہتی تھی میں بدنام ہو جاؤں گی۔ میں نے بہت زور مارا تو بڑے درد سے کہنے لگی۔ سلطان صاحب! ہم متوسط طبقے والوں کے پاس نام کے علاوہ اور ہے ہی کیا۔ اچھی اخلاقی شہرت کے لیے ہی تو ہم سینکڑوں ذہنی دیواریں بناتے ہیں اور اگر شادی سے پہلے دوں پر تجربوں میں وہ نام ہی کھو دوں تو کون شادی کرے گا مجھ سے۔ بھئی رحیم میں نے اس کی بات سنی تو مجھے یوں لگا جیسے اس نے میرے دل میں جھانک کر میری نیت کو گردن سے پکڑ لیا ہے۔ بحث تو شام تک میں پھر بھی کرتا رہا۔ مگر وہ اٹل تھی اور میں اٹھ کر آ گیا۔"

"اس کے بعد پھر کبھی نہیں ملے" میں نے پوچھا۔

"اوں ہوں۔ میں وقت ضایع کرنے کا قائل نہیں۔ اور کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔" اس نے کش لگایا۔ "دراصل اس کا باپ انتہائی غیر ذمہ دار تھا۔ اور توقع نہ تھی کہ وہ لڑکیوں کے لیے رشتے ڈھونڈ سکے گا۔ پھر اس کی چھوٹی تین بہنیں اور تھیں اور تم جانتے ہو کہ ہمارے خاندانی نظام میں گھر کے بڑے بچے کی چھوٹے بچے ہر حال میں تقلید کرتے ہیں۔ اس لڑکی کو اپنی اسی ذمہ داری کا احساس تھا...... ... وہ ہر ایک سے شادی کرنے کو تیار تھی۔ خواہ سلطان ہو۔ یا رحیم ہو یا کوئی اور ہو۔ مگر کسی سے دوستی کا جا کھیل کر اور بدنام ہو کر شادی کے آئندہ امکانات تباہ نہ کرنا چاہتی تھی —— اپنے بھی اور اپنی بہنوں کے بھی —— نام اس کا مسئلہ نہ تھا، سارے متوسط طبقے کا مسئلہ ہے۔ عورت کا بنیادی مسئلہ تم جانتے ہو شادی ہے۔ اسی کے نام پر وہ اپنا اخلاق تباہ کر سکتی ہے۔ اور اسی کی خاطر وہ اپنا اخلاق بچائے رکھتی ہے۔"

"وہ آج کل کہاں ہے" میرے دل میں یہ سوال بڑی دیر سے کھد بد کر رہا تھا۔

"فلاں کالج میں پروفیسر ہے —— میری لڑکی بھی اسی کالج میں پڑھتی ہے اور وہ ذکر کرتی ہے کہ ہر جگہ نیک اخلاق کی مثال دینے اسی پروفیسر کا تذکرہ ہوتا ہے ... —— بڑا اچھا نام ہے اس کا"

اتنے میں دو ایک دوست اور بھی آ گئے اور موضوع ختم ہو گیا۔

آج صبح میں اپنے ڈاکٹر دوست کے پاس بیٹھا تھا جو نفسیاتی معالج ہے اس کا خیال تھا کہ ہمارے ملک میں [illegible] اتنی ضرورت نہیں جتنی نفسیاتی معالجوں کی ہے۔ کیونکہ پابندیوں میں جکڑے ہوئے اس معاشرے میں زیادہ تر بیماریاں نفسیاتی [illegible] وجہ سے ہوتی ہیں۔ مجھے اس کا نقطۂ نظر تسلیم کرنے میں تامل تھا۔ اور میں کہہ رہا تھا کہ ہر سپیشلسٹ سمجھتا ہے کہ دنیا میں اس کے وجود کے علاوہ اور کسی کی ضرورت نہیں۔ بحث ہوتی رہی اور وہ اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کو مریضوں کے ہسٹری کارڈ اٹھا لایا۔ ایک ایک کارڈ پر نظر ڈالتا اور مریضوں کے حالات بتاتا جاتا۔

"ایک مریضہ ہے جس کی ہسٹری دلچسپ ہے۔ جب یہ پہلے روز میرے پاس آئی تھی تو میں میز پر کام کر رہا تھا مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھی تھی کہ اتنے میں بجلی بجھ گئی۔ ہم نے چند سے انتظار کیا اور پھر میرا ملازم ایک بڑی موم بتی اٹھا کر لے آیا۔ جو میں نے اپنے سامنے کی میز پر رکھ لی اور مریضہ کی ہسٹری لکھنے لگا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ مریضہ کی

زبان میں ہکلاہٹ پیدا ہوگئی - اور اس کی باتیں بے ربط ہوگئیں - میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ بڑی وحشت سے موم بتی کو گھور رہی تھی پھر ایک دم وہ اٹھی اور موم بتی کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا ۔"

" ارے " میں حیران رہ گیا - " مگر یہ کیوں کیا اس نے ؟"

ڈاکٹر مسکرایا - " میں نے اس کے گھر والوں سے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اکثر موم بتیوں کو توڑ پھوڑ دیتی ہے اور انہیں برداشت نہیں کر سکتی ۔"

" مگر کیا وہ اسی تکلیف کے علاج کے لیے آئی تھی ۔"

" نہیں یہ وقوعہ تو اتفاقیہ ہوگیا - وہ خود نہیں آتی تھی بلکہ اس کے گھر کے لوگ اُسے زبردستی لائے تھے - تکلیف اُسے یہ تھی کہ برسات کے موسم میں وہ ستون سے لپٹ کر رونے لگتی ۔ روتے روتے بے ہوش ہو جاتی اور اس کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو جاتے - بعض اوقات چاندنی راتوں میں بھی وہ ایسا ہی کرتی - اس کے لواحقین کو خاص طور پر ایسا گھر لینا پڑا جس میں ستون کوئی نہ تھا مگر تم جانتے ہو کسی اور جگہ ستون کا ملنا مشکل نہیں اور وہ ادھر ہی بھاگ جاتی ۔"

میں دم بخود تھا - ویسے ہی ہسٹری کارڈ اٹھا کر دیکھنے لگا - مریضہ کے نام پر نگاہ پڑی تو میں ایک دم چونکا یہ وہی تھی - عمر بیتالیس سال لکھی تھی اور نام کے ساتھ " مس " کا لفظ دیکھ کر مجھے نہ معلوم کیوں دکھ ہوا - میں تھوڑی دیر کو سُن سا ہوگیا -

" اب اسے کچھ افاقہ ہوا ہے تمہارے علاج سے " میں نے بالآخر پوچھا -

ڈاکٹر نے اپنی دونوں ٹانگیں میز پر رکھ دیں اور کرسی کی ٹیک پر پھیل گیا - پائپ میں تمباکو جما کر اس نے دیا سلائی دکھائی اور دھواں چھوڑتے ہوئے بولا -

" اگر ہم اسے عنقریب پاگل ہونے سے بچا سکیں تو یہ ایک معجزہ ہوگا ۔"

انور سجاد

مرگی

جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ وہاں بیٹھ کیا کر رہا ہے۔

اس نے آنکھیں مل کر کرنوں کے ننگے آئینے میں چاروں اور دیکھا۔ پھیلی ہوئی سیپیوں میں شیشے کی کرچیاں تھیں۔ اس کی نظریں سمندر کے چکنے کنارے پر بھاگتے ہوئے کیکڑوں کے پیروں میں الجھ الجھ کر ٹوٹنے لگیں تو مجھے پھر دورہ پڑا تھا؟ اس نے اپنے ٹوٹتے ہوئے جسم کو کانپتے گھٹنوں پر سیدھا کرنے کی کوشش کی، کیا ہوا تھا؟

میں ٹرام میں بیٹھا تھا۔ ٹرام کسی چیز سے ٹکرائی تھی۔ پتا چلا کہ کوئی ٹرام کے نیچے آ گیا ہے۔ ٹرام رک گئی تھی۔ چند ایک متجسس لوگوں کی گردنیں ٹرام کی کھڑکیوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ کیا ہوا ہے؟ ٹرام کے سارے مسافر نیچے اتر گئے تھے اور تیز تیز قدموں سے بس شاپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سڑک کے درمیان میں ٹرام کی پٹڑیوں پر ٹریفک رک گئی تھی۔ ساتھ والی پٹڑی پر مخالف سمت میں جانے والی ٹرام دندناتی ہوئی گذری، رکشا، بسوں موٹروں کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ لوگ اپنے کاموں میں مصروف آجا رہے تھے۔ ٹرام خالی ہو گئی تھی۔ کیا مصیبت ہے۔ پہلے ہی دفتر سے دیر ہو گئی ہے۔ اب جانے بس میں جگہ بھی ملتی ہے یا نہیں۔ میں ٹرام سے اتر کے آگے کو بڑھا تھا اور میری نظریں غیر ارادی طور پر ٹرام کے پہیوں کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ ایک بہت خوبصورت مکرانی لڑکی کچلی پڑی تھی۔ اس کا خون اس کی ولٹوہی سے بہتے دودھ میں پگڈنڈیاں بناتا سڑک اور پٹڑی کی دہلیز پر جم رہا تھا۔ فٹ پاتھ کی طرف بہہ رہا تھا۔ اس کی چھاتیاں پھٹے ہوئے گریبان میں تڑخ گئی تھیں۔ پاس کنڈکٹر اور ڈرائیور کھڑے تھے اور ٹریفک کا ایک سپاہی۔ رکشا، موٹریں، بسیں، لوگ آجا رہے تھے۔ میں ایک لحظہ کے لیے بھی رکے بغیر سیدھا دفتر کو چل دیا تھا مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی تھی، بس کا انتظار کون کرتا۔ اور پھر جانے جگہ بھی ملتی یا نہ۔ نہیں، اس واقعے کا اثر نہیں تھا۔

تو پھر؟

دفتر میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ پرزے مشینوں میں ڈھل ڈھل کر نکل رہے تھے۔ میں نے بڑے اطمینان سے اپنی شفٹ کا دورہ لگایا تھا اور کمرے میں آ کر کام میں مصروف ہو گیا تھا میں نے چائے کے دوسرے دور میں پورا اخبار پڑھ لیا تھا۔ اور تیسرے دور میں ناول کا ایک باب۔ یہ دن بھی دوسرے دنوں کی کاربن کاپی تھا تو آج پھر یہ دورہ کیوں پڑا۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ خوش بھی تھا۔ مالک نے میرے کام سے خوش ہو کر میری تنخواہ میں اضافے کا وعدہ بھی کیا تھا جس سے میری شادی کے امکانات روشن ہو گئے تھے۔ آئندہ سال میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ اپنے کسی رشتہ دار سے کہہ کہلوا کر شادی کا بندوبست کرا سکوں۔ پھر میں پوری طرح سیٹل ہو جاؤں گا، لاوارث ہونے کی حیثیت سے میرے رشتہ دار میری بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے اور مجھے اس سے بھی کبھی کوفت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن پھر کبھی کبھی مجھے یہ کیا ہو جاتا ہے؟

اس نے قریب سے بھاگتے ہوئے چھوٹے سے کیکڑے کو مکا مار کر ریت میں گاڑ دیا۔ اس کے جسم میں کمانیں ٹوٹ رہی تھیں

(کیوں؟)

اچھا بھلا دن گذر رہا ہوتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے یک دم اسے جانے کیا ہو جاتا کہ پتلیوں میں زلزلہ آجاتا۔ اس کی آنکھیں ساری کائنات کے ملبے میں دب جاتیں۔ جب اس کا احساس اُبھرتا تو وہ (کرنوں کی) انی پر تڑپ رہا ہوتا۔

وہ گرتا پڑتا اٹھ کھڑا ہوا اور سمندر کے کنارے بھاگنے لگا۔ پیروں میں پڑتی سمندر کی زنجیریں توڑتا ہوا، ہانپتا ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ بہت زور سے چیخے۔ اس نے چیخ ماری۔ آواز سمندر کی چیختی چپ میں ڈوب گئی۔

وہ ہنسا (یہ ... ہے ؟)

تھی منی تار مچھلیوں اور گھونگھوں نے سلیٹ پہن لیے۔ پانی کی چنگھاڑتی ڈائن چٹانوں کو جھنکار سے اڑاتی سمندر سے اٹھی اور اس کے جسم میں روئی کے دانت گاڑ کے بلبلوں میں پھوٹ بہی۔ وہ بھاگتا بھاگتا رک گیا اور غصے میں بلبلوں کو ٹھوکریں مارنے لگا۔ تم چپ کیوں ہو؟

ڈائن پھر اٹھی، بانہوں کی پھانسی بیے اس کی طرف بڑھی۔ اس کا سانس چھین کر اسے گیلی ریت میں اچھال دیا۔ مجھے چوٹ نہیں لگی۔ کوئی زخم نہیں آیا کیوں؟ اس نے مڑ کر سمندر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں طیش تھا، بے بسی تھی۔

دیکھا میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ دورہ مجھ میں نہیں سمندر میں ہے۔ میرے اردگرد ہے۔ میں اس کے اندر ہوں۔ اس نے ہوا سے سانس چھینے اور مٹھی بھر کے مٹی اپنے جسم پر مل لی۔ یہ میرا زخم ہے۔ یہ زخم پھیل کر میرا جسم بن گیا ہے۔ یہ زخم بے حس ہے۔ اس میں کوئی جلن نہیں (جلن کیوں نہیں ؟) اس نے آسمان کو گھورا پھیکے سے آسمان میں پرانے زخموں کی سڑاند تھی (یہ بو مجھے آرہی ہے ؟)

اس کے پیر پر سنہری چیونٹی نے کاٹا۔ وہ بلبلا اٹھا، یہ تو میرا پیر ہے۔ اس نے جھک کر چیونٹی کو وہیں مسل دیا۔ پھر دوسری چیونٹی پھر تیسری اس کے مسام میں برچھیاں گھبی ہوئی تھیں (میرے جسم کے تمام ریشے کب ڈھیلے پڑیں گے ؟)

دور سے آواز آئی (ہوا کی سرسراہٹ ؟ درختوں کی سرگوشی ؟ سانپ کی پھنکار ؟ پرندے کی سیٹی ؟) یہ آواز کیسی ہے ؟ مجھے آواز آئی تھی۔ اس نے ہوا نگل کر کانوں کے پردوں کو سرکایا۔ شر! یہ تو ہوا اپنے کاندھوں پر شر کر بٹھا کے لائی ہے اس کے کئی ریشے ڈھیلے پڑ گئے۔ شروں نے اس کے کانوں کے پردوں پر ایڑیاں ماریں۔ چشمے پھوٹ بہے اور اس کا سارا تناؤ کھل گیا۔ مجھے اس گیت کی آواز آرہی ہے۔ میں یہ آواز اس لیے سن رہا ہوں کہ میں بھی آواز کے سمندر کی ایک لہر ہوں وہ چٹان کی اوٹ میں ٹھنڈی ٹھنڈی گیلی ریتلی مٹی پر سیدھا لیٹ گیا۔ بھیگی مٹی کا ابھار اس کے ہر خلیے میں سرایت کرنے لگا۔ ہر ہنستی کھیلتی لہر دوسری لہروں کو پھلانگتی چٹان سے ٹکراتی۔ پھوار اس پر آکے پڑی (لہر کا خون!) میں بھی کیوں نہ تھوڑا سا خون بہالوں تاکہ شریانوں میں لہو کے بجائے اچھی طرح خلا بچ جائے، لیکن اس کا جی اٹھنے کو نہ چاہا۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور موت کے سکوت میں پہلا قدم رکھ دیا۔

("تم اپنا علاج کراؤ۔ تم ایسا قابل اور محنتی لڑکا ....")

(ہوں۔)

کئی مرتبہ دھوپ آسمان سے اتر کے اونچی اونچی عمارتوں کی سب سے آخری اینٹ سے پھسل تھی۔ اس کے حلق میں ٹپکی تھی اور دھوپ کا کانٹا اس کے تالو میں اٹکا تھا جس وقت اس کانٹے کی ڈوری ہلتی تھی تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ خود ہے تو سہی لیکن دھاگے کی جڑیں کہاں ہیں (کانٹا تو پھل ہے) دھاگا، جڑیں، دھوپ عمارتیں، اینٹیں، پرندے، لفظ، الفاظ — سیاہ الفاظ جو سفید کاغذ پر آکے سفید ہو گئے تھے۔ سفید الفاظ جو سیاہ بلیک بورڈ پر اتر کے سیاہ ہو گئے تھے، اپنا مطلب گنوا گئے تھے اور لفظوں نامروں کے ساتھ تمام چیزوں کا مقصد بھی، لوگوں نے حواس سے چیزوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ جاننا چاہا، لیکن سوچ کے لاوے تڑپل کرتے رہے، انھیں پر نہ نکلے۔

" (تم میں اچھی خاصی تخلیقی صلاحیتیں ہیں۔ اگر ذرا توجہ کرو۔ ننھے جھونپڑوں کے ڈیزائن — ")

لاسیدوں کی کرلاہٹ، ان کے ہلنے کی سرسر — مجھے خوف آتا ہے تو میں ابھی ہوں جو کبھی کسی گراری کے دانت میں آتا ہوں اور کبھی اس میں۔ نہیں یہ دانت تو نہیں یہ تو موت کے سکوت کی مسلسل داب ہے جو لمحوں میں منقسم ہے۔

("میں بالکل ٹھیک ہوں سر، بس یہ کبھی کبھی ذرا —)

نہیں یہ سب کچھ، کچھ نہیں ہے۔

اس کے سن چہرے پر حرارت کے چابک پڑ گئے۔ اس نے اپنی آنکھوں کے روزنوں سے دیکھا۔ چٹان کا سایہ، آسمان کی چھت، در و بام، اور کھجور کے درخت ان کے قدموں میں آک کے پودے پودوں کے قریب جھونپڑوں کی چھتیں (اور دور، افق پر عمارتوں کی چوٹیاں، مسجدوں گرجوں کے کلس) دھاگے کی چڑیاں — (یہ مجھے پھر کیوں یاد آگئیں، اوہ، کسی نے ڈوری ہلائی ہے۔ اور کانٹا — (چڑیاں کہاں ہیں؟) یہ سب موجود ہیں اور میں ریت میں ذرہ یہ سب مجھ پر چھائے ہوئے ہیں۔ نہیں یہ سب کچھ، کچھ نہیں ہے، صرف میں ہوں (؟)

کسی نے پھر مجھے چھوا ہے۔

(؟)

اس نے کراہ کے آنکھیں موند لیں۔ (میں نے زندگی میں کسی چیز کی بھی کمی تو محسوس نہیں کی۔ میری یہ حالت کیوں ہو جاتی ہے۔ میں نے دنیا میں اتر کے دیکھا ہے۔ ہر متحرک چیز کے ساتھ قدم ملا کر چلا ہوں، وقت تک کے ساتھ دوڑا ہوں۔ پھر یہ سب کچھ میرے ریشوں میں آ کے یکدم رک جاتا ہے!)

کسی نے پھر اس کے چہرے کو ہلایا۔

"آنکھیں کھولیے نا"

اس نے پوری آنکھیں کھول کر یکدم بند کر لیں (اور آنکھوں میں رنگ جھلکا ہوا، عکس اور احساس بھی)

"آپ کو کیا ہو گیا تھا؟"

نہیں نہیں —

"آپ چٹان سے ٹکرا گئے تھے؟"

نہیں

"آپ آنکھیں کیوں نہیں کھولتے" (باریک سی رو ہانسی آواز)

مجھے آواز واقعی سنائی دی ہے۔ مجھے واقعی کسی نے چھوا ہے۔ مجھے واقعی سینٹ کی خوشبو آ رہی ہے۔ میری آنکھوں میں اس کا عکس بھی ہے)

"اُف" میرے جسم سے یہ درد کبھی نکلا بھی تھا؟ وہ کہنیوں کے سہارے بیٹھ گیا۔

"آپ بیہوش ہو گئے تھے"

اس نے لڑکی کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ بھی مجھے دیکھ رہی ہے۔

"ہم پکنک منانے آئے ہیں۔ اس نے دور جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں گراموفون ریکارڈ اب بھی بج رہے تھے" میں سیر کرتی ادھر آ نکلی تھی۔

آپ۔ آپ کو کیا ہو گیا تھا؟"

"اُف" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"آپ کچھ بتائیں تو۔۔۔

"مجھے سمندر (۔۔۔

"اگر میڈیکل ایڈ کی ضرورت ہو تو۔۔۔"

۔۔۔ کی بانہوں نے بھینچ رکھا تھا)

میموں کی طرح کٹے ہوئے بال، کالی ساڑھی، بغیر بازو اور گہرے چاک کے گریبان والا سُرخ بلاؤز۔ بغلوں کے بالوں میں اٹکے ہوئے پسینے کے قطرے۔ گریبان کی اوٹ سے جھانکتی دودھیا چھاتیوں پر پھسلتی نظروں کی زبان پہ کانٹے پڑ گئے۔ اس نے تھوک نگلی۔ زندگی کتنی مہمل، کتنی بیکار اور کتنی پیاسی ہے اس کی چھاتیوں میں ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا عکس ہے۔ ہوا میں لہراتا، سیاہ ساڑھی کا پلو، ناگ کا سر ہے۔ لڑکی نے اس کے ہاتھ سہلاتے ہوئے ساڑھی کو سینے پر ٹھیک سے جمانے کی کوشش کی۔ ریت پہ کالا ناگ بل کھا رہا ہے۔ اس کے منہ سے سرسبز ڈالی جھانکی ہے جس پر پھل لگا ہے (مجھے بھوک لگی ہے)

لڑکی اس کی بے معنی نگاہوں میں معنی پا کر لرز سی گئی۔

"یہ دیکھیے نا، آپ کے پیروں میں چھوٹے چھوٹے کتنے ہی کیکڑے

(اچھا تو یہ کیکڑے ہیں)

لڑکی نے پاس پڑی خشک ٹہنی اٹھائی اور کیکڑوں کو دھکا دیا۔ کیکڑے ساتھ والے بل میں گھس گئے (یہ مجھے نوچنا چاہتے تھے ؟)

"آپ یہاں تنہا ہی آئے ہیں یا آپکے ساتھ دوست وغیرہ۔۔۔"

تنہا۔۔۔ آپ۔۔۔ دوست۔ ساتھ وغیرہ ؟ تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ آوازوں کے جو مختلف نمونے تمہارے منہ سے نکل رہے ہیں، یہ کیا ہیں ؟ ان کا میرے ساتھ کیا رشتہ ہے ؟ میرے سارے رشتے گم ہو گئے ہیں۔ میں کس چیز میں اپنا عکس دیکھوں ؟ سڑک اور پیڑی کے سنگم پہ لہو ملا دودھ ہے سانپ کے منہ میں پھل ہے اور پھل کے اندر زہر ہے مجھے بھوک لگی ہے۔

لڑکی نے اسے سوچتے ہوئے دیکھا "آپ ہوش میں آ گئے ہیں۔ اب میں چلتی ہوں"

اس کا گوشت کئی جگہ سے پھڑکا اور پھر تن گیا۔

"آپ کو یقین ہے کہ اب آپ کو کسی مدد کی ضرورت نہیں ؟"

یہ ، یہ آواز کیسی آ رہی ہے ؟ چریخ، چراخ، کھٹا کھٹ، ٹھکا ٹک، چرخ چراخ۔ یہ تو ابھی ابھی اس لڑکی نے کچھ کہا تھا۔

وہ اٹھی، کالے ناگ کا سر ہوا میں جھوما۔ ا۔ ا۔ آ۔ سانپ مسکایا۔ لڑکی نے اسے اٹھانے کے لیے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اپنے اکڑے ہوئے ہاتھ سے لڑکی کا ہاتھ پکڑا۔ یہ۔ یہ لوہے کا ٹکڑا کہاں سے آ گیا ؟ اس نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور لڑکی کی طرف دیکھا۔ چریخ چراخ، چریخ چراخ، غراریوں کے دانت ۔۔۔ اور ان میں چمکتا ہوا موبل آئل۔ یکدم اس کا جسم کانپنے لگا، اس کی آنکھیں ماتھے کے پیچھے چلی گئیں۔ اس کے پیٹ میں خلاء بھر کے اس کے وجود پہ چھا گیا۔ تم کہاں ہو ؟ میرے اندر پھر بھونچال آ گیا ہے۔۔۔ یہ دورے میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے۔ میرے دوروں کی کینچلی اتار دو۔۔۔ تم کہاں چلی گئیں میں سمندر کی تہہ میں جا کر سیپ کا منہ کھولنا چاہتا ہوں۔ اس نے اپنی آنکھیں مل کر سامنے دیکھا۔۔۔ لوہے کے بازو اس کو اٹھانے کے لیے اس کی طرف بڑھے تھے

بیٹے کی گول گول چمکتی آنکھیں، تمام جسم چاندی۔ میں نے تو نرم نرم ہاتھ چھوئے تھے یہ پتھر کہاں سے آ گئے؟ مشینوں کی آوازیں پیچھے آ رہی تھیں۔ وہ لڑکی کہاں گئی؟ اوہ ہاں، یہ اس کا گریبان ہے۔ اس کی آنکھیں گریبان کی بھول بھلیوں میں منڈلانے لگیں۔ انگلیوں نے محسوس کیا، سفید سفید نرم نرم دودھیا چھاتیاں یا تیز دھار جسم سرمئی، سرد، لوہا۔ اس کے سر میں ہمنا ر کی لہر آ کے ٹوٹی۔ اس نے خاردار زبان اپنے خشک ہونٹوں پر پھیری۔ اس کے کانوں میں لاتعداد کارخانے چل رہے تھے۔ اس نے اپنی فال کے آگے لگے بیٹے کو گریبان کی طرف بڑھتے دیکھا۔

چیخ۔

(لوہے کے پیالے آپس میں ٹکرائے۔ نرم نرم گوشت کہاں گیا؟ اس نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا۔ یہ آج میرے ہاتھ کو کیا ہوا؟ میں نے تو اس کی خواہش نہیں کی تھی۔ پھر یہ اکڑا ہوا پنجہ!) اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے سامنے گھورا۔

" پاگل "

اس نے فوراً بڑھ کر پاس سے گزرتے ہوئے سیاہ کپڑے کو پنجے میں پھنسا لیا۔ ساڑھی کا پلو پھٹ گیا، اس کے ہاتھ میں لوہے کا پھندا تھا (تو یہ ہاتھ نہیں؟) میری کپٹی کا شکنجہ اور بھی کس گیا ہے۔

اس نے لیر کو بڑی بے بسی سے بڑے غصے میں زمین پر دے مارا اور گھٹنوں پہ گر کر جنون میں اپنی اکڑی ہوئی انگلیوں سے گیلی زمین میں گڑھا کھودنے لگا دیوانہ وار۔

رفتہ رفتہ اس کے تنے ہوئے ریشے تھکاوٹ میں رچ گئے۔ وہ ہانپتا ہوا گڑھے میں جا پڑا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر پڑے تھکاوٹ کے غلاف کی اوٹ سے دیکھا کہ سمندر کے سانس منہ سے نکلی جھاگ میں لوٹ رہے ہیں اور چیونٹیوں کے بل سے کئی کیڑے نکل کر بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اس نے کروٹ بدل کر گڑھے کی آغوش میں منہ چھپا لیا اور پوری قوت سے آنکھیں میچ لیں۔

رضیہ فصیح احمد

شہرزاد

ہوٹل کے باہر لان میں ہم بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سرو کے گرد لپٹی ہوئی رنگین بتیوں کی مالائیں جل رہی تھیں۔ حوض میں لگے ہوئے شیشے کے پار سُرخ مچھلیاں تیر رہی تھیں اور اس کے اوپر دیوار میں لگے ہوئے رنگین قمقموں نے ابھی ابھی شروع ہونے والی رات کو عجیب سکون دہ روشنی بخشی تھی۔ اس خوبصورت اور پُرسکون ماحول میں ٹیپ ریکارڈر پہ رمسکی کورسکوف کا مشہور نغمہ "شہرزاد" بج رہا تھا۔ الف لیلیٰ سے متاثر ہو کر لکھا جانے والا یہ نغمہ یوں بنیے۔ دھیمے سروں میں آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے کہ مشکل سنائی دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ ایک آہنگ میں دوسرے سازوں کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ لمحہ بہ لمحہ سُر اور لے کی آواز تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ اس نغمے کو خاموشی سے سُنئے تو واقعی الف لیلیٰ کی روح اس میں سموئی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بغداد کی پُراسرار راتوں میں بھیس بدلے ہوئے بادشاہوں اور سیاہ فام حبشیوں کے قدموں کی چاپ، خوبصورت ملکہ اور نیم وا آنکھوں والی حسین کنیزوں کی دلفریب ہنسی سیاہ راتوں میں، دریائے دجلہ کی روانی اور ہر رات ایک نئے مہمان کے انتظار میں کھڑے رہنے والے ابوالحسن کے دل کی دھڑکن اشرفی کی تھیلیوں کی جھنکار، ان اطلسی پردوں کی سرسراہٹ جن سے بغداد کے محل مزیّن تھے اور اس رباب کا ارتعاش جس کی صدا سے خلیفہ ہارون الرشید نیند سے بیدار ہوتے تھے۔ یہ لمبا نغمہ جس کے چار حصے ہیں الف لیلیٰ کی ان ہزار راتوں کی یاد دلاتا ہے جو ہر رات ایک نئی کہانی کی کڑی میں ایک دوسری سے پیوستہ ہوتی چلی جاتی ہیں جیسے مختلف سازوں کی آوازیں گھُل مل کر دور تک ایک ہوتی چلی گئی ہوں۔

جب یہ نغمہ ختم ہوا اور اس کا سحر ٹوٹا تو میں نے بیگم سیف سے پوچھا "آپ نے الف لیلیٰ کی کہانیاں تو ضرور پڑھی ہوں گی؟"

"نہیں میں نے نہیں پڑھیں۔" انھوں نے لاپروائی سے کہا اور مجھے اُن کے اس جواب سے بے حد مایوسی ہوئی۔ عراق کی رہنے والی، بغداد میں پرورش پانے والی ان خاتون نے الف لیلیٰ تک نہیں پڑھی جبکہ ہمارے ذہن میں بغداد کا ہر تصور الف لیلیٰ کی سحر انگیز کہانیوں ہی سے وابستہ ہے۔ آج ہی کرنل سیف اور بیگم سے ہمارا تعارف ہوا تھا۔ کرنل ایک ملٹری کورس کرنے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ تعارف کے بعد کرنل نے ہم سے انگریزی میں بات کی مگر بیگم خاموش رہیں کیونکہ انھیں انگریزی کے صرف چند الفاظ آتے تھے اور وہ اپنی انگریزی سے شرمسار تھیں مگر رفتہ رفتہ وہ ہم لوگوں سے اتنا گھُل مل گئیں کہ گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتیں۔ انگریزی کے انہی الفاظ سے وہ دُنیا بھر کے مطالب ادا کر لیتیں، حالانکہ وہ جملہ بنانے کی الف بے سے بھی واقف نہیں تھیں۔ تب مجھے پتہ چلا کہ آپس کی گفتگو کے لئے گرامر جاننے کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر روز وہ ہمیں اپنے ملک کے نئے نئے قصے سنایا کرتیں۔ اس لئے میں نے ان کا نام شہرزاد رکھ دیا تھا۔ یہ انھیں بھی پسند تھا۔

ایک دن باتوں باتوں میں ہم انھیں عربی کے وہ الفاظ بتانے لگے جو ہم اردو میں بھی بولتے ہیں۔ وہ ہمارے تلفظ پر ہنستے ہنستے بے حال ہو گئیں۔ اُس وقت مجھے پتہ چلا کہ زبان کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ آپ چاہے یوں اپنے شین قاف پر کتنا ہی فخر کیوں نہ کریں جب دوسری

زبان کے الفاظ کا مسئلہ آتا ہے تو آپ کا تلفظ ہمیشہ مضحکہ خیز ہی ہوتا ہے۔ ایک پرلطف بات یہ بھی تھی کہ ہم دونوں دو زبانیں بولتے تھے جس کا رسم الخط ایک تھا مگر ایک دوسرے کی بات چیت بالکل نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ میرے افسانے بغیر سمجھے پڑھ لیتی تھیں اور ان کے وہ عربی رسالے جن میں خوبصورت مصری ایکٹرسوں کی تصویریں ہوتی تھیں سوائے دو چار الفاظ کے میرے پلّے کچھ نہ پڑتا تھا۔

"بغداد ویری رچ، ویری بیوٹی فل" ان کا تکیہ کلام تھا۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ بغداد میں ان کا ذاتی مکان بہت خوبصورت ہے۔ اس کے ہر کمرے میں الگ الگ رنگ ہے۔ ہر کمرے کی تین دیواروں کا رنگ ایک سا اور چوتھی دیوار کا رنگ جُدا ہے کہ یہی تازہ ترین فیشن ہے۔ ان کے پاس روٹیلی وژن اور دو ریڈیو سیٹ ہیں۔ ایک بڑی سی نئی کار ہے۔ وہ خود اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ ان کے گھر میں ایک آیا ہے جو بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ ایک پاکستانی خانساماں ہے جو بہت اچھا کھانا پکاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہاں پاکستانی خانساماؤں اور دربانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

کرنل سیف کو اس چیز کا بہت زیادہ احساس تھا کہ دوسرے ملک میں کسی چیز کی بُرائی نہ کریں مگر شہرزاد کو جو بات پسند نہ آتی جھٹ سے کہہ گزرتیں۔ اس سے ہم میں دوستی اور بے تکلفی کا ایک خاص رشتہ قائم ہوا جو رسمی طور پر ایک دوسرے کے ملک کی تعریفوں سے بلند تھا۔ شہرزاد کو کوئٹہ کی خاموش زندگی ذرا پسند نہیں تھی۔ وہ اپنے بغداد کی چہل پہل کو یاد کرکے اُداس ہو جاتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان میں ان کا دل کوئٹہ تو کوئٹہ کراچی میں بھی نہیں لگا۔ وہ جب بور ہوتیں تو کہتیں۔ "اب اگر سیف جنت میں بھی کورس کرنے گئے تو میں ساتھ نہیں جاؤں گی۔" دوسری شکایت پاکستان سے انھیں یہ تھی کہ یہاں باہر کی چیزیں نہیں ملتیں۔ وہ انگریزی اور فرانسیسی کپڑے جن سے ان کی بغداد کی دکانیں بھری ہوئی تھیں، وہ لپ اسٹک اور نیل پالش جن کی فیشن جیسے ہی پیرس سے نکل کر بغداد پہنچتی وہ چیزیں بھی وہاں پہنچ جاتیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ یہاں باہر کی چیزیں اس وجہ سے نہیں آتیں کہ ہم پاکستانی مصنوعات کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہاں کی چیزیں باہر کی چیزوں کا مقابلہ کرنے لگیں گی۔ پاکستان صنعتی لحاظ سے کہیں کا کہیں جا پہنچے گا اور عراق جہاں ہے وہیں رہے گا"۔ اس بات کو انھوں نے بہت غور اور دلچسپی سے سُنا۔ شاید اُن کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ غیر ملکی چیزیں استعمال کرنے یا نہ منگوانے کی اتنی معقول وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد میں نے انھیں کبھی اس بات کی شکایت کرتے نہیں پایا بلکہ میں نے دیکھا کہ پاکستانی مصنوعات میں ان کی دلچسپی دن بہ دن بڑھنے لگی۔ انھوں نے گھر کی آرائش کے لئے بہت سی چیزیں یہاں سے خریدیں۔ انہی دنوں اتفاق سے کوئٹہ میں صنعتی نمائش ہوگئی۔ اس میں وہ چیزوں کی خرید میں اس قدر محو ہو جاتیں کہ ہم سب کو چھوڑ کر ایک سے دوسری دکان پر لپک جاتیں اور ہمیں بھیڑ میں دقت سے انھیں تلاش کرنا پڑتا۔ جب بھی وہ ہمیں ملیں کسی نہ کسی دکان پر چاندی کے زیور یا کانچ کی چوڑیاں خریدتی ملیں۔ ان کے ہنس مکھ میاں ان کی اس حرکت پر مسکرا کر صرف اتنا کہتے "ہر جگہ کی عورتیں ایک سی ہوتی ہیں۔"

انھیں دنوں شہرزاد پر انکشاف ہوا کہ یہاں چیزیں بغداد کے مقابلے میں بہت سستی ہیں۔ گرم کپڑوں کی سلائی پر تو وہ منہ پھاڑ کر رہ گئیں اور میاں کے احتجاج کے باوجود اپنے اور بچوں کے گرم کپڑے سلوانے شروع کر دیے۔ ان کا کہنا تھا کہ جتنے پیسوں میں یہاں کپڑے اور سلائی دونوں کا خرچ نکل آئے گا وہاں صرف سلائی بھی اس سے زیادہ ہوگی۔ اب انھیں دکانداروں سے بھاؤ تاؤ کرنا بھی خوب آگیا تھا۔ چیز کے دام اس قدر کم بتاتیں کہ دکاندار کے ساتھ ہم بھی ان کا منہ دیکھنے لگتے۔ شیشے کے کام کے خوبصورت کشن، پچاس روپے جوڑے

جوڑے کو انھوں نے بیس روپے سے شروع کیا ۔۔ میں نے کہیں دکاندار سے کہہ دیا کہ یہ تو تمہارے سامان کی پبلسٹی ہو رہی ہے ، یہ چیزیں عراق جائیں گی ۔ اُس بے چارے نے یہ جوڑا انھیں آدھی قیمت پر دے دیا ۔ اب تو وہ میری بے دام غلام ہو گئیں ۔ ہر ایک سے کہتیں کہ جانے انھوں نے اردو میں کیا منتر پھونکا کہ یہ کشن مجھے سستے مل گئے ۔ اب وہ اس کوشش میں کہ ہمیشہ شاپنگ میں مجھے اپنے ساتھ رکھیں ، میں وہ منتر پڑھتی جاؤں اور انھیں چیزیں سستی ملتی جائیں ۔

ان کے دو بیٹے انتہا شریر بچے تھے ۔ سعد اور سنان ۔ دو فتنے کہہ لیجئے ۔ سعد ڈیڑھ پسلی کا کمزور سا بچہ تھا ، کل تین سال کا ، مگر کس قدر شریر ، کس قدر مضبوط ۔ اپنی سے دوگنی عمر کے بچوں کو وہ پٹخنی دیتا کہ وہ روتے ہوئے ماؤں کے پاس بھاگ جاتے ۔ ہر وقت اپنی عمر سے بڑے بچوں میں گھس کر ان کا کھیل بگاڑا کرتا ۔ وہ اس سے چھپتے پھرتے ۔ اپنے ٹکٹ اور البم اُٹھائے کسی کمرے میں چھپ کر دروازہ بند کر لیتے ۔ سعد تلاش کرتا وہاں پہنچ جاتا ، اور پھر دروازے سے لپٹ کر یوں دہاڑتا کہ سارے ہوٹل کو پتہ چل جاتا ۔ مجبوراً بچوں کو دروازہ کھول کر اس کی شرارتوں کو نشانہ بننا پڑتا ۔ کبھی کبھی وہ تنہا ہی شرارت پر تُل جاتا ۔ شرارت بھی کیسی خطرناک ! ایک دن جو ہماری نظر پڑی تو آپ چھت کے آگے چھجے پر ایک بڑا ڈنڈا لئے یوں چہل قدمی فرما رہے تھے جیسے کوئی عراقی جنرل اپنی فوج کی کمان دیکھ رہا ہو ۔ یہ جگہ اتنی پتلی اور اتنی اونچی تھی کہ حضرت گر جاتے تو ہڈی پسلی ایک ہو جاتی ۔ سنان صرف ڈیڑھ سال کا تھا مگر اس کی لکڑیوں کی مار سے شاید ہی کوئی بچہ اور اس کے ہاتھ سے شاید ہی کسی عورت کی چوٹی بچی ہو ۔ چپکے چپکے پیچھے سے آکر یوں بال پکڑتا کہ جب تک امی آکر دو چار دھپ نہ لگائیں کیا مجال کہ چھوڑ دے ۔ وہ جب پاکستان آیا تو اُسے بولنا نہیں آتا تھا ۔ اب جو باتیں کرنا سیکھیں تو مادری زبان کا اسے ایک لفظ بھی نہ آتا تھا ۔ آیا اور بیرے اسے پنجابی سکھا رہے تھے ۔ ساتھ کھیلنے والے بچوں سے اُردو اور انگریزی کے الفاظ سیکھ رہا تھا ، "پنجہ ست" کہنے پر ہاتھ ملاتا تھا ۔ مچھلیوں کو مچھی کہتا تھا ۔ چلنے کو واکی واکی ۔ آؤ جاؤ وغیرہ بہت سے چھوٹے چھوٹے الفاظ اسے آتے تھے ۔ حق یہ ہے کہ سعد اور سنان کرنل سیف اور شہرزاد دونوں سے زیادہ اردو سمجھ لیتے تھے ۔

پاکستان ہی میں لفٹنٹ کرنل سیف کے فل کرنل ہونے کے احکام آئے اور چند دن بعد شہرزاد کی امی نے کسی کے ہاتھ خالص سونے کے تاج بنوا کر بھجوائے جو وردی میں کاندھوں پر لگائے جاتے ہیں ۔ شہرزاد نے فخریہ بتایا کہ ان کے میاں جنرل قاسم کے "رائٹ ہینڈ مین" ہیں ۔ انھوں نے ہمیں عراق کے انقلاب کا حال سنایا ۔ شاہ فیصل کے سفاکانہ قتل کو تو وہ ضرور ناپسند کرتی تھیں ۔ باقی انقلاب انھیں بے حد عزیز تھا ۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ جس دن جنرل قاسم نے بغداد پیکٹ سے نکلنے کا اعلان کیا ، تمام بغداد میں خوشیاں منائی گئیں ۔ آدھی رات کو اسکول کے بچے سڑکوں پر گاتے ہوئے نکلے ۔ یہ اپنے مکان کی کھڑکی سے سارا منظر دیکھتی رہیں ۔ یہ سب اتنا حسین لگ رہا تھا کہ ان کا دل چاہا وہ بھی سڑک پر ان بچوں کے ساتھ گاتی پھریں ۔

• آج ہم برٹش استعمار سے آزاد ہیں ۔

"برٹش استعمار" جلد ہی ہماری روزمرہ کی گفتگو میں ایک خاص اصطلاحی لفظ بن گیا ۔ ہمارے ہاں کی بہت سی باتوں کو وہ "برٹش استعمار" کے نام سے یاد کرتیں ، ہم ان کے مغربی طرزِ زندگی اور طرزِ احساس کو "برٹش استعمار" کہتے ۔

ناشتے سے فارغ ہو کر روز یا وہ ہمارے پاس آ جائیں یا ہم تین چار خواتین ان کے پاس چلی جاتیں ۔ باہر لان میں بیٹھ کر سوئیٹر بنتے ہوئے گپ شپ چلتی رہتی ۔ بڑے خلوص سے شہرزاد ہمیں ٹرکش کافی پلاتیں جو زبان دراز عورت کے مزاج سے بھی زیادہ تیز اور

تکلیف ہوتی۔ شہرزاد ٹرکش کافی کو شاید دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتی تھیں۔ میرے خیال میں یہ کافی پینا اور لوہے کے چنے چبانا برابر تھا۔ مگر ان کی خاطر ہمیں یہ زہر بھی پینا پڑتا۔ انھیں دنوں انھوں نے ایک مزیدار قصّہ سنایا۔ ان کی امّی حج کرنے جانے لگیں تو چھوٹی بیٹی کو ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا، سب بڑے بہن بھائیوں نے جاکر ماں کو سمجھایا کہ اماں غضب کرتی ہو، یہ اس بے چاری کے کھیلنے کرنے کے دن ہیں۔ چنانچہ ماں اس کو ساتھ نہ لے جانے پر راضی ہوگئیں۔ انھوں نے وہ پیسہ جو بیٹی کو حج پر لے جانے کے لئے خرچ ہوتا اس کے ہاتھ پر رکھ دیا جس سے اس نے ایک کار خرید لی اور جب اماں حج سے لوٹیں تو اُسی کار میں انھیں لینے گئی۔

"مگر آپ نے اسے حج پر جانے سے کیوں روکا؟" ہم نے حیران ہوکر پوچھا۔

"اس لئے کہ جو عورت حج کرآئے وہ ہماری طرح بغیر آستین کی فراک نہیں پہن سکتی، کھُلے گھٹنوں نہیں پھر سکتی۔ اس کے لئے ٹخنے تک کا لباس، پوری آستین کی قمیص پہننا اور سر ڈھکنا لازم ہوجاتا ہے۔ بھلا اس بچی پر یہ ظلم کرنا اچھی بات تھی!!"۔

وہ دوڑ کر اندر گئیں اور اپنی چھوٹی بہن کی تصویر لاکر دکھائی۔ یہ بچی ان کے کہنے کے مطابق بیس پچیس سال کے درمیان تھی اور بینک میں ملازم تھی۔ بے حد خوبصورت ناک نقشہ، بال کٹے ہوئے۔ بغیر آستین کا چُست لباس پہنے ہوئے اپنی کار کے نزدیک کھڑی مسکرا رہی تھی۔

ہفتے میں ایک روز شہرزاد عراقی کھانا پکاتیں اور ہم سب کو بانٹتیں۔ جب ہم ڈائننگ ہال میں پہنچتے تو انگور کے پتوں، ٹماٹر اور پیاز میں بھرے ہوئے ڈھیر سے چاولوں کی پلیٹ ہم سب کی میزوں پر پہلے سے رکھی ہوتی۔ کھانے کے بعد ہم ان کا شکریہ ادا کرتے اور تعریف کرتے۔ مگر حق یہ ہے کہ ایسی ساری پلیٹوں کا کھانا بے چارے بیرے ہی کھاتے۔ ہر چیز کی طرح کھانے کی بھی ایک عادت ہوتی ہے، اکثر زبان نئی چیز کے ذائقے کو اتنی جلد قبول نہیں کرتی۔ جب کبھی اتوار کے دن ہم کرنل سیٹ کو انگور کے پتے توڑتے دیکھ لیتے پہلے ہی سے ایک دوسرے کو خبردار کر دیتے۔ ہفتے میں ایک دن رات کا کھانا وہ لوگ 'فرج' یا 'چائنیز' میں کھاتے۔ یہ شاید اُن کے نزدیک بغداد کی سوشل زندگی کا بدل ہو۔ ایک روز جب ہوٹل میں پارٹی ہوئی تو شہرزاد بچوں کی طرح خوش تھیں۔

"آئی لائک پارٹی" وہ باربار کہتیں — رات گئے تک سیاہ شال لپیٹے باہر بیٹھی وہ گانے سُنتی رہیں جن کا شاید ایک لفظ بھی ان کی سمجھ میں نہ آیا ہو —

ایک روز ناشتے کے بعد جب ہمارے کمرے کے آگے محفل جمی تو شہرزاد نہیں آئیں۔ بلوایا گیا تو انھوں نے کہلوا دیا کہ وہ مصروف ہیں نہیں آسکتیں۔ ہمیں تشویش ہوئی کہ جانے کیا بات ہے۔ جاکر دیکھا کہ شہرزاد ریڈیو سے کان لگائے بیٹھی ہیں۔ معلوم ہوا شام میں انقلاب آگیا ہے۔ اس نے مصر سے الگ ہونے کا اعلان کردیا ہے۔ جنگ ہورہی ہے اور وہ تازہ بتازہ خبریں سُن رہی ہیں۔ کئی دن تک وہ اسی طرح ریڈیو سے کان لگائے بیٹھی رہتیں اور شام کو ہمیں اہم خبریں سنایا کرتیں۔ انھیں دنوں ایک رات کھانے کے بعد ہم ان کے کمرے میں گئے۔ ہمیں ٹرکش کافی پلائی گئی جو ہم نے ڈھیر سے دودھ کے ساتھ پینی منظور کی حالانکہ وہ لوگ اس میں دودھ ڈالنا بدمذاقی سمجھتے تھے۔ اس دوران میں سعد اور سنان نے وہ شرارت کی کہ بات کرنا دشوار ہوگیا۔ دیکھتے دیکھتے سارے عربی رسالے، اخبار اور کھلونے فرش پر بکھر گئے۔ آپس کی لڑائی سے فرصت ملتی تو سنان کبھی اپنے گلاس کی کافی بابا کی پیالی میں اُنڈیل دیتا، کبھی بابا کی پیالی کی کافی امی کی پیالی میں

ڈالنے کی کوشش کرتا جو میز پہ گر جاتی۔ رات کو ان کی آیا چلی جاتی تھی اس لئے اس وقت ان کو قابو میں کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ شہزادہ تنگ آکر دونوں کو دوسرے کمرے میں چھوڑنے گئیں تو وہ ان کے واپس آنے سے پہلے پھر یہاں موجود تھے۔ یہ دیکھ کر وہ عربی میں جلدی جلدی بچوں کو کچھ بُرا بھلا کہنے لگیں۔ کرنل بڑے رسان سے اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور بچوں کی طرف اشارہ کر کے ہم سے بولے :" دیکھا آپ نے ہم عربوں کا خون کتنا گرم ہوتا ہے۔ تبھی تو ہمارے ملک میں اتنے انقلاب آتے ہیں۔

انھوں نے ٹھیک کہا تھا، اس بات کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ۸ فروری ۶۳ء کو عراق میں انقلاب آیا۔ بغداد پہ جنگی طیارے اُڑے۔ وزارتِ دفاع پہ بم برسائے گئے۔ جنرل قاسم اور اس کے چار ساتھیوں کی نعشیں ٹیلی وژن پہ دکھائی گئیں جنھیں ایک بند کمرے میں مقدمے کے بعد شوٹ کر دیا گیا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس جنگ میں چھ ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ سب سے پہلے جب ریڈیو پہ میں نے اس خونی انقلاب کی خبر سُنی تو میرا خیال ایک دم کرنل سیف تک پہنچا جو ان کی بیگم کے کہنے کے مطابق جنرل قاسم کے رائٹ ہینڈ مین تھے۔ کیا ان چھ ہزار قاسم کے حامیوں میں کرنل سیف نہیں ہوں گے !؟ — یہ سوچ کر میرا دل کانپ اُٹھا۔ انسانی نفسیات بھی کتنی عجیب ہے۔ چھ ہزار افراد صرف ریاضی کا ایک ہندسہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی موت اس ایک کنبے کی موت سے کہیں کم محسوس ہوتی ہے۔ جسے آپ نے نزدیک سے دیکھا ہو، جن سے آپ نے محبت کی ہو اور جن کے ساتھ اچھا وقت گزارا ہو۔

مجھے خیال آیا کاش شہزادہ اس وقت اپنے کنبے کے ساتھ پاکستان میں ہوتیں !! — یہ ملک ضرور ان کو اپنی پناہ میں رکھتا، یہ ملک جہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا، جہاں لوگوں کے پاس دو دو ٹیلی وژن اور ریڈیو سیٹ نہیں ہیں، جہاں ہر روز جشن نہیں ہوتے اور جہاں غیر ملکی چیزوں کے ڈھیر نہیں ہیں وہاں کم از کم ہر ایک کی جان محفوظ ہے، جہاں انقلاب خون کی آندھی اور طوفان بن کر نہیں، سبک رو ندی کے مانند چپکے سے آجاتے ہیں۔

میرے پاس ان کا پتہ محفوظ ہے اور وہ کارڈ بھی جو کرنل نے ہمارا شکریہ ادا کرنے کے لئے بغداد سے بھیجا تھا۔ الف لیلیٰ کا بغداد! — کارڈ میں دریائے دجلہ پہ پُل جمہوریہ نظر آرہا ہے۔ اس پہ سے گزر کر آنے والی سڑک کے ایک طرف نیا بغداد ہے اور ایک طرف پُرانا بغداد۔ ایک طرف نئی عمارتوں میں کھڑکیاں ہی کھڑکیاں نظر آرہی ہیں اور ان کے سامنے میدان میں ان گنت کاریں کھڑی ہیں۔ دوسری طرف پُرانی سرائے کے انداز کی ایک عمارت ہے جس کی محرابوں اور ستون کے اندر سے تاریکی جھانک رہی ہے۔ اونچے چپ چاپ کھڑے درختوں کے سائے میں ایک بوسیدہ سی مسجد ہے — اس کارڈ میں کرنل کی لکھی ہوئی انگریزی مضحکہ خیز ہے مگر اس سے بوئے خلوص اور وفا آتی ہے۔ شہزادہ نے مجھے کوئی خط نہیں لکھا، یہ معاہدہ پہلے ہی ہو گیا تھا کہ ہم خط و کتابت نہیں کریں گی کیونکہ شہزادہ نہ انگریزی لکھ سکتی تھیں نہ اُردو اور مجھے عربی نہیں آتی۔ میرے پاس ان کی وہ تحریر آج بھی موجود ہے جو چلتے وقت انھوں نے لکھ کر اور خود ہی ترجمہ کر کے مجھے سنائی تھی —" میں پاکستان کے یہ شب و روز اور پاکستانیوں کا خلوص و محبت کبھی نہیں بھولوں گی۔ ہم نے ان کے ساتھ بہت اچھے دن گزارے۔ مجھے "فرح" کی آئس کریم اور چائینیز کا چکن بھی بہت یاد آئے گا اور وہ اکلوتی پارٹی جو ہوٹل میں ہوئی تھی۔ اور میں پاکستانیوں کا وہ تلفظ بھی کبھی نہیں بھولوں گی جس میں وہ عید الفطر اور عید الضحیٰ کے الفاظ ادا کرتے ہیں ۔"

دل چاہتا ہے اپنا معاہدہ توڑ کر شہزادہ کو خط لکھوں اور ان کی خیریت پوچھوں، پھر سوچتی ہوں کیوں نہ میں یہ تصور کئے رکھوں کہ وہ سب خیریت سے ہیں اور خوش ہیں زندگی بھر ان سے ملنے کا امکان تو یوں بھی نہ تھا۔ پھر کیوں نہ ہم انھیں اپنے حافظے میں زندہ و سلامت رکھیں، زندگی کے لئے ضروری تو نہیں کہ جسم بھی ہمارے سامنے ہو۔

الطاف فاطمہ

عالیہ بڑی ہوگئی

مارے جلدی کے عالیہ نے بغیر چھلکا اتارے ہی آم کی کیری کو سل پر رکھ کر کچل ڈالا۔ سفیدی لیے ہوئے سبز سبز کچے آم کی مہک سیدھی اس کے نتھنوں میں گھسی اور اس کے منہ میں ڈھیر سا پانی بھر آیا جس کو متعدد گھونٹوں میں حلق سے نیچے اتارنے کے بعد اس نے مٹی میں دبی ہوئی پڑیا میں سے پسی ہوئی مرچ شکر اور نمک نکال کر کچلے میں خوب ملایا اور ایک ٹوٹی ہوئی پیالی کے نیچے کی ناند طشتری میں اٹھا لیا اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر امرود کے کچالوؤں جیسے چٹپٹے شیرے میں لتھڑی ہوئی انگلیاں چاٹ چاٹ کر چٹخارے لیتی رہی۔ خیر مئی کی تپتی ہوئی دوپہر میں کوئی بھی تو باہر نہ تھا۔ مارے تیزی کے دھوپ بالکل سفید نظر آ رہی اور باہر رکھی ہوئی سل کا پتھر آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ عالیہ نے اپنی چھلی ہوئی انگلیوں کو بغور دیکھا جو تپتا ہوا پتھر پکڑنے سے بالکل سرخ ہو گئی تھیں بس چھالے پڑنے کی کسر تھی۔ اس نے ایک بار پھر چور نظروں سے دیکھا بیچ والے بڑے کمرے کے دروازے اچھی طرح بند تھے جس میں گھر کے سب لوگ سو رہے تھے۔ دالان اور صحن میں کوئی بھی تو نہ تھا۔ فقط ایک کوا دیوار پر بیٹھا ایسی مکار آواز میں کُر کُر کر رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں سب جانتا ہوں، آج ذرا اٹھ لینے دو سب کو۔ وہ ہاتھ میں کیری کے کچلے کی طشتری پکڑے اور سر اونچا کئے ایسی بے نیازی سے دالان کی طرف چلی جیسے کہتی ہو کہہ دینا ضرور کہہ دینا میں کیا کسی سے ڈرتی ہوں۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور طشتری نعمت خانے پر رکھ کر انگلی انگلی کھٹ مٹھا کچلا چاٹنا شروع کیا۔ سائیں سائیں کر کے لو کا ایک تازہ تازہ گرم جھکڑ اس کے کانوں اور آنکھوں میں گھستا چلا گیا۔ نتھنوں منہ اور آنکھوں سے بہتے ہوئے دلچسپ پانی کا لطف لیتے ہوئے اس نے سوچا سرخ سرخ مرچوں کی بیٹھی بیٹھی چٹنی لو کا جھکڑ اور ٹھنڈا ٹھنڈا پانی، ہائے اللہ کتنا پیارا جوڑ ہے۔ سوں ہا۔ ہا اس نے اپنی جلتی جلتی سرخ زبان کی نوک کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے باہر نکال کر لہرایا۔ یہ سب ہو تو آدمی فیل ہونے کا غم بھی بھول جاتا ہے۔ دھپ چپت۔ خالد چچا کے بڑے بڑے مضبوط ہاتھوں کی ایک بھرپور دھپ اس کے دونوں کندھوں کے درمیان گردن سے ذرا نیچے پڑی اور دوسرا چپت چندیا پر لگا۔

ہائے اللہ بھی خدا کرے مر جائیں ——— ہم اور یہ ہم کا آخری ٹکڑا اس نے ضمناً لگایا تھا حالانکہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہ مستقبل قریب میں تھا اور نہ بعید میں۔ مطلب تو اس کا کچھ اور ہی تھا جو خالد چچا پر روز روشن کی طرح ظاہر تھا۔ مگر وہ اس کے مطلب سے بے پروا کھلکھلاتی ہوئی آواز میں بولے چڑیل یہاں لو میں کوڑی کیریوں کے کچلے ٹھونس رہی ہے۔ اُلٹے دو بھائی کو جوتے نہ کھلوائے ہوں تو نام نہیں۔

اوں! نام نہیں اتنا مبالغہ کرتے ہیں ایک تو کیری کا کچلا ہے کہہ رہے ہیں کیریوں کے کچلے ہیں۔ اس کو خالد چچا کے اس جھوٹ پر سخت اعتراض تھا مگر وہ بظاہر گھنی سی شکل بنائے ڈبڈبائی آنکھیں جھکائے کھڑی باقی کا کچلا جلد جلد ختم کرتی رہی۔

اے مر جائیں اللہ کرے اب ہمارے گھر میں آ کر چپکے ہیں تو کھسکنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ہر وقت جان کو آئے رہتے ہیں خود بھی فضیحتے کرتے ہیں اور گھر بھر سے فضیحتاں کرواتے ہیں۔ کون سے ہمارے سگے چچا ہیں۔ اس نے سخت روکھے پن سے سوچا۔

خالد چچا تو دادا ابا کے بھائی کے لڑکے ہیں۔ اس نے دادا ابا کو بیچ میں لا کر رشتہ کچھ اور پرے سرکا لیا ورنہ ابا تو یوں کہا کرتے تھے کہ میرا سگا چچا زاد بھائی ہے۔ سگے چچا زاد بھائی ایسے ہوا کرتے ہوں گے کہ بس ایک کے پیچھے کھٹکھٹا باندھ لیا۔ اب پڑھانے کا ارمان بھی ہے اور پڑھانے بیٹھیں گے تو چٹاچٹ ہاتھوں پر فٹے بھی مارتے جائیں گے اور گھر بھر میں یہ اعلان بھی کرتے جائیں گے، "عالیہ بڑی کوڑھ مغز ہے۔ میں کہتا ہوں بھابی اس پر تو پیسہ ضائع ہو رہا ہے۔"

اس کا کندھا پکڑ کر خالد چچا نے ایک جھٹکا دیا "چلتی ہے اندر کہ دوں ایک ہاتھ اور۔"

جی تو اس کا یہی چاہا کہ جھک کر کہہ دے کہ "دو۔ دے کر دیکھو اب کی سہی۔ مگر ٹھنڈے پانی کا گلاس اٹھانے وہ ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ مارے جلن کے کمرے کا دروازہ اتنی زور سے بند کیا کہ فرش پر یہاں تک کہ بکھرے ہوئے سارے ہی تو سونے والے کسمسا کر رہ گئے۔ خصوصاً امی جان کی تو بلی کی سی نیند تھی۔ فوراً چونک کر سر اٹھایا اور نیند میں بھرائی ہوئی گرگری گرگری آواز نکالی۔

"ارے کیا غضب ہے بھاگ ماروں ذرا کرتہ سیدھی کر لینے دیا کرو۔" امی جان بارہ بجے سے سو رہی تھیں۔

"بھابی یہ صاحبزادی تو وہیں کھڑی کیریوں کے چھلکے نوش فرما رہی تھیں۔"

پھر وہی مبالغہ۔ عالیہ نے نفرت کے مارے خالد چچا کی طرف سے منہ موڑ لیا۔

"تو لگاؤ نا۔ کھڑے دیکھ کیا رہے ہو۔" انھوں نے سر واپس تکیے پر رکھ دیا۔ "نگوڑا ایک کمرہ جس تو پنکھا ہے وہ بھی مسر مسر چلتا ہے" اور پھر انھوں نے سر اٹھا کر کھلی آنکھوں سے عالیہ کو دیکھا۔ "اے خدا تمھاری مٹی عزیز کرے عالیہ تم سے تو ناطقہ تنگ ہو گیا میرا۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ مرنا ہے تو سیدھے بھاڑ مرو۔ یہ وہ کھا کر مریں تو خدا کی قسم ہسپتال میں ڈلوا دوں گی۔"

اب عالیہ حیران رہ گئی۔ بھئی پھر آدمی کیونکر مرے سردیوں میں یہ کہہ رہی تھیں کہ نمونیہ سے مری تو ہسپتال میں پھنکوا دوں گی۔ امی کو گرم ہوتے دیکھ کر خالد چچا نے اس کو دھکیلا "اچھا چلو اب لیٹو جا کر" اور وہ پٹ سے سیدھی تکیے پر گری۔

اب امی جان اٹھ کر بیٹھ چکی تھیں۔ انھوں نے صراحی پاس گھسیٹ کر پکا آدھ سیر پانی پیا۔ پاندان کھینچ کر پان بنا کر منہ میں رکھا اور چھنگلیا میں چونا لگا کر چاٹتے چاٹتے ایک لمبی سی ڈکار لی اور پھر سیدھی ہو کر لیٹ گئیں۔

"اب کیا سوئیں گی نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ چلو جا کر وضو کر کے آؤ۔"

دادی اماں، جو بالکل سوتی نظر آ رہی تھیں، ایک لمبی سی جمائی لے کر پیر سمیٹتے ہوئے بولیں "اے خاک نماز پڑھیں گی۔ موت کو بغیر پانی پیے کھڑی ہو جاتی ہیں صاحبزادی۔ چلو تم پڑی رہو بلا سے کچھ یوں ہی تمھارا دف مرا رہے گا۔" اب عالیہ اس ششں و پنج میں تھی کہ پڑی رہے یا امی جان کے کہنے پر وضو کرے جا کر

"کمبخت ہڑ دنگی ہے۔ گھوڑی نہیں تو۔ بھلا غضب خدا کا لڑکے تک سو رہے ہیں اور یہ بلا چلچلاتی دھوپ میں گھوم رہی ہے" امی جان بڑبڑاتی چلی گئیں۔

"میں کہتا ہوں بھابی یہ لڑکی کبھی بڑی بھی ہو گی۔" خالد چچا نے اوندھے لیٹ کر تکیہ پیٹ کے نیچے اڑاتے ہوئے تشویشناک لہجے میں کہا۔

"بس تم اسی حسرت میں رہنا بڑی کب ہو گی۔" عالیہ سے ضبط نہ ہو سکا اور بڑبڑائی۔

"چپ نالائق چچا سے زبان لڑاتی ہے۔" امی جان نے ڈنڈی کے بجائے کھجور کا پنکھا دیا اس کی پیٹھ پر۔

"اے تو اب بڑے ہونے میں کیا رہ گیا ان کے ساتھ کی لڑکیاں بیر پڑ لگا سی ہو گئیں ان کو اپنے ہڑدنگے پن میں خوش نہیں۔ دہی گھسی گھسائی نظر آتی ہیں۔" دادی اماں کو اس کے یوں گھس گھس کر بڑھنے پر سخت اعتراض تھا۔

"خدا تمھارا بھلا کرے رجب کے چاند تیر...."

امی جان ہمیشہ یہیں پر آ کر دادی اماں کی بات کاٹ دیا کرتی تھیں۔ "اے میں میں کہتی ہوں خالد کل اتوار ہے ذرا پنکھے کی صفائی تو کروا لو تمھارے بھائی تو کسی بات کی خبر نہیں لیتے۔" دراصل امی جان عالیہ کے ابھی سے بڑے ہو جانے کی حمایت میں نہ تھیں۔

اب یہی تو عالیہ کی مشکل تھی کہ بڑے لوگ طے ہی نہ کر پاتے تھے کہ اس کو بڑا ہونا چاہیے یا اپنی جگہ پر برقرار رہے۔ خالد چچا دن بھر میں کئی مرتبہ یہ سوال اٹھاتے

"نہ جانے یہ لڑکی بڑی کب ہو گی۔"

دادی اماں کا خیال تھا کہ نہیں خوب بڑی ہیں۔ اس عمر کی لڑکیاں بچوں کی مائیں بن جاتی ہیں۔ ایک یہ ہیں کہ اپنی عمر سے دو سال چھوٹی نظر آتی ہیں۔ اے بھی ہڑدنگے پن میں نہ کھانے کا ہوش ہے نہ پہننے کا ایسے بچے کی بڑھوتر آپ سے آپ رک جاتی ہے۔ اے ہم تو دس سال کی عمر میں پوری عورت نظر آتے تھے

" اے ہے جیئے دن بچہ نظر آئیں غنیمت ہیں۔" امی جان زیر لب بڑبڑائیں "عورت نظر آنا کچھ آسان ہے آج کل تو جوان لڑکی کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے" امی جان ہر بات ہی میں پست ہمت تھیں دنیا کی جوان لڑکیوں کو سنبھالنا تو تھی دور وہ تو بس اس خیال ہی سے لرز جاتی تھیں۔

گھنٹہ بھر تک جامن کے پیڑ پر ٹنگے رہنے کے بعد وہ نیچے کودی تو ہاتھوں میں جگہ جگہ کھرونچے لگے تھے۔ شلوار اور قمیض پر اودے اودے دھبوں سے گلکاری ہو رہی تھی اور دبلے پتلے سے چہرے پر لٹوریاں جھول رہی تھیں۔ گلے پر پڑی ہوئی دوپٹے کی جھولی میں کالی کالی جامنیں تھیں۔ اس نے چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور اندر آگئی۔ انگنائی کے مغربی کونے میں دادی اماں کی نماز والی چوکی پر دونوں پیر پھیلا کر بیٹھنے کے بعد اس نے تام چینی کے پیالے میں پڑی ہوئی جامنوں اور نمک کو جھٹکنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی خالد چچا کی سائیکل ایک سڑاکے سے اندر گھسی اور انھوں نے اونچی آواز میں کہا۔

" کہاں گئی یہ عالیہ کی بچی! آج پھر جامن کے درخت پر چڑھی تھی۔"

اس کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا لیکن بدستور مزے سے جامنیں جھٹکتی رہی اور امی جان مارے غصے کے بغیر چپل پہنے ہی دالان کے در میں آکھڑی ہوئیں

" کیوں عالیہ ذرا ادھر تو آؤ " اور پھر ایکدم غضبناک ہو کر چلائیں۔ " کم بخت مسہرے ٹانگیں چیر کر بیٹھنا کس نے بتایا ہے۔ میں کہتی ہوں تو اٹھنا بیٹھنا بھی سیکھے گی کبھی!"

" میں کہتا ہوں یہ کبھی بڑی بھی ہو گی۔" خالد چچا مایوس آواز میں بولے ان کی آواز سن کر اچانک ہی امی جان کو یاد آگیا

" اے بھئی خالد۔ آج تم اسٹیشن جاسکتے ہو "

" کس واسطے!" خالد چچا نے سائیکل جامن کے سائبان کے نیچے کھڑی کر کے اپنا بوسف کیس سنبھالتے ہوئے کہا۔

" زہرہ کو لانا تھا۔"

" زہرہ کون ؟"

" بڑی خالہ کی نواسی ہے نا وہ آئے گی۔"

" اکیلی آئے گی ؟"

" نہیں اس کے دونوں بھائی ساتھ ہیں۔ مگر وہ سیدھے چلے جائیں گے۔ وہ یہاں اترے گی۔"

" زہرہ آپ کی خالہ کی کون سی نواسی ہے۔" خالد چچا سوچ میں پڑ گئے۔

" اے ہے وہی سب سے چھوٹی۔ اے تمھیں شاید یاد نہیں ہماری عالیہ ہی کے برابر ہے جن دنوں تمھاری شادی ہوئی تھی تو خضر آباد آئی ہوئی تھیں تو یہ چھوٹی سی ساتھ تھی۔"

اپنی شادی کا نام سن کر خالد چچا کی آنکھوں میں آنسو تیر نے لگے۔ حسنی کی معصوم دلہن سی مرجھائی ہوئی شکل ان کی آنکھوں میں گھوم گئی اور کتنے ہی دن بعد ان کو مسعود کا خیال آیا جو اب اپنی نانی کے پاس پل رہا تھا۔ اچھا ہاں کل اس کا منی آرڈر بھی بھیجنا ہے۔ وہ چونکے۔

" ہاں تو پھر پونے ساڑھے چھ بجے گاڑی پہنچتی ہے۔"

خالد چچا دل ہی دل میں برا مان گئے ، اسے وہ ٹانگہ برابر کی چھوکری اور میں اس کو اسٹیشن لینے جاؤں۔ " بھابی آج مجھے کام ہے ملایا سے جو وفد آیا ہے آج اس کا انٹرویو لینے جائیں گے پریس کے نمائندے۔ آپ منظور کو بھیج دیجیے۔"

"اسے منظور تو ایسا غیر ذمہ دار ہے۔ خیر اچھا اسی کو بھیج دوں گی۔"

درمیانہ قد گداز بانہوں والی گوری چٹی تندرست زہرہ کو دیکھ کر عالیہ کو یقین نہ آیا کہ اس کی اپنی عمر کی ہے اور پھر اس کے اٹھنے بیٹھنے اور کام کے انداز میں جو رعنائی اور سگھڑاپا تھا وہ کسی سولہ سترہ سال کی لڑکی سے کم نہ تھا

"دیکھا! ہم کیا کہتے تھے۔ کہ تم ننھی نہیں ہو" دادی اماں نے چپکے چپکے عالیہ کو ٹرنس ڈالا۔

"اوں! سب جھوٹے یوں ہی مجھے بیوقوف بنانے کو کہتی ہیں۔" امی جان سامنے نہ ہوتیں تو عالیہ دادی اماں سے اچھی خاصی زبان چلا لیتی تھی۔

"اے ہم تو جھوٹے ہیں تم اپنی ماں سے پوچھ لو۔" دادی اماں کی آواز روز بروز مردانی ہوتی جا رہی تھی۔

اور جب اس خبر کی تصدیق ہوگئی تو عالیہ کو واقعی ہوش سا آگیا۔ اس کو اپنی کمتری کا احساس بھی ہوا اور ملال بھی کہ یہ امی جان اور دادی اماں کو غیر سنجیدگی کا سارا قصور ہے۔ ہر وقت کہتی تھیں ننھی ہے، ہڑونگی ہے اور واہگنی ہے، بلا ہے اور ان الفاظ کو کچھ ایسے تمسخر آمیز لہجے میں ادا کرتیں کہ وہ ان سب باتوں کو تعریفی سمجھ سمجھ کر اور بھی زیادہ لونڈا اور ہڑدنگی ہوتی چلی گئی۔ یہ سب کہنے کے بجائے مجھے زہرہ کی طرح پالتیں تو میں بھی ایسی پیاری پیاری نکل آتی جیسی یہ ہے کہ دل چاہتا ہے دیکھے جاؤ۔ زہرہ پوری بڑی لڑکیوں کے سے بکل اور خوش وضع کپڑے پہنتی۔ رنگین اور سفید شلواریں، خوبصورت پرنٹ کی باقاعدہ سی ہوئی قمیص چنے ہوئے خوش رنگ ڈوپٹے اور بڑی بڑی لڑکیوں کی سی نازک چپلیں۔ چمکدار گھنیرے بالوں کی موٹی سی ڈھیلی ڈھیلی چوٹی۔ کہاں وہ اس کی کانوں کے قریب کس کس کر گوندھی ہوئی دو چوٹیاں اور پھر بھی منہ پر لوٹتی ہوئی لٹوریاں۔ ڈھیلی ڈھالی قمیص یا اُچکی اُچکی شلواروں پر اونچی اونچی فراکیں وہی عالیہ جو اب سے دو چار روز پہلے تک اپنے کو بے عیب اور بالکل ٹھیک ٹھاک لڑکی سمجھتی تھی۔ اب اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ مارے شرم کے زمین میں گڑ جائے ٹھیک تو کہتے ہیں خالد چچا۔ آخر میں کب بڑی ہوں گی۔ اسے کہیں میں بونی نہ رہ جاؤں۔ وہ الماری میں لگے ہوئے آئینے میں اپنے سراپا کو دیکھتی۔ مگر نہیں قد تو زہرہ سے کچھ ہی دبتا ہوا ہے۔ بس ایک تو جسم بالکل کھپچی سا ہے اور کچھ دکھاوا بالکل چھوٹا چھوٹا سا ہے۔ کم بخت خدا سمجھے زبیر اور داؤد کو ان سے کھیل کھیل کر اور میرا ناس ہوگیا۔ اب وہ اپنے لونڈے پن کا سارا الزام اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو دیئے بیٹھ گئی تھی۔

اکھٹ۔ دکھٹ۔ تکھٹ زہرہ گوری اور گداز کلائیوں میں پھنسی ہوئی سرخ اور سبز چوڑیوں کی ہلکی ہلکی سی چھن چھناہٹ کے ساتھ گٹے کھیلنے میں مشغول تھی۔

"ہل گیا ہل گیا۔ جناب۔" عالیہ نے حسب عادت اپنی چیختی آواز میں شور مچایا۔

"واہ جناب یہ تو کچے نکلے ہیں۔ پکوں میں نہیں ہلنا چاہیے۔" زہرہ نے چھوٹا گول پتھر فضا میں اچھالا اور فرش پر بکھرے ہوئے تین پتھر سٹ اپنی مٹھی میں سمیٹ لیے۔

اس کی مشاقی پر عالیہ کا دل جل رہا تھا وہ ہر بات ہی میں ٹھونٹھ تھی۔

بمشکل تو اس کی باری آئی اور جوں ہی اس نے فضا میں گٹہ اچھال کر باقی کے پتھر سمیٹنا چاہے خالد چچا کے مضبوط ہاتھوں کی انگلیاں اس کی گردن میں پیوست ہوتی چلی گئیں۔

"چڑیل! بھتنی! میری تیار رپورٹ کے کاغذ نکال کر اپنی کاپی پر چڑھا لیے۔ چل تو سہی آج بھیا سے پٹواؤں گا۔"

"ایں۔ آں۔ مر جائیں ..... مر جائیں اللہ کرے ...... ہم ...... اُدھر سے کوستی ہے کبھی میرے کاغذ چھوئے تو ہاتھ توڑ کے پھینک دوں گا۔"

عالیہ کی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں نے ایک لمحے کو زہرہ کی طرف دیکھا جو اپنی شفاف اور بلا وجہ ہی شرمائی آنکھوں سے خالد چچا کے غصیلے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ گھر آئی ہوئی لڑکی کے سامنے ایسی بے عزتی۔ مر جائیں اللہ کرے خالد چچا جیسے ان کی بیوی مر گئیں ایسے ہی یہ بھی مر کر ختم ہو جائیں۔ اس کے دل نے صاف

صاف نام لے کر کر سا اور جو نہی خالد چچا کمرے سے نکل کر گئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایسے کم بخت ہیں۔ یہ زہرہ کی آنکھوں میں زبردست تجسس تھا اور وہ مسکرا رہی تھی " اے عالیہ یہ ہیں کون تمہارے سگے چچا تو ہیں نہیں۔"

" ہمارے کیوں ہوتے سگے چچا۔ دادا ابا کے بھائی کے لڑکے ہیں "

" تو یہ تم پر سارے وقت رعب کیوں جماتے ہیں۔ یہ تو اپنا کھاتے کماتے ہیں شادی کر کے اپنے گھر کیوں نہیں رہتے " زہرہ ذہنی طور پر بھی عالیہ سے بہت بڑی تھی۔

" خاک اب ان کی کیا شادی ہوگی۔ " وہ آگے کھسک کر سرگوشی میں بولی " پتہ ہے تم کو یہ بیوہ ہیں۔ بیواؤں کی شادیاں کب ہوتی ہیں۔ "

" بیوہ! زہرہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ بیوہ تو عورتیں ہوتی ہیں۔"

" اور مرد بیوہ کیا کہلاتے ہیں۔" عالیہ اب درحقیقت اپنی معلومات میں ہر قسم کے اضافے کرنا چاہتی تھی۔

" بھئی ان کو تو رنڈوے کہتے ہیں۔"

" اے بھئی ہٹو تم تو گالیاں بک رہی ہو۔"

" زہرہ ہنسی کے مارے لوٹ گئی۔ " بھئی تم تو بالکل ہی پگلی ہو۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ " وہ خالد چچا کے موضوع میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے بولی " یہ تمہارے یہاں کیوں پڑے رہتے ہیں۔" " پڑے کہاں رہتے ہیں گھوما کرتے ہیں۔ بھئی دیکھو جب چچی مریں نا تو مسعود کو تو اس کی نانی اماں لے گئیں اور کچھ دنوں بعد یہ صاحب بیمار پڑ گئے۔ جب ابا ان کو دیکھنے گئے تو بالکل بخار میں بیہوش مرنے کو پڑے تھے۔ اس دن سے ابا ان کو یہاں لے آئے۔ بس اب یہ یہیں رہیں گے " عالیہ کے لہجے میں یاس اور صبر کی ملی جلی کیفیت تھی۔

اس نے ذرا دیر ٹھیر کر کہنا شروع کیا۔ حسنی چچی اتنی پیاری تھیں۔"

" کیا بہت خوبصورت تھیں۔ " زہرہ کی آواز کچھ گھٹی گھٹی سی نکلی۔

" نہیں تو مگر بہت پیاری لگتی تھیں۔ ہر وقت ہنستی رہتی تھیں۔ اور وہ بڑی والی گڑیا انھوں نے ہی تو مجھے دی تھی۔"

" اور مسعود۔ وہ کیسا ہے۔"

" مسعود تو داؤد سے کچھ چھوٹا ہے۔ پچھلے سال لائے تھے اس کو یہاں۔ اس کے تو خوب لاڈ کرتے ہیں۔ وہ تو ان ہی کی طرح ہے بالکل۔ صورت میں۔"

" پھر تو خوبصورت ہوگا۔ "

" خاک خوبصورت ہیں۔ ہر وقت تو گھورتے گھورتے رہتے ہیں۔ کالے تو ہیں۔"

" واہ کالے کب ہیں پگلی اس کو تو گیہواں رنگ کہتے ہیں اب کوئی تمہاری طرح پھیچ گورے ہو جائیں اور آنکھیں تو دیکھو کتنی خوبصورت ہیں۔ جب گھورتے ہیں تو کتنے پیارے لگتے ہیں۔" زہرہ کی اپنی آنکھوں میں اتنی پر اسرار سی روشنی اور چمک آگئی کہ عالیہ سٹ پٹا گئی۔

خالد چچا اتنا دلچسپ موضوع تو نہ تھے کہ انسان ان ہی کی باتیں کیے جائے خصوصاً جب زہرہ جیسی لڑکی گھر میں موجود ہے جو دنیا بھر کی نقلیں اتارنے میں ماہر ہو۔ بے شمار فلمی، گانوں اور شادی کے گانوں کا پشتارہ ہے اور کمرہ بند کر کے ٹھمک ٹھمک کر ناچنے میں ماہر ہونے کے علاوہ کانوں میں ایسی ایسی باتیں کرتی ہو کہ سنتے سنتے ہی جسم میں جھرجھری آجائے۔ ان دنوں زہرہ کی مصروفیت میں عالیہ کے ہڑونگے پن میں خود بخود کمی آگئی تھی اور یہی وہ زمانہ تھا جب خالد چچا پر انٹرویوں اور کانفرنسوں کی بھرمار ہوگئی۔

" توبہ نہ معلوم بھئی یہ الم غلم کون سے گیا۔ " خالد چچا ٹائپ کرتے کرتے جھنجھلائے اور داؤد کو ڈانٹنا شروع کیا۔

"مجھی کو ڈانٹ رہے ہیں۔ صبح آپ کے کمرے میں عالیہ باجی اور زہرہ آپا تلاشی لے رہی تھیں۔ ربر عالیہ باجی کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔" داؤد بڑبڑایا۔ جو خالد چچا کی فرمائش پر بیٹھا ان کے اخباروں کے فائل درست کر رہا تھا۔ تن تناتے ہوئے خالد چچا اس چھوٹے کمرے کی طرف لپکے جس میں آج کل وہ اور زہرہ تمام دوپہر گھسی رہتی تھیں۔ اندر سے گھنگھروں چھنکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ خالد چچا نے غصے سے دروازے پر ہاتھ مارا اور اندر گھس گئے زہرہ پاؤں میں گھر بھر کی چابیوں کے گچھے باندھے کسی کلاسیکل نما رقص کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اور عالیہ مسحور ہو کے تماشے میں غرق بیٹھی تھی ایسی کہ اس کو خبر بھی نہ ہوئی۔ ان کے گھسنے کی۔

زہرہ نے ان کو گھستے دیکھا۔ گنجیوں والا پاؤں ویسا ہی اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ نازک اور لہرائی ہوئی سرخ سبز چوڑیوں والی گداز کلائی کی رہ گئی۔ اس نے ایک بھرپور نگاہ ان کی طرف ڈالی اور آہستہ سے نظریں جھکا لیں۔ خالد چچا پھر سٹ پٹا سے گئے ایسا کہ عالیہ کی گوشمالی کا جو ارادہ وہ دل میں لے کر چلے تھے وہ ملتوی کرنا پڑا۔

بھئی عالیہ تم میرا انک ربر کیوں اٹھا لائیں۔" انھوں نے بڑے لحاظ سے کہا۔

عالیہ نے ان کے لحاظ کا فوراً فائدہ اٹھایا اور نہایت بدتمیزی سے کہا۔ "وہ پڑا ہے میز پر اٹھا لیجیے۔"

اور جب ربر لے کر وہ باہر نکل رہے تھے تو انھوں نے زہرہ کو کہتے سنا "ہائے اللہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ لڑکیوں کے کمرے میں بلا کہے سنے گھس آئے۔ اور گھور کیسے رہے تھے۔" اس کی آواز لجیائی ہوئی تھی۔

"وہ ایسے ہی گھورا گھورا کرتے ہیں۔" عالیہ نے ہمیشہ کی طرح جھلساتے لہجے میں کہا۔

اس شام خالد چچا نے بھابی کی عدم موجودگی میں دادی اماں سے کھسر پھسر کی۔

"چچی جان بھئی یہ زہرہ تو بڑی پکی لڑکی ہے۔ اپنی عالیہ تو ایک بیل ہے"

"اے ہاں بھئی ہماری دلہن کے میکے میں بڑی آزادی اور راحت سے لڑکیاں پالی جاتی ہیں جب ہی تو وقت سے پہلے جوان ہو جاتی ہیں۔" دادی اماں ایسی باتوں میں حصہ لینے کو ہر وقت تیار رہتی تھیں۔

اور اب عالیہ کو اپنی کمتری کا پورا احساس ہوا جب اس نے محسوس کیا کہ وہ فضول میں ہی خالد چچا سے دبتی چلی آتی رہی ہے جبکہ زہرہ جو کہ خالد چچا کی بھتیجی بھی نہیں آنکھیں مٹکا مٹکا کر ان کا بات بات میں مذاق اڑاتی ہے اور وہ چپ کے چپ رہ جاتے ہیں۔ ان کی چیزیں چھپا دیتی ہے اور جب تک ٹافیاں وصول نہیں کر لیتی ہرگز ان کا پتا نہیں دیتی۔ اس دن ان کی البم دیکھنے بیٹھی تو ساری تصویریں بکھیر دیں۔ مسعود کی تصویر کا کونہ توڑ دیا اور یہ بات تو عالیہ کو سخت بری لگی کہ حسنی چچی کی تصویر دیکھ کر جانتے بوجھتے بولی۔

"اے یہ کون صاحبہ ہیں آنکھیں تو دیکھو بالکل ٹیڑھی ہیں۔"

حالانکہ ان کی ساری صورت میں ان کی مسکراتی ہوئی آنکھیں ہی تو پیاری تھیں۔

اور خالد چچا مزے سے اپنی کرسی سے پیٹھ لگائے فرش پر پیر پھیلائے چپکی چپکی آنکھوں سے اس کو دیکھنے اور سگرٹ پہ سگرٹ پیتے رہے۔

اور جو اس کی جگہ بھی ہوتی تو گھر بھر میں غدر مچا دیتے، عالیہ نے ملول ہو کر سوچا۔ پر ایک بات تھی کہ اس نے زہرہ کے دن رات کہتے رہنے پر آج جو غور سے دیکھا تو خالد چچا کی گھورتے رہنے والی غصیلی آنکھیں اس وقت واقعی بڑی پیاری نظر آ رہی تھیں۔ اور بھئی زہرہ کا تو یہ تھا کہ چاہے وہ عالیہ داؤد کو غصہ ہی میں کیوں نہ گھور رہے ہوں۔ ان کی پیٹھ مڑتے ہی اچھی خاصی اونچی آواز میں کہہ دیا کرتی تھی "ہائے اللہ کیسی عجیب آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں اچھا نہیں لگتا" اب جو یہ ادھر اتنے آدمی بن گئے ہیں اور گھورنا گھورنا کم کیا ہے تو شاید اپنی تعریف سن سن کر ٹھیک ہوتے جا رہے ہیں۔ اے بھئی زہرہ بڑی کام دار ہے، اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ اس طرح اپنے مخالفوں کو ٹھیک کرتے ہیں ورنہ یہ تو ان میں کے تھے کہ اس کے بھی چٹکیاں لگاتے اور فضیحتے بکھیرتے۔

اور جب زہرہ واپس گئی تو اس مرتبہ خالد چچا کو اس کو اسٹیشن چھوڑ کر آنے میں کوئی عذر نہ ہوا۔ زاہد کسی وفد کے انٹرویو میں جا نکلا وہ اور عالیہ بڑی دیر اس ڈبے کے پاس کھڑے رہے تھے جس میں وہ بیٹھی تھی۔ خالد چچا نے اس کو اور اس کے طفیل میں عالیہ کو آئس کریم کھلائی تھی۔ کولڈ کافی پلائی تھی۔ اس کے ساتھ ٹوکری سنترے لئے تھے اور اس کی پسند کے مطابق کو لمبے کر دینے کے علاوہ کسی ہندوستانی فلم کے گانوں کی ٹیپ بھی لے دی تھی۔

عالیہ ٹک ٹک یہ سب دیکھ رہی تھی۔ زہرہ کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں بڑی بڑی لڑکیوں کی سی رونق اور چمک تھی

کئی دن خالد چچا نے بار بار کہا "بھئی زہرہ تو بڑی رونق کی لڑکی تھی سناٹا کر گئی۔"

اور پھر جب زندگی اپنے معمول پر آ گئی تو شام کو حساب سکھاتے سکھاتے خالد چچا نے ٹیپ لگا کر اس کو گھورا۔

"نامعقول کہیں کی، ضرب بھی غلط دیتی ہے۔"

عالیہ نے ان کی گھورتی ہوئی غصیلی آنکھوں کو دیکھا اور زہرہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

"ہائے اللہ کیسی عجیب آنکھوں سے گھورتے ہیں بھئی ہمیں" عالیہ کی آنکھیں عجیب انداز سے نیچے جھک گئیں اللہ اپنے ڈوپٹے کا پلو مروڑتے ہوئے دھیرے سے بولی "ہائے اللہ کیسے عجیب طرح دیکھتے ہیں۔ بھئی ہمیں نہیں اچھا لگتا۔"

ایک دم ہڑبڑا کر خالد چچا کھڑے ہو گئے اور عادتاً انھوں نے آواز دی "سن رہی ہیں اب بھابی"

"کیوں کیا ہے!" ان کو معلوم تھا کہ ضرور عالیہ کا کوئی دکھڑا ہے مگر اب وہ یہ سوچ رہے تھے کہ بھابی کی بات کا کیا جواب دیں کیا ان سے یہ کہیں کہ عالیہ بڑی ہو گئی۔

حامد و اصغر

دہانِ زخم

جب ممدو دودھ والے نے آ کر دروازے پر دستک دی، اور دودھ سے بھری پتیلی کی گاگر سیڑھیوں پر ٹکا دی، تب اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھ کھولی، مگر آج دن کی گلابی روشنی میں ڈھلتا سُرمئی آسمان، آنکھ کھلنے پر چکرایا نہیں، نیم اور سنبل کے درخت بھی چپ چاپ اس کے قریب کھڑے رہے، پہلے کی طرح اس پر جھکے نہیں۔ ممدو نے ایلمونیم کے بڑے دیگچے میں دودھ اُنڈیلا اور گاگر سر پہ اُٹھائے چل دیا۔ پھر اخبار والا دوسرے پھاٹک سے تیزی سے سائیکل چلاتا آ گیا۔ سُرخ برآمدے میں اخبار پھینک آن کی آن میں خورشید احمد ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور کی کوٹھی میں پہنچ بھی گیا۔ سڑک پہ سائیکلوں، موٹروں، ٹانگوں اور انسانوں کا سلسلہ ہولے ہولے تیز ہو گیا۔ الگ الگ آوازیں ایک دوسرے میں گھل کر شور بن گئیں۔ ایک دھڑکتا انتشار جو اس کے جسم میں دھڑکتی نبضوں کی تال پہ سانس لے رہا تھا۔

باورچی خانے سے کسیلا دھواں اُٹھنے لگا۔ آٹے کی پرات ٹھک ٹھک اُٹھ کر فرش سے بج رہی تھی۔ (ابھی ہو گئے کوئوں جھنڈوں کی طرح آٹا گوندھنے پہ لوٹ کے گی۔ لپکے پرات کے پرخچے اڑا دیئے ہیں) دھوئیں کا کسیلا پن موتیے کی خوشبو میں گھل گیا اور یہ گھلی خوشبو کوارٹروں کے قریب حوض میں گرنے والے نل کی موٹی دھار کے شور میں ڈوب گئی۔ اندر کمرے بھی جاگ اُٹھے تھے۔ گزری رات کا احساس دن کے اُجالے میں ہولے ہولے ڈھل رہا تھا۔ یک دم اس کے خالی کمرے کے ساتھ چپکے پیٹ میں پھر کڑوی جلن کی لہر اُٹھی — دانت بھینچ کر اس نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں۔ آج اس کا سر چکرا نہیں رہا تھا۔ مگر وہ پہلے دنوں کی طرح حوض کے نل پہ منہ دھونے نہیں گیا۔

"اساں چن توں گواہ کیتا ۔" کما۔ پتیل کی تھالی میں دوہرا کیا ہوا پراٹھا اور چائے کی پیالی اس کے سرہانے رکھ کے چلا گیا۔ گھی کی خوشبو سے اس کی آنتیں جل اُٹھیں۔ اس نے چارپائی کی پٹیوں کو پکڑ کر اُٹھنا چاہا — مگر ایک سیاہ بوجھ اس کے سینے پہ جھک آیا۔ (حرکت اور سمتیں سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ صرف بوجھ باقی تھا) اس کا دل رُک گیا۔ اور ایک سرد سنسنی سے تمام جسم جھنجھنا گیا۔

اس سیاہ بوجھ کا خطرہ اُسے کچھ عرصے سے تھا — مگر یوں انجانے میں وہ اس کی لپیٹ میں آ جائے گا — اس نے کبھی آج تک سوچا بھی نہ تھا۔ سوچ کا یوں بھی شروع ہی سے اس کی زندگی میں کوئی دخل نہ تھا۔ ورنہ لائل پور کا گھنٹہ گھر، کچہری بازار اور دھوبی گھاٹ اور منشی محلّے کی پتلی پیچ در پیچ گلیاں وہ اتنے اطمینان سے چھوڑ کر یہاں نہ آ بستا۔ جب اچانک ہی اس نے خان حمید احمد خان جج کی اردلی گیری چھوڑنے کی ٹھانی تھی تو بھائی صاحب نے حسبِ عادت اس کی سہل پسندی کو خوب خوب کوسا تھا۔ خود اس کی سمجھ میں بھی نہ آیا تھا کہ وہ اس بھرے پُرے شہر کی مٹی کو چھوڑ کر بھلا انہی بھائی صاحب کے در پہ کیوں جا پڑے گا جو ہمیشہ سے اس کی نحوست ماری طبیعت کا رونا روتے آئے ہیں۔ مگر اب جو چپ چپاتے اس کے اندر ایک گہری ہوک سی اُٹھنے لگتی تھی وہ ان سب چیزوں سے زیادہ کھٹور تھی۔ اور اس سے بچنے کے لئے تو وہ دنیا کے آخری کنارے تک بھاگ سکتا تھا۔

اس شہر کے چھُٹنے سے کیا کچھ چھٹے گا، اگر وہ یہ کچھ سوچتا تو شاید اسٹیشن ہی سے پلٹ آتا۔ کمپنی باغ، زراعتی کالج کے پلاٹ،

اور بھوانہ بازار میں بھولا حلوائی کی دکان۔ اور بازاروں میں ریڑھیوں پر بیٹوں کے حساب سے بکتا پلاؤ اور دتے حجام کی دکان اور کچہری کے باہر جانے پہچانے عرضی نویس، اور انجان انسانوں کا ہجوم، اور اس کے علاوہ خاندان کے بہت سے لوگ جو بے شمار گلیوں میں بھرے پڑے تھے۔ گو بھائی صاحب نے اس کو بیسیوں مرتبہ ہی ٹوکا تھا کہ یوں ہی آوارہ سب کے گھروں میں نہ جایا کرے۔ مگر دل کی ہوک نے ساتھ ساتھ اس کے پاؤں میں بھی چکر بھر دیا۔ اپنے تنگ صحن اور نیلے فرش والے کوارٹرز سے نکل کر بچوں سے کھیلاتے اپنے تاریک کھوڈ گھوڈ صحنوں والے مکانوں کا دن میں ایک آدھ چکر لگانے لگ جاتا ہے۔ بنیاد تو ہوار ہو جاتا۔ شیخ عطا اللہ۔ بہن زینب — اور شیخ کرم دین اور ماسی صرلنٹ (اب بھی یہ سوچ کر اسے ہنسی آ گئی کہ نہ جانے اصل نام ماسی کا کیا تھا) — تو اس کے لمبوترے چہرے اور جھکے جھکے بھاری پپوٹوں پر تعلقانہ خیمہ سجتا۔ پھر پھری سی ہو کر تھوڑا آ بیٹھا۔ بھائی غلام محمد کا بائیں توڑی شاہ کا مجاور تھا اور ہر جمعرات گزر جانے کے بعد بتاتا تھا کہ رات ہی اس نے یہ سب کچھ خواب میں دیکھا تھا۔ بھائی غلام محمد کے ساتھ ہر شام تکیے پر اس کی ملاقات ہوتی جہاں وہ یوں تو قوالی سننے جاتا تھا مگر چند قدم پرے ہی جینے کا منہ دھرا تھا۔ جہاں جینے کی جوان بیوی اپنے مہندی رنگے ہاتھوں سے روٹیاں لگانے لگی تھی۔ سورج ڈھلے وہ اپنے حنائی ہاتھوں سے تندور سے تھوڑی تھوڑی روٹیاں نکالتی۔ ان کی سوندھی مہک چاروں طرف پھیل جاتی اور تکیے پر لال خاں قوال "اودے سدی کلی یار دی کھڑ بیا" — بار بار الاپتے — اور تندور اور لالٹین کی سرخ روشنی میں جینے کی ووہٹی بیٹی کی دوہری بکل مارے دیگچے میں سے پیتل کی تھالی رکابیوں میں دال نکالتی۔ اور کھانے کے انتظار میں بیٹھے انسانوں کی خواہش بھری آنکھیں چمکنے لگتیں۔

اس منظر کے ساتھ اس کا دن ختم ہو جاتا۔ بڑے اطمینان سے حقے کا آخری کش لے کر وہ گھر کی طرف ہو لیتا۔ جینے کی بیوی کی گداز باہوں میں پھنسی کانچ کی چوڑیاں کنکھیوں سے دیکھتا، انجانے ہی میں کھنکھارتا وہ باغ کی سیڑھیاں اترنے لگتا۔ گھاس پر بچھی نلیوں میں سے پانی سرسر بہتا چاروں طرف پھیلتا جاتا۔ بچے پائنچے چڑھائے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوتے۔ سامنے دھوبی گھاٹ میں دو منزلہ مکانوں کی بتیاں، چھتوں سے چھن چھن کر زمین پر گرتیں اور گلیوں میں بندھی چمکتے سیاہ رنگ اور تنی جلد والی بھینسیں اور کھڑے — اور چارپائیوں پر اونگھتے، پنکھیاں جھلتے لوگ اور ان سب کے اوپر پھیلی وسیع رات — بھولا حلوائی کی دکان سے کہنی برابر گلت کے گلاس میں کڑاہی کا دودھ پی کر، شانے پر رکھے تولیے سے منہ پونچھتا وہ آخری گلی میں ٹھہرتا اور چارپائی پر لیٹ کر اسے لال خاں قوال کی دھن میں "اودے سدی کلی یار دی" — تک الاپنے کی مہلت نہ ملتی۔ موت ایسی سیاہ بوجھل نیند اس کو تنکے کی طرح بہائے جاتی۔

دوسرے تیسرے دن بھائی صاحب کا ملامتوں بھرا خط اسے مل جاتا۔ "شیخ عطا اللہ کے خط سے معلوم ہوا ہے تم نے پھر بے فکری کی چھٹی لے لی ہے۔ اپنی عزت کا نہیں تو کچھ ہماری ہی عزت کا خیال کرو۔ کیوں تمام دن لوگوں کے گھروں میں مارے مارے پھرتے ہو۔ اتنی گرمی میں دوپہروں کو سڑکوں پر گھومنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آرام سے گھر بیٹھا کرو۔ اپنی عقل نہیں تو کسی کمبخت کا کہنا ہی مان لیا کرو۔ وغیرہ وغیرہ" شروع دن ہی سے ایسی باتیں سن سن کر اب وہ وقت آن پہنچا تھا کہ لفظ خالی آوازیں بن کر رہ گئے تھے۔

اب وہ بھلا بھائی صاحب کو یہ کیونکر سمجھا سکتا تھا کہ گرمیوں کی یہ سناٹے بھری دوپہریں، پگھلتی کولتار سے تپتی سڑکیں اور گلیوں میں سڑتے آم خربوزوں کے چھلکے جلد کی طرح اس کے وجود کے گرد تنے ہیں۔ لہٰذا وہ بھائی صاحب کی بات کا کچھ خیال نہ کرتا۔ دراصل لوگوں کو اس سے ایسی عجیب و غریب توقعات تھیں کہ کبھی کبھی اسے ہنسی آ جاتی۔ وہ جب بھی شیخ کرم دین کے گھر، اندھیری سیلی ڈیوڑھی

میں حقہ لیکر جا بیٹھتا، کرم دین ناک پر ڈھلک آنے والی عینک کو اونچا کرکے، کھنکار کے گلا صاف کرتا۔

"میدے یار، انگریزی دوائیوں میں اچھا خاصہ کیمیا مل سکتا ہے۔ ایمان سے تو ذرا سا — میرا مطلب ہے کہ ذرا آدمی جوان ہوتا تو تیرا بیاہ کروا دیتا —" وہ اپنے گنجے چمکتے سر پہ ہاتھ پھیر کے ،بچے کھچے دانت نکال کر کہتا۔ کرم دین کو تنا دیکھ کر اُسے خواہ مخواہ ہنسی آجاتی ماسی مہرنشا صحن میں چولہا پھونکتے پھونکتے نوک جاتی۔ اور دوپٹے سے آنکھیں مل کے کہتی۔ (جب وہ دوپٹے سے اپنے بھرے بھرے پپوٹے ملتی تو اس کے دانت جانے کیوں کھلکھلا اُٹھتے۔)

"لو اور سنو — جو کوئی آتی مصیبتوں کو روتی — اس کا تو سڑکوں اور تکیوں کے ساتھ ناطہ ہے۔ اللہ بخشے آپا بیچاری کڑھتی مر گئی —"

پھر کرم دین اور ماسی مہرنشا مل کر اس بات کا ماتم کرنے لگتے کہ ایسے سیانے خاندان میں ایسا بے ڈھنگا، سودائی انسان پیدا ہو گیا۔ اور یہ کہ بھلا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ وہ پروفیسر سعید الدین ہی کا بھائی ہے، وہ بیچارے بھی عاجز آگئے ہیں۔ مگر ماسی مہرنشا کا خیال تھا کہ "اس بیچارے میدے کے بس کی بھی بات نہیں۔ یہ سب بڑے ماما جی کے شدا (سودا) کا ورثہ ہے، جو اس کی پیدائش سے برس بھر پہلے پھرتے پھراتے آپا کے پاس آن رہے تھے اور دن بھر سڑکوں پر گھومتے اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر روتے تھے۔"

وہ مزے سے بیٹھا حقہ پیتا رہتا۔ اور کرم دین کا پوتا اُسے گھوڑا بنائے اس کے کندھوں پہ ہمکتا رہتا۔ پھر وہ وہاں سے اُٹھ کر بہن جینا کی ڈیوڑھی میں آن بیٹھتا۔ بہن جینا کے ساتھ اس کا واسطہ یوں تھا کہ وہ بھی اس کی طرح "سُفنے" بہت دیکھتی تھی۔ اب یہ تو اُسے بھی معلوم نہ تھا کہ "سفنوں" کا یہ ٹھاٹھیں مارتا سمندر اس کو کہاں سے اور کیوں ودیعت ہوا تھا۔ بہر حال واقعہ یوں تھا کہ سوتے میں بھی وہ جاگتے سے کہیں زیادہ بامعنی زندگی جیتا تھا۔ اور برسوں کے بچھڑے لوگوں سے اس کی نت نت ملاقات ہوتی تھی۔ اب تو بھائی صاحب لئے جاگتی زندگی میں سڑکوں پہ گھومنے اور لوگوں سے ملنے کو منع کرتے تھے تو وہ بھلا ان خاک ہوئے لوگوں کا کیا علاج کر سکتے تھے جو رات رات بھر اس کے ساتھ محفل جماتے تھے۔ جینے اور مرنے والے انسانوں کے ساتھ اس کا جانے کیسا کڑا رشتہ تھا۔ بس یہی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اس نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔ انسانوں، سڑکوں اور پوری زندگی کے انتشار سے اس کے اندر ایسی دیوانگی جوش مارتی کہ کبھی کبھی اُس کا جی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہتا۔

بہن جینا سُفنوں پہ یوں تڑپ اُٹھتی تھی جیسے سائیں نوڑی شاہ کے تکیہ پر لوگ لال خاں قوال کی تان پہ — رات کا تازہ خواب اُس کو سنانے سے پہلے اُسے یہ قطعاً نہ کہنا پڑتا کہ کیا دیکھتا ہوں —" خواب ان کے لئے جیتی زندگی کا حصہ تھے۔

"رات اپنے شیخ بہاؤ الدین، سفید شملہ پہنے، ہاتھ میں مکے شریف کی تسبیح پکڑے آئے تھے۔ پیچھے پیچھے چاچی برکت تھی اپنی۔ — چادر کی بکل مارے — کہنے لگے — میدے — گھنٹہ گھر کا وقت غلط ہو رہا ہے اتنے دنوں سے —"

(پورے شہر کے بوجھ تلے اس کے شانے دُکھنے لگے تھے)

"ہائے ہائے۔ اپنی چاچی —" بہن جینا تڑپ کر ہاتھ ملنے لگی — یہاں سفنوں کی داستان کہہ سُن کر وہ شیخ عطا اللہ کی بیٹھک میں آن بیٹھتا — جو (اُسے معلوم تھا) اُسے سخت ناپسند کرتے تھے۔ اور اکثر انہی کے ذریعے بھائی صاحب تک اس کی آوارگی کی شکایتیں پہنچتیں۔ مگر وہاں سے چائے کی ایک پیالی ضرور ملتی تھی — اور یہ پیالی ان کی مالک سکینہ خاتون، موٹا دوپٹہ اوڑھے — اپنے کھردرے

ہاتھوں سے لاتی تھی۔ اور سکینہ خاتون کے ساتھ اس کا واسطہ محض اتنا ہی تھا کہ ایک روز جب شیخ عطاء اللہ گھر پر نہیں تھے تو سکینہ خاتون چپکے سے اپنے حصے کی پیالی اس کے لئے لے آئی تھی۔ اور پھر دروازے کے ساتھ لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

" چاچا — میرا بھی تیری طرح کوئی نہیں —" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا تھا —

"ارے کیسی بات کرتی ہے کالی — میرا — میرا کوئی نہیں — حد ہو گئی — بھئی میرا تو سب کچھ ہے — ہاں تیرا —" اس کی بے بس تنہائی کے خیال سے وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ مگر بعد کو دل ہی دل میں ہنستا وہ تکیے کی طرف چل دیا تھا۔ "حد ہو گئی — حد ہو گئی —" وہ گنجان گلیوں میں، انسانوں سے دھڑکتے مکانوں کے قریب سے دیوانگی بھری ترنگ سے گزرتا رہا۔

گر آج تکیے پر جانے کی بجائے وہ پہلے تندور پر رک گیا۔ جنتے بالوں میں مہندی لگائے بیٹھی تھی۔ ابھی روز کے آنے والے نہیں آئے تھے۔ جنتے کی بہو ہرے دوپٹے کی بکل مارے پیڑے کر رہی تھی۔ اور اس کا سرخ چہرہ تندور کی طرح دہک رہا تھا۔ ناک اور اوپر کے ہونٹ کے درمیان موتیوں ایسی پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ آج گداز باہنوں میں ہری اور سرخ چوڑیاں پھنسی تھیں۔ رات ابھی پوری طرح نہ جھکی تھی۔ تندور سے پرے، کمیٹی کے باغ کے آخری سرے پر، آسمان سرخ روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور باغ میں لڑکے ہو ہو کرتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ چوک کی سبیل پر بالٹیوں میں پھیکے سرخ شربت میں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے ڈل ڈل کرتے کناروں سے ٹکرا رہے تھے۔ "ٹھنڈا ٹھار — ٹھنڈا ٹھار" — نورا شربت فروش گلے کا تعویذ ٹٹولتا چلا رہا تھا — اور تندور پر رکھی لالٹین جھکتی رات کے پھیکے اندھیرے میں جھک جھک ٹمٹما رہی تھی۔

" میں کی کراں کنڈا دور نی اڑیئے — میں کی کراں —" لال خاں قوال تکیے پر تان اڑا رہے تھے۔ (گھنٹہ گھر کی سوئیاں ہولے ہولے اگلی لکیر کی طرف بڑھ رہی تھیں) تب یکدم اس کے دل میں وہ گہری ہوک اٹھی — وہ سر ہاتھوں میں تھام کے رہ گیا۔ (میں کی کراں کنڈا دور نی اڑیئے — میں کی کراں) جنتے نے پیتل کی تھالی میں دال نکال کر اس کے سامنے رکھ دی — اور جنتے کی بہو اپنے حنائی ہاتھوں سے سوندھی روٹی دسترخوان میں لپیٹ کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اس وقت ہر ایک چیز اس کے دل میں پیوست ہو رہی تھی۔ (جیسے سب کچھ جنتے کی بہو کی ہری سرخ چوڑیاں بن گیا ہو۔) اس کا جی چاہا زمین کے ساتھ لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے — جنتے کی مشہور دال اس کے منہ میں لئی کی طرح چپک گئی۔ آج سب چیزیں اُسے دکھ دینے پر تلی تھیں۔ ایک دو نوالے لیکر ہی، چوتی پھینک وہ اٹھ کر چل دیا۔ جنتے کی بہو کا رسیلا قہقہہ باغ تک اس کا پیچھا کرتا آیا۔

"آج کیا ہوا ہے اسے —؟"

"سودائی ہے!" جنتے نے حقہ کا کش لیکر کہا —

وہ لڑکوں سے بچتا — تیزی سے کمیٹی کا باغ عبور کرنے لگا۔ شہر کی آوازیں اس کے گرد گھیرا ڈالے تھیں۔ اس کا دل گھنٹہ گھر کی سوئیوں میں دھڑک رہا تھا۔ اس رات پہلی بار اس کا سر یوں چکرایا کہ پل بھر کو تمام کا تمام شہر کھلونا بنا منہ کے بل گر گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ ایک انجانی تھکن سے اس کا تمام وجود لڑکھڑا گیا۔ (اب وہ بھلا کب تک پورے شہر کا بوجھ اٹھائے پھرتا) اس رات بھولا حلوائی کی دوکان کی بجائے وہ سیدھا کوارٹر پہنچا اور صبح کی اذان تک کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا۔

اگلی صبح کچہری جانے کی بجائے وہ بہن جیناں کی ڈیوڑھی پہنچا۔

"لو اپنا تو بلاوا آ گیا۔" اس نے دروازے میں کھڑے کھڑے کہا۔

"اللہ خیر کرے — کیسا بلاوا؟" جینا نے دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"صبح اذانوں کے وقت اپنے حکیم صاحب چوبارے والے آئے تھے۔ کہنے لگے۔ گھنٹہ بھر اسٹیشن پر تیرا انتظار کرتے کرتے آیا ہوں، اتنی دیر کیوں لگادی — ؟ میں نے پوچھا۔ حکیم جی کونسی گاڑی؟ کہنے لگے لاہور کی اور کونسی؟"

اور جب خلافِ توقع جینا نے دبی زبان سے کہا کہ سفنوں کا کیا بھروسہ۔ تو اس کو جیسے دھکا سا لگا۔ اور یہ دھکا بھی اسی گہری ہوک میں مل کر ایک ہوگیا — جینا کا ایمان خوابوں سے اٹھ سکتا ہے۔ اس کا اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اور لائل پور کو اتنی جلدی چھوڑ دینے کا ایک سبب یہ بھی تھا —

لاہور میں اور کچھ نہ سہی، اِس گہری ہوک سے تو اُسے نجات مل گئی تھی۔ بھائی صاحب کی ملامتوں کا کیا تھا۔ سال بھر بول بول کے خود ہی خاموش ہوگئے۔ خان حمید احمد خان جج کی کوششوں سے، وقت سے پہلے ہی سترہ روپے تو اُسے ماہوار پنشن ملنے لگی تھی۔ اور پھر سڑکیں اور انسان تو ہر شہر میں بستے ہیں۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ لائل پور کے محلّے اور سڑکیں، گھنٹہ گھر اور سائیں توڑی شاہ کا تکیہ، یہاں تک کہ تندور اور اس کے ساتھ ہی جینے کی بو تک، کسی بھولے بسرے خواب کی طرح دُھندلا گئے تھے۔ اب جب دن بھر مزنگ سے لے کر داتا صاحب تک گھوم کر وہ نیم اور سنبل سے گھرے مکان کے اس چبوترے پر بچھی کھری چارپائی پر آن بیٹھتا تو حکیم صاحب چوبارے والوں کی روحانیت پر اس کا ایمان زیادہ پختہ ہوجاتا۔ جنہوں نے مر کے بھی اس کے ساتھ تعلق نہ توڑا تھا۔

شروع شروع میں یہاں سفنوں کے بارے میں خاصی دقت پیش آئی بھاوج کی کم گوئی کنبہ بھر میں مشہور تھی۔ اور پھر اوپر سے وہ جانے کن کن منتوں مرادوں کے لئے وظیفے کرتی رہتی تھی۔ (اکثر آدھی آدھی رات کو اس نے اُسے سجدے میں گرے دیکھا تھا) مگر یہ مسئلہ بھی سڑک کے کنارے نیم تلے بیٹھنے والے حجام اور پان سگرٹ والے نے حل کردیا تھا۔ گو یہ صحیح ہے کہ یہ دونوں بہن جینا ایسے باذوق نہ تھے کہ اس کے سُفنے لہو بن کر ان کی رگوں میں دوڑنے لگتے۔ مگر پھر بھی وہ پروفیسر صاحب کے گھر کا آدمی سمجھ کر اس کی بات سُن لیتے۔ (پروفیسر صاحب کے ساتھ اس کا کتنا قریبی رشتہ ہے، آج تک کسی کو بھی اس حقیقت کا احساس نہ ہوا تھا)

بھائی صاحب کو معلوم نہیں کیوں اس کا پہروں نیم تلے بیٹھنا اُٹھنا کھٹکتا تھا۔ "کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ کیوں بنی بنائی عزت خاک میں ملا رہے ہو؟ وہ اسے گھنٹوں سمجھاتے کہ ایسے گھٹیا لوگوں کے ساتھ یوں گھل مل کر باتیں کرنے سے ان کی کتنی ہتک ہوتی ہے۔ گو یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی مگر پھر بھی نیم کا درخت چھوڑ کر وہ مزنگ چنگی کی دکانوں کے قریب "آرائش سنگ" کے بنچوں پر بیٹھنے لگا۔ جہاں تیل میں بھیگے گھنگھریالے بالوں اور سرمے سے بھری آنکھوں والا ڈنڈے کے ساتھ گھنگھرو باندھے۔ کونڈی میں خربوزے کے بیجوں کی سردائی گھوٹتا تھا۔ اور "پیئے جا — پیئے جا" کی رٹ لگاتا تھا اور چند ہی قدم پر، سر سے پاؤں تک سیاہ کپڑے پہنے حکیم ولی محمد "سرمۂ چشم وفا" پڑیوں میں باندھ کر دیتا تھا —

بھائی صاحب کے گھر آکر وہ گہری ہوک تو کبھی اس کے اندر نہ اُٹھی تھی مگر اندر ہی اندر کھا جانے والی ایک بے نام بھوک، ہر دم آگ کی طرح بھڑکتی رہتی۔ جو ڈھیروں چیزیں کھانے پر اور بھی کٹاری تیز ہوجاتی: جب ایک روز اس نے بھاوج سے کہا۔

"ایک گانٹھ سی میرے اندر پھیلتی سکڑتی رہتی ہے — کھانے پر بھی بھوک نہیں مٹتی" تو اس نے اپنے نیلاہٹ مائل سفید دانتوں

میں خلال کرتے ہوئے لاتعلقی سے کہا تھا۔ "ڈاکٹر نذیر کو دکھا دو، کہیں کیڑے نہ ہوں پیٹ میں۔"

ڈاکٹر کے نام ہی سے اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ ابھی تک پچھلے برس ملیریا میں ملنے والی مرچ مکسچر نہ بھولا تھا۔ لہٰذا یہ اندر ہی اندر کھا جانے والی بھوک جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگی۔ اور وہ روز بروز بھائی صاحب کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتا گیا۔ اب یہ اس کے بس کی بات تو نہ تھی کہ جب بھی کوئی ملنے ملانے والا آتا۔ اُسے دیکھنے۔ اس سے بات کرنے کی شدید خواہش اس کا دل دبوچ لیتی۔

"کون ہے۔ کون آیا ہے کاکی؟" وہ بچوں سے پوچھتا پھرتا۔

"کوئی نہیں۔ اُدھر نہ جانا چاچا"۔ بچے حفظِ ماتقدم کے طور پر اُسے پہلے سے نوٹس دے دیتے تاکہ بعد کو بھائی صاحب ان کو الزام نہ دے سکیں۔

"اچھا کوئی ہوگا — مجھے کیا؟" وہ بڑے حوصلے سے دل کو تسلی دیتا اور چبوترے پر چارپائی ڈالے بیٹھا رہتا۔ مگر پھر ان انسانوں کو دیکھنے، ان کو محسوس کرنے کی بھوک اس کو نگلنے لگتی۔ سب کی نظریں بچا کر بھولے ہوئے اپنی کوٹھری کے دروازے سے وہ گول کمرے کے قریب لمبی ڈیوڑھی میں جا کھڑا ہوتا۔ پنکھے کی ہوا میں ہلتے پردے میں سے اُسے آدھے، تین چوتھائی انسان تو ضرور نظر آ جاتے۔ وہ اس وقت تک ہلتے پردے میں سے جھانکتا رہتا جب تک کوئی بچہ پیچھے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ نہ لے جاتا۔ اور مہمانوں کے جانے کے بعد وہ بھائی صاحب اور بھاوج کی ملامت کے لئے تیار رہتا۔ اس بھوک کی آگ سے بچنے کے لئے وہ سب کچھ سُننے پر آمادہ تھا۔

"ہمارے تو سر کے ٹھیکرے اُتر گئے ہیں" بھاوج ماتھا پیٹ کے کہتی۔ اُسے بھاوج کی اس بے بسی پر رحم بھی بری طرح آتا تھا۔ مگر اس کا کیا علاج تھا کہ بھاوج کے تقاضے، روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ ہر روز کپڑے بدلنا اور سردیوں میں بھی جمعے کے جمعے نہانا اور زنانہ مہمانوں کی موجودگی میں ادھر ادھر ٹل جانا۔ یہ سب کچھ اس کے بس سے باہر تھا۔ جہاں تک بھاوج کی ملنے والیوں کا تعلق تھا وہ کسی ایک کو بھی نہ جانتا تھا۔ مگر اس کے ترستے کان ان کی آوازوں کو پیاسی زمین پر پڑتی بوندوں کی طرح جذب کرتے رہتے۔ ایک روز جب بڑے کاکے کی سُسرال والیاں آئیں تو وہ آخر ضبط نہ کر سکا۔ اندر کے باغیچہ میں ٹوکریاں بھر بھر موتیا کھلتا تھا — وہ بھری بھری کلیاں توڑ، چھابی میں ڈال دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا

"میں نے کہا — یہ پھول لے لو۔"

بھاوج کا چہرہ ایکدم سُرخ ہو گیا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ چھابی پکڑ کے وہ پھر اپنی جگہ پر آن بیٹھی۔

"کون ہے؟" بڑے کاکے کی ساس نے پوچھا تھا۔

"آپ نے آلو بخارا تو لیا ہی نہیں۔" بھاوج نے بات بدل دی تھی۔ وہ کچھ دیر دروازے کے ساتھ کان لگائے کھڑا رہا، پھر حالات کی سنگینی سے ڈرتا ہوا، باہر سڑک کی طرف چل دیا۔ بھاوج بڑے طیش میں تھی۔ اس رات وہ بتیاں بجھے آیا اور چپکے سے بھوکے پیٹ ہی چبوترے پر بچھی چارپائی پر لیٹ رہا۔

صبح سویرے دودھ والے کی آواز پر اُٹھ کر وہ حوض کے نل پر جا کر منہ دھونے لگا۔ بھاوج تخت پر بیٹھی حسبِ معمول وظیفہ کر رہی تھی۔ پھر باورچی خانہ کی چوکی پر سر نیوڑھائے چائے اور پراٹھا کھا کر وہ چپکے سے اُٹھ کر باہر آ گیا۔ مگر بھاوج خاموش رہی اور اس خاموشی سے اس کو معلوم "اتنی تکلیف کیوں ہوئی"۔ ؟ جیسے وہ بھاوج کو دیکھا ہی نہ ہو، جیسے وہ موجود ہی نہ ہو۔ اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا۔ بھائی صاحب کی تیز

کنارسی باتوں اور بھاوج کے سوکھے سوکھے لفظوں کو اس کا جی ترس گیا۔

دسمبر میں بڑے لڑکے کا بیاہ ہوا۔ دلہن کی رخصتی کے وقت وہ دلہن کے باپ سے بھی زیادہ دیواروں کے ساتھ سر ٹکرا ٹکرا کے رویا۔ بے پناہ اداسی اس کے اندر زہر کی طرح پھیلتی گئی۔ بھائی صاحب مارے شرمندگی کے اس سے دور دور ہی رہے۔ اب یہ رونے کی بات بھی اس کے بس کی نہ تھی۔ معلوم نہیں یہ آنسوؤں کا سیلاب اس کے اندر کہاں سے پھوٹ نکلا تھا کہ کبھی خشک ہی نہ ہوتا تھا۔ گھر میں کوئی بیمار ہو جاتا وہ گھڑیوں جھر جھر آنسو بہایا کرتا — (ایسے میں اسے ماسی نرنشا کی بڑے ماما جی کے ورثہ والی بات یاد آ جاتی)

بہو گھر میں آئی تو بھاوج سے زیادہ بچوں نے اس کا تعارف کرایا۔ جانے ان شیطانوں کو کیسے پتہ چلا تھا کہ اس کا وقت کا احساس نہایت شدید ہے۔

"آپ کو ایک تماشا دکھائیں بھابھی جی۔" وہ بہو کے کان میں کہتے۔ اور پھر —

"کیوں چاچا، وقت کیا ہوگا —؟" منجھلا کاکا اس سے پوچھتا۔

"یہی کوئی سوا تین ہوں گے۔ سوا تین — کیوں کاکی؟" وہ بہو کی کلائی پر لگی سنہری گھڑی کی طرف اشارا کرتا۔ بچے بے تابی سے بہو کی گھڑی پر جھک جاتے

"ہائے اللہ — پورے سوا تین — توبہ چاچا — تم تو پورے گھنٹہ گھر ہو!" بہو ہنس کر کہتی۔ اور ایک ایک لمحے کی محبت کنار بن کر اس کے دل میں چبھ جاتی۔ اور جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے والی بھوک سے بے تاب وہ پہلو تھامے اٹھ کر کسی طرف کو چل دیتا۔

جب سے بہو آئی تھی اس کے زندگی کے معمول میں بھی کچھ فرق آ گیا تھا۔ اب صبح حوض پر منہ دھونے کے بعد وہ جھولی میں موتیا بھر کر اندر آتا اور دالان کی کارنس پر رکھی رنگین چھابی میں ڈالنے کے بجائے — "بڑی کاکی — بڑی کاکی —" پکارتا پھرتا۔ بہو اپنے کمرے سے چوڑیاں جھنکاتی نکلتی۔

"لاؤ چاچا —" وہ دوپٹہ پھیلا دیتی۔ اور پھول اس میں گرا کر جیسے اس کے دل سے بھاری بوجھ اتر جاتا۔ بہو میں پھولوں کا وہی ذوق تھا جیسا جیتا میں سفنوں کا۔ وہ ایک ایک کلی کو گجرے، کانوں کے بالوں، یا چوٹی کے ہار میں کہیں نہ کہیں ضرور پرو لیتی جب ایک ایک پھول سنبھل جاتا تو پل بھر کے لئے اسے یوں لگتا جیسے اس کے اندر بھوک تھم گئی ہو۔

بھائی صاحب کے گھر میں رسالوں کا بڑا خبط تھا۔ روز ہی اخبار والا کوئی نہ کوئی رسالہ سرخ برآمدے میں ڈال جاتا۔ وہ اخبار بھائی صاحب کی میز پر رکھ کے رسالے بہو کے پاس لے جاتا۔ اور صفحے کھول کھول کر بہو کو تصویریں دکھاتا۔ رنگین تصویروں سے اس کی آنکھوں میں انگارے سے اتر جاتے۔

"بلبلیں اڑتی پھرتی ہیں — بلبلیں —" وہ بہو کو ایک ایک ورق الٹ کر دکھائے جاتا اور بہو خوش دلی سے ہنس دیتی۔

"چاچا — تو نے یونہی ساری عمر گنوا دی — کہیں ڈھنگ سے گھر بنا کے رہا ہوتا۔" بہو نے رسالے کے ورق الٹتے ہوئے ایک بار کہا تھا۔ اسے شیخ عطا اللہ کی بالک سکینہ یاد آ گئی تھی۔ پل بھر کو اس کا دل رک گیا۔ مگر پھر وہ سچے دل سے ہنس دیا۔

"عمر گنوائی کہاں کاکی —؟" اب وہ اتنی سی حقیقت کس طرح سمجھاتا اور بھلا اس بات کی کسی کو سمجھ بھی کس طرح آ سکتی تھی کہ وہ جو ہر دن ڈاک کے انتظار میں لیٹر بکس کے قریب زمین پہ اکڑوں بیٹھا رہتا ہے۔ باوجود اس کے کہ اس کو خط لکھنے والا کوئی بھی نہیں۔ نہ ہی زندگی میں

اس کے نام کوئی خط آئے گا۔ مگر سیاہ لیٹر بکس میں بڑے نیلے لفافے، اور بڑے بھاٹک کو کھولتا ہوا خاکی کپڑوں والا ڈاکیہ۔ اور لیٹر بکس کے
قریب کچی زمین پر ڈاکیے کی سائیکل کے گول نشان ۔۔ یہ سب کچھ اس کے اندر بھڑکتی آگ پر ٹھنڈی بوندیں بن کر گرتا تھا ۔
پھر جب کوئی بات نہ سمجھتی تو اُسے اس کی نادانی پر غصے کی بجائے پیار آجاتا۔ اُس کی بچوں ایسی ہنسی اُسے بڑی اچھی لگتی اور
پھر وہ جب بھی چولہے کے پاس بیٹھی ہوتی تو وہ بڑے اطمینان سے دھڑا دھڑ جلتے ہوئے چولہے میں سے سُرخ سُرخ موٹے موٹے کوئلے اور اُپلے اپنی
چلم میں رکھ سکتا تھا۔ بھاوج کے وقت میں تو چولہے کے قریب جانا اچھا خاصا ہفت خواں طے کرنا تھا ۔
" چاچا ۔ کبھی تو آگ چھوڑا کر ۔" سیہ ماتھے پر بل ڈال کے کہتی ۔ مگر اس کے ہونٹ مسکراتے ہی رہتے ۔
"اچھا کاکی ۔ اچھا کاکی ۔" وہ ہنستے ہوئے چلم بھرتا جاتا
مگر جس روز اس نے بڑے بڑی رازداری کے ساتھ آنتیں نکلتی بھوک کا تذکرہ کیا ۔ اور اس نے بھی بھاوج کی طرح ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ
دیا، اس روز اُسے یوں لگا جیسے جیتا دہیز میں کھڑی کر رہی ہو ۔" سفنوں کا کیا بھروسہ ؟" یک دم اس کا جی متلانے لگا۔ حقہ اُٹھائے وہ سڑک
پر چل نکلا احمد دین خانساماں کے بیٹے شیدے نے سڑک کے پار ہی گلی میں نواڑوں کے باہر سائیکلوں کی مرمت کی نئی نئی دکان کھولی تھی ۔ حقے کر
وہ وہاں اکڑوں زمین پر بیٹھ گیا ۔
"چاچا ۔ شیخ صاحب کی گاڑی آرہی ہے ۔" شیدے نے دُور سے بھائی صاحب کی گاڑی آتی دیکھ کر کہا ۔ وہ فوراً اُٹھ کر اندر کوارٹر
میں چل دیا ۔ کمرے میں بڑی سخت گھٹن تھی ۔ فرش پر گوری مٹی کا لیپ تھا ۔ اور سامنے طاق میں چینی اور تانبے کے برتن سجے تھے ۔
" بیٹھو جی ۔ بیٹھو !" شیدے کی ماں نے چارپائی پر بچھے کھیس کی سلوٹیں نکال کر کہا ۔۔ " لاؤ حقہ تازہ کر دوں "۔ وہ حقہ اٹھا کر باہر
صحن میں چلی گئی ۔ کبھی آج تک کسی نے اس کو حقہ تازہ کر کے نہ دیا تھا ۔ وہ خود ہی چلم اُٹھائے اُٹھائے باورچی خانے کے پھیرے
لیا کرتا تھا ۔ آسودگی کا عجب سا احساس اُس کی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھوں میں پھیل گیا ۔ شیدے کی ماں ایسی ستھری چلم بھر کے لائی کہ وہ اس کے
ذوق کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا ، اور وہ مسکرا کر دوپٹے کی بکل ٹھیک کرنے لگی ۔ جانے کیوں ایک جھٹکے کے ساتھ اُس کو جنتے اور اس کی بہو
یاد آگئی ۔ درد کی شدید لہر سے وہ کانپ اُٹھا ۔ حقہ اُٹھا کر وہ فوراً کھڑا ہو گیا ۔
" بیٹھو شیخ جی ۔۔ دال روٹی حاضر ہے ۔" وہ حیرت سے شیدے کی ماں کا منہ تکنے لگا ۔ سوائے میدے اور چاچا کے کسی نے آج تک
اس کو کسی اور نام سے نہ پکارا تھا ۔ شیخ جی کے نام پہ ایک خوشگوار سی لہر اُس کے اندر دوڑ گئی ۔
" نہیں بھئی چلتے ہیں ۔" اُسے معلوم تھا کہ اگر بھائی صاحب کو شک بھی ہو گیا کہ وہ خورشید احمد ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور کے
خانساماں کے گھر گیا ہے تو بہت بدمزگی ہوگی ۔ وہ حقہ اُٹھائے سیدھا چبوترے پر اپنی چارپائی پر آن بیٹھا ۔
مگر اگلے روز نفیس چلم کی کشش اُسے پھر وہاں کھینچ لے گئی ۔ اور پھر شیدے کی ماں کے اصرار پر گھی سے چپڑی بیسنی روٹی بھی اُسے کھانا
پڑی اور اس کے بعد روز والی لسی ، گلٹ کے گلاس میں اُسے بالکل نئی لگی ، جیسے زندگی میں پہلی بار پی ہو ۔ احمد دین خانساماں کہ عرف عام میں
دینا کہلاتا تھا ، دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر کھاٹ پہ پڑا دانتوں میں خلال کرتا رہا ۔ تینوں لڑکیاں لیمپ تلے کپڑے دھوتی رہیں ۔ شیدے
کی ماں اس کی چارپائی کے قریب پیڑھی پر بیٹھی دال چُنتی رہی اور بڑی بیٹی کی سسرال کے قصے کہتی رہی ۔
کچھ دن بعد ہی صبح سویرے اپنا وظیفہ توڑ کے بھاوج نے کہا ۔

"کیوں جی - دن دن بھر غائب رہتے ہو - دونوں وقت کی روٹی خراب جاتی ہے - بیمار پڑنے کی صلاح ہے کچھ ؟ مجھ سے علاج نہیں کیا جائے گا - ابھی اس روز کہہ رہے تھے پیٹ میں درد ہے !"

"وہ تو ٹھیک ہو گیا -" اُسے خود بھی حیرت تھی کہ پھیلتی سکڑتی گانٹھ خود بخود کہاں گھل گئی - مگر وہ سوچنے کا عادی نہ تھا - صبح سویرے اخبار اور رسالے سمیٹ کر، پھول بہو کے سپرد کر کے، ناشتہ سے فارغ ہو کر وہ حقہ اُٹھائے چل دیتا — اور پھر دوپہر کی ڈاک کے وقت آن پہنچتا ڈاک کے وقت اُسے کوئی لاکھ روکتا، وہ نہ رُکتا، سیاہ لیٹربکس میں بھرے نیلے، سفید، پیلے لفافوں کے تصور سے اس کے دل میں میٹھی میٹھی ٹیس اٹھتی — وہ تیزی سے سڑک پار کرنے لگتا گویا اس کے بغیر دنیا بھر کے لیٹربکسوں اور خطوں کا مفہوم ہی ختم ہو کے رہ جائے گا — اور پھر لفافے ڈالنے والے بھی تو لیٹربکس میں جھانکنے کی بجائے اسی کے ہاتھوں اور جیبوں میں خطوں کے لئے جھانکا کرتے تھے -

کچھ دنوں بعد اُسے شام کے وقت بھی باہر رہنا پڑتا - شیدے کی بہن شجو کی بات چیت ہو رہی تھی اور شیدے کی ماں نے لڑکے والوں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جو کچھ بھی ہے شیخ جی ہی کریں گے - اور یہ کہہ کر وہ کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی - دیا سلائی کا خلال دانتوں میں پھیرتا ہوا یونہی کھانسنے لگا تھا - ایک میٹھی ترنگ نے اس کے دل کو دبوچ لیا - ذمہ داری کے شیریں بوجھ تلے اس کی ہڈیاں چٹخ اٹھیں "کیوں کیا خیال ہے شیخ جی - لڑکا تو اچھا ہے -" شیدے کی ماں نے مہمانوں کے جانے کے بعد اس سے پوچھا تھا - اور پھر بھرے دل کے ساتھ اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے بعد وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا

"بس بیٹیوں کا تو یہی ہوتا ہے -" شیدے کی ماں نے دوپٹے سے خشک آنکھیں ملتے ہوئے کہا -

اگلے روز وہ مزنگ، کسیرے بازار، اور گنٹی میں دن بھر مارا مارا پھرتا رہا -

سورج ڈھلے شیدا سامان سے لدا ہوا تانگہ لے کر گھر آیا - اور وہ سلیپروں کی مٹی جھاڑتا چبوترے پر بچھی چارپائی پر جا بیٹھا -

"کہاں سے آئے ہو"؟ بھائی صاحب نے بہت دنوں کے بعد اس کی طرف توجہ کی تھی -

"کہیں نہیں - شہر گیا تھا -"

"اب تمہاری عمر نہیں دن دن بھر گھومنے کی - کیا کریں قسمت ہی خراب ہے !" وہ مایوس ہو کر اندر چلے گئے -

بھاوج نے لہجہ دھیما رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا -

"چار مہینے کی پنشن کہاں ہے ؟"

"ہیں - ؟" وہ ایک دم سناٹے میں آگیا -" وہ تو خرچ ہو گئی -"

"خرچ ہو گئی — اور جو پچاس روپے مجھ سے لے گئے تھے اپنے — وہ بھی ؟" مارے غصے کے بھاوج کا چہرہ سُرخ انگارا ہو گیا -

وہ خاموشی سے حقہ پیتا رہا -

"اور اپنی حالت دیکھو — فقیروں کی سی بنا رکھی ہے - کہاں ہیں پیسے ؟" وہ اپنی بات پر اڑ گئی -

"کہا جو خرچ ہو گئے -" وہ بیزاری سے آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا -

اگلے روز شجو کی رخصتی تھی - صبح سویرے لڑکوں سے گلی میں لال، ہری، پیلی جھنڈیاں لگوا کر (گلی میں اس کا کھلے بندوں کام کرنا خطرے سے خالی نہ تھا) وہ کوارٹر کے پچھواڑے دیگوں کے قریب چارپائی بچھا کر بیٹھ رہا - وہ خود منڈی سے بڑے ستھرے باسمتی چاول لایا تھا -

جہیز اور کھانے پر تو ساری عزت تھی۔ برات کی آمد کے خیال سے اس کا دل بادلوں کی طرح دھڑک رہا تھا۔ اور ایک انجانا سیلاب آنکھوں کی طرف زور کر کے آتا تھا۔

برات کی خاطر مدارات میں اس کی کمر دوہری ہو گئی۔ اور بول بول کر آواز بیٹھ گئی۔ رخصتی کے وقت وہ دیواروں سے لپٹ لپٹ کر دھاڑیں مارتا رہا۔ اب اُسے یہ کب معلوم تھا کہ شیدے کی ماں نے بھاوج کو بھی مدعو کر رکھا ہے۔ اور اگر اُسے معلوم ہوتا بھی تو کچھ فرق نہ پڑتا۔ وہ ایسا تند سیلاب دل میں چھپائے خود کو مٹا نہ سکتا تھا۔

رات جب وہ تھک ہار کر گھر لوٹا تو بھاوج اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

"کیوں بڑھاپے میں منہ کالا کر رہے ہو؟ کچھ ہمارا ہی خیال کرو۔"

"کالک کیسی؟" اس کا دل رُک گیا۔ بھائی صاحب اور تمام گھر والوں، اس کچی گلی کے کوارٹر کے باسیوں اور دنیا میں بستے تمام انسانوں کی شدید محبت سے اس کا دل پھٹ گیا۔ اور باغیچے میں کھلی بھری بھری کلیاں، سیاہ لیٹر بکس میں بڑے نیلے لفافے، سرخ برآمدے میں بکھرے اخبار اور رسالے اور نیم اور سنبل کے درخت... (ہر سال وہ ہلکے ہلکے پودوں سے تمام کوٹھی میں بکھرنے والی سنبل کو چنا کرتا) اور چولہے میں سلگتے سرخ سرخ کوئلے اور تیزی سے سرکتے تلے۔ ہر چیز اس کے دل میں چبھ گئی (جیسے سب کچھ جلنے کی ہو کی چوڑیاں بن گیا ہو) اب وہ بھاوج کے سامنے اس کالک کی کیا تشریح کرتا۔

اگلے روز شیدے کی ماں اُسے دیکھ کر مسکرائی نہیں۔ نہ ہی آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے حقہ لیا۔ دینا کھاٹ پر بیٹھا کل کے باسی چاول کھا رہا تھا اور دونوں چھوٹی لڑکیاں کمرے میں مٹی کا لیپ کر رہی تھیں۔ باہر شیدا پانی سے بھری کڑاہی میں ٹائر ڈال کر پنکچر ڈھونڈ رہا تھا۔ چاروں سمت ایک کٹھور دن پھیلا تھا۔

اس نے خود ہی اُٹھ کر چولہے میں سے آگ لینی چاہی۔ شیدے کی ماں ایک دم چلائی۔

"کچھ تو آگ چھوڑا کرو۔ مفت کی لکڑیاں نہیں ہیں۔"

"کوئی لنگر نہیں لگا۔" دینا گھی بھری انگلیاں چاٹ کر بولا۔

وہ چپکے سے حقہ اُٹھا، گھر کی جانب چل دیا۔ چبوترے تک پہنچتے پہنچتے وہی پُرانی ہوک اس کے وجود کے ٹکڑے کر گئی۔ وہ چارپائی پر اوندھے منہ گر گیا اور ابکائیوں سے اس کا حلق دُکھنے لگا۔

"اور دھوپ میں گھومو چاچا۔" کلّے نے کھسر کھسر اکھڑے پتیلا مانجھتے ہوئے کہا۔ اس نے ہولے سے آنکھیں کھولیں۔ تمام شہر کھلونا بنا، اوندھے منہ گر گیا تھا۔ نیم اور سنبل کے درخت اس پر جھک آئے۔ اس نے ڈر کے آنکھیں بند کر لیں۔

ڈاکٹر نے اس کی پسلیاں ٹٹول کر، اور پیٹ دبا دبا کر ڈھیروں دوائیں دے دیں۔ مگر وہ اس ہوک کا راز تو نہ جانتا تھا۔ چنانچہ سے خود معلوم تھا کہ یہ سب دوائیں بیکار ہیں۔ اس نے دوا پینے سے انکار کر دیا۔

"ایسے سودائی کا کیا علاج؟" بھاوج یہ کہہ کر خاموش ہو گئی تھی۔

اگر دن رات زمین آسمان گھومتے تھے، اور اس کے حلق میں زہر سا بھرا تھا، اور آنکھوں میں انگارے، تو یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ بچے ہمیشہ کی طرح چبوترے کے قریب کچی زمین پر کبڈی کا ڈنڈا — اور کوڑا جمال شاہی کھیلتے تھے، بند آنکھوں پر بھی وہ ان

کی چمکتی آنکھوں اور پسینے میں بھیگے سُرخ گالوں کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا اس کے قریب رک کے کہے۔ "چاچا بھلا وقت کیا ہوگا ؟" اور پھر ہو ہنس کے کہے، تو بہ تم تو پورے گھنٹہ گھر ہو چاچا ۔ مگر سب اس کے قریب سے گزر جاتے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا اسے آرام کی ضرورت ہے۔

آج اس کا سر چکرایا نہیں تھا، مگر وہ اندھا بوجھ اس کے سینے پر سل کی طرح آن گرا تھا، یہ وہی بے نام ہوک اور اندر ہی اندر کھا جانے والی، جنگل کی آگ کی طرح بھڑکتی بھوک تھی۔ جو مدتوں سے اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ اب ہر سمت ختم ہو چکی تھی۔ رین کی کشش مر چکی تھی۔ وہ کاغذ کا پُرزہ بنا ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ مگر یک دم موتیا کی بھری بھری کلیاں اور سیاہ لیٹر بکس میں بھرے نیلے، سفید لفافے اور سُرخ برآمدے میں بکھرے اخبار اور رسالے اس کی نظروں میں گھوم گئے۔ ایک زرد مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی

کلّو، چار ادھر پڑا تھا اُٹھا کر لے گیا۔

"اب تک پڑا رہا ہے۔ اتنی بار بلایا ہے، چاچا اُٹھتا ہی نہیں ـــ" وہ بھاوج کو بتا رہا تھا۔

"بڑا ضدی ہے۔ کیا کیا جائے ـــ" بھاوج کی آواز آئی۔

دھوپ کے رُخ اور تپش سے اس کو اندازہ ہو گیا۔ گیارہ بج گئے تھے ـــ اس کے شانوں پر شیریں بوجھ جھک آیا۔ ایک گہرے سرور سے اس نے خود سے کہا ـــ "میدے ـــ پھولوں اور ڈاک کے لئے اُٹھنا ہی پڑے گا ـــ" اور دھوپ میں پیلے پڑتے کٹوروں ایسے پھول، اور سیاہ لیٹر بکس سے جھانکتے لفافے، جیسے آنکھوں کے پردوں پر چپک گئے۔ اس نے رُوح کی تمام قوت کے ساتھ اُٹھنے کے لئے کروٹ بدلی۔

یک دم موتیا کی تیز مہک اس سے چھو کر گزر گئی ـــ اس نے کانپ کر خوشبو کے پیچھے نظریں دوڑائیں۔ بہو بانہوں میں موتیا کے بھرے بھرے گجرے پہنے، ہاتھ میں نیلے لفافے لئے جا رہی تھی۔

اندھے بوجھ نے اس کا لہو چوس لیا۔ سکینہ خاتون دروازے کے ساتھ لگی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میں کی کراں کنڈا او رُنی اڑیے ـــ میں کی کراں ـ جلنے کے تندور پہ رکھی لالٹین جھکتی رات کے اندھیرے میں بھک بھک ٹمٹما رہی تھی ـــ

ذکاء الرحمٰن

"رات کا موسم"

"اور ٹوٹے ہوئے پتے کی آواز،
ان کا پیچھا کرے گی،
اور وہ گر پڑیں گے،
جب کوئی ان کا تعاقب نہیں کرے گا۔"

(نیوٹیکس ۲۶ - ۳۰)

دھماکے کے بعد ایک پُرسکون لمحہ فضا پر چھا گیا۔
شاہی کے تناور درخت سے ٹکرا کر ریڈی ایٹر پاش پاش ہو گیا تھا، کھڑکیوں کے شیشے کرچی کرچی ہو کر نیچے سڑک پر پھیلے ہوئے خزاں گزیدہ پتوں پر بکھر گئے تھے اور مڈگارڈ مڑ کر ٹائیروں میں گھس گئے تھے۔ یہ سب کچھ ایک ثانیے میں ہو گیا تھا۔
اور اب جبکہ فضا میں سکوت تھا تو نہر کے ٹرّانے والے مینڈک اور جنگل میں بولنے والے جھینگر بھی اپنی آوازوں کو قید کئے بیٹھے تھے ...... شاید کسی اور دھماکے کے انتظار میں .... لیکن اور کوئی دھماکہ نہ ہوا اور لال سو ہارسے کے ہیڈ ورکس پر نارنجی روشنیاں بعد طمانیت کے ساتھ جھلملاتی رہیں۔
اس خاموشی میں پہلا شگاف اس وقت پڑا جب ارد گرد پھیلے ہوئے گھنے جنگل میں کوئی شب بیدار پرندہ زور زور سے چیخنے لگا۔ اور پھر شگاف پڑتے گئے۔ مینڈکوں نے ٹرّانا شروع کر دیا، جھینگر اپنے مخصوص سر تال میں نغمے الاپنے لگے اور ایک خرگوش جو دھماکے سے خوفزدہ ہو کر نہر کے کنارے اُگی ہوئی لمبی گھاس میں چھپ گیا تھا گدّے کھاتا ہوا سڑک عبور کرنے لگا۔
اس طرح جب کئی لمحے گزر گئے ...... خاموشی اور شور کے ملے جلے لمحے ...... تو ڈاکٹر احمد سعید الدین نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ آنکھیں کھلنے کے باوجود وہ دیکھ نہیں سکتا تو بلا کسی پریشانی اور جھنجھلاہٹ کے اس نے دوبارہ آنکھیں میچ لیں۔
ایک اور لمحہ گزر گیا۔ ڈاکٹر کچھ نیم بیہوشی کے سے عالم میں تھا، جیسے کوئی نہ تو سو رہا ہو اور نہ ہی بیدار ہو اور اسی سوتی جاگتی کیفیت میں بڑی مشکلوں سے بھلایا ہوا، پرانا خواب یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو .... اس نے ایک بار پھر آنکھیں کھولیں لیکن اب بھی کچھ نہ دیکھ سکا۔
کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے اپنا بایاں بازو اوپر اُٹھانا چاہا مگر وہ کسی گرم گرم سی چیز کے بڑے دلنواز بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے بازو آزاد کر لیا۔

اسے معلوم تھا کہ اسٹیشن ویگن ٹاہلی کے دیو قامت درخت سے ٹکرا کر چور چور ہو گئی ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی غیر معمولی اہمیت رکھنے والی بات نہ تھی۔ ایسے حادثے روز ہوا کرتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا دماغ اس وقت اپنی جگہ سے ہل گیا ہے اور وہ اپنی سوچ کو کسی ایک قطعے پر مرکوز نہیں کر سکتا۔ لیکن اس سے بھی وہ قطعاً پریشان نہ ہوا۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔

سب سے پہلے اس کے ذہن میں لاہور کے کسی گمنام سے کوچے کا نقشہ آیا . . . . . موہوم سا . . . . . پھر ہارون آباد کی ایک صاف ستھری سڑک، پھر اپنی بیوی کا من موہنا چہرہ، اور پھر بہاولپور کے وکٹوریہ ہسپتال کے بڑے گیرٹ سے لپٹ کر جھولتی ہوئی انگور کی بیلیں . . . . . . اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور آنکھوں پر جما ہوا خون پونچھنے لگا۔ کلائی کے قریب ساری آستین لہو میں لتھڑ گئی۔ اس نے پتلون کی جیب سے رومال نکال لیا اور چہرہ صاف کرنے لگا۔ چہرے اور ناک پر کئی چھوٹے چھوٹے زخم تھے اور ان میں گھسی ہوئی شیشے کی کرچیاں بری طرح کھٹک رہی تھیں۔ رومال پھیرنے سے یہ کھٹک اور زیادہ تکلیف دہ ہو گئی۔ اس کا جسم کانپ اُٹھا اور وہ ہائے کر کے رہ گیا۔

اس دفعہ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ اپنے ارد گرد پھیلا ہوا منظر دیکھ سکتا تھا . . . . ونڈ شیلڈ نیم دائرے کی شکل میں ٹوٹ گیا تھا۔ اس جگہ شاید اس کا سر ٹکرایا تھا۔ اسٹیرنگ وہیل اس کی طرف جھک آیا تھا اور اس کے سینے سے صرف ایک ناد دانچ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ ایک ہیڈ لائٹ اب تک روشن تھی اور اس پر پتنگوں کے کئی چھوٹے چھوٹے بادل جمع تھے اور ان بادلوں کا عکس روشنی کی زد میں آئے ہوئے ایک بڑے سے درخت کے تنے پر کانپ رہا تھا۔ کار کے اندر بالکل اندھیرا تھا . . . . . .

ڈاکٹر کا ہاتھ ناک کے بانسے پر تھا جہاں زخموں کی خلش ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔

——— شکر ہے کہ میں عینک نہیں لگاتا۔

یہ پہلا مکمل خیال تھا جو حادثے کے بعد اس کے ذہن میں آیا۔

——— اور میں اس خیال کو پہچانتا ہوں۔

یہ دوسرا مکمل خیال تھا۔

اس نے اپنے جسم کو کار سے باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن زخموں اور خراشوں کی بڑھتی ہوئی ٹیس نے اسی طرح ساکت و صامت پڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔

اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور حواس کی طرف سے پیش ہونے والی ہر چیز کو دماغ بڑے میکانکی انداز میں جذب کر رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ جسمانی حواس اور اشیاء کے ساتھ اس کا اتنا گہرا، صاف اور خوشگوار رشتہ بھی قائم ہو سکتا ہے . . . . . بہار کی پہلی رات کی ٹھنڈی ہوا ٹوٹے ہوئے ونڈ شیلڈ میں سے پہلو بدلتی ہوئی اندر آئی اور اس کے خون آلود چہرے پر خوشبوئیں چھڑک گئی . . . . مینڈکوں کی آوازیں اسے اپنے دل کی دھڑکنوں کی طرح مترنم اور فطری محسوس ہو رہی تھیں . . . . . . رات کا اندھیرا ریشم کی مانند ملائم اور اس کے اپنے وجود کا ایسا مادی تھا اور ہیڈ لائٹ کی زرد روشنی کا دھرا دور ایک دیو قامت درخت کے چوڑے چھلکے تنے میں پیوست تھا۔

——— تاروں کے جلنے کی بو آ رہی ہے۔

اس نے ڈیش بورڈ کے نیچے سلگتے ہوئے تاروں کے گچھے کی طرف آہستہ سے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا۔ تاروں کو چھوتے ہی اسے یوں لگا

جیسے اس کی انگلیوں کی انگلی پر بدن پر انگارے سے سلگ رہے ہوں۔ اس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور انگلیوں کو منہ میں لے کر چوسنے لگا۔

ڈیش بورڈ کے نیچے اُلجھی ہوئی تاریں سلگتی رہیں اور ڈاکٹر بڑا امن محسوس کرتا رہا۔ اس کی نظریں ونڈ شیلڈ کے خلا میں گذر کر رات کی تاریکی میں آہستہ آہستہ سانس لیتے ہوئے جنگل پر جمی تھیں اور گردن ہلانے کو وہ فی الحال ایک بے کار ضرورت سمجھ رہا ہے۔

اور جب باہر سے نظریں ہٹا کر اس نے کار کے اندر ادھر اُدھر دیکھا تو سب سے پہلے اس کی نظر رضیہ کے جسم پر پڑی۔ اس کی ٹرسا کیپ کہیں غائب ہو گئی تھی۔ سیاہ بالوں نے پریشان ہو کر لالہ گون چہرے کو یوں ڈھانپ رکھا تھا جیسے گلاب کے پھول پر بھنوروں کے گچھے ہوں ...... وہ گرم گرم سی چیز رضیہ کا جسم ہی تھا جس کے بوجھ تلے ڈاکٹر کا بایاں بازو دبا رہا تھا۔

رضیہ کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس کا سر بائیں رخسار کے بل ڈاکٹر کی دائیں ران پر اس طرح رکھا ہوا تھا جیسے کوئی غم محبت کی ماری اپنے محبوب کی گود میں سو گئی ہو۔ معاً ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ اس کی انگلیاں ہولے ہولے رضیہ کے بالوں میں رینگ رہی ہیں ...... انگلیاں بالوں میں رینگتی رہیں اور اس کی نظریں ونڈ شیلڈ کے باہر والے منظر کی طرف لوٹ آئیں۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بہار کی تمام کنواری خوشبو اپنے سینے میں سمیٹ لی ..... جنگل کا شور اب صاف سنائی دے رہا تھا اور آوازیں ایک دوسرے میں مدغم ہونے کی بجائے ایک دوسرے سے الگ ہو گئی تھیں۔

ڈاکٹر نے آنکھیں جھپکائیں اور باہر کے منظر سے نظریں ہٹا کر ایک بار پھر رضیہ کے جسم کو دیکھنے لگا۔ تب اسے وکٹوریہ ہسپتال کے ان تین مریضوں کا خیال آیا جنہیں وہ مریضوں کے ایک تبادلے کے سلسلے میں چھٹیاں لے کر جا رہا تھا۔ اس نے مڑ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھنا چاہا لیکن اس کی گردن کے پٹھے اس بری طرح اکڑے ہوئے تھے اور اسٹیرنگ وہیل اس کی چھاتی کے اتنا قریب آ گیا تھا کہ اس کے لیے گردن یا پورے جسم کو موڑنا ممکن نہ رہا تھا۔ اس نے ریئر ویو مرر کی طرف دیکھا مگر وہ بھی اپنی جگہ سے غائب تھا۔

وہ بڑی کاہلی کے ساتھ سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

اب کیا کرنا چاہیے؟

یہ سوال اس کے دل و دماغ پر ایک صلیب بن کر لٹکا ہوا تھا اور ذہن ایک ایسا آئینہ خانہ بن کر رہ گیا تھا جس میں ان مانوس چہروں اور جانی پہچانی جگہوں کا عکس کانپ رہا تھا۔ جن کا اس حادثے سے کوئی تعلق نہ تھا۔

پھر اچانک یوں ہوا کہ آئینہ خانے میں گھپ تاریکی چھا گئی اور کسی نامعلوم گوشے میں ایک خیال جگنو کی طرح ٹمٹمانے لگا۔

- - - - - میں کار سے باہر نکلوں گا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر ان مریضوں کو دیکھوں گا۔ اس نے ایک بار پھر ڈیش بورڈ کے نیچے لٹکے ہوئے تاروں کی طرف ہاتھ بڑھایا ..... تار اب تک سلگ رہے تھے ..... وہ مکمل تاریکی میں تھا ..... صرف جنگل کے درختوں کے اوپر چمکتے ہوئے چاند کی نحیف کرنیں بچے کھچے ونڈ شیلڈ کے بلوریں فرش پر بڑے اجنبی انداز میں ناچ رہی تھیں۔ ہیڈ لائٹ پر پتنگوں کے بادل اسی طرح جمع تھے اور اس کی نظریں اسی طرح ونڈ شیلڈ سے باہر جنگل کے افسوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ ہل جل سکتا ہے۔

- - - - گویا اب میں پورے ہوش و حواس میں ہوں اور ذہن میں بیہوشی کی جو گرد سی جمی تھی وہ صاف ہو گئی ہے۔

لیکن اس کے باوجود دوسرے خیالات، جن کا اس حادثے سے کوئی تعلق نہ تھا، قطار اندر قطار ذہن میں سے گذر رہے تھے جیسے شفاف بلور کے طاس پر پانی کی دھارا بہتی چلی جا رہی ہو ..... بہاولپور کے ڈرنگ اسٹیڈیم کا مصنوعی تالاب ..... کسی کھیت کی منڈیر پر پیلان ڈال کر چلتی ہوئی متوالی

مٹیار . . . . گنگ کے تاروں پر تھرکنے والا کوئی سادہ و پرسوز دہقانی گیت . . . . کپاس کے سفید سفید گالوں سے لدا ہوا کسی قریبی منڈی کی طرف رواں دواں ایک گڈا ۔

ــ ــ ــ ــ اشفتی دیگی پاش پاش ہو گئی ہے ۔

اسے یہ معلوم تو پہلے سے تھا لیکن اب تک اس نے اپنے آپ کو یہ اطلاع نہیں دی تھی . . . . بہار کی خوشبو پورے جنگل میں پھیلی ہوئی تھی اور نہر کے دوسرے کنارے پر کوئی تنہا پرندہ ہولے ہولے بول رہا تھا، جانو کسی کو سرگوشیوں میں پکار رہا ہو ۔

ــ ــ ــ ــ مجھے دروازہ کھول کر رضیہ کو اور پچھلی سیٹ والے مریضوں کو دیکھنا چاہیے ۔

ڈاکٹر نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھایا اور کار کا دروازہ کھول دیا ۔ جھکے ہوئے اسٹیرنگ وہیل کے نیچے سے رینگ کر نکلا اور باہر سڑک پر آ گیا ۔ اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں اور پیشانی کے زخم سے خون پھر بہنا شروع ہو گیا تھا ۔ اگر خون دوبارہ نہ بہتا تو اسے پتہ ہی نہ چلتا کہ ماتھا بھی زخمی ہے ۔ کانپتی ٹانگوں اور بہتے خون کے ساتھ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا عقب کا چکر کاٹ کر، کار کی دوسری طرف آ گیا اور دروازہ کھول کر رضیہ کے جسم کو دیکھنے لگا جو اسی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا ۔ زخم تو رہا ایک طرف جسم کے کسی حصے پر خراش تک نہ آئی تھی اور اس کے نرسوں والے سفید لباس پر کوئی داغ دھبہ نہ تھا ۔ ڈاکٹر نے آگے کو جھک کر اس کے پریشان بالوں کو چہرے سے ہٹا دیا . . . . وہ مر چکی تھی . . . . وہ کچھ دیر تک اس کے مردہ چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر پیچھے ہٹ گیا . . . . اس کی موت شاید کسی اندرونی چوٹ سے واقع ہوئی تھی . . . . بڑی ظالم ہوتی ہیں یہ اندر کی چوٹیں ۔

اس نے مڑ کر پچھلی سیٹ والے مریضوں کو دیکھا . . . . وہ تینوں عورتیں تھیں . . . . وہ انہیں گننے لگا . . . . ایک، دو، تین . . . . آخری کا سر پیچھے کی طرف ڈھلک گیا تھا، گردن ٹوٹ گئی تھی اور سانس کی ڈوری کے دونوں سرے غائب ہو گئے تھے . . . . زبیدہ کا جسم نمو کے جسم پر آ پڑا تھا اور ان دونوں کا سانس باقاعدگی سے چل رہا تھا . . . . ڈاکٹر کو یہ معلوم کر کے بے حد طمانیت محسوس ہوئی کہ دونوں محفوظ ہیں اور موت کا خوفناک ہاتھ ان سے زندگی کا تحفہ چھیننے میں ناکام رہا ہے ۔

رات کی شاداب ہوائیں سرسراتی ہوئی لال سوہارے کے جنگل میں سے گذرتی رہیں اور ڈاکٹر کار کا دروازہ بند کر کے سیدھا کھڑا ہو گیا ۔ اس کے بائیں بازو میں ٹیسیں اٹھنی شروع ہو گئی تھیں . . . . ذہن کے کسی انجانے، بھولے ہوئے گوشے میں سے اتھاہ، گہری خاموشی کا ایک طوفان اٹھا اور وہ اس طوفان میں غوطے کھاتا ہوا اپنے کو بے حد پریشان محسوس کرنے لگا اور طوفان کے شعور کے باوجود اس کی پریشانی کم نہ ہوئی ۔

ــ ــ ــ ــ ہم خیرپور ٹامیوالی اور لال سوہارے کے درمیان کسی جگہ ہیں اور یہ ٹلے کا علاقہ ہے ۔ یہاں کے رہنے والے سادہ، محنتی، دیانتدار اور مضبوط لوگ ہیں اور ہر بات چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں . . . . میں کچھ نہیں کر سکتا حالانکہ مجھے کچھ کرنا چاہیے ۔ کہیں سے کوئی گڈا ہی مل جائے تو زبیدہ اور نمو کو کسی محفوظ، آرام دہ مقام تک پہنچایا جا سکتا ہے ورنہ یہ بھی زندگی سے اپنے رشتے توڑ لیں گی ۔

ہیڈ لائٹ پر مچھروں اور پتنگوں کا بادل اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ روشنی دھندلا کر رہ گئی تھی ۔ اس نے ہیڈ لائٹ کو بدستور روشن رہنے دیا اور کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھنے لگا، جو شیشہ ٹوٹنے کے باوجود اب تک صحیح کام کر رہی تھی . . . . اس وقت چار بجے تھے ۔

ڈاکٹر ہولے ہولے چلتا ہوا اس منڈیر پر جا کھڑا ہوا جو سڑک اور نہر کی حد اتصال تھی ۔ وہاں سے اس نے چاروں طرف دیکھا ۔ دور دور تک نظروں کی زد میں کچھ نہ تھا . . . . نہ کوئی گاؤں، نہ کوئی مکان اور نہ کوئی متنفس ۔ بس لال سوہارا ہیڈ ورکس کی نارنجی بتیاں تھیں کہ مشرق کی طرف دو میل کے فاصلے پر یوں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں ۔ جیسے کئی باگھ دور اندھیرے میں بیٹھے آنکھیں جھپکا رہے ہوں ۔ وہ بڑی آہستہ خرامی کے

ساتھ ان روشنیوں کی طرف روانہ ہوگیا۔

حادثے سے پہلے اس نے نارنجی روشنیوں کی اس دنیا کو نہ دیکھا تھا۔ یہ دنیا خبر نہیں کب سے وجود میں تھی۔ لیکن اس کے لیے اس دنیا نے صرف پانچ ثانیے پیشتر جنم لیا تھا جب نہر کی منڈیر سے اس کی آنکھوں نے کسی مددگار چہرے، کسی محفوظ مقام کی ناکام تلاش کی تھی۔

اسٹیشن ویگن میں دو زندگیاں موت کی آغوش میں ٹھنڈی ہوگئی تھیں ...... ایک نرس اور ایک مریضہ ... اور دو وجود ابھی تک زندگی کی گرد میں سانس لے رہے تھے اور اس معاملے پر غور کرنے کے لیے بڑے گمبھیر ضابطے اور سکون کی ضرورت تھی ..... اسی ضابطے کی جو سڑک کے ویران خراشوں والے سینے پر پھیلنے والی چاند کی اداس کرنوں میں تھا۔ اسی ضابطے کی جس کے تحت پتوں نے اپنے چہروں پر باریک باریک رگوں کا جال بنا تھا۔ (وہ ہر پتے کے چہرے پر انہیں رگوں کی یہ نازک بنت دیکھ سکتا تھا۔ اگرچہ چاندنی ملے اندھیرے میں درختوں کے نیچے بھی دھندلا گئے تھے) اور اس سکون کی جو اس غیر معمولی رات کی دور تک پھیلی ہوئی پہنائی میں دل کی مثال دھڑک رہا تھا ..... اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے اپنی گردن موڑی تو وہ اسٹیشن ویگن کے اندر زندگی اور موت کا تماشہ دیکھے گا۔ اس لیے وہ سیدھا چلتا گیا۔ وہ رات کی شاداب ہوا اس کے کشادہ سینے میں بہار کا خوشبودار احساس پیدا کرتی رہی۔

جوں جوں وہ نارنجی روشنیوں کے قریب آرہا تھا، اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جارہی تھی اور رگوں میں خون کا بہاؤ اس قدر جولان ہوگیا تھا کہ اسے اپنا وجود ہوا کے شہپروں پر سوار زمان و مکاں کی سرحدیں پھلانگتا ہوا محسوس ہوا۔

اب وہ لال سو ہار سے کے ہیڈ کوارٹر پر پہنچے گا۔ سوال و جواب کے مرحلے سے گذرنا ہوگا اور پھر وہ لوگ کوئی سواری لے کر جائے حادثہ کی طرف بھاگیں گے ..... لیکن ابھی نہیں۔

——— ابھی ہیڈ کوارٹر تک پہنچنے میں کچھ دیر باقی ہے اور اس درمیانی لمحے میں اپنے آپ کو میں آزادی، لاتعلقی اور امکان کے میٹھے میٹھے احساس میں گم کر سکتا ہوں۔

باغ میں گائے ہے ..... ایک بہت بڑی گائے۔ اس کی آنکھیں بہت گہری ہیں ..... سمندروں سے بھی گہری۔ وہ گھاس چرنے کی بجائے پھول کھا رہی ہے ..... گلاب، نرگس، سوسن ..... بہت ہی خوبصورت، بہت ہی پیارے پیارے پھول ..... اس کے منہ میں چبائے ہوئے پھولوں کی رنگ برنگی گھاس ہے ..... اسے کوئی منع نہیں کرتا چونکہ کوئی بھی وہاں موجود نہیں ..... وہ باغ میں بالکل اکیلی ہے اور نوّو نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ زبیدہ جس کا جسم اس پر جھک آیا تھا بدستور سو رہی تھی۔ چاروں اور اندھیرا تھا لیکن موٹر کی ایک ہیڈ لائٹ اب تک روشن۔ اختری بھی سو رہی تھی۔ نوّو نے اس کے بازو کو چھوا اور پھر اس کو زور زور سے جھنجھوڑا۔ اس کا سر نوّو کی چھاتی پر آ پڑا اور پھر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ تب نوّو کو پتہ چلا کہ اختری مر چکی ہے۔ ڈاکٹر وہاں موجود نہیں تھا۔ نوّو آہستہ سے اٹھی تاکہ اگلی سیٹ پر سوتی ہوئی نرس کو سارے معاملے سے آگاہ کرے۔ اس نے بڑے نامعلوم انداز میں آگے کو جھک کر نرس کو جگانے کی کوشش کی مگر موت کی نیند سے بھی کبھی کوئی بیدار ہوتا ہے۔ وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر چپ چاپ بیٹھ گئی اور اس کے ہاتھ بے جان سے ہو کر خود بخود گود میں آن گرے۔ اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی ..... لیکن آنسو ..... آنسو بھی کبھی روکے سے رکے ہیں؟ اور بیازی آنسوؤں کی لڑیاں نے مندی ہوئی نازک نازک پلکوں اور شعلہ رخساروں کے درمیان درد کا رشتہ قائم کر دیا۔

——— یا خدا نجات کے لمحے اتنے مختصر کیوں ہوتے ہیں اور اگر ایسا ہوتا ہی ہے تو پھر میں کیوں اس سیٹ پر بیٹھی ہوں۔ . . . اے خدا ؟

ڈاکٹر جب ہیڈ ورکس کے قریب پہنچا تو اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس کے بائیں کندھے میں شدید تکلیف تھی اور ٹیسیں یوں اٹھ رہی تھیں جیسے سمندر میں جوار بھاٹے اٹھ رہے ہوں۔ اسکے دائیں جانب نہر تھی۔ اس طرح بہتی ہوئی جیسے کوئی بے سہارا بیوہ سر نہوڑائے کسی انجانی منزل کی طرف جا رہی ہو . . . . . ساری دنیا سے لاتعلق اور اپنے آپ سے بھی بے خبر . . . . . جنگل کی ہوا میں رات کی تازگی تھی اور رات کی تازگی پہ حادثے اور موت کے زخم تھے۔

——— اور اس وقت کیا ہو گا جب اعلیٰ حکام کو اس حادثے کی خبر ہو گی ؟ . . . . . کار کے پرخچے اڑ گئے ہیں۔ ایک نرس اور ایک مریضہ مر چکی ہیں، کار آدھی رات کے وقت درخت سے ٹکرائی ہے جبکہ تم . . . . . ڈاکٹر احمد سعید الدین . . . . . ڈرائیو کر رہے تھے۔ جانتے اس کے نتائج کیا ہوں گے ؟

ہیڈ ورکس کی طرف بڑھتے ہوئے وہ آپ ہی آپ مسکرا تا رہا اگرچہ جواب طلبی کے لیے ڈائریکٹر ہیلتھ سروسز کے سامنے پیش ہونے کا خیال خاصا پریشان کن تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ڈائریکٹر کن الفاظ میں اس کی جواب طلبی کرے گا۔ لیکن اس سے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہ لمحوں کی جادوگری کا وقت تھا . . . . ندموں کے نیچے بچھی ہوئی نہر کی کچی اور سخت پٹری، درختوں کی اوٹ میں چھپی ہوئی حادثہ زدہ اسٹیشن ویگن اور رات کے گمبھیر سناٹے میں جنگل کی خوشبوؤں کا کبھی آہستہ، کبھی تیز رقص . . . . بس یہی موجود تھا، بس یہی حقائق تھے . . . . . . باقی سب عدم، باقی سب جھوٹ۔

ہاں بس یہی حقائق تھے اور ان حقائق کو اس نے ان کی تمام تر ملائمت اور تغیر ناآشنائی کے ساتھ مجاز کے سارے پردے اٹھا کر دیکھا تھا لیکن سب سے زیادہ مشکل بات یہ تھی کہ حکام اس سے ان از حد غیر معمولی لمحات کے ادراک کی وضاحت نہیں مانگیں گے بلکہ حادثے کی تفصیلات اور وجوہات طلب کریں گے۔

——— مگر میں کیا کر سکتا ہوں جبکہ ہوا اس قدر صاف ہے اور اشیاء کا مجھ سے براہ راست تعلق قائم ہو گیا ہے۔ یہ ٹھیک کہ رضیہ مر چکی ہے اور اختری بھی . . . . . میرے ماتھے پر تکلیف دہ خراشیں ہیں اور میرا بازو زخمی ہے . . . . . . ہوا میں ہلکی ہلکی خوشگوار گرمی ہے اور درختوں میں ایک ان دیکھی زندگی متواتر سرسرا رہی ہے اور یہ سب کچھ ناقابل بیان حد تک حقیقی ہے، مناسب ہے، لامحدود ہے۔ مدہوش کن ہے اور جذبات کی مٹھاس کے بغیر شیریں ہے۔ ایسے میں اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں اس بے پناہ لمحے کی سچائی کو تسلیم کر لوں۔ اس وقت جواب طلبی کے خوف سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ کائنات اپنی تشریح آپ کر رہی ہے۔

ڈاکٹر آہستہ آہستہ چلتا ہوا جب ہیڈ ورکس پر پہنچ گیا تو اس نے دیکھا کہ نارنجی روشنیوں کے اس جھرمٹ میں اندھیرا ہے اور اس اندھیرے میں، عین نہر کے کنارے پر وہ مختصر سا مکان یوں استادہ ہے جیسے کالے سمندر میں ایک موہوم سا جزیرہ . . . . . ہیڈ ورکس کے پل کے نیچے پانی بے محابا شور مچا رہا تھا۔ وہ اس شور کو نظر انداز کرتا ہوا مکان کی طرف چل دیا۔ یہ شاید ہیڈ ورکس کے چوکیدار کا گھر تھا۔ اکلوتے دروازے کی جھریوں میں سے لالٹین کی ہلکی زرد روشنی غبار بن کر باہر نکل رہی تھی۔ ڈاکٹر دھیمے دھیمے قدم رکھتا ہوا دروازے کے نزدیک آ گیا۔ اندر ایک عورت اور ایک مرد

مدتوں وہ دونوں میں باہم جھگڑ رہتے تھے۔

—— تو میری ماں آتاں ایس گھر وچ آئی . . . . . ملنگوں جھڈ کر کیا آکھدی وتّی . . . پر . . . (میری ماں یہاں اس گھر میں آئی . . . . . اس سے بحث نہیں کہ وہ کیا کہتی رہی . . . . مگر . . .)

—— تینوں کیس دتا . . . . . تے میتھوں امبڑی کیوں نیکو نہ دے گئی۔؟

(تجھے کس نے دیا . . . . . اور میری ماں کیوں نہ دے گئی؟)

ڈاکٹر کئی ثانیوں تک کھڑا ان کی باتیں سنتا رہا۔ معاً اسے خیال آیا کہ یہ لئے کا علاقہ ہے اور یہاں ایک دفعہ بات شروع ہو جائے تو ختم نہیں ہوتی بلکہ تفصیلات کے ساتھ جاری ہی رہتی ہے۔ چنانچہ اس نے ہاتھ اٹھا کر دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ آوازیں یکدم بند ہو گئیں۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ڈاکٹر نے دوبارہ دستک دی مگر اس دفعہ بھی اندر کوئی حرکت نہ ہوئی۔ اس نے تنگ آ کر دروازے کو زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا۔ اندر سے ایک مرد کی غصیلی آواز آئی۔

"دروازے کو کیوں توڑ رہا ہے"؟

وہ بدستور دروازے کو پیٹتا رہا۔

"او ٹھہر ہے کا بھی کہ نہیں کون ہے تو؟ کس کی اولاد؟"

ڈاکٹر نے منہ کھولا، لبوں کو تھوک سے تر کیا اور چلا کر کہا۔

—— مجھے مدد کی ضرورت ہے۔

حادثے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ ڈاکٹر کے حلق سے آواز نکلی تھی اور اس آواز میں وہ سب کچھ تھا جو ایک صحت مند انسان کی آواز میں ہونا چاہیے۔

—— میں تو اپنے کو بیمار سمجھ بیٹھا تھا مگر میں تو بھلا چنگا ہوں۔

اور پھر یکایک اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں اور یوں لگا جیسے وہ گہرے پانیوں میں تہ در تہ ڈوبتا ہی چلا جا رہا ہے۔ جب دوران سر ذرا کم ہوا اور آنکھیں کھلیں تو اس نے دیکھا کہ دروازہ ایک جھری کی صورت میں کھلا ہوا ہے اور لالٹین کی زرد روشنی اس کے چاروں طرف کچا سونا بکھیر رہی ہے اور ایک ادھیڑ عمر کا تنومند شخص پتلی منڈھی لاٹھی لیے اس کے سامنے کھڑا ہے۔ اس نے تیوریاں چڑھا کر ڈاکٹر کے زخمی بازو کو اور خون آلود پیشانی کو دیکھا۔ ایک قدم پیچھے ہٹا اور لاٹھی پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

—— مدد لے کر پہنچو کار کی ٹکر ہو گئی ہے۔

بیہوشی کے غلبے میں ڈاکٹر کو پتہ ہی نہ چلا کہ اس کی آواز کمزور ہو کر سرگوشی بن گئی تھی۔

لمحوں کے کئی کارواں گذر گئے تھے اور کچھ بھی نہیں ہوا تھا . . . . . مجو نے نازکی کے ایک بہت ہی لطیف احساس کے ساتھ ہولے ہولے اپنی آنکھیں کھولیں اور گردن کو اک ذرا خم دے کر زبیدہ کو دیکھا . . . . زبیدہ ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھی اور پسینے کی لڑیوں کے پیچھے اس کا چہرہ خزاں کے موسم میں کھلنے والے گلاب کا ایسا زرد ہو رہا تھا۔

نمو نے کار کے اندر چاروں طرف دیکھا۔ وہاں اخنزی اور نرس کے مردہ جسموں اور ٹوٹی ہوئی چیزوں کے علاوہ کچھ بھی تو نہ تھا اور باہر جنگل میں سیٹیاں بجاتی ہوئی ہوا جھوم رہی تھی۔

نمو دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ کچھ دیر تک بے حس و حرکت کھڑی رہی اور پھر یوں دروازہ بند کرنے لگی کہ ذرا سا بھی شور ہوا تو سب جاگ اٹھیں گے۔

——— مگر سوال یہ ہے کہ میں باہر کیوں آئی ہوں؟

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کار کے انجن کے قریب آگئی اور اگلے پہیے کے مڑے ہوئے مڈگارڈ کو سیدھا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

——— پاگل ہوں میں بھی، بھلا یہ سیدھا ہونے لگا ہے . . . . . میرا جسم کمزور ہے۔

جنگل کی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور وہ بے ساختہ مسکرا اٹھی۔ اس کے گالوں میں گڑھے پڑ گئے اور دل کے رخنوں میں رات کے پچھلے پہر کی ٹھنڈک بھی خنک چھڑکاؤ کر گئیں۔

——— اس سے پہلے کہ میری اور زبیدہ کی خاطر وہ واپس آئے مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ضرور واپس آئے گا . . . . . وہ ہمیشہ واپس آتا ہے۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ ڈاکٹر کو اور نرس کو اور اس دوسری لڑکی کو تو اپنے ساتھ لے جائے اور مجھے چھوڑ جائے۔

وہ بڑے نامعلوم انداز میں مڑی اور جلدی سے نہر کی پٹری پار کر کے جنگل میں داخل ہو گئی۔ جنگل بہت گھنا تھا۔ درختوں کی شاخیں نیچے تک جھک آئی تھیں۔ سطحِ زمین کو خود رو جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا اور وہ درختوں اور شاخوں سے یوں دامن بچا کر گذر رہی تھی جیسے کنواری مریم گناہوں سے دامن بچاتی ہوئی چل رہی ہو۔

ڈاکٹر نے اپنی ٹوٹے ہوئے شیشے والی گھڑی میں وقت دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ اسٹیشن ویگن کو چھوڑے ہوئے آدھ گھنٹہ گذر چکا ہے۔ وہ ادھیڑ عمر شخص اور اس کی بیوی مدد حاصل کرنے کے لیے کسی قریبی گاؤں میں جا چکے تھے۔ اس کی پیشانی کی مرہم پٹی ہو چکی تھی اور زخمی بازو کسی پھٹے پرانے دوپٹے سے بنائی ہوئی گل پٹی میں بڑے آرام سے جھول رہا تھا۔ بان کی کھری چارپائی پر جب اس نے اپنے جسم کو بے حد پرسکون محسوس کیا تو اس نے پوری طرح آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا . . . . . ان کا سترہ برس کا لڑکا اس کے سرہانے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک نیند کی بھوک تھی۔ ڈاکٹر نے لڑکے سے کوئی بات نہ کی اور چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ چھریرے بدن، لانبے قد اور چوڑے کندھوں والا وہ لڑکا لالٹین کی زرد روشنی میں اسے بہت اچھا لگا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر بالوں کا ایک گچھا جھول رہا تھا اور گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں لالٹین کی زرد روشنی کو اپنے اندر جذب کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

خاموشی سے اٹھ کر ڈاکٹر نے اپنی مرہم پٹی کی ہوئی پیشانی کو سہلانا شروع کر دیا اور لڑکا اپنی نیند بھری آنکھوں کو دونوں ہتھیلیوں سے مسلنے لگا۔ لڑکے کی آنکھیں سرخ ہو گئیں تھیں۔ تب اس نے بے حد اکتائے ہوئے لہجے سے ڈاکٹر سے کہا۔

——— سورج ٹپیاں پیا بھر بیندا اے، سویر تھیں ای آئی اے۔

(سورج چمک رہا ہے ، صبح ہونے ہی والی ہے ۔)

ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی اثبات میں سر ہلا دیا ۔

——— اگر کسی کے پہنچنے سے پہلے ہی تم اور زبیدہ کو ہوش آگیا تو بہت برا ہوگا ۔ کہیں وہ دہشت زدہ ہو کر ، مدد کی تلاش میں جنگل میں نہ بھٹک جائیں ۔ اور یہ کمبخت بھی اس لڑکے کو چھوڑ کر خبر نہیں کہاں جا بیٹھے ہیں ۔

" او بھائی گھڑی والے "

——— کیا ہے ؟

" بتاؤ کتنے آدمی تھے تم موٹر میں "

——— " چار مجھے چھوڑ کر "

" کتنے مرے ہیں ؟ "

——— " دو "

" اور دوسرے زخمی ہوئے ہیں ؟ "

——— " پتہ نہیں ، وہ دونوں بیہوش ہیں "

" یہ سب کچھ ہو کیسے ؟ "

——— " تمہارا مطلب ہے یہ حادثہ ؟ "

——— " ہاں "

ڈاکٹر نے کندھے جھٹکائے اور پوری دیانتداری سے کہا ۔

——— " مجھے نہیں معلوم "

" اور موٹر تم ہی چلا رہے تھے ؟ "

——— " تیری زبان کو چھنڈر کراں ، تجھے یہ بھی نہیں پتہ کہ یہ کیسے ہوا ؟ "

اس غیر متوقع حملے سے ڈاکٹر گھبرا گیا ۔

——— میں شاید چلاتے چلاتے سو گیا تھا ۔

معاً لڑکے نے محسوس کیا کہ اس نے اپنے زخمی مہمان کو بڑی ناز یبا بات کہہ دی ہے ۔ اس نے واضح الفاظ میں تو معذرت نہ کی ۔ البتہ نرم لہجے میں ڈاکٹر سے پوچھنے لگا ۔

" تمہارے سر میں درد تو نہیں ہو رہا ؟ "

——— " نہیں "

اس کے بعد کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی ۔ خاموشی کا یہ وقفہ ابھی زیادہ طویل نہیں ہونے پایا تھا کہ لڑکا بڑے دکھ سے تڑپ کر بولا ۔

" مرنے والوں میں تمہارا اپنا بھی کوئی بھائی بند تھا ؟ "

—— "نہیں، ایک نرس تھی اور ایک مریض عورت۔"

بڈھا بڑے غور سے ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے حلقے تنگ ہو گئے تھے۔ ماتھے کی سلوٹوں میں اضافہ ہو گیا تھا اور وہ شہادت کی انگلی کا ناخن دانتوں سے کترتے ہوئے کہنے لگا۔

"اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کبھی ایسی غلطی نہ کرتا"

اور ڈاکٹر سوچنے لگا کہ میں نے تو کوئی غلطی نہیں کی، یہ تو بس اپنے آپ ہو گیا۔ تب اس نے حادثے کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کے متعلق سوچنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے خیالات اس سے الجھے ہوئے تھے اور وہ بان کی کھری چارپائی پر لیٹا سرکنڈوں کی چھت کو گھورے جا رہا تھا۔

—— یہ سب کچھ ایک خواب سا ہے۔ لیکن پھر بھی ایک حقیقت ہے ...... دو انسان مر چکے ہیں ..... اتنی مکمل موت کہ اس موت میں شک و شبہ کی گنجائش نکالنا بھی پاگل پن ہے ...... لیکن یہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ میں اس موت کے بارے میں کچھ محسوس نہیں کر سکتا ...... نہ خوشی ...... نہ غم ...... جنگل لڑکے تم شاید نہیں جانتے کہ مرنا اور مرتے ہوئے دیکھنا کتنا خاموش اور پُرسکون عمل ہے۔ .

.. یہ عمل ہر شئے کو اپنی حقیقی جگہ پر پہنچا دیتا ہے ...... موت کے علاوہ سب کچھ بے معنی ہے، پاگل پن ہے۔ بے وقوفی کی بات ہے۔

اور اب ڈاکٹر کا جی چاہا کہ وہ اپنی نقاہت کو بھلا کر اٹھے اور نہر کی پٹری پر دور تک چلتا چلا جائے ...... ہمیشہ چلتا رہے ...... نہر کے کنارے اُگی ہوئی گھاس کو سونگھے، یہ معلوم کرے کہ زندگی اور موت ہر لحظہ نت نئی شکلیں اختیار کر رہی ہے اور دن کا اجلا شہر روشنی کے روپ میں چاروں طرف پھیل جائے۔ تو وقت اور انسان کے ہنگاموں سے دور لال سوہارے کے جنگل میں یوں ڈوب جائے جیسے بھاری پتھر دریا میں ڈوب جاتے ہیں۔

—— عقل و خرد کی تماشا گاہوں سے دامن بچا کر جنون و عشق کے جنگلوں اور صحراؤں کی ایک سادہ و پرسوز کہانی بن جانا فرار کی ایک کیفیت ہی سہی مگر بہت پیاری، بہت دلنواز کیفیت ہے۔

وہ چوہدری لینے گئے تھے، ابھی تک واپس نہیں آئے۔ لڑکا حقے کی چلم میں تمباکو بھرنے میں مصروف تھا اور باہر موسم بہار کی ٹھنڈک بڑھ گئی تھی۔

—— ڈاکٹر ...... اسپیشلسٹ ...... نرسیں ...... مریض ...... جب یہ سب مر جاتے ہیں تو ان کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟ ...... میری بیوی کی آواز سے بھی کم، کریر کی ان جھاڑیوں سے بھی کمتر جو بے ہنگم انداز میں بس پھیلتی ہی چلی جاتی ہیں ...... اس اجڈ لڑکے کے سینے میں پمپنگ کرتے ہوئے دل سے بھی حقیر ...... موت کے بعد سب کچھ ختم ہو جاتا ہے ...... کائنات ہر موت کے ساتھ مر جاتی ہے اور یہ اس کا انجام ہے ...... میں ہسپتال میں ہوں ...... اور اگر مجھے جیل نہ بھیجا گیا تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی ...... میری بیوی، میں فون پر اس کی آواز سن سکتا ہوں ...... لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

ڈاکٹر نے ایک سگرٹ سلگایا اور ماچس پرے پھینک دی۔ سگرٹ کا دھواں کمرے کی بھاری ہوا میں ایک ننھا سا بادل بن کر تیرتا رہا۔

—— میں نے دو انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا ہے، مار دیا ہے۔ اگرچہ میرا ارادہ ہرگز یہ نہ تھا۔ لیکن وہ مر گئے ہیں، اور پتھروں کی طرح بے جان ہیں، برف کی مانند ٹھنڈے ہیں ...... ایک نرس اور ایک مریضہ ...... رضیہ اور اختری ...... ایک صحت مند ایک بیمار ...... گھنے اور بھورے بال جیسے شہد کا چھتا ...... کالی سیاہ آنکھیں ...... میں اسے تین برس سے جانتا

. . . . . اور وہ کیا تھی . . . . . ایک نرس ؟ . . . . رضیہ ؟ . . . . . یا اختری ؟ . . . . . بازوؤں کی اعصابی حرکت ؟ . . . . . یا گورے گورے گالوں والی ایک ناتواں لڑکی جس کا مرض کئی سال تک ناقابل تشخیص رہا . . . . . میں رضیہ کے ساتھ سونا چاہتا تھا . . . . میں اس کے لب چوسنا چاہتا تھا . . . . . لیکن اب بہت دیر ہو گئی ہے . . . . . کئی صدیاں بیت چکی ہیں ۔

اس نے آخری کش لے کر سیگرٹ کو پاؤں تلے مسل دیا اور پھیپھڑوں میں سے دھواں یوں خارج کرنے لگا جیسے دم نزع بیمار کا سانس اکھڑتا ہے ۔

——— آج کے بعد سے میں اپنے کو دنیا کے سامنے مسٹر احمد سعید الدین کی حیثیت سے لاؤں گا . . . . . سابق ڈاکٹر احمد سعید الدین . . . . . یہ نیا نام میں لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کروں گا جیسے کوئی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے ۔ لیکن مصافحہ کرنے والے کے چہرے کو نہیں دیکھتا ۔

کتنا اداس اور الجھا ہوا تھا لال سوہارے کا جنگل . . . . . ہر درخت ، ہر جھاڑی ، ہر شاخ باہم بری طرح گتھم گتھا ہو رہی تھی . . . . . نمو صبح کے اولین دھندلکے میں ہولے ہولے چل رہی تھی ۔ اس کا کاہی لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور ساری شلوار پر محبت بوٹی چپک گئی تھی ۔ کانٹوں نے اس کی ایڑیوں پر خراشیں ڈال دی تھیں ، اور وہ ہاتھ بڑھا کر اپنا راستہ تلاش کر رہی تھی ۔ بھیگے پتے اور نرم شاخیں اس کے چہرے پر اوس کا چھڑکاؤ کر رہی تھیں ۔

کچھ دیر بعد نمو رک گئی اور ادھر اُدھر دیکھنے لگی ، دونوں ہتھیلیوں سے شہد آگیں بالوں کو درست کیا ، چہرے سے اوس کے قطرے پونچھے اور پھر جنگل کی تازہ ہوا کو اپنے سینے میں داخل کرنے لگی ۔ وہ اکیلی نہیں تھی . . . . . کبھی بھی اکیلی نہیں تھی ۔ تنہا ہونا بڑی خوفناک بات ہے . . . . . قطعی ناقابل برداشت ؟ . . . . . درختوں پر شہید جوانیاں لٹک رہی تھیں . . . . . مضطرب مرکھی ، مصلوب اور زخموں سے چھلنی جوانیاں . . . ان کی آنکھوں میں میٹھے میٹھے درد کے بادل تھے ، ان بادلوں میں دکھوں اور آنسوؤں کا پانی تھا اور یہ درخت ان مقہوروں کی آخری پناہ گاہ تھے . . . . نمو سرس کے ایک قد آور درخت کے قریب پہنچی اور اس کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی . . . . . وہ سارے شہیدوں سے بڑھ کر نازک تھا اور خوبصورت تھا . . . . . اس کا سانچے میں ڈھلا ہوا ، متناسب جسم کسی قدیم یونانی دیوتا کا سا تھا . . . . . اس نے نمو کو دیکھ کر نظریں پھیر لیں اور شاید اپنے الہامی منبع کی طرف دیکھنے لگا . . . . . اس کو یوں اپنے سے نالاں دیکھ کر نمو نے ایک آہ بھری اور اپنے پیار سے جذبہ رحم کو لے کر آگے بڑھ گئی ۔

تب ڈاکٹر نے بے حد فکرمندی سے سوچا ۔

——— بے خبری میں قتل کی کیا سزا ہے ؟ . . . . . ۳۰۴ الف . . . . . دو سال قید یا ایک ہزار روپے جرمانہ ۔ لیکن اس کا فائدہ کیا ہوگا . . . . . کیا وہ زندگیاں واپس آ جائیں گی ؟ . . . . . نہیں ہرگز نہیں . . . . . اختری اور رضیہ مر چکی ہیں ۔ خدا کی قسم میں نے انہیں نہیں مارا ۔ یہ محض ایک حادثہ تھا اور اس کے باوجود وہ مردہ ہیں . . . . . بالکل مردہ جیسے میں نے انہیں ارادتاً چاقو یا بندوق سے مارا ہو . . . غفلت . . . . . ایک خواب آلود لمحہ . . . . . بے توجہی کا ایک ذرا سا اظہار . . . . . اور میں پرسکون ہوں . . . . . قطعی پرسکون . . . . . مجھے اس گھر کو اکھاڑ پھینکنا چاہیئے تھا ، زور زور سے رونا چاہیئے تھا ۔ پتھر کے بت کی طرح گونگا ہو جانا چاہیے تھا یا ان کی سرد نعشوں کو جھنجھوڑنا

میں سے کر درد ناک بین کرنے چاہئیں تھے۔ لیکن آخر کس لیے . . . . . کیوں . . . . . ان کا گوشت، ان کی چربی، ان کی ہڈیاں اپنا کام چھوڑ چکی ہیں . . . وہ صرف بے جان گوشت کے ڈھیر ہیں . . . . اب کوئی مسیحا ان میں روح نہیں پھونک سکتا . . . . مگر ان کی موت کس قدر غیر حقیقی ہے کہ مجھے اب تک اس موت کا یقین نہیں آ رہا . . . . . شاید یہ سب کچھ ایک مذاق ہو، ایک دھوکا ہو۔

لڑکے نے حقے کا ایک گہرا کش لیا اور منہ پھلا کر دھواں چھوڑ دیا۔

——— "اوئے پھر اگھڑی والیا"

——— "کیا ہے؟"

——— "اب تم کیا کرو گے؟"

ڈاکٹر نے کندھے جھٹکا کر لڑکے کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

"اگر میں تمہاری جگہ ہوتا . . ."

——— "بکواس بند کرو۔"

ڈاکٹر پلنگ پر سے اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چل کر باہر جانے لگا۔

——— "بھئی کہاں جا رہے ہو؟"

ڈاکٹر رک گیا اور گردن موڑ کر لڑکے کو دیکھنے لگا۔ پھر اسی طرح چلتا ہوا باہر آ گیا اور گھر کے سامنے زمین پر ہی، سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

جنگل تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ درخت اتنے گھنے ہو گئے تھے کہ چاندنی بھی ان کی شاخوں میں الجھ کر رہ گئی تھی اور زمین تک نہ پہنچ پاتی تھی۔ نتو نے احتیاط سے اپنا بازو آگے بڑھایا اور اندھیرے میں ایک جھکی ہوئی شاخ تلاش کر لی۔ اس شاخ کے ذریعے وہ درخت کے تنے تک پہنچ گئی۔ وہاں سے اسے ایک نئے درخت کی شاخ ہاتھ آ گئی۔ اس کے سہارے وہ دوسرے درخت پر پہنچ گئی اور یوں وہ شاخوں کی رہبری میں درخت درخت اپنا سفر طے کرتی رہی اور اپنے تلووں کے تلے شبنم کا لوچ محسوس کرتی رہی۔ جنگل میں جنگلی جانوروں کا شور اور نقل و حرکت مسلسل جاری تھی اندھیرے میں درخت یوں دکھائی پڑ رہے تھے جیسے کسی گم گشتہ گلے کے سیاہ فام، خمیدہ چرواہے ہوں۔

جب آگے بڑھنے کی ہمت جواب دے گئی اور پاؤں میں چھالے پڑ گئے تو وہ نہر کی طرف لوٹ آئی۔ وہاں اس نے دیکھا کہ نہر کے پانی میں چاند کے کئی ٹکڑے تیر رہے تھے۔ ایک خرگوش نے اپنی گول گول آنکھوں سے اسے گھورا اور پھدکتا ہوا لمبی گھاس میں غائب ہو گیا۔ مینڈکوں کی ٹراہٹ موقوف ہو گئی اور کنارے پر بیٹھ کر اپنی انگلیوں سے پانی کی سطح کو چھونے لگی اور پھر بڑی خاموشی سے اس نے اپنے جوتے اتار کر نہر میں بہا دیے۔ پانی پانی سرل سرل بہتا رہا۔

——— "اوئے پھر اگھڑی والیا"

——— "کیا ہے؟"

——— "تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں"

ڈاکٹر بدستور سر پکڑے بیٹھا تھا اور لڑکا اس کے لیے بڑی پریشانی کا اظہار کر رہا تھا۔

یہ شاید مجھے مجرم سمجھتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید آج سے ہر ایک مجھے مجرم سمجھے گا۔ چونکہ میں بے حد پرسکون ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شور، غل، بکواس، بے مقصد تفتیش سزا، جرمانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میں تو جیل جانے سے بھی نہیں ڈرتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو خود موت کے گھاٹ اتر چکا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے جیل بھیج کر انہیں کیا مل جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ڈرتا ہوں ان فضولیات سے جو انکوائری کے دوران رونما ہوں گی۔ ڈاکٹر کا ہاتھ خود بخود اس کی گود میں آگرا۔ اس کے چہرے کے پٹھے کھنچ گئے تھے اور وہ مسکرا رہا تھا۔

میں اس فضول انکوائری کا شکار نہیں بنوں گا۔ میں خودکشی کر لوں گا۔ لیکن لوگ کیا کہیں گے۔ یہی نا کہ میں نے شرمندگی کے مارے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا ہے۔

لڑکے نے زرافے کی مانند گردن اچکا کر دور شمال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"او ئے بھرا گھڑی والیا"

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ابا اور اماں گڈا لیے آ رہے ہیں"

ڈاکٹر نے چونک کر سر اٹھایا۔

"کتنی دور ہیں؟"

"وہ دیکھو، بلوچوں کی ڈھوکوں کے قریب سے، نور سے کے سرسبز ٹیلوں کے قریب سے اور چھوری والے ٹوبے کے قریب سے بیل قلانچیں بھرتے آ رہے ہیں"

ڈاکٹر بے ساختہ مسکرا اٹھا۔

آ گیا کمبخت اپنے لئے کی بولی پر۔

ڈاکٹر وہیں بیٹھا اپنے پیر کے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگا اور لڑکا بدستور شمال کی طرف دیکھتا رہا۔

نجات کا کوئی کنارا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوست، ملازمتیں، روزمرہ کے معمول، اچھی کتابیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ننگے پاؤں زمین پر چلنا چاہتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یوں کہ میری آنکھیں بند ہوں اور مجھے موت کا کوئی خوف نہ ہو اور اوس میں بھیگی ہوئی ہوا میرے سارے گناہ دھو ڈالے۔

ایکا ایکی ڈاکٹر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے قے کرنی شروع کر دی۔

نہ تو کچھ ہوا تھا اور نہ ہی کوئی تبدیلی عمل میں آئی تھی۔ لیکن اس سے کیا ثابت ہوا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ بھی تو نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر وہ اس کے لیے واپس نہیں آیا تو کیا ہوا۔ دوسرے بھی تو موجود ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بے قابو، طوفانی جوانیوں کو تنظیم و ضبط کی تلقین کرنے والے وہ جو بدترین روحانی بے پروبالی اور جسمانی عذاب کو بازو سمیٹے بڑے سکون سے دیکھتے رہے۔ عظیم انسان جنہوں نے ہر تقدس کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا جنہوں نے مذاق اڑایا، جنہوں نے دھتکارا اور جنہوں نے تباہ کیا۔ وہ جنہوں نے اپنے سبز مغفر بڑی کاہلی کے ساتھ جھکا لیے تاکہ اپنے بے رحم

قہقہوں کی گونج اچھی طرح سن سکیں اور جب تمام جوابیاں درختوں پہ شہید ہو گئیں تو انھوں نے جنگل میں نئے شکار کی تلاش شروع کر دی . . . . . وہ نموّ کو چاروں طرف سے گھیر لیں گے ۔ انھوں نے بڑے بڑے مغفر اوڑھ رکھے ہونگے ، ان کے بازو ننگے ہونگے وہ خوفناک قہقہے لگائیں گے اور اس کی شلوار کے پائنچے اوپر اٹھا کر اس کی بے بس پنڈلیوں میں اپنی لوہے کی ایسی انگلیاں چبھوئیں گے ۔ انکے قہقہوں کا شور ایسا ہی ہوگا جیسا برف پر لڑھکتی ہوئی چٹانوں کا شور ہوتا ہے ۔

نموّ آہستہ سے نہر میں پھسل گئی ۔ پانی اس کی چھاتی تک آ رہا تھا ۔ اس کی قمیص میں پانی بھر گیا تھا اور وہ پھولے ہوئے غبارے کی مانند سطح آب پہ تیر رہی تھی ۔ ہوا بند تھی اور پرندے صبح کی ٹھنڈک میں خاموش تھے ۔ مشرق میں سورج کی کرن یوں انگڑائیاں لے رہی تھی جیسے سہاگ رات کو سوکر کوئی شرمیلی دلہن اٹھ رہی ہو ۔ ندی کی لہر لہر پہ شاداب رنگوں کا منوالارقص تھا اور نموّ پانی کی یخ بستگی میں بے حد سکون محسوس کر رہی تھی ۔

———" اوئے پھر اگنڑی دالیا ۔"

" اکھیاں تاں کھول گڈا آ گیا ای ۔"

اور جب ڈاکٹر نے آنکھیں کھولیں تو ایک بڑا سا گڈا جس پر کئی دیہاتی لدے ہوئے تھے ، دھول اڑاتا اس کی طرف آ رہا تھا ۔ وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا اور گڈے والوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اسٹیشن ویگن کی طرف بھاگ گیا ۔

جب وہ اسٹیشن ویگن کے قریب پہنچا تو اس نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا ۔ لیکن نگاہوں کی زد میں کوئی نہ تھا ۔ وہ اسٹیشن ویگن کی طرف مڑا اور کھلے ہوئے دروازے میں سے رضیہ کے مردہ جسم کو دیکھنے لگا ۔ رضیہ کی لاش پر چند کیڑے چہل قدمی کرنے میں مصروف تھے ۔ ڈاکٹر نے لاش کا سرد بازو تھام کر باہر نکالنے کی کوشش کی ۔ لیکن اس کا مردہ جسم کسی وزنی پتھر کا ایسا بھاری ہو گیا تھا ۔

———" ڈاکٹر"

ڈاکٹر کے ہاتھ سے رضیہ کا بے جان ہاتھ چھوٹ گیا اور لاش سیٹ پر اوندھے منہ گر گئی . . . . . ڈاکٹر کے پیچھے نموّ کھڑی تھی ۔ اس کے پاؤں ننگے تھے ۔ گیلے کپڑے جسم کے ساتھ چپک گئے تھے ۔ بھیگے بال کندھوں پر ہولے ہولے بل کھا رہے تھے اور نہر کی شبنمی پانی کے درخشاں قطرے صبح کی اولین روشنی میں اس کے چمپئی رخساروں پر یوں دمک رہے تھے جیسے چاند اور سورج نے کہکشاں کی ردائیں اوڑھ لی ہوں ۔ وہ بڑی شگفتگی سے مسکرا رہی تھی ۔

" تمہارے جانے کے بعد جب میری آنکھ کھلی ڈاکٹر تو میں جنگل میں نکل گئی اور پھر نہر میں تیرتی رہی ۔ میں نے اتنا اچھا پانی کبھی نہیں دیکھا ڈاکٹر ۔"

یک دم اسے یاد آیا کہ بھیگے ہوئے لباس میں اس کے جسم کا ہر پیچ و خم نمایاں ہو رہا ہے ۔ اس نے نئی نویلی دلہن کی طرح شرما کر اپنا جسم چرا لیا ۔

———" پانی رات کے سمے گدلا گدلا سا لگتا تھا ۔ لیکن اب تو یوں لگتا ہے جیسے سپید موتی پگھل رہے ہوں . . . . . مجھے یہاں کوئی جانی پہچانی شکل نہیں ملی اور کار میں میرا دم گھٹنے لگا تھا . . . . . بہرحال یہ جگہ بہت پیاری ہے ۔ وعدہ کرو ڈاکٹر کہ ہم ایک بار پھر یہاں

ضرور آئیں گے۔ لیکن صرف تم اور میں، اور کوئی ہمارے ساتھ نہ ہو گا۔"

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اڑتے ہوئے ونڈ شیلڈ میں سے ایک ترچھی اکھڑ کر کار کے بونٹ پر گر گئی۔ ڈاکٹر دو قدم آگے بڑھا اور نمو کے جسم کو اپنی کہنی سے ضرب لگائی۔ نمو ایک لمحے کے لیے لڑکھڑائی اور پھر اپنی آنکھوں میں حیرانی لیے چپ چاپ پرے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

تب ان دونوں نے پشیمانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اپنے جسم کے اس حصے کو سہلانے لگی جہاں کہنی کی ضرب لگی تھی۔ اب اس کے چہرے سے حیرانی کا تاثر غائب ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک مکمل سنجیدگی نے لے لی تھی . . . . . اس نے آہستہ سے کہا۔

"ڈاکٹر کیا مجھے بھی مر جانا چاہیے تھا؟"

ڈاکٹر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس لمحے یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کبھی پاگل پن کی مریض تھی۔

"نہیں تمہیں نہیں مرنا چاہیے تھا اور نہ ابھی مرنا چاہیے۔"

ڈاکٹر کی آواز میں صبح کی تازگی تھی . . . . . نمو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی افشاں بکھر گئی اور وہ ڈاکٹر کے مضبوط بازوؤں میں سمٹ آئی اور پھر یوں ہوا کہ ڈاکٹر بھی اس کے رخساروں پر آنکھیں رکھ کر، حادثے کے بعد پہلی بار زار و قطار رو دیا۔

وہ یونہی ایک دوسرے کے بازوؤں میں سمٹے کھڑے رہے اور گڈے کے بیلوں کی گردنوں میں لٹکی ہوئی گھنٹیوں کی آواز قریب آ گئی جیسے ایک پاس کئی ننھے ننھے گجر ایک ساتھ بج اٹھے ہوں۔

غلام محمد

محوِ سفر

اُس شخص نے جواب دیا کہ مقدس علی ڈھاکا چلا گیا ہے ۔

ڈھاکا ؟

وہاں جو آدم جی نگر ہے نا ۔

ہاں ہاں

وہیں رہتا ہے ۔اس نے جوٹ مل میں نوکری کر لی ہے ۔

باقی لوگ تو خیریت سے ہیں ؟

چیربن کا لڑکا لاہور میں ہے ۔ وہیں پڑھتا ہے ۔ سُننے میں آیا ہے کہ وہ کسی پنجابن سے شادی کرنے والا ہے ۔

غضنفر میاں کہاں ہیں ؟

پچھلے برس ان کا انتقال ہو گیا ۔

حکیم صاحب بہت پریشان حال ہیں ۔ بلکہ پریشانی پورے گاؤں پر آئی ہے ۔ ہر پانچواں آدمی نوکری کی تلاش میں باہر چلا گیا ۔ جورو گیا ہے ۔ وہ کبھی کھیتوں کو دیکھتا ہے اور کبھی آسمان کو ۔

دیپک ؟

وہ ڈھاکا جا کر بلبل اکادمی میں ٹیچر ہو گیا ہے ۔اس کی ایک بہن کسی کے ساتھ کلکتہ بھاگ گئی ۔

دوسری ؟

دوسری بہن فحاشہ ہے ۔ چھی !

میں کبھی تصور نہیں کر سکتا کہ ۹ برس کے اندر مشرقی بنگال کے ایک گاؤں میں اتنی بڑی بڑی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو سکتی ہیں ۔ دکھوں کی ایک لہر دیکھی جو لاہور، کراچی اور ڈھاکا سے نکل کر دور افتادہ گاؤں دیہاتوں پر پھیل گئی تھی ۔ ہر شخص پر اُداسی ۔ جسے دیکھئے وہ متاثر ہے ۔ ۹ برس پہلے اس ڈاک بنگلو میں بجلی نہیں تھی ۔ میں نے پورب کی طرف والے کمرے میں ایک ماہ قیام کیا تھا ۔ جھروکے پہ ایک چھوٹی سی بچی کھڑی ہے ۔ ۵ ۔ ۶ برس عمر ہو گی ۔ کبوتروں کو غٹر غوں غٹر غوں کرتے دیکھ رہی ہے ۔ خدا جانے وہ بڑی ہو کر اس گاؤں کو کس رنگ روپ میں پائے ۔ ہر شے بدل رہی ہے ۔ مگر وہ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک ویسی ہی ہے ۔اس کے کنارے کنارے کرشنا چورا کے درخت ایستادہ ہیں ۔ وہی درخت ہیں ۔ اسی حال میں ہیں ۔ مگر اُن پر نو دفعہ بہار آئی ہے اور نو دفعہ خزاں ـــ

تائی آکاشے رنگیر ما یا لاگے
باتاشے سُورو بھی آ جو پائی ———

اُس شخص نے کہا ہے کہ حکیم صاحب بہت پریشان حال ہیں ۔
وہ ۹ برس پہلے تو بہت خوشحال تھے ۔
ان کے کھیتوں پر دھان کی چار فصلیں ہوا کرتیں ۔ ہلدی کے کھیت بھی تھے ۔ اور تمباکو کے بھی ۔
مگر رآنی کہاں ہے ؟
کیا اس کی شادی ہو گئی ؟ میں نے اُسے ایک خط بھی نہیں لکھا ۔
اتنے دن ہو گئے ۔

میں چلتے چلتے سڑک پر سے کھیتوں میں اُتر گیا ۔ پوری کائنات بدل گئی ۔ اینٹ پتھر ۔ سمنٹ بالو ۔ لوہے کی سلاخیں ۔ موٹر کرین میں نے نصف درجن "رائس مل" اپنی آنکھوں سے دیکھیں ۔ اسٹیشن کے پاس ایک موٹر ورکشاپ بنا ہے ۔ وہاں پہلے بازار لگا کرتا تھا ۔ لوگ دُور دُور سے ساگ سبزی، مچھلی ترکاری، مرچ پیاز وغیرہ بیچنے کے لئے لاتے تھے ۔ گائے کا گوشت دو تین ہفتے کے بعد ایک دفعہ بکنے کو آتا ۔ لوگ اس پر ٹوٹ پڑتے تھے ۔ ویسے ہفتے دو ہفتے کے بعد دس بارہ گھر آپس میں ٹٹ کر کے بکرے ذبح کر لیا کرتے ۔ میں نے بازار میں کئی شامیں گزاریں ۔ جیتی تڑپتی مچھلیاں، ادھ مری مچھلیاں، سوکھی مچھلیاں سامنے ٹوکروں میں یا تختوں پر رکھی ہوئی ہیں ۔ مچھیرے ہاتھ ہلا ہلا کر مکھیاں اڑا رہے ہیں ۔ گاہکوں سے مول تول کر رہے ہیں ۔ لوگوں کا اژدہام ہے ۔ دھکم پیل ہو رہی ہے ۔ ایک طرف پان اور سپاری بکتی ہے ۔ ایک طرف سگریٹ ۔ دیا سلائی ۔ بلیڈ ۔ سوئی دھاگے ۔ پلاسٹک کے کھلونے ۔ ایک طرف سڑکیہ حکیم ترنم سے دوائیاں بیچ رہا ہے ۔ ایک طرف مداری کھیل تماشے دکھانے میں محو ہے ۔

میں نے سوکھی مچھلی کبھی نہ کھائی تھی ۔ اس کے تعفن سے جی متلانے لگتا ۔ چنانچہ میں نے رانی سے کہا تھا کہ تم لوگ اسے کیسے کھاتی ہو ؟
کیا آپ نے کبھی نہیں کھائی ۔
کبھی نہیں ۔
اچھا میں آپ کو سوکھی مچھلی پکا کر کھلاؤں گی ۔
نہیں نہیں شکریہ ۔
وہ بہت زور سے ہنسی ۔ دیکھئے جمیل صاحب اس میں ایک ذرا تعفن نہ ہوگا ۔ بہت مزیدار ہوتی ہے ۔
گولی مارو ۔ مجھے تو قے آنے لگتی ہے ۔ چھی ۔ کیسی بو آتی ہے ۔
حکیم صاحب بولے کہ نہیں سوکھی مچھلی بہت لذیذ ہوتی ہے ۔ اور ۔ رآنی بہت عمدہ پکاتی ہے ۔ کھا لیجئے گا ۔ مگر ہاں بہت احتیاط سے کھائیے گا کہ وہ پیٹ میں جا کر ڈبل روٹی کی طرح سے پھولتی ہے ۔
کھانے پر رانی موجود ۔ مسکرا رہی تھی ۔ پنکھا لے کر آئی تھی ۔ دسترخوان پر سامنے بیٹھ گئی ۔ میں نے کہا کہ رانی جاؤ ۔

میں پنکھا جھل دوں ؟

نہیں ۔

گرمی لگے گی ۔

نہیں بھائی ۔ میں نے کہا ۔ یہ بھی کوئی گرمی لگنے کا موسم ہے ۔ فروری کا اتنا حسین موسم ۔

اتنا حسین موسم ۔ کھائیے ۔ تو پتہ چلے گا ۔

میں کھیتوں پر سے گزرتا جا رہا تھا ۔ نزدیک سے ایک شخص گزر گیا ۔ ٹوکری میں سوکھی مچھلیاں لئے جا رہا تھا ۔ مگر اب مجھے سوکھی مچھلیوں سے متلی نہیں آتی ۔ بلکہ جب سے میں نے رانی کے ہاں سوکھی مچھلی کھائی تھی زبان پر ایسا ذائقہ بیٹھ گیا تھا کہ محض گرم گرم سیخ کباب سے اس کی کسی قدر تلافی ہو سکتی تھی ۔ مجھے سوکھی مچھلی کھاتے کھاتے پسینہ آنے لگا ۔ اور اتنا پسینہ چلا ہے ۔ اتنا پسینہ چلا ہے کہ پہلے میں نے خود پنکھا جھلا ۔ پھر رانی سے کہا کہ پنکھا جھل دو ۔ رانی نے ہنس کر کہا کہ میں نہ کہتی تھی کہ آپ کو کمبل اڑھا کر آئس کریم کھلاؤں گی ۔

میں نے بارہا سوچا کہ سیخ کباب اور سوکھی مچھلی کے ذائقے بڑی حد تک مماثل ہیں ۔ مگر یہ دونوں چیزیں دو مختلف تہذیبوں کی خبر دیتی ہیں ۔ میں سیخ کباب کا رسیا ۔ رانی سے مل کر سوکھی مچھلیوں کا کیسا دلدادہ ہو گیا ہوں ۔ مگر رانی تو خیریت سے ہے ۔ ؟ اس کا گھر دکھائی دیا تو یہ تشویش میرے دل میں پیدا ہوئی ۔

میں نے اس سے کتنے وعدے وعید کئے تھے ۔

ہم لوگ اس پلاس کے نیچے بیٹھے تھے ۔ چاندنی رات تھی ۔ رانی نے ہلکے ہلکے مجھے گیت گا کر سنائے تھے ۔

ایک ایک لمحے کے سینے میں ایک ایک داستان پوشیدہ ہے

داستان جو ——————

میں نے اس کی پلکوں پر آنسوؤں کی کہکشاں دیکھ کر کہا تھا ۔ کہ رانی

کیا ؟

پلاس کبھی نہیں روتا ۔ اس نے بھی بہت دکھ اٹھائے ہیں ۔ ہر شخص دکھی ہے ۔ ہر شخص زخمی ۔

مگر جمیل صاحب ۔

ہاں ۔

آپ پھر کب آئیے گا ؟

میں نے اس سوال کا جواب دیا تھا ۔ جو آج ۹ برس کے بعد ایک بہت بڑا جھوٹ ثابت ہوا ۔ اس پر میں تو جی لوں گا ۔ بلکہ اتنے دنوں سے جی رہا ہوں ۔ مگر خدا جانے رانی پر کیا گزری ہے ؟ میں نے بہت سوچا کہ چل کر اس سے ملاقات کر لوں ۔ یا اسے ایک خط ہی لکھ دوں ۔ مگر سوچتا رہ گیا ۔ دفتر کے مسائل کچھ ایسے پیچیدہ رہے کہ مجھے ۹ برس میں سچ پوچھئے ایک لمحہ فرصت نہ ملی ۔ آج یہاں ۔ کل وہاں — کتنے حادثات ہو گزرے ۔ بیجی محترمہ کے انتقال کے بعد گھر پر ایک سناٹا طاری ہو گیا ۔ دوست احباب نے مشورہ دیا کہ بھائی اپنی

زندگی کو ترتیب دو۔ تو پہلی دفعہ مجھے ۹ برس کا اتنا طویل فاصلہ محسوس ہوا۔

کٹھل کے پیڑ تلے حکیم صاحب ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی داڑھی اور سر کے بال سفید ہوگئے تھے۔ وہ اپنی پیشانی سے پہچانے گئے۔ ان کے بدن پر دو بچے لدے ہوئے تھے۔ اور ان کا منہ پکڑ کر اپنی توتلی زبان میں کچھ بول رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر حکیم صاحب پہلے ساکت رہ گئے۔ اور میں اپنی جگہ منجمد۔ پھر وہ زور سے چلائے۔ کون۔ جمیل میاں ؟

السلام علیکم حکیم صاحب۔

علیکم السلام۔ وعلیکم السلام۔ وہ مجھے سینے سے لگا کر بولتے رہے۔ کیسے ہو جمیل۔ کیسے ہو؟

آپ کیسے ہیں ؟

اُن کے چہرہ پر دفعتاً پژمردگی چھا گئی۔ کیسا ہوں۔ بس زندہ ہوں۔ اچھے دن دیکھے۔ اب برے دن دیکھنے کو جی رہا ہوں

کیا ہوا ؟

میرا بڑا لڑکا جو پاکستان ایئر فورس میں تھا۔ ہوائی جہاز کے حادثہ میں مرگیا۔ یہ اسی کے بچے ہیں۔

بچوں نے اُداس ہو کر مجھے دیکھا۔ دھان کے کھیت ریکوزیشن ہوگئے۔

۴ برس پہلے جو سیلاب آیا تھا اس میں اناج بھی ضائع ہوئے اور مویشی بھی۔

میں نے کھیت بیچ کر مویشی خریدے اور گھر مرمت کرایا۔

مگر وہ کھیت جو ریکوزیشن ہوگئے ہیں۔ بہت زرخیز تھے۔ دھان کی چار فصلیں ہوتی تھیں۔

مگر حکیم صاحب وہ کھیت کیوں ریکوزیشن ہوگئے ؟

وہ سڑک کے کنارے تھے۔ وہاں حکومت شیشہ بنانے والی ایک فیکٹری قائم کرے گی۔

اور کیا حال ہیں ؟

اور کیا پوچھتے ہو جمیل میاں۔ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ چلو۔ بہت تھکے ہوئے ہو۔ اندر چلتے ہیں۔

تو یہ بچے آپ ہی کے ساتھ رہتے ہیں ؟

ہاں۔ اور رانی شادی کے دوسرے ہی برس بیوہ ہوگئی۔

ہیں ؟ ۔ بیوہ ہوگئی ؟؟

بیوہ ہی تو ہے۔ ۸ برس ہوگئے۔ اس کا شوہر جانے کہاں لاپتہ ہوگیا ہے۔

اس کے بچے ہیں ؟

حکیم صاحب نے چوکھٹ پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ نہیں۔ کوئی بچہ نہیں ہے۔ رانی میرے ہی ساتھ رہتی ہے۔ غالباً ابھی اسکول سے نہیں آئی۔

اسکول ؟ اسکول سے اس کا کیا تعلق ہے ؟؟

وہاں پڑھاتی ہے ۔ وہ تو اس کے بھائی مرحوم نے تعلیم دلوائی تھی کہ اب کام آرہی ہے ۔

پھر کوئی نصف گھنٹہ کے بعد رانی آئی ۔ مجھے ٹھٹھک کر دیکھا ۔ ابرو نصف دائرہ کی صورت آنکھوں پر کھنچ آئی ۔ حکیم صاحب بولے بیٹی ۔ یہ جمیل میاں ہیں ۔ تم نے پہچانا نہیں ؟

جمیل صاحب ۔ آداب ۔

کیسی ہو ؟

خدا کا فضل ہے ۔

چہرہ پر ایک اُداسی تھی ۔ جو میری نظر میں رانی کے لئے بہت خلاف معمول تھی ۔ مجھے بہت دکھ ہوا ۔ وہ خیریت پوچھ کر اندر چلی گئی ۔ میں یہاں ہفتہ عشرہ کے لئے آیا تھا ۔ حکیم صاحب نے میرے لئے ایک کمرہ خالی کروا دیا ۔ رانی سے میری تنہائی میں ملاقات ہوئی ۔ مگر مجھے اُس میں پہلے کی سی بات نظر نہیں آئی ۔ ویسے ۹ برس گزرنے کے بعد بھی اس کے خط وخال پہلے ہی کے ایسے تھے بلکہ نکھر آئے تھے ۔ صحت بہتر ہو گئی تھی ۔ میں نے اس میں زیادہ کشش محسوس کی ۔

دوسری رات کی بات ہے ۔ میں اپنے کمرہ میں لیٹا ہوا تھا ۔ ½۱۲ بجے ہوں گے ۔ ایک کتاب پڑھ رہا تھا ۔ نظریں کتاب کے صفحات پر سے پھسل کر رانی کے کمرے کی جانب گئیں تو رانی نظر آئی ۔ فرش پر شیتل پاٹی بچھا کر اُس پر بستر لگائے بیٹھی تھی ۔ سامنے کاغذات کا ایک انبار تھا غالباً امتحان کی کاپیاں دیکھ رہی تھی ۔ لالٹین کی سُنہری روشنی اس کے تمتماتے ہوئے سرخی مائل چہرے پر پڑ رہی تھی ۔ اور ایک ایک نقش واضح کر رہی تھی ۔ آنکھیں ویران ۔

ضبط کا یارا نہ رہا ۔ میں اُٹھ کر سیدھا اس کے کمرے میں پہنچا ۔ حکیم صاحب سو چکے تھے ۔ تیسرے کمرہ سے اُن کے بھرپور خراٹے سُنائی دے رہے تھے ۔

رانی ـــ

جی ۔ اس نے سر جھکا لیا ۔ اس نے اپنے سر کے بالوں کی بیچ سے مانگ نکالی تھی ۔

تم اتنی کھنچی کھنچی کیوں رہتی ہو ؟

دیکھئے جمیل صاحب ۔ میں ایک بیاہتا عورت ہوں ۔ میرے بدن کو ہاتھ نہ لگائیے ۔

مگر تمہارا شوہر ـــ

شوہر ؟

وہ تو تمہیں چھوڑ گیا ہے

اُس نے شدید غصہ کے عالم میں مجھے دیکھا ۔ لگا جیسے غلطی سے ایک ناگ پر پاؤں پڑ گیا ۔ پھر اُٹھا ۔ پھنکارنے لگا ۔ اس نے کچھ اسی بپھرے ہوئے انداز میں مجھے گھور کر دیکھا ۔ یعنی بس چلتا تو میرا چہرہ نوچ لیتی ۔ کہ میں نے اس کے شوہر کے بارے میں ویسا کہا ۔

اس کے ہونٹوں میں سے طنز میں بجھے ہوئے تیر نکلے ۔ جمیل صاحب ۔ اور ۔ آپ نے کیا کہا ؟

میں نے ؟ ۔

میرے کان بجنے لگے ۔ کرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا ۔

چپ رہئے ۔ دوسروں کو بُرا کہتے ہیں ۔ وہ ایسے نہیں ۔ وہ ایسے ——

رو پڑی ۔ اور ۔ اپنے ہاتھوں کی مستطیل میں منہ چھپا کر سسکنے لگی ۔ اس کے شانے لرز رہے تھے ۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا ۔ میں نے نہایت ہی بھونڈے طریقے سے گفتگو کا آغاز کیا تھا ۔ جس کا احساس اب ہوا ۔ بات اس کے دل پر ایک تیر کی مانند جا لگی ہے ۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا ۔ رانی سنو ۔ میں نے بھی تمہیں بہت دکھ دیئے ۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ حالات —— میں نے پہلی دفعہ رانی کا بدن چھوا تھا ۔ غالباً یہی وہ کشش تھی ۔ جس نے مجھے تین روز پہلے اتنا بے چین کر دیا ۔

۹ برس پہلے وہ پلاس کے نیچے بیٹھ کر گا رہی تھی ؎

ایک ایک لمحہ کے سینے میں ایک داستان پوشیدہ ہے ۔

داستان جو اضطراب و حرکت کے واقعات سے پُر ہے ۔

اضطراب جو ازل سے ہے ۔ اور ابدی ہے ۔

حرکت جو زندگی ہے ۔

تو چاندنی کی آنچ میں اس کا بدن سلگ رہا تھا ۔ اونچا قد ۔ سڈول ۔ متناسب بدن ۔ بھری بھری بانہیں ۔ چہرہ پر دو لٹیں بکھری ہوئی وہ اب حسین تر تھی ۔ میں نے اسے تقریباً اپنی آغوش میں لے کر کہا کہ رانی ہر شخص دکھی ہے ۔ میں بھی دکھی ہوں ۔ اور ۔ تم بھی ۔

بہت رو چکی تھی ۔ بولی ۔ نہیں ۔ جمیل صاحب ۔ مگر ۔ مگر ۔ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا ؟

۹ برس گزر گئے ۔

۹ برس گزر گئے اور ہم لوگ دو متوازی لکیروں کی صورت ایک دوسرے کی جستجو میں آگے بڑھتے گئے ۔ اتنے دن ۔ میں نے آپ کو ہمیشہ یاد کیا ۔ مگر کیا کر سکتی تھی کہ میں ایک عورت ہوں ۔

میں بھی —— گرچہ میں ایک مرد ہوں ۔

نہیں نہیں ۔ جمیل صاحب ۔ خدا کے لئے ——

مجھے تین روز پہلے ۹ برس کے فاصلہ کا احساس ہوا ۔

نہیں دیکھئے جمیل صاحب ۔ میں ایک بیاہتا عورت ہوں ۔ جمیل صاحب ۔ جمیل ۔ جمی ——

نہیں مگر مجھے شادی کرنے کا خیال پیدا ہوا ۔ تو

—— تو ؟ ۔

میں تمہی سے شادی کروں گا رانی —

مجھ - مجھ سے ؟

ہاں -

میں ہر صبح حکیم صاحب کے تالاب میں تیرتا تھا - جو چاروں طرف چمپا کیلے کے پیڑوں سے گھرا ہوا تھا - میں اس روز تیر نہ سکا - رانی کے خیالات مجھ پر غالب آ گئے رانی جواب مجھے ڈھاکا کی ایک عورت معلوم ہوتی تھی - ڈھاکا کی عورت جو لاہور میں بھی ہے اور کراچی میں بھی - بلکہ دنیا کے کسی بھی شہر میں - اس کا بدن جس کی میں نے اتنی شدت سے خواہش کی تھی اسی عورت کا بدن ہے ، جو نہ شعر و ادب ہے نہ حور ، نہ کسی شاعر کی کنواری البیلی غزل - مگر اسے کیا کیجئے گا کہ وہی رانی مجھے چار گھنٹے قبل خدا جانے کیا کیا لگتی تھی - تین روز سے میں سوچ رہا تھا کہ وہ کچھ اور ہے - یعنی عورت سے کچھ زیادہ ہے - اور یہ خیال پانی کی سطح پر پھیلتے ہوئے اس دائرہ کی طرح لگا جو پھیل کر وسعتوں میں گم ہو جاتا ہے - ایک کنگ فشر نے پانی میں ڈبکی لگا کر ایک مچھلی پکڑ لی - رانی ادھر سے گزری تو مجھے تالاب کے کنارے گم سم بیٹھا دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی نہا لیجئے -

نہا لوں ؟

اللہ - آپ کیسے غلیظ ہیں - مٹی پر اس طرح سے بیٹھے ہوئے ہیں

رانی - میں نے سانس لے کر کہا - مٹی پر ہنستی ہو - اسے غلیظ کہتی ہو - سوچ کر دیکھو - تم بھی مٹی ہو اور میں بھی - چنگیز خاں بھی مٹی تھا اور سکندر بھی - زلیخا بھی مٹی تھی اور یوسف بھی —

بس - بس کیجئے -

مگر سنو - کہاں جا رہی ہو - اسکول ؟

ہاں -

فوراً آ جانا -

گاؤں بھر میں یہ بات آگ کی مانند پھیل گئی کہ جمیل حکیم صاحب کی بیٹی سے بیاہ کرے گا -

وہ رانی ؟

مگر وہ ایک بیاہتا عورت ہے -

عشق چل رہا ہے عشق - پورے گاؤں میں چھٹکے پھر رہے ہیں - نہیں دیکھا اکٹھے تفریح کے لئے جاتے ہیں ؟

بھائی - وہ ۹ برس سے پھنسی ہوئی ہے -

کیا اسی لئے اس کا شوہر اسے چھوڑ گیا ہے ؟

اور نہیں تو کیا ؟

چھی —— !

حکیم صاحب بہت پریشان ہوئے ۔ مگر نہ مجھ پر اپنی پریشانیوں کا اظہار کیا نہ رانی پر ۔

رانی اور میں شام کو ٹہلنے کے لئے نکل جاتے تھے ۔ ہم لوگوں نے فیصلہ کیا تھا کہ افواہوں کا کوئی خیال نہیں کریں گے بلکہ خوب ڈٹ کران کا مقابلہ کریں گے چنانچہ ہمارے لئے یہ کوئی مسئلہ نہ تھا ۔ ویسے گاؤں کی پردہ نشین لڑکیاں رانی سے کترانے لگی تھیں کہ ان کے ماں باپ انھیں روکتے تھے ۔ یعنی وہ لڑکیاں رانی کے ساتھ رہ کر عشق کے فن میں طاق ہو جائیں گی ۔ پر پہلے اس واقعہ کا بہت اثر ہوا جسے میں نے ہنس کر اڑا دیا ۔ تو اس کے بھی خیالات بدلے ۔ مجھے کسی کی پرواہ تھی نہ کسی کا ڈر تھا ۔ اور چند روز کی قلیل مدت میں میں نے محسوس کیا کہ رانی کے اندر بھی ایک عجیب و غریب جرأت پیدا ہو گئی ہے ۔ وہ اور میں ٹہلتے گھومتے دوڑتے بھاگتے کیمرہ اور بندوق لئے پہاڑیوں پر چڑھ جاتے ۔

کھلی ہوئی فضا ۔

وسعت ۔

بلندی ۔

میں کبھی مناظر کی تصویر لیتا اور کبھی رانی کی ۔ رانی نے بندوق چلانا سیکھی اور پرندوں کا شکار کیا اور تصویر لی ۔ اور کھل کر باتیں کیں اور گیت سنائے اور ایک دم سے پہلے کی ایسی ہو گئی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ——

ایک رات میں نے سوچا کہ رانی مجھے کیوں پسند ہے

بدن ؟

نہیں —— وہ ایک عورت کا بدن ہے ۔

آواز ؟

نہیں —— وہ ایک گلوکار کی آواز ہے ۔

بے ساختگی ؟

نہیں —— وہ ایک نوجوان عورت ہے جسے میں اچھا لگا ہوں ۔

پھر ؟

معاً میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ غالباً وہ مرکب ہے ۔ اچھے بدن ۔ میٹھی آواز اور بے لاگ خلوص کا ۔ ہنس مکھ بھی ہے اور ملنسار بھی ۔ روتی بھی ہے تو جیسے "کنول کے پھول سے شبنم" جھلکتی ہے ۔ اور ہنستی ہے تو بیلے کے حسین پھول کھل اٹھتے ہیں ۔ موتی کے ایسے دانت ۔ پنکھڑیوں کے ایسے ہونٹ ۔ ریشم کی ایسی جلد بدن ۔ غالباً اسی واسطے وہ مجھے عزیز ہے کہ میں نے اس میں اپنی آرزوؤں کو مجسم پایا ۔

ایک روز حکیم صاحب کٹھل کے پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنے پوتوں سے کھیل رہے تھے۔ میں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ بیل گھوڑے جگالی کر رہے تھے اور بکریاں ممیا رہی تھیں۔ ایک مرغا پنکھ پسارے ایک طرف کو جھک کر اپنی مرغی کا طواف کر رہا تھا۔ میں نے کہا کہ حکیم صاحب میں رانی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور وہ بھی تیار ہے۔

حکیم صاحب نے مجھے چونک کر دیکھا۔ وہ بھی تیار ہے؟ خوش خوش زیرِ لب کہتے رہے۔ وہ میری بچی۔ رانی تجھ پر اُس شخص نے کتنا ظلم کیا۔

مگر تو نے کبھی اُف نہ کی۔ نہ گلہ کیا۔ نہ شکوہ۔

میں نے تجھے چھپ چھپ کر روتے دیکھا ہے۔

مگر تو جب بھی میرے سامنے آئی ہے۔ مسکرا کر بولی ہے کہ ابا جی۔ غم نہ کیجئے۔

میری بچی -!

حکیم صاحب کے چہرہ پر دکھ سکھ کی ملی جلی کیفیات ہویدا تھیں۔

میں وہاں سے اُٹھ کر رانی کی تلاش میں نکلا کہ وہ مجھے گھر پر نہ ملی تھی۔ پچھواڑے چمپا کیلے کے پیڑوں کے حصار میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ وہ تالاب میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے۔ اور کنکریاں اُٹھا اُٹھا کر پانی پہ پھینکتی جاتی تھی۔ میں پنجوں کے بل چلتا ہوا اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

کون؟ - وہ بل کھا کر بولی -

میں نے اس کے گالوں پہ چٹکی لی۔ میں ہوں۔

ہنسی۔ بولی - میں تو ڈر گئی تھی کہ

کہ آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ کسی فلسفہ پر غور کیا جا رہا ہے کیا؟ -

نہیں۔ ایسے ہی۔

تو سُنئے۔

کیا؟ -

مجھ سے پردہ کیا کرو کہ چاند کی ۱۴ تاریخ کو ہماری شادی ہو رہی ہے۔

شادی؟

چاند کا شادی سے گہرا تعلق ہے کہ اس کی کشش سے جب سمندر کی لہروں میں —

— بس۔ بس کیجئے۔

بیٹھو۔ سنو۔ کہاں جا رہی ہو۔ رانی۔ ایک بات میرے ذہن میں بہت شدت سے پیدا ہو رہی ہے۔ یعنی ہم لوگ سیخ کباب کھایا کریں گے یا سوکھی مچھلی؟

جو بہتر ہو -

تم ساڑھی پہنا کرو گی ۔۔ یا شلوار قمیص ؟

جو بہتر ہو ۔

تم اُردو بولو گی ۔ یا ۔ بنگالی ؟

چلیئے جمیل صاحب ۔ آپ مجھے خواہ مخواہ بور کر رہے ہیں ۔ یہ بھلا پوچھنے کی باتیں ہیں ۔ زبردستی بھی کوئی چیز مسلط کی جاتی ہے ۔ سیخ کباب یا سوکھی مچھلی ۔ ساڑھی یا شلوار قمیص ۔ اردو یا بنگالی میں سے بہتر وہی ہے ۔ جو زندگی بہتر طور پر گزارنے میں مدد پہنچا سکے ۔ مجھے وہی پسند ہے ۔

گویا اتنی دیر سے یہی سوچا جا رہا تھا ۔ چلو ۔

مگر جمیل صاحب ۔۔۔

۔۔۔۔ کیا ؟

ابا جی بہت پریشان حال ہیں ۔ کھیتوں سے اب کہاں گزر بسر ہوتی ہے ۔ اتنا اناج بھی پیدا نہیں ہوتا کہ اپنے کھانے پینے کے لئے کافی ہو ۔ اب تو ہمیں بازار سے چیزیں خریدنا پڑتی ہیں ۔ جو پہلے کبھی نہ ہوا تھا وہ آج ہو رہا ہے ۔ بھیا کا انتقال ہو گیا ۔ اچھے کھیت چلے گئے ۔ سیلاب سے تباہی مچی ۔ چنانچہ میں نے نوکری کر لی تھی ۔ کہ ½ ۱ سو روپے کی آمدنی ہر ماہ ہو جاتی ۔ اب وہ بھی چھوٹ جائے گی ۔

تو کیا ہوا ۔ حکیم صاحب کو ہم لوگ ڈھاکا بلا لیں گے ۔

وہ نہیں جائیں گے ۔

جائیں گے ۔

اور ہاں ۔ اس کے بارے میں کیا ہوا ۔ وہ ؟

وہ ۔ یعنی تمہاری پہلی شادی ؟

ہاں ۔

وہ معاملہ طے ہو جائے گا ۔ حکیم صاحب اور میں گفتگو کر رہے ہیں ۔

حکیم صاحب ڈھاکا منتقل ہونے پر رضامند نہ ہوئے ۔

ہمیں چھوڑنے کے لئے اسٹیشن پر آئے ۔ دفعتاً ان کی ضعیف آنکھوں سے آنسو کے قطرے چھلک پڑے ۔ بولے ۔ جمیل میاں ۔ یہ میرے پرکھوں کی زمین ہے ۔ اسی میں میرے پرکھوں کے بدن خاک ہوئے ۔ بڑی بڑی یادیں وابستہ ہیں ۔ میں کیسے اپنی جڑیں اس زمین سے منقطع کر لوں ۔ اسی پر میں نے آنکھیں کھولی ہیں ۔ بچپن گزارا ہے ۔ جوانی گزاری ہے ۔ سرد و گرم دیکھا ہے ۔ اس زمین سے میرا دکھوں کا رشتہ ہے ۔ جمیل میاں میں یہاں سے جا کر کبھی خوش نہیں رہ سکتا ۔ ویسے تم لوگوں کو دیکھنے آجایا کروں گا ۔

گاڑی چل پڑی ۔ مجھے رانی کے اندر عورت پر ایک ذرا تعجب نہیں ہوا کہ عورت اپنی تکمیل کے لئے مرد کا سہارا تلاش کرتی ہے ۔

جس سے اسے ایک تخلیق چاہیئے۔ وہ بے قصور ہے۔ حوا کی بیٹی ہے۔ مگر حکیم صاحب۔ بہت اُداس تھے۔ غالباً اس لئے اداس تھے کہ وہ خواہش کے باوجود اپنی پرکھوں کی زمین سے ناطہ نہیں توڑ سکتے تھے۔

نہ بیٹی کی جدائی برداشت کر سکتے تھے۔

کہ بیٹے نے ایسا داغ مفارقت دیا۔ جو لہو بن بن کر اُن کے دل سے ٹپک رہا تھا۔

نہ بیٹی کی خوشیوں کی راہ میں حائل ہو سکتے تھے

وہ اپنے پوتوں کو دیکھ دیکھ جئیں گے۔ ہنسیں گے۔ روئیں گے۔

کہ یہ آدم کی سرشت میں داخل ہے۔

اُن کی سفید داڑھی کے نیچے گلے پر رگیں اُبھر آئی تھیں۔ کھڑے تھے۔ مگر لگتا تھا جیسے وہ ابھی اُڑ کر زمین پر گر پڑیں گے۔ وہ اپنے آپ کو کس قدر تنہا محسوس کر رہے ہوں گے۔ چاروں اور سناٹا۔ ہاتھ ہلا رہے تھے۔ کھڑے تھے۔ چلتی گاڑی کو دیکھ رہے تھے۔ جو ہر لحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ حکیم صاحب پہلے ہی بوڑھے ہو گئے تھے۔ مگر وہ مجھے پہلے کبھی اتنے بوڑھے نہ دکھائی دیے تھے۔

پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے چپکے سے آ کر میرے کانوں میں کہہ دیا کہ جمیل پوری کائنات محو سفر ہے۔ تو کس سمت جا رہا ہے کیوں جا رہا ہے۔ کہاں تیری منزل ہے۔ سوچا بھی ہے کبھی؟ -

نوید انجم

بوندیں موم کی

وہ کچھ ایسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ دودھ اُبل کر دیگچی سے باہر بہنے لگا اور جب وہ گھبراہٹ میں دیگچی چولھے سے اتار کر نیچے رکھنے لگی تو کچھ چھینٹیں ننگے پاؤں پر جا پڑیں۔

"اُف" اس نے تکلیف دبانے کو دانتوں سے ہونٹ کاٹے۔

"رضو۔ لے ننھو میاں کی کھردری آواز اس لمحے بڑی بُری لگی اور چہرے کی کھنچی ہوئی نسوں کو یونہی کھنچا چھوڑ اس نے غصّہ سے چولھے میں پھونک ماری تو راکھ اڑ کر اس کے چہرے پر آ پڑی۔

جھنجھلا کر وہ زمین پر دھپ دھپ پیر مارتی اٹھ کھڑی ہوئی اور کولھوں پر اپنے ہاتھ دھر کر روہانسی ہو کر اس نے جیسے گلے ہی میں سسکیاں ضبط کر لیں' ایک اکیلی جان اور سو ڈکھڑے جان کو ۔۔۔ مر جاؤں گی تو تم رہو گی!"

منّو میاں کمرے کے بٹن بند کرتے باورچی خانے میں آ گئے "کیوں کیا ہوا؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا بس دیدے نکال کر میاں کو دیکھا اور پھر ہاتھ سامنے پھیلا کر بولی "ذرا میرا حال تو دیکھو، ٹھنڈ پڑ جائے گی۔"

"ہی ٹھنڈ تو جناب کے لال لال منہ کو دیکھ کر ہی پڑ گئی ہے" ننھو میاں نے مذاق کیا۔

رضو کے آگ لگ گئی "میں مر گئی تو یاد کرو گے۔ ہاں ۔۔ اتنا سا نہیں ہوتا کہ ایک چھوٹا موٹا نوکر ہی رکھوا دیں۔ میری اکیلی جان اور ہزار بکھیڑے کب تک یہ سلسلہ چلے گا؟"

"یعنی نوکر چھوٹا بھی ہو اور موٹا بھی" ننھو میاں حسبِ معمول خوش دلی سے مسکرائے۔

رضو نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی سانس کھینچی اور منہ سے کچھ نہ بولی

"بھئی نوکر کوئی پیڑوں پر تو لگے نہیں کہ تم کہو اور میں جا کر توڑ لاؤں۔"

"تو میں چلی جاتی ہوں میکے" اس کی آنکھوں میں اتنے بڑے بڑے آنسو آ گئے "میں کوئی نوکر نہیں کہ ۔۔۔۔" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر پلّو سے سُڑک سُڑک کر ناک صاف کرنے لگی۔

ننھو میاں کو باہر جانے کی جلدی تھی۔ چھوٹے بھیا کو ہسپتال دیکھنے جانا تھا اور ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا سو رضو کو منائے بغیر ڈیوڑھی کی طرف بڑھے "نوکر آ جائے گا ۔۔ نہیں نوکر چاہیے یا میری جان؟" اور پھر دروازے سے باہر نکلتے نکلتے انھوں نے وہیں سے ہانک لگائی "بھنڈیوں کا مزا نہ خراب ہو کہیں تمہارے رونے دھونے میں۔"

رضو نے جل کر بند ہوتے دروازے کی طرف دیکھا۔ بھنڈیاں! بھنڈیاں! بھنڈیاں!!! اس نے غصّے میں چبا چبا کر کہا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خود عورت نہ تھی محض ایک سبزی بن کر رہ گئی تھی، دھم سے وہ نیچے فرش پر بیٹھ گئی۔ گھٹنوں میں سر دیئے کتنی ہی دیر وہ بیٹھی اپنی حالت پر غور

کرنے لگی۔ اسے ہو کیا گیا تھا ۔۔۔ ہ کیا ہوا تھا اُسے ۔ اتنی ذرا سی بات تھی اور وہ زخمی ناگن کی طرح تلملائی پھر رہی تھی۔

رہ رہ کر اُسے خود پر غصہ آ رہا تھا اور اسی طرح اُسے منّو میاں پر بھی بے پناہ غصہ آ رہا تھا۔ سر نیہوڑا کر اس نے اپنی قمیض کے کھلے ہوئے گلے میں پھونک ماری اور آہ بھر کر بڑبڑائی "ہائے میں مر کیوں نہ گئی۔ ایسے آدمی کے پلّے باندھ کے ابو کو بھی کیا ملا!"

آج اسے رہ رہ کر ہر ایک پر غصہ آ رہا تھا، اپنے ابا پر اپنی اماں پر اور اپنے آپ پر اور سب سے زیادہ اُن پر ۔۔۔ اس پرچے نے اس کے دل کا سارا سکون ختم کر دیا تھا۔

کالی بلی باورچی خانے میں فرش پر گرا دودھ چاٹ کر بڑے اطمینان سے اس کے قریب آئی اور بولی "میاؤں" رضو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اُسے باورچی خانے کا خیال آیا۔ تیزی سے اٹھ کر وہ اندر آئی اور پھر ڈولی کھول کر اس نے سگرٹوں کا وہ ڈبہ نکالا جو اب مرچ رکھنے کے کام آتا تھا اس کا ڈھکنا کھول کر اس میں سے لفافہ نکال کر اس نے پھونک مار کر اس پر لگی ہوئی مرچ صاف کی اور پھر غور سے لفافے پر لگی ہوئی ڈاک کی مہر دیکھنے لگی۔

اچھی طرح الٹ پلٹ کر کے اسے دیکھنے کے بعد اس نے اس میں سے خط نکال کر ایک نظر دیکھا اور پھر اس کے آنکھوں میں آنسو ابل آئے اور ٹپ ٹپ آنکھوں پر رکھے وہ گھس گھس رتی لفافہ ڈبے میں رکھ کر دوبارہ ڈولی بند کر کے پھر فرش پہ بیٹھ گئی۔

اس کا دل چاہا زور زور سے گالیاں دے پر جیسے گالی نکالنے کی اب اس میں ہمت نہ تھی کتنی دیر خلاء میں یونہی تکتے رہنے کے بعد وہ اٹھی اور دودھ کی دیگچی ڈولی پر رکھ کر سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

سامنے پڑی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا آپ دیکھتے ہی اُسے پھر رونا سا آ گیا۔

اس سے پہلے جب کبھی منّو میاں نے اس سے مذاق کے طور پہ کہا "جانے میری اماں کو یہ سڑی شکل . . کیوں بھائی کہ میری جان سے چمٹا دیا" وہ آئینے کے سامنے آ کر اپنا سراپا دیکھتی اور پھر منہ چڑا کر منّو میاں کو انگوٹھا دکھاتی "اجی رہنے دیجئے، وہ تو یوں کہیے کہ جانے میرے ابا کو آپ کی کونسی ادا بھائی کہ مجھ غریب پہ یہ ظلم ہوا"

" اچھا جی تو گویا ہماری بیگم بن کے تم . . . . ."

پر وہ منّو میاں کی بات تھوڑی سن رہی ہوتی تھی، ایسے میں تو اُسے شاہد یاد آ رہا ہوتا تھا۔ وہ شاہد جو منّو میاں سے کہیں زیادہ وجیہہ تھا۔ ایسا جوان تھا کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ پھوپھی کے ہاں جاتے وقت کنوارپنے کے دنوں میں جب وہ اُسے دیکھا کرتی تو جیسے کوئی انگ انگ میں چٹکیاں لیا کرتا اور اس دن کی تو بات ہی نہ پوچھو جب پھوپھی اماں نے میلاد کروا رکھا تھا اور ایسے میں سامنے میں اک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ وہ موقعہ پا کر اس کے قریب سرک آیا اور اس کی کانوں کی لو کے قریب منہ لے جا کر اپنی شریر مسکراہٹ کے ساتھ بولا "اجی ہم پر ظلم مت کرو"

وہ تو سر سے لے کر پاؤں تک یوں کانپی تھی کہ برآمدے کے ستون کا سہارا نہ لیتی تو دھم سے نیچے گر جاتی اور مدہوش آنکھوں پر سے بھاری پپوٹے بمشکل اٹھا کر اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اُس کی شریر آنکھوں کی بڑھتی ہوئی چمک دل میں اتری جاتی تھی۔ انگوٹھا سامنے کر کے اس نے لبوں پر تھوڑی سی زبان پھیری اور پھر جلدی سے باہر کو کر کے شاہد کو چڑایا اور بھاگی ہوئی اندر پھوپھی اماں کے کمرے میں آ گئی۔

" میں کہوں یہ عمر ہے کو کڑے لگنے کی ؟" اماں پھوپھی اماں کے ہاتھ سے پان لیتے ہوئے بولیں۔

" بی خیر تو ہے" پھوپھی اماں نے پاندان پر کھٹاک سے ڈھکنا دھرا۔

" اے وہ ۔۔۔ وہ پھوپھی اماں وہ رسی لٹک رہی تھی میں سمجھی سانپ تھا" اس نے سینے کے اتار چڑھاؤ کو دوپٹہ سامنے کر کے چھپایا۔

پگلی —! پھوپھی اماں مسکرائیں۔ وہ جی ہی جی میں مچلتی ہوئی سانسوں کی مہک چھپائے ادھر کو آئی — وہ جو شاہد کا کمرہ تھا۔ اس کے بستر کی سفید براق سی چادر پر ہولے سے دوبار ہاتھ پھیر کر تیزی سے پھر برآمدے میں آگئی۔

اس دن اسے کیا ہو گیا تھا۔ اُسے اس کا احساس تھا اور نہیں بھی تھا۔ کچھ ایسی حالت تھی اس کی کہ ہرنی کی سی تیزی کے ساتھ چھلانگیں لگاتی ادھر سے ادھر بھاگتی پھرتی ہی رہی اور شاہد کو کن انکھیوں سے تکنے بنا بھی تو اب اس سے رہا نہ جاتا تھا!

اس کے بعد کی تو بس کچھ نہ پوچھو۔ پھوپھی اماں کے ہاں جانے میں کوئی رکاوٹ تھوڑا ہی تھی۔ کئی بار ادھر جانا ہوا اور کئی بار شریر چمکتی آنکھوں والے کا ان کے ہاں آنا ہوا، کتنی ہی دفعہ ایسی محفلیں منعقد ہوئیں کہ کسی کو سر پیر کا ہوش نہ رہتا اور ایسے میں ایک دوسرے سے ہنسی ہنسی ہی میں کئی ایک وعدے ہو گئے۔ اور وہ جو کہتے ہیں دل سے دل کو راہ ہوتی ہے تو کچھ غلط نہیں!

پھر دو ٹھوڑا ہو اس شرم کا کہ اماں بی نے آکر سرگوشیوں میں رضو سے بات کی کہ ابو کو شرفو میاں کی شرافت اور نوکری بھی کچھ بے انتہا پسند آئی تھی کہ ہاں کہے بغیر نہ رہ سکے اور سسکتے ہوئے جذبات رضو کے دل میں اپنا گلا گھونٹ کر رہ گئے۔

پھر وہ شام بڑی پراسرار تھی۔

فضا میں ہر طرف ایک عجیب سی مہک محسوس ہو رہی تھی وہ مہک جو بھلی تھی، بری بھی تھی — پر اس بات کا فیصلہ رضو نہ کر پائی تھی۔ وہ تو شادی کے بعد پہلی بار پھوپھی اماں کے کتنے ہی اصرار پر ان کے ہاں آئی تھی —

برآمدے کے ستون پہ اس کی نظر پڑی پر اُسے گزری ہوئی باتوں کی یاد نے بالکل نہ ستایا۔ شاہد کے کمرے کی طرف سے گزرتے وقت اُسے وہ لمحہ بھی یاد نہ آیا جب اس نے سفید براق سی چادر پر ہولے ہولے اپنا ہاتھ پھیرا تھا یا شاید جب اُسے ان لمحوں کی یاد آئی تو وہ محض صابن کے ناپائدار بلبلوں کی طرح اک لمحے کے لیے جیسے ادھر گئے —

اور اس وقت وہ کھانا کھانے بیٹھے تھے۔ شرفو میاں مہک مہک کر باتوں میں مشغول تھے۔ پھوپھی اماں کا سرو تا اپنی پوری رفتار سے چل رہا تھا، اور بڑی بوا چاولوں سے بھری تھال سامنے رکھ کے کہہ رہی تھیں،

"اب چھوڑو اور باتوں کو — کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے" — کہ اک دھیمی سی آواز آئی "اماں میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ بھوک نہیں ہے۔"

پھوپھی اماں کا سروتا رک گیا۔ شرفو میاں چپ سے ہو گئے اور رضو نے چونک کر بند سرتے کی طرف دیکھا جس کے درمیان کٹی ہوئی چھالیا کی ایک چھوٹی ڈلی پڑی تھی۔ پھوپھی نے آہ بھر کر شرفو میاں کو دیکھا "خدا نے اسے کیا ہو گیا ہے بس ہر وقت گم سم رہتا ہے۔ میں تو کہوں میرے بچے کو کسی کی نظر کھا گئی ہے۔"

شرفو میاں نے لپک کر آواز دی "اجی شاہد میاں ذرا آؤ تو، ہمارے ساتھ مل کر دو ایک نوالے ہی کھا لو۔ ہم کوئی روز روز تھوڑا آتے ہیں میاں؟"

پھوپھی اماں اور شرفو میاں کے کتنے ہی اصرار پر وہ ادھر آیا اور رضو نے تکتی ہوئی آنکھوں کی کھوئی کھوئی چمک کو ایک نظر دیکھا اور تب کتنے سارے لمحے اس کی نظروں کے آگے آکر ناچے اور ناچتے ناچتے ماضی کے بھنور میں ڈوب گئے۔

کانپ کر اس نے اپنا ہاتھ پرے کھینچ لیا۔

اس رات گھر واپس آئی تو وہ کھوئی کھوئی سی تھی۔ شرفو میاں نے کئی بار پوچھا، کئی بار پیار سے، غصے سے، بن کر، روٹھ کر، ہر طرح سے پوچھا پر وہ کچھ نہ بولی۔ جب وہ سو گئے تو چپکے سے اٹھ کر اندر لگے شیشے میں آکر اپنا آپ دیکھنے لگی۔

وہ خوبصورت تھی اس میں کیا شک ہو سکتا تھا جبھی تو شاہد میاں کی یہ حالت تھی۔ ساری خوبروئی کو جیسے گھن لگ گیا تھا۔ اس سے اُسے بے انتہا خوشی محسوس ہو رہی تھی ـــ نہیں اُسے شاہد میاں کی حالت پر رحم آ رہا تھا۔ اس کی حالت کی ذمہ دار وہ تھی ـــ وہ تھی جس نے شاہد کی تمام خوشیاں دیمک کی طرح چاٹ لی تھیں۔ پر اس رحم خوف اور ترس کے جذبوں پر ایک جذبہ خوشی کا۔ بھرپور خوشی کا ایک ایسا تھا جس نے بس میں بھرے ہوئے ناگ کی طرح اپنا پھن پھیلا رکھا تھا ـــ

اس کے انگ انگ میں خوشی کا نشہ سرایت کرنے لگا۔

پھر کئی بار پھوپھی اماں کے ہاں جانا ہوا۔

وہ کتنی دکھی تھیں، شاہد میاں سے کئی بار افسردگی کی وجہ پوچھی پر وہ ہمیشہ ٹال گئے اور جب دکھی ماں دکھ سے بوجھل آواز میں رضو سے کہتی "ہائے اب کس سے پوچھوں اسے کیا ہو گیا ہے!" تو ایک پراسرار سی مسکراہٹ رضو کے لبوں پر پھیلنے لگتی اور ایک روز اس نے مشورہ دیا "پھوپھی اماں آپ شاہد میاں کی شادی کر دیں ـــ بس ٹھیک نہ ہو گئے تو میرا نام بدل دیجئے گا ـــ ہاں!"

پھوپھی اماں پھول کی طرح کھل گئیں۔

پر شاہد میاں شادی کو سن کر مرجھائے پھول سے بھی گئے گزرے نظر آنے لگے۔

"وہ تو صاف انکار کر گیا" اک روز پھوپھی اماں رو رو کر رضو کی اماں سے بولیں "کوئی پسند ہی نہیں آتی"

رضو سن سی ہو کر رہ گئی ـــ پر اس سن سے ہو کر رہ جانے میں ایک بھرپور خوشی تھی۔

اس روز وہ اپنا پورا بناؤ سنگھار لیے گھنٹوں آئینے کے سامنے رہی۔

زیرِ لب اس نے کئی بار اپنے عکس سے کہا "یہ میں ہوں ـــ یہ میں ہوں نا" اور اسے رہ رہ کر شرفو میاں کی خوش قسمتی کا احساس ہونے لگا۔

آئینے میں اس کا مسکراتا ہوا وجود پھیلنے لگا اور اس قدر پھیلا کہ اس نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اور پھر سیالکوٹ سے وہ لاہور آ گئی۔ شرفو میاں کی تبدیلی جو ہو گئی تھی۔

سچ پوچھو تو لاہور آتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ اپنی خوشیوں کا خزانہ پیچھے چھوڑ آئی ہو۔ پر میاں کے ساتھ آئے بغیر وہ کیسے رہ سکتی تھی؟ کئی دن اُسے اماں بے انتہا یاد آئیں ابو یاد آئے پھوپھی اماں اور ـــ اور ہاں وہ بجھی بجھی آنکھیں جنہیں دیکھ کر وہ اپنے دل میں مچلتے ہوئے جذبات پر ایک سنجیدہ مسکراہٹ کا لبادہ اوڑھ کر کہا کرتی "ہائے ـــ شاہد میاں اب بحال آئیں تو ہمیں خوشی ملے!"

کئی بار پھوپھی اماں کے خط آئے تو یہی رونا وہ روئے جاتیں کہ شادی کا نام تو تجھو شاہد میاں گھر سے غائب ہیں ـــ

اور وہ خط لیے آئینے کے سامنے آتی۔ بالوں کو نئے نئے انداز کے ساتھ ماتھے پر ڈالتی۔ آنکھوں کو مختلف زاویوں سے جھپکاتی سکیڑتی اور لبوں کو بنا بنا کر ہنستی۔ یوں دن بھر خوش رہنے کا راز شرفو میاں پوچھتے تو وہ منہ چڑا چڑا کر ان کے آغوش میں گر جاتی ـــ

پر آج صبح سے ہر کام الٹا ہو رہا تھا۔ دودھ کئی بار ابلا، کئی بار کالی بلی فرش پہ گرا دودھ چاٹتی اور میاؤں میاؤں کرتی پھری اور وہ شرفو میاں سے بات بے بات الجھتی رہی اور اس قدر اس کا مزاج بگڑا کہ شرفو میاں ہنپیاں سے چھوٹے بھیا کی مزاج پرسی کے بعد آئے تو ان کی پسندیدہ سبزی کا ذائقہ تک بگڑا ہوا تھا۔

وہ اندر کمرے میں منہ بنا بنا کر کھانا کھا رہے تھے اور رضو مرچ والے ڈبے میں سے مرچ لگا لفافہ نکال کر جھاڑتی پھونکتی اپنے آپ کو کوستی کمرے میں آئی

"ہوا کیا ہے؟" مسز ثریا نے خفگی سے پوچھا "تم سے سالن تک نہ پکایا گیا۔"

اس نے منہ بسور کر خط آگے کر دیا۔

"تو پھر کیا ہوا؟" خط پڑھ کر وہ بولے۔

"ہونا کیا ہے" وہ چڑ کر بولی، "اتنی سی تنخواہ ہے ہزار خرچ ہیں۔ اب میرے پاس کون سا لہنگا ہے جو پہن کر شاہد کی شادی میں جاؤں گی" اور پھر ڈبڈبائی نظروں سے آئینے میں اپنا آپ دیکھتے ہوئے وہ رو سی دی، "ان کپڑوں میں کیسی زہر لگتی ہوں!"

بلراج مینرا

بس اسٹاپ

مجھے اس دبلی پتلی، نرم و نازک، سانولی، پتلے ہونٹوں، پتلی کمر اور بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی نے اسی بس اسٹاپ پر ایک بجے ملنے کو کہا تھا۔

میری ننھی سی گھڑی میں ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور میں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

نام کو تو وہ بس اسٹاپ تھا، نام کو کیا، وہ واقعی بس اسٹاپ تھا کہ بجلی کے کھمبے پر، تین ہاتھ اوپر، سبز رنگ کے ٹین کے ٹکڑے پر لکھا ہوا تھا BUS STOP BY REQUEST — ہاں، اگر آپ بس اسٹاپ پر سر چھپانے کی جگہ بھی چاہیں تو وہ بس اسٹاپ نہیں تھا۔ نہ تو وہاں کوئی شیڈ تھا اور نہ ہی کوئی پیڑ۔ راکھ کی رنگت کی لمبی، ویران سڑک تھی، بجلی کے تاروں کی پرچھائیاں تھیں، باریک اور متوازی اور کھمبے کی پرچھائیں تھی، ٹھگنی سی، زمین میں دھنسی ہوئی کہ سورج سر کے اوپر تھا۔

میں یہ جان نہ پا رہا تھا کہ اس دبلی پتلی، سانولی لڑکی نے، جون کی جلتی بھنتی دوپہر کے ایک بجے، ملاقات کے لیے کیوں اس بس اسٹاپ کا انتخاب کیا تھا — شہر سے دور، اجاڑ بس اسٹاپ، جون کی دوپہر، پینے کو پانی نہیں، دم لینے کو سایہ نہیں اور میری کمبختی کہ ساڑھے بارہ بج رہے تھے، اس نے ایک بجے آنے کو کہا تھا۔

میں اس آگ اگلتی دوپہر میں اپنے دل کی تسکین کے لیے آیا تھا مگر چند ہی لمحوں میں مجھے یہ احساس ہو گیا کہ اس دبلی پتلی لڑکی کے آنے تک میں زندہ نہ رہوں گا، وہیں بس اسٹاپ پر پگھل جاؤں گا۔

میں نے سوچا کہ لوٹ جاؤں مگر یہ سوچتے ہی میری حالت اور غیر ہو گئی کہ بس سروس ایک گھنٹے کی ہے۔ اگلی بس کو ڈیڑھ بجے آنا تھا، کسی دوسری سواری کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ اجاڑ، جلتے بھنتے بس اسٹاپوں پر رکشا، تانگہ، اسکوٹر یا ٹیکسی کہاں ملتی ہے۔

اب میں تھا، دھوپ تھی، سڑک تھی اور بجلی کا کھمبا تھا — اس سے بڑھ کر بھلا بس اسٹاپ اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس انتظار کے لمحوں میں ایک راکھ کی رنگت کی سڑک ہی تھی جو مرکزِ نگاہ ہو سکتی تھی اور تھی۔

کہیں کہیں تارکول پگھل گیا تھا اور سڑک گہری کالی ہو گئی تھی اور سورج کی تیز روشنی میں چمک رہی تھی۔

سڑک کو تاحدِ نظر ناپ تولنے کے بعد میں نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ منٹوں کی سوئی پینتیس کے نشان کے قریب تھی ...

میں اس جلتے بھنتے ویرانے کا بھرپور جائزہ لے لیا تھا اور ایک میری وہ دبلی پتلی لڑکی تھی کہ میری سمجھ سے بہت پرے ... غالباً اس کا انتظار کر رہا تھا۔

پہلی بار میں نے اس لڑکی کو بس میں دیکھا تھا اور مجھے وہ اچھی لگی تھی۔ دوسری بار ہفتہ بھر میں نے اسے بس ہی میں ... بار بھی میں نے اسے بس ہی میں دیکھا اور چاہنے لگا اور جب میں نے اس سے بات کرنا چاہی اس نے مجھے اس بس اسٹاپ ...

آخر بس سے اتر گئی۔

سوئی پینتیس کے نشان سے ذرا پرے تھی۔

چند لمحے میں گھڑی کی جانب دیکھتا رہا اور ان چند لمحوں میں مجھے محسوس ہوا کہ میری زندگی کا حصار، میرے گوشت پوست کے جسم کا حصار میرے ذہن کا حصار جس میں ساتوں سمندروں کی وسعتیں سمٹی ہوئی ہیں۔ پل بھر میں بکھرنے کو ہے۔ جب میری دبلی پتلی لڑکی ایک نئے اس بس اسٹاپ پر پہنچے گی، اسے ریت کے ذرے منتظر ملیں گے۔

"ہم قیامت تک انتظار بھی نہیں کر سکتے، ہماری زندگی اس قدر ناپائیدار ہے ....." میں مسکرا دیا۔

لیکن اس دبلی پتلی لڑکی کا انتظار تو میری بے بسی تھی کہ بس کو لڑکی کے بعد آنا تھا۔

"ہم جھنجھلاہٹ میں اوٹ پٹانگ سوچتے ہیں ....." میں پھر مسکرا دیا۔

میں اس لڑکی ہی کا منتظر تھا، بس کو پہنچنا ہوتا تب بھی میں لڑکی ہی کا انتظار کرتا کہ انتظار تو میری زندگی تھی جو پل بھر میں بکھرنے کو تھی کہ گھڑی کی سوئی دس کی طرف سرکنے لگی تھی۔

میری اٹھائیس سالہ زندگی، اس سے پہلے، صرف ایک بار بس اسٹاپ پر ٹھہری تھی۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میری کنپٹیوں پر سفید بال نہیں تھے میری آنکھیں موٹے شیشوں کی محتاج نہیں تھیں اور مجھے جان لیوا انتظار کی لذت نصیب نہیں ہوئی تھی۔

اور پھر وہ بس اسٹاپ بھی کہیں مختلف تھا — وہاں سر چھپانے کو شیڈ تھا۔ پیاس بجھانے کو پیاؤ تھا، بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ بھانت بھانت کی آوازیں تھیں۔ لوگ بسوں سے اترتے اور تانگوں پر چڑھ جاتے، تانگوں سے اترتے اور بسوں پر چڑھ جاتے۔ اور اسکوٹر تھے، رکشا اور ٹیکسیاں تھیں اور ڈھیر سارے، لڑتے جھگڑتے ہنستے بولتے مسافر تھے۔

مجھے اس بس اسٹاپ پر بھی ایک لڑکی نے ملنے کو کہا تھا۔ لڑکی کے خدوخال اب میرے ذہن میں نہیں ہیں اور وہ سمے بھی مجھے یاد نہیں، جب اس لڑکی نے مجھے ملنے کو کہا تھا۔ آتا یاد ہے اس دن بھی جون کی دوپہر تھی۔ دھوپ تیز تھی کہ نہیں، اس کا مجھے اندازہ نہیں کہ میں شیڈ تلے کھڑا تھا۔ ایک دو مرتبہ زبان خشک ہوئی تھی اور میں نے پیاؤ سے کنوئیں کا ٹھنڈا اور شہد سا میٹھا پانی پیا تھا۔ گھڑی دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی کہ ان گنت چہرے نظروں کے سامنے۔ شاید میں چہروں سے اکتا کر، گھڑی دیکھتا اور مجھے اس لڑکی کے انتظار کا احساس ہوتا مگر یہ بھی نہ ہوا کہ مجھ پر اور ہو گیا۔ اب یہ میرا دل، یا اس بس اسٹاپ کا اعجاز، کون جانے؟

میں ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ یونہی کہ ہنستے بولتے لوگوں کو دیکھ کر میری نظریں ایک مزدور کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ دور نہ اس کے مرکز نگاہ تھا، مجھے یاد ہے، ٹھیلہ کھینچ رہا تھا۔ ٹھیلے کے دونوں بم اس کے گرے ہوئے ہاتھوں میں تھے اور دونوں بموں سے بندھی ہوئی رسی اس کے دائیں کندھے میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ چیونٹی کی چال سے ٹھیلہ کھینچ رہا تھا کہ ٹھیلے پر اس کے قد سے کہیں اونچے، آگے پیچھے ٹرنک لدے ہوئے تھے۔ ایک رسی تھی جو ٹرنکوں کو روکے ہوئے تھی۔ ایک میلا کپڑا تھا جو اس کے بائیں کندھے پر رکھا ہوا تھا — دس قدم ٹھیلہ کھینچنے پر وہ رک جاتا۔ بائیں ہاتھ چھوڑ دیتا، بوجھ اس کے دائیں کندھے اور دائیں بازو پر آن پڑتا۔ وہ تھکا تھکا سا، بایاں ہاتھ اٹھا کر بائیں کندھے پر رکھا ہوا میلا کپڑا اٹھاتا چہرے پر پسینہ ہوا سے پونچھتا، کپڑا پھر کندھے پر جاتا اور بایاں بم تھام کر پھر ٹھیلہ کھینچنے لگتا۔ پھر دس قدم پر رکتا۔ پھر پسینہ پونچھتا اور پھر چیونٹی کی چال سے

چل پڑتا۔

اتنا مجھے یاد ہے، اس سمے میں نے یہ سوچا تھا کہ جانے اس کی منزل کہاں ہے؟

اس کا ہر دسواں قدم ایک پڑاؤ تھا۔ یہ میں نے جان لیا تھا اور پھر میں نے اس کی منزل بھی دیکھی۔

میری نظروں کے سامنے وہ اپنے ہوتھے پڑاؤ پہ رکا ہی تھا اور اس نے ٹھیلے کا بایاں بم چھوڑا ہی تھا اور بائیں کندھے پر رکھا ہوا میلا کپڑا اٹھانے لگا تھا کہ اس کی ٹانگیں کانپ گئیں۔ رسی ڈھیلی پڑ گئی اور ٹرنک اوپر تلے نیچے آن پڑے۔ ایک ٹرنک اس کے سر پر آن پڑا اور ٹرنک کی نوک اس کی دائیں کنپٹی میں گڑ گئی۔

اس کے بعد یہی ہوا کہ بسیں رک گئیں، سکوٹر، تانگے، رکشا، ٹیکسیاں، سب رک گئے، ٹریفک جام ہو گیا۔ لوگ بھاگ اٹھے اور پھر چند لمحوں کے بعد بسیں پھر ٹنے لگیں، سکوٹر، تانگے، رکشا، ٹیکسیاں، سب دوڑنے لگے، ٹریفک بکھر گیا۔ لوگ لوٹ آئے۔

اور وہ مزدور کہ وقتی طور پہ مرکزِ نگاہ تھا، اللہ جانے کہاں تھا اور ان چند لمحوں میں اللہ جانے کتنا سمے بیت گیا تھا۔

کسی نے کہا، چار بجے ہیں تو میری توجہ اُدھر ہوئی۔ اس لڑکی کو نہیں آنا تھا، وہ نہیں آئی اور میں بنا کسی احساس کے، مایوسی کے، لوٹ آیا۔

ابھی ایک بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔

"ایک بس اسٹاپ دوسرے بس اسٹاپ سے کس قدر مختلف ہے...." میں مسکرا دیا۔

میرے لب خشک ہو گئے تھے، زبان سوکھ گئی تھی، حلق کانٹا ہو گیا تھا۔

میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں، دل زوروں سے دھڑک رہا تھا، آنکھیں بری طرح جل رہی تھیں۔

"ایک بس اسٹاپ دوسرے بس اسٹاپ سے کس قدر مختلف ہے...." میں پھر مسکرایا۔

ہر بس اسٹاپ کی، ہر نقطے کی اپنی دنیا ہوتی ہے...." مسکراہٹ بدستور میرے لبوں پر تھی۔

میں نے پلکیں گرا کر چکا چوند آنکھوں میں اندھیرا لانا چاہا مگر میری آنکھوں میں سورج اتر گئے تھے۔ میں نے پھر پلکیں اٹھا لیں۔

سڑک ہونٹوں کی طرح دراز تھی۔ دُور دور تک کوئی مزدور نہ تھا، کوئی ٹھیلہ نہ تھا۔

میں اُس بس اسٹاپ کا مقدر تھا یا پھر وہ بس اسٹاپ میرا مقدر تھا۔

میں نے کھمبے کی جانب بنا کسی احساس کے دیکھا، تین ہاتھ اوپر اسبز رنگ کے ٹین کے اس ٹکڑے کی جانب دیکھا جس پر لکھا تھا BUS STOP BY REQUEST اور پھر مسکرا دیا۔

اور پھر میں نے بجلی کے متوازی تار دیکھے اور پھر اوپر آکاش دیکھا۔ پھر میری نظریں نیچے لوٹ آئیں۔ وہی راکھ کی رنگت کی سڑک تھی جو کہیں کہیں تارکول کے پگھلنے سے کالی ہو گئی تھی اور چمک رہی تھی۔

ایک میں دس منٹ تھے۔

مجھے تھکن کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ میں نے کھمبے کا سہارا لے لیا۔

میں تنہا ہوں.... نہیں! میں تنہا نہیں ہوں کہ منتظر ہوں.... میرے سوکھے لب مسکرانے لگے۔

"میں تنہا نہیں ہوں کہ منتظر ہوں.... میری دبلی پتلی، نرم و نازک، سانولی، پتلے ہونٹوں، پتلی کمر، دبلی چھاتیوں اور بڑی آنکھوں والی میرے ساتھ ہے.... دس منٹ ہی تو رہ گئے ہیں اس کے آنے میں، اس کے مجھ تک پہنچنے میں.... میرے مجھ تک پہنچنے میں! دس منٹ کیا ہوتے ہیں....! میرے

لب جن کے توں مسکراہٹیں اپنائے ہوئے تھے ۔

میں نے دائیں ٹانگ پر جسم کا پورا بوجھ ڈالتے ہوئے بائیں ٹانگ کو تھکن سے نجات دلائی ، رومال سے آنکھیں مسلیں، پھر مسلیں، عینک کے شیشے رگڑے اور عینک آنکھوں پر چڑھالی ۔

مجھے تعجب ہوا ، آخری منٹ درمیان میں کھڑا تھا ۔

اور پھر میں نے دیکھا ، مشرقی افق سے ٹیکسی لپکتی آرہی تھی ۔

میری ٹوٹی ہوئی گھڑی میں ایک بج رہا تھا ۔

ٹیکسی میرے سامنے کھڑی تھی ۔

میری دبلی پتلی ، سانولی لڑکی نے دروازہ کھولا اور میری جانب بڑھی ۔ اس کی آنکھیں اور لب مسکرا رہے تھے ۔

اس نے میری کمر کے گرد اپنا نرم و نازک بازو لپیٹ کر مجھے سہارا دیا اور ہم ٹیکسی کی جانب بڑھے ۔

میں ٹیکسی میں بے سدھ گرا ہوا اس کے سینے میں منہ چھپائے ہوئے تھا اور وہ مجھے کہہ رہی تھی ۔

" پانی پیو ، تمہارے لب سوکھ رہے ہیں ...... "

ا

انتظار حسین

ٹانگیں

چونگ زو نے خواب دیکھا کہ اس کی جون بدل گئی ہے۔ صبح اٹھ کر وہ سخت حیران ہوا اور سوچتا رہا کہ کیا وہ واقعی آدمی نہیں رہا ہے۔ اور وہ یہ طے نہ کر پایا کہ وہ آدمی ہے یا آدمی نہیں ہے اور یاسین نے چابک ایک طرف رکھا اور کہا "سید صاب وہ میرا شہردار تھا اور اس حرامزادے نے میرے ساتھ یہ کیا، آدمی سالے کا کوئی اعتبار ہے؟"

وہ یہ طے نہ کر پایا کہ اس سوال کا کیا جواب دے، مگر یاسین اس کے جواب کا منتظر بھی نہیں تھا۔ وہ پھر شروع ہو گیا "صاب یہ گھوڑی سدھتے سدھتے ہی سدھے گی اور سدھ بھی جائے تو میرے گھوڑے کی طرح کی تو نہیں ہوگی۔ سید صاب، وہ کوئی گھوڑا تھا، آدمی تھا، بہت وفا کی اس نے مجھ سے۔" وہ رکا اور پھر بولا "بڑی مشکل ہے جی۔ میں نے یاں والوں کو سب کو بتا رکھا تھا کہ یہ میرا شہردار ہے اس کی مروت کیجیو۔ اب میں اگر کہوں کہ وہ میرا گھوڑا کھول کے لے گیا تو جی کتنا کھسیانا پڑوں گا۔ مقدمہ کروں تو سب منہ میں گو دیں گے کہ یاسین نے شہردار کو پکڑوا دیا۔"

گھوڑی چلتے چلتے پھر رک گئی، مگر اس مرتبہ وہ اڑی نہیں تھی۔ ایک بڑا سا درخت گرا ہوا سڑک کے آر پار پڑا تھا۔ یاسین نے اتر کر گھوڑے کی باگ پکڑی اور اسے کچے میں اتار، تھوڑی دور چلا۔ چند قدم کے بعد وہ پھر اسے پکی سڑک پہ لے آیا۔ تانگے میں بیٹھتے ہوئے بولا "سید صاب آندھی بہت سخت چلی تھی۔ بہت پیڑ گرا ہے۔"

"ہاں بہت نقصان ہو گیا"

"مگر سید صاب" اس کی آواز دھیمی پڑ گئی جیسے کچھ سہم سا گیا ہو "داتا صاب کے مینار بھی گر گئے..... یہ کیسے ہوا۔ سمجھ میں نہیں آئی بات"

"آندھی بھی تو بہت تیز تھی" اس نے کسی قدر بے تعلقی سے جواب دیا۔

"سید صاب آندھیاں آگے بھی بہت تیز چلی ہیں۔ سیلاب بھی آئے ہیں۔ دریا داتا کے قدم چھونے تو بہت دفعہ آیا۔ پر سیڑھیاں نہیں چڑھا" یاسین کچھ دیر چپ رہا پھر بولا "سمجھ میں نہیں آئی بات۔ میری تو عقل حیران ہے۔ اچھا یا مولا" اس نے ٹھنڈا سانس بھرا "تیرے بھید تو ہی جانے۔"

یاسین خاموش ہو گیا۔ اور ادھر اس کا ذہن اور اور طرف بھٹکنے لگا۔ داتا دربار، علی بن عثمان جلابی۔ کشف المحجوب۔ اور وہ فقیر جو اس امام کے پاس کہ دنیوی جاہ و اقتدار میں ملوث ہو گیا تھا آیا اور کہا "اے فلانے اب مرجانا چاہیے۔" امام نے سنا اور ... وہ خاموش رہا۔ دوسرے دن وہ فقیر آیا اور امام نے اسے قہر بھری نظروں سے دیکھا اور اس کے بولنے سے پہلے بول پڑا کہ "اے فلانے اب مرجانا چاہیے" یہ سن کر فقیر نے مصلے کو بچھایا، اس پہ دراز ہوا، اور اعلان کیا کہ "میں مر گیا" اور وہ مر گیا.... عجب قسم کے فقیر تھے وہ۔ بھرے بازاروں میں چلتے چلتے نعرہ لگاتے کہ "میں مر گیا" اور مر جاتے کبھی اینٹ پر سر رکھ کر، کبھی کھڑے کھڑے، کبھی بیٹھے بیٹھے۔

"بھیا اچھرے کی سواری لے لے"

"نہیں میاں" اس نے مختصر لیکن لاتعلقی سے جواب دیا

"لے چلتے، کیا حرج تھا"

نہیں، سیّد صاحب۔ یاسین خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے گھوڑے کو چابک مارا، تانگہ تیز ہو گیا "سید صاحب رات کو میں عورت کی سواری نہیں لیتا"۔ وہ پھر خاموش ہو گیا اور تانگہ تیز چلتا رہا۔ اور پھر وہ بولا "صاحب ایک دفعہ کی بات سناؤں۔ رات کے دس بجے ہوں گے جی۔ میں چوبرجی پہ کھڑا تھا۔ مجھے میں اونگھ سا گیا۔ چھم چھم گھنگھروؤں کی آواز کان میں آئی۔ میں چونک پڑا کہ یہ گھنگھروؤں والی یہاں کہاں سے آ گئی۔ گھوڑے نے دانہ کھاتے کھاتے ایک ساتھ منہ اٹھایا اور زور سے ہنہنایا۔ پھر کتے بھونکنے لگے میں نے کان لگایا۔ میاں صاحب وہاں سڑک پہ نہیں۔ ادھر سے آواز آ رہی تھی۔ اور جی پھر چھم سے وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ تانگہ والے چلے گا۔ سید صاحب، عورت اتنی خوبصورت، میرا دل یوں یوں کرے۔ پر میری نظر ایک ساتھ اس کے پیروں پہ جا پڑی۔ بس جی میرا جی سن سے نکل گیا۔ میں نے کہا کہ یاسین آج مارے گئے۔ پھر جی میں نے سوچا کہ جو کرے کرتار۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بڑھ کے چوٹیا پکڑ لی اور ایک بال توڑ لیا۔ اب تو وہ میرے قدموں پہ گر پڑی۔ سید صاحب چھلیل پائی کا بال مٹھی میں لے لو، پھر وہ تمہاری باندی ہے۔ میں نے وہ بال زمین میں داب دیا۔ بس جی پھر وہ میری باندی بن گئی۔ بہت مزے کیے میں نے اس کے ساتھ" یاسین نے مزے میں آ کر ادنچا سانس لیا پھر گھوڑی کو زور سے چابک رسید کیا "پر مجھ سے چوک ہو گئی۔ اور چوک کیا ہو گئی، کوئی بھی عورت ہو، گود میں سر رکھ کے رو پڑے، پھر دیکھوں کونسا مرد ہے جو ٹھہرے گا۔ تو جی میں پگھل گیا۔ میں نے اس کا بال اسے دے دیا۔ بال ملنا تھا کہ یہ جا وہ جا۔ میں نے بہت دہائی دی مگر صاحب وہ صاف گئی۔"

"کیوں بھئی اچھرے جانا ہے" ایک راہگیر نے سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے آواز لگائی۔

"سید صاحب ایک سواری لے لوں۔ تکلیف تو نہیں ہو گی۔"

"ہاں ہاں لے لو"

یاسین نے تانگہ روکا۔ مگر روکتے روکتے پھر لگام ہلا دی "نہیں بابو"

"کیوں، لے لو نا سواری"

نہیں جی، ہماری باتوں میں خلل پڑے گا۔"

تمہاری مرضی"

"سید صاحب میں نے بہت دنیا دیکھی ہے" یاسین پھر شروع ہو گیا "یہ جانثار والا گنبد آپ دیکھ رہے ہیں۔ دن میں کبھی غور سے دیکھنا۔ کھلے ہوئے تربوز کی طرح رکھا ہے کہ جیسے ابھی چٹکی مارنے سے بکھر جائے گا۔ اس پہ سلاما لیکم رکھی ہے"

"سلاما لیکم رکھی ہے؟ کیا مطلب" وہ بہت چکرایا۔

"چکردار بات ہے ذرا۔ بات یہ ہوئی سید صاحب کہ ایک رات میں راوی روڈ سواری لے گیا۔ بڈھے دریا سے بھی آگے کی سواری تھی۔ خیر سواری کو تو میں اتار آیا پر رستے میں ہو گئی بارش۔ میں نے تانگہ ایک طرف ایک گھنے سے پیڑ کے نیچے کھڑا کر لیا۔ وہ جی میں پیڑ کے نیچے گیا ہوں کہ اوپر سے دھم سے ایک مسٹنڈا نیچے کود پڑا۔ میں نے کہا کہ لے یاسین آج تو کوئی نئے ناکہ ہو گئی، ہو جائیں ذرا دو دو ہاتھ۔ میں جوانی کی ترنگ میں تھا۔ تانگے سے کود اس سے لپٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھوں ہوں کہ وہ لمبا ہو رہا ہے۔ میں حیران کہ یہ کیا چکر ہے۔ لمبا ہوتے ہوتے اس کا سر درخت کی سب سے اوپر والی پھننگ سے جا لگا اور میں اس کی ٹانگوں سے لپٹا رہ گیا اور ٹانگیں اس کی بکرے کی۔"

"بکرے کی ٹانگیں" اس نے تعجب سے سوال کیا۔

"ہاں جی ان کی ٹانگیں بکروں کی سی ہو رہے ہیں۔ تو جی میں نے کہا کہ بے یاسین آج مارے گئے۔ پر جی میری کاٹھی بھی اس وقت بنی ہوئی تھی۔ یا مولا کہہ کے میں اس سے نپٹ گیا۔ نہ میں گردن نہ وہ گرے۔ آخر کو جی صبح ہو گئی۔ پھر اس کا زور ٹوٹنے لگا۔ میں نے کہا کہ بے یاسین اب اسے ڈھالے۔ پر وہ نکلا چالاک۔ اس نے مجھ سے صلح کر لی اور کہا کہ دیکھ بھئی تو میرے علاقہ میں مت آ، میں تیرے علاقے میں نہیں آؤں گا۔ میں نے شرط مان لی۔ پر جی میں نے گھر آ کر جو چربائی سے کمر لگائی ہے تو ہڈی ہڈی چور۔ تین دن تک بخار میں پھنکتا رہا۔ اور جب میں اٹھا اور تانگہ جوڑا تو اسی سڑک پہ مجھے ایک آدمی ملا۔ دوپہری کا وخت تھا۔ سڑک بالکل خالی، بولا کہ بھئی راوی روڈ گیا تھا میں۔ وہاں والے نے تجھے سلاما لیکم کہی ہے۔ بس جی میں نے ایک سکنڈ سوچا اور کہا کہ اسے سامنے والے گنبد پہ رکھ دے۔ اس نے سلاما لیکم اس گنبد پہ رکھ دی اور گنبد چٹاخ سے بولا، اس پہ دراڑیں ہی دراڑیں پڑ گئیں اور وہ آدمی میانی صاب کی طرف مڑ گیا ..... تو جی میں بال بال بچ گیا۔ کہیں سلاما لیکم لے لی ہوتی تو بوٹی بوٹی اڑ جاتی"

اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا، مگر ایک شک بھری نظر سے یاسین کو سر سے پیر تک دیکھا مگر یاسین اپنی جگہ بہت مطمئن تھا "سید صاب دیکھو کیا ہو یہ تو میں نے ایک سنائی ہے۔ میں نے بڑے بڑے چھیڑے لیے ہیں۔ ایک دفعہ ایک بھتنے سے کشتی ہو گئی۔ میں نے سالے کو دھر پٹکا"

یاسین کی اس بات پہ وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"جی آپ کو یقین نہیں آتا۔ بات یہ ہے جی کہ ان دنوں میری کاٹھی بہت اچھی تھی اور کیوں اچھی نہ ہوتی، روز صبح کو ادھ سیر بادام پیس کے کھاتا تھا اور خوب زور کرے تھا۔ اب کاٹھی کیسے بنے۔ ساڑھے سولہ روپے من تو آٹا بک رہا ہے" وہ رکا، پھر بولا "سید صاب مہنگائی اب تو بہت ہو گئی۔ دانہ گیہوں کے بھاؤ ہو گیا اور گیہوں موتیوں کے بھاؤ بک رہا ہے۔ آپ جی اخبار میں ہیں اس کے خلاف کچھ لکھتے نہیں؟"

"لکھتے ہیں" اس نے رکتے رکتے کہا "پر لکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"لکھنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا" یاسین کو سخت تعجب ہوا۔

پھر اسے خود تعجب ہونے لگا۔ لکھنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ لکھنے سے اگر کچھ نہیں ہوتا تو اتنا کیوں لکھا جاتا ہے؟ اور اگر کچھ نہ لکھا جائے؟ فرض کیجیے کوئی کچھ نہیں لکھتا؟ پھر؟ ....

"سید صاب اب جینے کا مزہ نہیں رہا" ___ اور اس فقیر نے پھر اس امام کے دروازے پر دستک دی اور کہا کہ اے فلانے اب مرجانا چاہیے۔

"سید صاب، یہ جو بہت باتیں کریں ہیں آپکے دوست ہیں؟"

"ہاں"

"یہ شاعر ہیں؟"

"ہاں بہت بڑے شاعر ہیں۔"

"اچھے خاصے پڑھے ہیں۔"

"پر لگتے تو نہیں"

"کیوں نہیں لگتے بھئی"

"جی انھوں نے چاندھڑ والے سے وعدہ کیا تھا کہ گورمنٹ میری دوست ہے، اس سے ٹیکسی کا لیسنس دلوا دوں گا۔ اسے ڈور پہ لگا رکھا ہے، یہ

ابھی تک لیسنس دلوایا نہیں۔ وہ بیچارہ ان کے پیچھے پیچھے پھرتا پھرتا ہے۔ دیکھا ہوگا آپ نے جالندھر والے کو۔ بہت غریب ہے بیچارہ۔"

ایک دبلا پتلا مسکین صورت تانگے والا اس کے تصور میں ابھرنے لگا۔ اپنے پیشے سے بیزار، اور اور دھندوں کی فکر میں مبتلا" سید صاب جی میں ٹیکسی چلانا سیکھ رہا ہوں۔"

" اچھا ؟"

" ہاں جی، میں نے ایک ٹیکسی والے سے بات کرلی ہے۔ وہ مجھے ایک ہفتے میں چلانا سکھا دے گا۔ شاہ صاب کی گورنمنٹ سے دوستی ہے۔ وہ مجھے کل لیسنس دلا دیں گے۔ بات یہ ہے سید صاب جی کہ تانگے سے گذارہ نہیں ہوتا۔ بہت ٹیکسی چل پڑی۔ صاب جی بڑی سواری اب تانگے میں نہیں بیٹھتی"

" سید صاب" یاسین نے پھر سوال اٹھایا" یہ جی آپکے دوست سے گورنمنٹ کی سچ مچ دوستی ہے ؟"

" ہاں ہوگی ہی"

" پر لگتی نہیں" وہ رکا، پھر بولا "بات یہ ہے جی کہ اگر دوستی ہے تو پھر بچارے کو لیسنس دلا دیں۔ بغیر سفارش کے تو کوئی کام نہیں ہوا کرتا۔ سید صاب، یہ جالندھر والا جالندھر کا رہنے والا ہے۔ سینتالیس میں آیا تھا اس کا سارا کنبہ کٹ گیا۔ اکیلا بچا ہے، بس جبھی سے اکھڑا اکھڑا ہے۔ اس نے کئی کام کیے پر سب فیل ہوگئے۔"

سینتالیس کے ذکر سے اس کا ذہن بھٹکا اور ان دنوں کی طرف گیا جب شہر اجڑ رہے تھے اور قبیلے ڈھل رہے تھے۔ اجڑتے خالی ہوتے شہر۔ پرانا عہد نامہ بستیوں کے بسنے اجڑنے کی داستانیں۔ یرمیاہ نبی کا نوحہ ان کے لیے جو تلوار سے قتل کیے گئے اور ان کے لیے جو بھوک سے مرے۔ وہ جو تلوار سے قتل کیے جاتے ہیں ان سے بہتر ہیں جو بھوک سے مرتے ہیں کہ کھیتوں کے پھل نہ پانے سے وہ سوکھتے جاتے ہیں اور مر رہتے ہیں۔ اے خداوند جو کچھ ہم پر ہوا اسے یاد رکھ ہم نے اپنا پانی بھی مول لے لیکے پیا۔

" سید صاب آپ دلی کے ہیں ؟"

" نہیں بھئی"

" دلی کا تو میں بھی نہیں۔ پر وہاں رہا بہت ہوں۔ اُدھر ہی کا ہوں۔ صاب دلی کی جمعہ مسجد تو بالا ٹھ ہے۔ جب فساد ہوئے تھے تو سنگھ والوں نے اسے پھونکنے کی ٹھانی۔ پر مسجد جل کے نہیں دی۔ بس ایک داغ پڑ گیا۔ میں جی آنے کے بعد ایک دفعہ دلی گیا تھا، میں نے اس داغ کو دیکھا تو جی میں رو پڑا۔"

یاسین کی آواز کسی قدر بھرا گئی۔ وہ خاموش ہوگیا۔ پھر آہستہ سے بولا" سید صاب ایک بات پوچھوں، دلی کی جمعہ مسجد کو تو ہندوؤں نے آگ لگائی پر داتا صاب کے مینار کس نے گرائے ؟"

داتا صاحب کے مینار کس نے گرائے، عجیب سوال ہے ؟ یہ لوگ بھی کتنے توہم پرست ہوتے ہیں ؟ اور جب وہ یہ سوچ رہا تھا تو تانگے نے مزنگ چونگی کے چبوترے کا چکر کاٹا اور پنواڑیوں کی منور دکانوں کے سامنے رک کر کھڑا ہوگیا۔" ٹھیکیدار صاب چلنا ہے تو آجاؤ" اور یاسین نے یہ صدا لگانے کے بعد اس کی طرف دیکھا "سید صاب" ٹھیکیدار صاب اپنے ہی آدمی ہیں۔ بٹھاؤں "

" ہاں ہاں بٹھاؤ"

ٹھیکیدار صاب نے جلدی سے پان لگوا منہ میں رکھا اور لپک کر تانگہ کی اگلی سیٹ پر آبیٹھے۔ تانگہ چلنے کو تھا کہ اوورکوٹ پہنے ہوئے ایک شخص خاموشی سے آیا "اچھرے"

" ہاں جی" اوورکوٹ والے شخص نے اعتماد سے قدم اٹھایا اور پچھلی نشست پر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"ٹھیکیدار جی! پاکستان اب کیا کرے گا؟" یاسین نے تانگہ ہانکتے ہی سوال کر ڈالا۔

"پاکستان کیا کرے گا؟ کیا کرتا؟"

"جی میں یہ کہوں ہوں نہ امریکہ تو ٹرخی دے گیا۔ اب پاکستان کیا کرے گا؟"

"اچھا اچھا۔ ہاں"

ٹھیکیدار صاحب ہکے، کچھ کھنکارے، مگر یاسین نے ان کے جواب کا مزید انتظار نہیں کیا، فوراً اس کی طرف مخاطب ہوا "سید صاحب آپ تو اخبار میں کام کریں ہیں، ایک بات بتائیں۔ اگر امریکہ اور روس میں جھگڑا ہو گیا تو کون جیتے گا؟"

ٹھیکیدار صاحب نے اس سوال کے جواب کی ذمہ داری اپنے سر لی اور بولے "امریکہ مارے ہی مارے۔"

"سوچنے کی بات ہے" یاسین نے قنوطیت آمیز لہجہ میں کہا۔

"میاں ہم نے بھی سوچ کے بات کہی ہے۔ یہ انگریزاں کا یار ایسا دانہ ڈالتا ہے کہ پھوٹ پڑے ہی پڑے اور انگریز امریکہ کی طرف ہے۔"

"ٹھیکیدار صاحب" یاسین نے نہایت سنجیدگی سے اپنی رائے کا اظہار کیا "میرا یہ دھیان پڑے ہے کہ یہ سب اڑنگے کی بات ہے۔ روس اگر امریکہ کے اڑنگے میں آ گیا تو امریکہ سرمے کی طرح اسے پیس ڈالے گا اور اگر...... یاسین نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا" امریکہ روس کے اڑنگے میں آ گیا تو یہ سمجھو ٹھیکیدار جی کہ وہ امریکہ کو چورن بنا کے چاٹ جاوے گا۔"

سب اڑنگے کی بات ہے، اس نے سوچا، کوئی ضعیف نہیں ہے، کوئی قوی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کون کس کے اڑنگے میں آئے گا؟ اور ہم کس کے اڑنگے میں ہیں؟

گھوڑی چلتے چلتے اڑ گئی۔ اس نے اسے بہت ہنٹر رسید کیے مگر وہ آگے چلنے کی بجائے اپنے مقام پر کھڑی کودنے لگی جیسے ابھی الف ہو جائے گی۔ تب یاسین تانگے سے اترا، لگام پکڑ کر تھوڑی دور چلا، پھر اچک کر تانگے کے بم پر بیٹھ کر اعتماد سے آخری ہنٹر رسید کیا اور گھوڑی معمول کے مطابق چلنے لگی۔

"کیوں بھئی" ٹھیکیدار صاحب نے کچھ بیزاری کے سے لہجے میں کہا "آج تیرا گھوڑا بہت اڑ رہا ہے۔"

"اجی میرا گھوڑا کہاں ہے۔ میرا گھوڑا کبھی اڑا تھا۔ یہ تو نئی گھوڑی ہے"

"گھوڑا کہاں گیا؟"

"گھوڑا؟" وہ تلخ سی ہنسی ہنسا "کیا بتاؤں جی میرا ایک شہردار تھا، سالا کراچی سے آیا تھا۔ ایک مہینے میرے ساتھ رہا اور پھر سالا گھوڑا لے کے غائب ہو گیا۔"

"یہ کمال ہوا"

"بس جی کمال ہی ہو رہا ہے آج کل تو" اس نے ٹھنڈا سانس بھرا "اجی میں کراچی گیا تھا۔ سب میرے ساتھ کے آدمی وہیں ہیں جی۔ میں نے ان سے کہا کہ تم واں پہ تو ایسے نہیں تھے، یاں آ کے کیا دھندا شروع کر دیا۔ انھوں نے میرے سر پہ چپت ماری اور کہا کہ لے یہ کراچی ہے... ٹھیکیدار صاحب میں یہ سوچوں ہوں کہ کراچی میں جا کے آدمی کو کیا ہو جاوے ہے۔"

ٹھیکیدار صاحب نے اطمینان سے داڑھی پہ ہاتھ پھیرا۔ پھر کہنے لگے "میاں کراچی کی مت پوچھو۔ واں سب چلتا ہے۔"

"پر ٹھیکیدار صاب" یاسین نے کراچی کی بات کاٹتے ہوئے اپنا بھولا سوال اٹھایا "میں یہ پوچھوں ہوں کہ داتا صاحب کے مینار کس نے گرائے؟"

ٹھیکیدار صاحب نے زور سے ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہو گئے۔ پھر ان کی گردن جھک گئی۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے اور ان کے جسم میں

ہلکا سا رعشہ پیدا ہو چلا تھا۔ پھر ان کی آواز کسی قدر بلند ہوئی۔ مگر بلند ہونے پر بھی وہ بہت دھیمی تھی۔ وہ اپنی لرزتی کانپتی آواز میں گنگنا رہے تھے ؎

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا

ناقصاں را پیر کامل۔ کاملاں را رہنما

اور گنگناتے گنگناتے ان کی آواز بھرا گئی۔ اور وہ چپ ہو گئے۔

تانگہ مزنگ چونگی سے بہت آگے نکل آیا تھا۔ کچھ خاموشی کچھ اندھیرا۔ جہاں تہاں کھڑے ہوئے سپاہی، کوئی آہستہ آہستہ چلتا ہوا جیسے سو رہا ہے اور چل رہا ہے۔ کوئی چپ چاپ کھڑا ہوا جیسے چلتے چلتے سو گیا ہے۔ یاسین نے فضا کی خاموشی سے پورا فائدہ اٹھایا۔ یا شاید اس خاموشی میں اس کا دم الٹنے لگا تھا۔ اس نے چابک کو تیز دوڑتے پہیے کی تیلیوں پہ لٹکا دیا اور اس سے ایک تیز سی آواز پیدا ہوتی چلی گئی پھر اس نے یکایک گانا شروع کر دیا ؎

عاشق نامراد کو لازم ہے یہ دعا کرے

جس نے دیا ہے درد دل اس کا خدا بھلا کرے

گم متھان ٹھیکیدار صاحب یہ سن کر جاگ سے پڑے "اماں بہت پرانا ریکارڈ لگایا تم نے"

یاسین نے پھریری لی "ٹھیکیدار صاحب، یہ غزل گا دیوے تو اس کا جوتی کا غلام بن جاؤں"

"اماں چھوڑو گنا ونا کی بات۔ لچھن یاد ہے لچھن؟"

"لچھن بائی" یاسین تازہ دم ہو بیٹھا۔ وہ تانگہ کے بم سے اٹھا اور سیٹ پہ ٹھیکیدار صاحب کے برابر آ بیٹھا" بڑی ٹھسے والی عورت تھی جی۔ لتا سالی کیا کھا کے اس کا مقابلہ کرے گی"

ٹھیکیدار صاحب نے لچھن بائی کی آواز پہ بات اس طرح شروع کی تھی کہ یہ کسی لمبی داستان کا آغاز ہے۔ مگر ابھی انھوں نے فقرہ پورا ہی کیا تھا کہ اچھرہ موڑ آ گیا۔ ٹھیکیدار صاحب جھٹ پٹ تانگہ سے اترے اور یاسین کی طرف رخ کیے بغیر سامنے والی چائے کی دکان پہ ہو لیے۔

ٹھیکیدار صاحب کو اتار کر یاسین نے اوورکوٹ والی سواری کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور کوٹ والے نے جواب میں کہا "آگے" اور اوورکوٹ کے اندر منہ دے کر خاموش ہو گیا۔ یاسین نے باگ اٹھائی اور تانگہ ہانک دیا۔

اچھرہ موڑ سے آگے نکل کر یاسین بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ وہ اور اوورکوٹ والا پہلے ہی سے خاموش تھے۔ اس وقت پتہ چلا کہ سردی اچھی خاصی ہے اور کہر سڑک پہ دور تک ٹھنڈے دھوئیں کی طرح اٹا ہوا ہے۔

اچھرہ تھانے سے تھوڑا آگے نکل کر اوورکوٹ والے نے آہستہ مگر رعب دار آواز میں کہا "روکو"

تانگہ رکا تو اس نے جیب سے پیسے نکال یاسین کے ہاتھ پہ رکھے اور خاموشی سے اتر گیا۔ چار قدم وہ سڑک پہ چلا۔ پھر کچے میں اتر گیا جہاں اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں چلتا ہوا وہ تھوڑی دور دکھائی دیا، پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"سید صاحب" یاسین کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ہوں"

"یہ آدمی کون تھا؟"

"کیا خبر کون تھا؟ یہ تم جانو"

"مجھے کچھ شک ہے"

"کیسا شک؟"

یاسین نے سوال کا جواب نہیں دیا۔ ایک اور سوال کھڑا کر دیا "سید صاب، آپ نے اس کی صورت دیکھی تھی؟"

"نہیں"

"اور میں نے بھی نہیں دیکھی"

یاسین پھر چپ ہو گیا۔ گھوڑی اچھی خاصی رفتار سے چل رہی تھی۔ اسے چابک مارنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے پھر سوال کیا۔

"جی آپ نے اسے بالکل نہیں دیکھا؟"

"دیکھا ہو گا، مگر میں نے دھیان نہیں دیا"

"یہ بھی میرے ساتھ ہوئی۔ اور جی وہ سارے رستے بولا ہی نہیں، جانے کون تھا"؟ یاسین چپ ہوا اور پھر بولا "سید صاب جب وہ مجھے پیسے دینے لگا تو میں نے دیکھا .... یہ بڑا ہاتھ۔ ہاتھی کا سا کان۔ میں ڈر گیا جی" یاسین کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے سرگوشی بن گئی "جانے کون تھا"

یاسین خاموش ہو گیا اور دیر تک خاموش رہا۔ پھر اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا "سید صاب، آدمی سالے کا کچھ پتہ نہیں۔ کیا پتہ کون کیا ہے؟ جبھی تو میں کوئی اجنبی سواری نہیں لیتا" وہ رکا، پھر بولا "میں نے عورت کی سواری نہیں بٹھائی تھی نا؟ بات یہ ہے سید صاب کہ عورت کی سواری رات کو تو میں بالکل نہیں بٹھاتا"

"کیوں؟"

"نہیں سید صاب" وہ رکا۔ پھر کہنے لگا "سید صاب زمانہ بہت برا آ گیا ہے۔ کل کی سنو جی، میں میکلوڈ پہ کھڑا تھا۔ ایک جنٹلمین سوٹ بوٹ ڈانٹے آیا۔ میں نے کہا کہ لے بے یاسین سواری مل گئی۔ مگر جی وہ چپکے سے بولا، مال ملے گا، میں بہت کھسیانا پڑا۔ میں نے کہا کہ نئیں بابو صاب میں یہ کام نہیں کرتا۔ خیر جی وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک بابو صاحب آئے جھومتے جھامتے، تانگے میں بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا، بابو صاب کدھر؟ وہ ہنس پڑا بولا "لے چل یار اپنی مرضی سے" میں جی تاڑ گیا، بابو میں یہ کام نہیں کرتا۔ تانگے سے اترجا، اس ماں کے یار نے مجھے موٹی سی گالی دی اور اتر کے چلا گیا"

یاسین نے ایک دم سے چپ سادھ لی۔ گھوڑی پہ زور سے چابک رسید کی پھر بڑبڑانے لگا "سالا برا زمانہ آ گیا ...... سید صاب جی" وہ اس سے مخاطب ہوا، "تانگہ چلانے کا مزہ نہیں رہا۔ نہ عزت نہ پیسہ۔ قسم اللہ پاک کی میں تانگہ کبھی نہ جوتتا مگر کیا کروں جی، اپنے جانور کو کیسے بھوکا مار دوں"

اس آخری فقرے پہ وہ چونک سا پڑا۔ اس کا ذہن پھر بھٹکنے لگا۔ کوفہ۔ کشف المحجوب، علی بن عثمان ہجویری۔ میں علی بن عثمان ہجویری نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ باحشمت صوفیوں میں سے تھے۔ وہ جنگل سے نکل کر فاقہ کے مارے رستے کی تکلیف اٹھاتے ہوئے کوفہ کے بازار میں پہنچے۔ ہاتھ پر ان کے ایک چڑیا تھی اور وہ صدا لگاتے تھے "کون ہے جو اس چڑیا کے واسطے مجھے کچھ دے؟" کسی نے پوچھا "اے مرد بزرگ تو کیا کہتا ہے" تب انھوں نے ایک آہ کھینچی اور یوں گویا ہوئے کہ اے شخص یہ شہر کوفہ ہے، میں کیسے کہوں کہ خدا کے لیے مجھے کچھ دو"

یاسین نے گھوڑی کو زور سے چابک رسید کیا اور پھر گانے لگا ؎

عاشق نامراد کو لازم ہے یہ دعا کرے
جس نے دیا ہے دردِ دل اس کا خدا بھلا کرے

ادھر وہ اڈا اور اس کی آباد دکانیں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ سڑک سنسان تھی اور تھوڑی تھوڑی تاریک، کہرے میں کھمبوں کے قمقمے دھندلے دھندلے دکھائی پڑ رہے تھے۔ ایک سائیکل رکشا ابھی برابر سے شور کرتی گزری تھی۔ مگر اب وہ دور نکل گئی تھی۔ اس کی آواز کسی دوسرے شہر سے آتی معلوم ہوتی تھی۔ یاسین گاتے گاتے رکا اور اس سے مخاطب ہوا" سید صاب چودھویں صدی آگئی۔ پوچھو کیسے؟ وہ ایسے کہ میری اماں کہا کرے تھی کہ چودھویں صدی میں گلتے گوبر کھلے گی، مینہ برسانگے گی۔ پر جی اب تو اس سے بھی زیادہ ہوگئی۔ پرسوں رات میں بیڈن کے اڈے پہ کھڑا تھا۔ کیا دیکھوں ہوں کہ حرامی لونڈی کے تانگہ میں ایک لونڈیا بیٹھی ہے۔ لونڈی سالا بہت حرامی ہے۔ میں جی اس لونڈیا کو جانے تھا میں نے کئی مرتبے کالج پہنچا کے آیا تھا، پر وہ تانگہ میں بیٹھی تھی، سید صاب میں مرگیا ۔۔۔ اور اس فقیر نے مصلے پہ لیٹ، آنکھیں بند کر اعلان کیا کہ میں مرگیا، اور وہ مرگیا۔

" صاب، برا زمانہ آگیا" اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور پھر بولنے لگا" کسی کا کوئی اعتبار نہیں، نہ مرد کا نہ عورت کا، جس عورت کو دیکھو کھلا پلا اور یہ سالا مرد، سب سالوں کی ٹانگیں بکروں کی ہوگئی ہیں۔"

اس نے یاسین کی بات سنی ان سنی کی اور کہا" یاسین خاں میکلوڈ والی سواری نے واقعی تم سے وہی سوال کیا تھا؟"

" ہاں جی، میں سب سالوں کے اشارے جانوں ہوں۔"

" اور تم نے سواری کو اتار دیا؟"

" بالکل جی۔"

" اور اگر ۔ ۔ ۔ ۔" وہ بولتے بولتے کھنکارا، دم لیا، تھوڑا ہنسا اور دل لگی کے انداز میں کہنے لگا" اگر میں وہی سوال کروں؟

یاسین نے ایک دم سے مڑ کر اسے غور سے دیکھا۔ وہ جھجک گیا۔ مگر سے فوراً خیال آیا کہ اس نے تو مذاق میں یہ سوال کیا تھا، اور وہ ہنسنے لگا، یاسین نے اس کے ہنسنے کا مطلق نوٹس نہیں لیا۔ کہنے لگا" سید صاب، آپ؟"

یاسین خاموش ہوگیا اور اسے یوں لگا کہ اس نے سچ مچ یاسین سے یہ سوال کر ڈالا تھا۔ اس کے ماتھے اور گردن پر پسینہ آگیا۔

" نہیں، سید صاحب" یاسین نے دم لے کر کہا" آپ ایسا نہیں کہیں گے۔" وہ رکا، پھر بولا" نہیں سید صاب، آپ مت کہئے ایسا"

ایک ٹیکسی زناٹے سے برابر سے گزری۔ کئی کالے کلوٹے اور ایک خوش رنگ چہرہ دم بھر کے لیے نظر آیا اور اوجھل ہوگیا۔ پھر ٹیکسی دور نکل گئی مگر عقب والی سرخ بتی دیر تک نظر آتی رہی۔ سڑک پھر سنسان تھی اور بالکل تاریک۔ ابھی ابھی بجلی گئی تھی اور چمکتے دمکتے کھمبے ایک دم سے اندھے ہوگئے تھے۔

" سید صاب" یاسین کچھ سوچتے سوچتے آہستہ سے بولا" میں تانگہ بیچ رہا ہوں جی۔"

" تانگہ بیچ رہے ہو؟ کیوں؟"

" بس جی اپنا جی بھر گیا اس دھندے سے۔"

" مگر تم تو جالندھر والے کو برا بھلا کہتے تھے کہ وہ جی چھوڑ گیا۔"

" ٹھیک ہے جی میں بھی جی چھوڑ گیا۔ پر میں ٹیکسی کے لیسنس کے پیچھے نہیں بھاگوں گا"

" پھر کیا کروگے؟"

"کچھ کروں جی، پر تانگہ کا دھندا اب نہیں چلتا۔ سید صاب" اور اس نے بات کو مزید طول دینے کی بجائے گھوڑی کو ٹھوڑا ٹھوکا، پھر گانا شروع کر دیا ؎

عاشق نامراد کو لازم ہے یہ دعا کرے

جس نے دیا ہے دردِ دل اس کا خدا بھلا کرے

گاتے گاتے وہ دفعتاً رکا "سید صاب، وہ آدمی کون تھا؟"

"کون؟" اس نے بے دھیانی میں پوچھا۔

"وہی جی اوورکوٹ والا، کچھ سمجھ میں نہیں آئی جی میرے، کون آدمی تھا وہ؟"

"ہوگا کوئی آدمی"

"پر کون آدمی تھا؟" وہ پھر سے حیرانی میں ڈوب گیا۔ "آدمی سالا بہت کتی چیز ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا، کون کیا ہے۔ آپ کو کیا پتہ کہ میں کون ہوں اور جی مجھے کیا پتہ کہ آپ کون ہیں"

گھوڑی چلتے چلتے پھر اڑ کر کھڑی ہو گئی۔ یاسین نے اسے ہنٹر مارے، پھر پچکارا، پھر گالی دی۔ گھوڑی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"سید صاب" وہ بیزاری سے بولا "یہ گھوڑی آگے نہیں جائے گی۔ اور جی میرا جی برا ہو رہا ہے"

"کوئی بات نہیں" وہ تانگہ سے اترتے ہوئے کہنے لگا "یہاں سے تو ہم پیدل بھی جا سکتے ہیں۔ فاصلہ ہی کتنا ہے"

یاسین نے تانگہ موڑا اور رحمٰن پورہ کی سمت ہو لیا۔

تھوڑی دور وہ بے سوچے سمجھے پیدل چلتا رہا۔ یاسین کے بہت سے فقرے اس کے ذہن میں اس طرح گونج رہے تھے جیسے اس کے اندر کوئی بلوہ ہو گیا ہو یا جیسے تانگہ سڑک پر چلتے چلتے کچے میں اتر گیا ہو۔ اور سارا رستہ اڑتی ہوئی گرد میں چھپ گیا ہو۔ رفتہ رفتہ یہ گرد خود ہی بیٹھ گئی۔ بس کوئی کوئی فقرہ یاد آتا اور اسے پکڑ لیتا "نہیں سید صاب آپ یہ نہیں کہیں گے؟" اور اسے یاد آیا کہ یہ کہتے کہتے یاسین کتنا سنجیدہ ہو گیا تھا۔ تو کیا اس نے سنجیدگی سے یاسین سے سوال کیا تھا۔ وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ شاید اس نے سنجیدگی سے یہ سوال کیا تھا ورنہ یہ بات اس کی زبان پر آئی کیوں؟ مگر شاید یہ اتفاق تھا کہ اس کی زبان پر ایک فقرہ آ گیا۔ وہ دیر تک ایک ناخوشگوار آدیزش میں مبتلا رہا اور فیصلہ نہ کر سکا کہ اس نے سوال سنجیدگی سے کیا تھا یا سنجیدگی سے نہیں کیا تھا۔ نہیں یہ بات محض دل لگی میں کہی گئی تھی اس نے تھک ہار کر فیصلہ کن انداز میں سوچا اور اس خیال کو ذہن سے بالکل رفع کر دیا۔

خیال کہ ذہن سے بالکل رفع ہو گیا تھا آدمیوں کی صورت واپس آیا؟ وہ آدمی جس نے تانگے کے برابر آ کر بال کا سوال کیا اور واپس چلا گیا، وہ آدمی جو تانگہ میں بیٹھا اور گالی دے کر اتر گیا، ان آدمیوں کے متعلق اسے یونہی تجسس سا ہوا کہ کون تھے وہ۔ اور جب وہ ان کے متعلق سوچ رہا تھا تو اسے اچانک اوورکوٹ والا آدمی یاد آ گیا۔ کون تھا وہ؟ اس سوال نے ایک حیرت بن کر اسے آ لیا۔ جب یاسین نے یہ سوال اٹھایا تھا تو وہ بالکل بے تعلق رہا تھا لیکن اب اس سوال نے اسے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا تھا، کون تھا وہ؟ اس نے اس کی صورت کو دھیان میں لانے کی بہت کوشش کی مگر اسے یاد آیا کہ وہ تو اوورکوٹ کے اونچے کالر میں گردن سمیٹے منہ دبئے بیٹھا رہا تھا اور وہ اس کی صورت دیکھ بھی نہیں سکا تھا اور وہ یہ سوچ کر حیران ہوا کہ جاڑے کی خاموش راتوں میں کس طرح کوئی اکیلی سواری تانگہ میں چپ چاپ بیٹھ جاتی ہے اور کسی بھی موڑ پر چپ چاپ اتر جاتی ہے، اور پھر وہ کبھی نظر نہیں آتی۔ اور کبھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس طرف سے آئی تھی اور کس طرف چلی گئی۔ "سید صاب آپ کو کیا پتہ کہ میں کون ہوں، اور مجھے کیا پتہ کہ آپ کون ہیں" عجب بات ہے۔ ہم جان کر بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ جب وہ یوں حیران ہو رہا تھا تو شک کی ایک ہلکی سی رو اٹھی اور اس کے دھیان کو کہیں سے کہیں لے گئی۔

کھمبے کے نیچے کھڑی ہوئی وہ عورت کہ چہرہ پہچانا چاہتی تھی کون تھی ؟ اور سڑک کے کنارے کنارے اندھیرے میں چلتا ہوا وہ شخص ؟ اسے یاسین کے سلوک کا دھیان آیا ۔ ان قصوں کا جو اس نے سنائے ۔ عجیب شخص ہے ۔ عجیب طرح کے قصے سناتا ہے ۔ کہتا ہے کہ ادھر کا ہوں ، کدھر کا ؟ اور اسے اپنی بے دھیانی کا خیال آیا کہ اس نے کبھی اس سے نہ پوچھا کہ وہ کس شہر سے آیا ہے اور کب آیا ہے ۔ پھر اس نے یونہی سوچا کہ آخر مجھ سے یہ کیسے بے تکلف ہوا کہ میں رخصت کے وقت ریستوران کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور کوئی دوسری سواری نہیں کرنے دیتا ۔ اسے کچھ یاد نہ آیا اور وہ یہ سوچ کر حیران ہوا کہ اس نے مجھے کیسے جانا ، اور میں نے اسے کیسے جانا ، آپ کو کیا پتہ کہ میں کون ہوں اور مجھے کیا پتہ کہ آپ کون ہیں ؟ میں ؟ ـــ وہ چلتے چلتے ٹھٹھک گیا ۔ میں کون ہوں ؟

میں کون ہوں ؟ اس سوال نے اسے بہت گڑبڑایا ۔ اس نے یہ طے کرنے کی بہت کوشش کی کہ وہ کون ہے لیکن وہ یہ طے نہ کر سکا کہ وہ کون ہے ، اور اسے شک ہوا کہ اسے اپنے بارے میں کچھ اسی قسم کا شک ہو چلا ہے جو اسے یاسین کے بارے میں اور یاسین کو دوسروں کے بارے میں چلا آتا ہے ۔ اس شک کے جھمیلے کو اس نے ایک ہی وار میں توڑ ڈالا ۔ اس نے ایک لمبی سی جمائی لی اور دل میں کہا کہ میں جو کوئی بھی ہوں ، بہرحال میں ہوں ، میں ہوں ، میں ہوں ؟ اسے دفعتاً احساس ہوا کہ اس نے کوئی بہت بڑا دعویٰ کر ڈالا ہے اور یہ احساس ہوتے ہی اس کا دعویٰ ایک شک بھرے سوال میں بدل گیا ۔ کیا میں سچ مچ ہوں ؟ پھر اس سوال نے ایک اور قلابازی کھائی اور یوں کھڑا ہوا ، تو کیا میں نہیں ہوں ؟ سوال یہ ہے کہ میں ہوں یا میں نہیں ہوں ؟ سوال یہ ہے کہ میں ہوں تو کیوں ہوں اور نہیں ہوں تو کیسے نہیں ہوں ۔ اور سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی ہو اور پھر نہ ہو ۔ سوالوں کے اس نرغہ میں گھرا گھرا وہ اس لمحہ میں پہنچ گیا جب وہ اب سے برس بھر پہلے اسی سڑک پہ سکوٹر سے گرا تھا ۔ جب وہ اٹھایا گیا تو اس نے تعجب سے یہ خبر سنی کہ وہ سکوٹر سے گر پڑا تھا ، مگر کب اور کیسے ؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ۔ آدمی جب گرتا ہے تو اسے مطلق اطلاع نہیں ہوتی کہ وہ گر گیا ہے ۔ یہ سوچ کر اسے کسی قدر تعجب ہوا اور اس نے اس لمحہ کو پھر سے یاد کیا جب وہ لوگوں کے کہنے سننے پر یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کیونکر گرا تھا ۔ اس نے اپنی گری ہوئی حالت کو دھیان میں لانے کی سخت کوشش کی ۔ مگر اس حالت کی کوئی تفصیل اس کے دھیان میں نہیں آئی ۔ بس یوں لگا جیسے وہ ان لمحوں میں تھا ہی نہیں ، جیسے وہ تھا اور پھر نہیں ہو تھا اور اب میں ہوں ؟ اس نے ہمدردی کرنے مجمع کے درمیان کھڑے کھڑے سوچا اور اسے یوں لگا جیسے وہ ہے بھی اور نہیں بھی ہے ۔ اور یہ خیال کر کے وہ ڈرا کہ شاید وہ نہ رہے اور اس نے اپنے سارے حافظہ کو ، اپنے ارادے کو اپنی مدد کے لیے بلایا اور اپنی پوری قوت فکر کے ساتھ اپنے وجود کو محسوس کرنے کی کوشش کی ۔ ہم ، اس نے سوچا ، اپنی فکر سے ، اپنے وجود کو محسوس کرتے ہیں ۔ میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں ۔ اور اس تکلیف کے لمحہ میں اس نے آپ پر کتنا جبر کر کے سوچنا شروع کیا تھا اور ان یادوں کو واپس لانے کی ٹھانی ، جو یکایک چڑیوں کی طرح اڑ گئی تھیں ۔ اور وہ انھیں ایسے واپس لایا جیسے کھیل سے بھاگے ہوئے بچوں میں سے کسی ایک بچہ کو کپتان پکڑ دھکڑ کر کے لائے اور فیلڈ میں کھڑا کر دے ۔ پھر دوسرے کو خوشامد کر کے لائے اور پھر بچے کچھ زبردستی کچھ اپنی خوشی جمع ہوتے چلے جائیں ۔ اور پھر اس نے وارڈ میں مریضوں کے درمیان پڑے پڑے ایک اطمینان کے ساتھ سوچا کہ چونکہ میں یادیں رکھتا ہوں اس لیے میں ہوں ۔ اور اس لمحہ اس نیم تاریک خاموش سڑک پہ پیدل چلتے ہوئے اس نے سوچا کہ اگر میں سوچنا بند کر دوں اور یادوں کو ملتوی کر دوں اور اس نے سوچا جیسے وہ نہیں سوچ رہا ہے ، جیسے وہ نہیں ہے ۔ چونکہ میں نہیں سوچتا اس لیے میں نہیں ہوں اور 'میں' کی قید سے آزاد ہو کر وہ دور دور گیا ۔ اس نے اس اجنبی جزیرے میں قدم رکھا اور سوچا کہ یہاں آدم زاد نہیں بستا ۔ پہلے اس نے سوروں کی ایک ریوڑ دیکھی ، پھر اسے کتے ہی کتے نظر آئے ۔ پھر اس نے اپنے آپ کو کتوں کے درمیان پایا اور ایک ہرن اسے دیکھ کر رو دیا اور آدم زاد کی زبان میں بولا کہ اے بدبخت تو بھی جزیرے میں ہے یہاں ایک ساحرہ حکومت کرتی ہے ۔ آدمی اس کی محلسرا میں جاتا ہے اور جانور بن جاتا ہے اور یہ سب پہلے آدمی تھے پھر سور اور کتے اور بکرے بن گئے اور مجھ پر اس نے رحم کیا اور ہرن بنایا اور اس نے ساحرہ کی محلسرا میں سوروں اور کتوں اور بکروں کے درمیان چلتے ہوئے اذیت سے سوچا کہ میں

کب تک اپنے تئیں برقرار رکھ سکوں گا۔ اس پر ایوب نے اپنی مثل بڑھائی اور کہا قسم زندہ خدا کی جس نے میرا حق لے لیا اور قادرِ مطلق کی جس نے میری جان کو کلپایا۔ میں اژدہوں کا بھائی اور شترمرغوں کا ہم نشین ہوا۔ بعد اس کے ایوب نے اپنا منہ کھولا اور اپنے دن پر لعنت کی۔ نابود ہو وہ دن جس میں میں پیدا ہوا اور وہ رات جس رات میں کہتے تھے کہ ایک لڑکا پیٹ میں پڑا۔" اس رات چوانگ زو نے خواب دیکھا کہ وہ مکھی بن گیا ہے وہ صبح جاگا تو سخت حیران ہوا کہ کیا وہ سچ مچ مکھی بن گیا ہے اور وہ عمر بھر یہ طے نہ کر سکا کہ آیا وہ آدمی ہے یا مکھی ہے اور سالا مرد، ان سب سالوں کی ٹانگیں بکروں کی ہیں۔ اس یاد کے ساتھ وہ واپس آیا اپنے 'میں' کے اندر اور اسے یاد آیا وہ شخص جس نے یاسین سے ماں کا سوال کیا اور مایوس گیا، وہ شخص جو تانگہ میں بیٹھا کہ تانگہ اسے کہیں لے جائے اور پھر وہ گالی دے کر اتر گیا۔ تب اس نے بڑے درد کے ساتھ کہ اس درد میں احساسِ برتری بھی شامل تھا سوچا کہ میں ان کے درمیان کب تک اپنے آپ کو برقرار رکھ سکوں گا۔ احساس برتری سے معمور اس درد نے اسے بہت تسکین بخشی۔ اس نے ایک پُراعتماد مظلومانہ شان کے ساتھ سوچنا شروع کیا۔ رات کے پُراسرار مسافروں کے بارے میں، دن دہاڑے، بنا سبب کچھ باہر سے آنے والوں کے بارے میں، یاسین کے بارے میں، جالندھر والے کے بارے میں۔ اور اس نے ان میں سے کسی کے بارے میں نفرت وحقارت کے احساس کے ساتھ اور کسی کے بارے میں ہمدردی اور انس کے ساتھ سوچا۔ اور اس نے سوچا کہ چونکہ میں محسوس کرتا ہوں اس لیے میں ہوں اور اس نے محسوس کیا اور اپنے دن پر لعنت کی۔ لعنت کی اس نے ان زندہ خداؤں پر جنھوں نے اس کا حق لیا اور اس کی جان کو کلپایا۔ ان شترمرغوں اور اژدہوں پر جو اس کے بھائی اور ہمنشین ہوئے۔ ترس کھایا اس نے اس ترسندہ ہرن پر جو اس کے لیے رو دیا: تو میں محسوس کرتا ہوں اس لیے میں ہوں مگر عین اسی گھڑی اس کے دماغ کے اندر اس کے اپنے کہے ہوئے لفظ گونجنے لگے۔ لفظ جو اس نے یاسین سے کہے اور لفظ جو یاسین نے اس سے کہے حیرت وتعجب سے تکتا ہوا یاسین اس کی نظروں میں پھر گیا۔ "سید صاب، آپ؟" اس نے حیران ہو کر سوچا کہ کیا یہ لفظ اسی نے کہے تھے اور یہ سوچنے کے ساتھ اس کا احساس مظلومی کچھ ڈھیلنے لگا۔ مگر یہ بات تو اس نے دل لگی میں کہی تھی۔ دل لگی میں؟ مگر دل لگی کیا ہوتی ہے؟ اس سوال پر وہ سخت گڑبڑایا اور پھر وہ یہ طے نہ کر سکا کہ وہ لفظ اس نے سچ مچ کہے تھے یا سچ مچ نہیں کہے تھے۔

ایک ذہنی کرختگی کے تحت وہ چلتا چلا گیا۔ یہ ساری گڑبڑ اس ایک سوال نے پیدا کی تھی کہ وہ لفظ اس نے سنجیدگی سے کہے تھے یا دل لگی میں کہے تھے اس نے بار بار طے کیا کہ وہ لفظ دل لگی میں کہے گئے تھے، مگر یہ طے ہوتے ہی دوسرا سوال سامنے آ کھڑا ہوتا، دل لگی کیا ہوتی ہے؟ اور ہم اپنے آپ کو باہر کب لاتے ہیں۔ اس وقت جب سنجیدہ ہوتے ہیں یا اس وقت جب دل لگی کرتے ہیں؟ اور اس عالم میں اس نے بڑے رشک کے ساتھ یاسین کو یاد کیا، کمبخت دم کے دم میں فیصلہ کر ڈالتا ہے کبھی عورت کے پیر دیکھ کر، کبھی مرد کی ٹانگیں دیکھ کر اور اس کے لب پر آنے والے اتنے سیدھے ہوتے ہیں کہ خود ہی اپنا جواب بن جاتے ہیں۔ ایک کتے نے لیٹے لیٹے اسے اپنی کینچ کی گولیوں ایسی آنکھوں سے گھور کر دیکھا۔ پہلے وہ اسی طرح لیٹے ہوئے گھورتا رہا، غراتا رہا، پھر وہ کھڑا ہو گیا جیسے ابھی وہ اس پر ٹوٹ پڑے گا، وہ ڈر کر پیچھے ہٹا، مگر یہ تو خود اسی کی گلی تھی۔ وہ سڑک سے نیچے اتر آیا تھا اور اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا اور اسے پہلے تعجب ہوا، پھر غصہ آیا کہ کمبخت روز اسے اس وقت آتے دیکھتا ہے اور آج اسے دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا۔ اس نے اسے سختی سے جھڑکی دی اور اپنے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ کتا پیچھے ہٹا، مگر پھر بھونکتا ہوا تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ اس نے کھڑے ہو کر پھر اسے جھڑکا، کتا پیچھے ہٹ گیا اور اس نے آگے بڑھ کر اپنے گھر پر دستک دی۔

اپنے کمرے میں داخل ہو کر بجلی جلائی، صبح کے آئے ہوئے کئی خط پڑے تھے۔ اس نے انھیں کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا، اس نے کس قدر چونکتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔ ایک بلی آہستہ سے کمرے میں چلی آئی تھی، مگر اب وہ دروازے کے قریب ٹھٹھکی ہوئی تھی اور اپنی نیلی نیلی

آنکھوں سے اسے تک رہی تھی " ہشت " اس نے بلی کو دھتکارا۔ دھتکار کھاتے ہی وہ اس طرح سٹکی جیسے وہ یہاں کبھی تھی ہی نہیں۔ اور اس نے اطمینان سے اخبار اٹھایا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ اس نے آج صبح بہت روا روی میں اخبار دیکھا تھا اب جو پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ پھر پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھوں میں غنودگی سی آنے لگی۔ اسے خیال آیا کہ اچھی خاصی رات گزر گئی ہے سونا چاہیے، تب اس نے اخبار بند کر ایک طرف ڈالا اور کپڑے بدلنے کی نیت سے پچھلے کمرے میں چلا۔

پچھلے کمرے میں جا کر جہاں روشنی خاصی مدھم تھی۔ اس نے کپڑے بدلنے شروع کیے۔ کپڑے بدلتے بدلتے اس نے اپنی برہنہ ٹانگوں پر نظر ڈالی اور کسی قدر ٹھٹھکا۔ اس نے تھوڑے شک کے ساتھ پھر اپنی برہنہ ٹانگوں کو دیکھا مگر وہ شک بس شک ہی رہا۔ وہ یہ طے نہ کر سکا کہ یہ برہنہ ٹانگیں اس کی اپنی ٹانگیں ہیں یا بکرے کی ؟

انوار الہدیٰ فی سیرت المصطفیٰ

المعروف بہ

انوارِ رسالت

سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ پر بے شمار کتابیں تصنیف ہوئیں۔ جن میں حضور سراپا منور کے کمالات کو تاریخ اور روایت کے آئینے میں دکھایا گیا ہے۔

حضور کی تشریف آوری کا اصل مقصد انسانیت کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو اللہ تعالیٰ سے جوڑنا تھا۔ اور مردہ دلوں کو زندہ کرنا تھا۔ دل کی موت کیا ہے؟ اور اس کی زندگی کیا ہے؟ اور وصال محبوب حقیقی کے کیا معنی ہیں؟ اور اس مقصد کا حصول کیسے ممکن ہے؟ انوار الہدیٰ میں تاریخ اور روایت کے ساتھ ساتھ اس موضوع کو واضح کیا گیا ہے اس کے مؤلف حضرت مولانا حاجی فضل احمد صاحب نے اپنے نرالے انداز تحریر سے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ ایک ایک لفظ تاثیر سے بھرا ہوا ہے اس کتاب کے مطالعہ سے آپ انشاء اللہ محسوس کریں گے کہ آپ کے دل میں انوار کی بارش ہو رہی ہے اور حبیب کبریا کا فیض آپ کے دل کو منور کر رہا ہے۔

۹ روپے

نظم :

خلیل الرحمٰن اعظمی
منیر نیازی
غالب احمد
ساقی فاروقی
محمد علوی
شہر یار
محمود ایاز
راجہ فاروق حسن
علاؤ الدین کلیم
محبوب خزاں
مبارک احمد

خلیل الرحمٰن اعظمی

شہر آشوب

جنابِ اعظمی! کیوں آپ ہیں اداس و ملول
ہوا ہے خانۂ دل میں یہ کس بلا کا نزول
ہیں بال بال پریشان، اڑی ہوئی ہے دھول
کسی سے بات بھی کرتے ہیں اب تو اوٗل جلول
کہاں گیا وہ توازن، وہ ضبطِ غم کے اصول

عزیزِ من! مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ہے مگر
خدا نے دی ہیں جو آنکھیں یہ میرے چہرے پر
سمجھ میں اب نہیں آتا کھلی رکھوں کیونکر
مجھے عجیب سا لگتا ہے آج ہر منظر
بدل گئے ہیں زمین و زماں کے سب معمول

ہے چہل پہل بہت، شہر خوب ہیں آباد
مگر کہیں نہیں ملتی ہے روحِ آدم زاد
جسے قریب سے دیکھو وہی ہے گرگ نژاد
چمن کو آج نہیں کوئی خطرۂ صیّاد
کہ ہیں بھرے ہوئے زاغ و زغن، چغد، چنڈول

وہ جن کو کہتے تھے سب مردمانِ بازاری
کہ جن کا پیشہ تھا آہنگری و نجّاری
وہ نائی، باطی، کباڑی، پنساری
امورِ خاص ہیں اب اُن کی ہے عملداری
بڑے عروج پہ ہیں آج سب ظلوم و جہول

ذلیل و خوار وہی ہیں جو اب ہیں اہلِ کمال
ہیں فاقہ مست جو اب ڈھونڈتے ہیں اکلِ حلال
نہیں شریفوں کو ملتی ہے آج روٹی دال
مگر رذیلوں کی جھولی میں ہے ہر اک زر مال
انھیں پہ فضلِ خدا ہے کہ جو ہیں سخت فضول

اُسی کی آؤ بھگت جس کو آئے دلّالی
جو کھودتا ہو جڑیں سب کی، ہے وہی مالی
اُسی کا نام مسیحا، کرے جو پامالی
اُسی کو عدل کا دعویٰ جو عدل سے خالی
اُسی کی عقل کا چرچا کہ جو ہے نامعقول

بغل میں جس کی ہو اب ردّیوں کا پشتارہ
اُسی کے علم کا بجتا ہے خوب نقّارہ
وہی ہے صاحبِ فن جو ہے فن کا ہرکارہ
وہ جس کا نام چلے، ہے اُسی کا پَو بارہ
جو منبروں پہ کھڑا ہو وہی ہے آج رسول

جو اپنی ذات سے اِک مرکزِ جہالت ہو
جو کوڑھ مغز ہو، جو تودۂ حماقت ہو
وہ جس کی منصبِ اعلیٰ کے بَل پہ شہرت ہو
اُسی کو پیش ہر اِک کرسیٔ صدارت ہو
اُسی کے سر پہ نچھاور ہوں ساری قوم کے پھول

وہ درسگاہوں میں تعلیم پر ہیں اب مامور
کہ جن میں علم نہ دانش، نہ زندگی کا شعور
کسی کے رُخ پہ خباثت، کسی کے سر میں فتور
ملے جو موقع تو بن بیٹھیں نادر و تیمور
یہ دیتے کٹے ڈگریاں کرتے ہیں انکے دام وصول

وہ جن کے نام کے آگے لگا ہے پروفیسر
کوئی غلام چرڈی کا تو ہے کوئی جوکر
کسی کا چہرہ ہو نقّ، کسی کا دِل پتھر
اکڑتے پھرتے ہیں یوں جیسے چونگی کے افسر
یہ جمع کرتے ہیں بازارِ علم کے محصول

عجیب طرح کے ہیں اب نونہالوں کے اطوار
نہ ان میں ذوقِ نمو، نے صلابتِ اظہار

یہ وضع قطع سے لگتے ہیں فلم کے کردار
بس ایک فکر کہ ہم بن سکیں دلیپ کمار
یہ ہیرو اپنی اداؤں کے آپ ہیں مقتول
نہ اُن میں میر نہ غالب نہ کوئی تلسی داس
نہ جستجوئے ہنر ہے نہ کوئی علم کی پیاس
وہ کہتے ہیں کہ ہے یہ شعر و فلسفہ بکواس
ہمارے جسم پہ سجتا ہے صرف چُست لباس
مکالماتِ فلاطوں کو پڑھ کے کیا ہے حصول
جو دیویاں تھیں وہ کرتی ہیں اب نئے فیشن
کوئی ہے زلف بریدہ تو کوئی تخجلی بن
بتائے کون کنواری ہیں یا کہ یہ دُلہن
نہ اِن کی مانگ میں سیندور نہ ہاتھ میں کنگن
نہ ان کی ناک میں ٹیکا، نہ ان کے کان میں پھول
مشاعروں میں غزلخواں ہیں شاعرانِ کرام
سُنا رہے ہیں بڑے تال سُر سے اپنا کلام
جو کامیاب گوئیے ہیں اُن کے اونچے دام
بدل سمجھتا ہے مجرے کا اس کو مجمع عام
غزل ہو پست تو کچھ اور ہوتی ہے مقبول
پڑھے لکھوں میں نئی شاعری کا چرچا ہے
ہر ایک مجتہدِ عصر بن کے بیٹھا ہے
مگر رسالوں میں ایسا کلام چھپتا ہے
کہ جس کا کوئی نہ اُلٹا ہے اور نہ سیدھا ہے
ہے ناقدوں کی سزا یہ بٹھائیں اس کی چُول
یہاں ادیب تو کم ہیں مگر بہت نقاد
کہ جن کا علم بہت سرسری و نام نہاد
کوئی کلرک کوئی مدرسے کا ہے استاد
رٹی رٹائی سی کچھ اصطلاحیں ان کو یاد

کہ جن کو اپنے مضامین میں کرتے ہیں منقول
ہے ناشروں کو شکایت ادب نہیں بکتا
یہ سوچتے ہیں کریں کاروبار کوئلے کا
وہی کتابیں جو ہیں فحش ، مبتذل ، گھٹیا
بس ان کو چھاپ کے ہوتا نہیں کوئی گھاٹا
کہ آج خلق خدا کرتی ہے انھیں کو قبول

بڑے فروغ پہ ہے آج فلم کا بیوپار
تجوریاں لیے بیٹھے ہیں سیٹھ ساہوکار
وہی گھسے ہوئے قصے ۔ وہی پٹے کردار
وہی سڑی ہوئی رومانیت کہ جس کے شکار
تمام کوچہ و بازار ، کالج و اسکول

منگائی جاتی ہیں جاسوسی ناولیں گھر گھر
عجیب نشہ سا ہوتا ہے جن کو پڑھ پڑھ کر
کمی سی رہتی ہے ملتا نہیں جو فلم فیئر
ریلیز کیوں نہ ہوئی بن رہی ہے جو پکچر
پہن کے نکلیں گے جس میں گدھے سنہری جھول

ہمارے مورث و اجداد پیٹتے تھے لکیر
اسی لیے تو بنے رہ گئے حقیر فقیر
مگر یہ ہم کہ جو روشن خیال و باتدبیر
رہیں گے توڑ کے رسم و رواج کی زنجیر
رہے گا اب نہ کوئی فرق فاعل و مفعول

اب اس کے آگے کہوں گا تو ہونگے سب برہم
اگرچہ اس میں نہیں جھوٹ کچھ خدا کی قسم
بدل گیا وہ زمانہ ، بدل گئے موسم
گئے دنوں کا کہاں تک کریں گے ہم ماتم
اسی میں خیر ہے اب اور دیں سخن کو نہ طول

منیر نیازی

تصویروں کا باطن

اِس موسم میں سارے شہر بنجر سے لگتے ہیں
پھر بھی اندر ایسا ہے اُن کا یوں اوپر سے لگتے ہیں
جیسے اچانک کبھی کھنڈر آباد نگر سے لگتے ہیں
دل ہیبت سے بھرے ہوئے اور چہرے ان کے خالی ہیں
جو کچھ ہے باطن میں ہے اور ظاہر جن کے خالی ہیں
آنکھ جمی ہے ان چہروں پر سارے عہد کے لوگوں کی
جیسے انہی کے پاس دوا ہے ان کے سارے روگوں کی

غالب احمد

وہ چندر

اُس کے چاروں اور گلابی پھول کھلے
وہ چندر کیوں پیلے پھول میں کھویا رہتا ہے
کب تک زرد نگارش سے سپنوں کے جال بُنے گا
کب تک دل کے درد کو یاد کی ندی میں دھوئے گا
کب تک درد کی مایا سے سیراب رہے گا
کب تک جسم کے اندھے خانوں میں سوئے گا
خون کو خواب کی سُولی پہ بیدار کرے
کبھی تو ان پھولوں سے آنکھیں چار کرے
اُس کے چاروں اور گلابی پھول کھلے

★

ساقی فاروقی

بس اسٹاپ

سُورج کی کرنوں سے پوچھو سُورج پیاسا ہے کہ نہیں!
سر نیوڑھائے کھڑی ہے دنیا ایک تماشا ہے کہ نہیں!
لِپ اسٹک، اسکرٹ، پوسٹر، برجتی بردت، چیک بک، نرس
اور دھوئیں کی شال میں لپٹا شہر سسکتا ہے کہ نہیں
اس پٹرول کی جھیل میں دل کا کنول اکیلا ہے کہ نہیں

ہوائی جہاز

یہ نیند میں کیسی گرہ پڑنے لگی
پلکوں کی محرابوں پہ جتنے خواب تھے
وہ ایک مہلک دھار سے کٹنے لگے
یہ رات اب تقسیم ہو جانے کو ہے
یہ شہر اب دو نیم ہو جانے کو ہے
وہ اک لکیر آواز کی بڑھنے لگی

محمد علوی

جدائی کا غم

گھنے جنگلوں میں
درختوں کی شاخوں پہ بیٹھے ہوئے
آدمی کی شباہت کے
بندر کی آنکھوں میں
(پچپڑی ہوئی،
ادھ کھلی، سرد آنکھوں میں)
غم یوں جھلکتا ہے جیسے
ابھی اُس کے ساتھی
ذرا دیر پہلے
اُسے چھوڑ کے
دُور ——
جنگل کے اُس پار
سرسبز و شاداب
میدان میں جا بسے ہیں!!

محمود ایاز

نیا نوحہ

سیہ رات میں ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے،
خروشاں سمندر کی موجیں مجھے ڈھونڈتی ہیں
خروشاں ہوا کی صداؤں میں تیری صدا ہے
مرا دل تجھے ڈھونڈتا ہے

سیہ رات اشکوں کی شبنم میں سوئی ہوئی ہے
ہر اک پل، ہر اک لمحہ ماضی کا زندہ ہے، موجود میں جاگتا ہے
مگر تیرا پیکر،
تہِ خاک اندھیروں کے دامن میں سویا ہوا ہے
مرا دل کہ ماتم گرِ رفتگاں ہے، تجھے ڈھونڈتا ہے

میں آسودۂ الگ، خاموش، اس رات کی جلتی آنکھوں کو دیکھوں،
سیہ رات میں ٹمٹماتے ہوئے ان ستاروں سے پوچھوں،
خروشاں سمندر میں ڈوبا ہوا چاند کس اجنبی سرزمیں پر تبسّم کناں ہے
نقوشِ کفِ پا کی منزل کہاں ہے ؟

یم زندگی سیل در سیل بہتا ہوا،
ایک لمحے کو رُک کر، پلٹ کر تو دیکھے ۔
سیہ رات میں ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے،
فقط اک شبِ بے صدا جاگتی ہے
شبِ بے صدا پوچھتی ہے
بپھرتی ہوئی موجِ دریا کدھر سے چلی تھی،
کدھر کو چلی ہے ؟
ترا دل کہ ماتم گرِ رفتگاں ہے،
کسے ڈھونڈتا ہے ——— ؟؟

شہریار

ایک منظر

نیند کی سوتی ہوئی خاموش گلیوں کو جگاتے
گنگناتے
مشعلیں پلکوں پہ اشکوں کی جلائے
چند سائے
پھر رہے تھے
رات جب ہم خواب کی دنیا سے واپس آ رہے تھے

"وہ آسمان"

آسمان دکھ کے غموں کے آسماں
آسماں سیراب جو کرتے زمیں دل کی زمیں کو تھے سدا
جن سے سیکھی ہم نے جینے کی دوا
بے حسّی کے بادلوں کی دھند میں گم ہو گئے
وہ آسماں

راجہ فاروق حسن

سلسلہ شوق کا

اسی وسیلے سے جانتا ہوں
تمہیں بھی ، اس جسم کو بھی
جو زندگی نے بخشا ہے
جس سے مجھ پر سلامتی ہے
گئے دنوں کی حکایتوں میں
کتابچوں میں
جو جسم کا دوسرے سے پیمان کا وسیلہ ہے
جانتا ہوں
کہ ہیں بھی ہم بھی
کچھ آج کے دن کی روشنی میں جواں نہیں ہوں
کچھ آج کے دن کی روشنی ہی نہیں ضمانت
کہ دونوں زندہ ہیں
آج کی رات کی سیاہی میں سانولا جسم
دوسرے جسم کی عبادت کا مستحق ہے

حکایتوں کے ہزار ایسے ہی واسطے ہیں
حدیث ہیں جو مرے تمہارے ملاپ کی
اور ملاپ کی تہ میں رقص کرتی جدائیوں کی
جدائیوں کی ،
دنوں کو شب میں بدلنے والی قیامتوں کی
قیامتوں کی ،
کہ اس سے آگے بس انتہا ہے
جدائیوں کی ، ملاپ کی بھی ؛
طویل ہے تیرا میرا قصہ ،

س. ذ. الدین کلیم

جامِ خالی

(شیخ اکرام الحق کے نام)

سرسرائی جو گلستاں میں ہَوا دُور تلک — چار سُو پھیل گئی تازہ شگوفوں کی مہک
لہلہاتے ہوئے جھونکوں نے کہا سبزے سے — تو ابھی اور لہک اور لہک اور لہک
قعرِ دریا میں ستاروں کے سفینے اُترے — رُوئے دریا پہ چلی چاند کے بجرے کی جھلک
دُور پربت سے دھواں دھار گھٹائیں اُٹھیں — اپنے آنچل سے چھپاتے ہوئے بجلی کی چمک
اپنی رفتار کی گرمی سے گھنیرا بادل — بن گیا ایک بھڑکتے ہوئے شعلے کی بھڑک
پھر گرجنے کی صدا رات کے سناٹے میں — دامنِ کوہ سے پہنچی مرے کاشانے تک
میری آنکھوں میں چکا چوند ہوئی بجلی سے — میرے چہرے پہ تھرکنے لگی کوندے کی لپک

حسرت و یاس کے نغمے کی پرانی آواز
جامِ خالی میں برستی ہوئی بُوندوں کی کھنک

محبوب خزاں

قطعات

ایک محبت کافی ہے — باقی عمر اضافی ہے
کہتا ہے چپکے سے یہ کون — جینا وعدہ خلافی ہے

سونی سونی سہانی سہانی — اُف یہ فصلِ محبت۔ جوانی
پھر وہی سلسلے تشنگی کے — دلکشی۔ دل کی عادت پُرانی

اب آنکھوں میں جلوے ٹھہرتے نہیں — ایسے لمحے بھی ہیں جو گزرتے نہیں
ہائے جی کی لگن کیسی رسوا ہوئی — حُسن والے محبت سے ڈرتے نہیں

محبت کے لیے دنیا بہت ہے — سرِ تسلیم میں سودا بہت ہے
ارادہ ہے کہ دنیا کو بھی دیکھیں — تجھے ہر چیز میں دیکھا بہت ہے

گئی بہار پھر اب کے برس ہے آنکھوں میں — بہار آئے تو کیسے، قفس ہے آنکھوں میں
یہ ہاتھ اب نہیں اُٹھتے، نگاہ بڑھتی ہے — طلب نہیں تو بڑی دسترس ہے آنکھوں میں

کھلتے نہیں ہیں بھید، نصیبت یہی تو ہے — دُنیا سے آدمی کو شکایت یہی تو ہے
ہاں پھر وہی سوال۔ کوئی اور داستاں — اے خانماں خراب محبت یہی تو ہے

ہم ان کو امام جانتے ہیں — جو علم کلام جانتے ہیں
بدنام نہ کر ہمیں کہ آخر — ہم بھی ترا نام جانتے ہیں

حسن کو سادگی سمجھتے ہیں — رنگ کو روشنی سمجھتے ہیں
اس طرح مسکرا کے مت دیکھو — لوگ کچھ اور ہی سمجھتے ہیں

مبارک محمد

زمانہ عدالت نہیں ہے

زمانہ عدالت ہے
اور مَیں بغاوت کے الزام میں پا بجولاں کھڑا ہوں
مرا جُرم یہ ہے کہ میں نے
مقدس بلندی پہ استادہ ہو کر
زمانے کو آواز دی
اور صدیوں پُرانا لبادہ اُتارا
مرے جسم پر ایک سو ایک روشن نشاں تھے
مرے زرد ماتھے کی بارہ لکیروں سے
گہرے تفکر کی کرنیں بکھرنے لگیں
اور لوگوں کے چہروں پہ گزرے زمانوں کی
اندھی عقیدت کا سیلاب پایاب تھا
اُن کی آنکھوں میں صدیوں پُرانی کہانی سے
تازہ اُبھرتے سوالوں سے
مجھ سے جوابات چاہے تو مَیں نے کہا
ارتقا اور تعقّل سے عاری مذاہب جہالت کا سرمایہ ہیں
اور یہ دورِ جمہوریت اور عدل و مساوات کا دَور ہے
آمریت کی سب صُورتیں
کفرِ انسان و الحادِ انسانیت کا کھلا درس ہیں
اور فکر و عمل کے سبھی مسئلے
کاروبارِ شب و روز کے سب تقاضے
سیاق و سباقِ محبت کی تفسیر ہیں
اور سیاق و سباقِ محبت میں ایفائے عہدِ وفا شرط ہے

اِس زمیں کا ہر اک فیصلہ تم سے منسوب ہے
اور جزا و سزا کے سبھی مرحلے
ذات کے مرحلے ہیں
بدن کا جزا و سزا سے علاقہ نہیں ہے
کہ فکر و ارادہ میں ہر ذہن آزاد ہے ——
"کون آزاد ہے
دائیں بازو کے راہب نے مالا ہوا میں اُچھالی
تو کتنی ہی مالائیں اوپر ہوا میں اُٹھیں
اور راہب مقدس بلندی کی ڈھلوان پر
ایک سو اک قدم میری جانب بڑھا
اور گویا ہُوا
"کون آزاد ہے ——
ہم بہت ہیں تو پھیلے سمندر کی موجیں ہیں
طوفاں نہیں ہیں
کہ طوفاں ستاروں سے منسوب ہے
اور موجوں کی بے بادباں کشتیوں کو
حوادث کے گرداب میں
عکسِ افلاک ساحل نہیں ہے
یہاں کس کے ترکش میں وہ تیر ہیں
جو ستاروں کو چھیدیں تو قسمت کی تحریر بدلے
پُرانی کمندیں کہاں ہیں
کہ ہم چاند جُوئے پہ جُھولیں

تو خوشیوں کو چھو لیں
ہمارے نغموں میں امنگوں کی پہلی پرانی پیاس رہتی ہے
جیسے کھول کر ہم زمینوں کے
صحراؤں کے
اور پہاڑوں کے دروازے کھولیں
تو مخفی خزانوں کو پائیں
ہواؤں کو قبضے میں لائیں
تو بادل برسنے لگیں
بجلی اور بنجر زمینوں پہ
پاؤں کی ٹھوکر سے چشمے اُبلنے لگیں
اور دریاؤں کا جال پھیلے
ہری کھیتیاں لہلہائیں
تو خوشبو بھری ٹہنیاں جھوم اٹھیں
مگر اب کوئی ایسا امکاں نہیں ہے
کہ ہم اپنے ہاتھوں کی اُن لکیروں میں
اُن ہوئی آرزوؤں کی
تسکین و تکمیل چاہیں تو ممکن نہیں ہے
کہ یہ دور عجز و نیاز اور دعاؤں کا طالب ہے
لیکن یہاں
ایک سو ایک دانوں کی مالا پہ اقرار کی انگلیاں کم پھسلتی ہیں
پھیلی زمیں پر بدن کا مقدر سزا ہے
کہ انسان خواہش کے صحرا میں
انکار کی ریت پر
خود ستائی کا اِک عارضی نقش ہے
صورتیں اپنی حالت میں قائم نہیں
ہم اسیرِ زمان و مکاں ہیں
یہاں کون آزاد ہے

ہم تو سانسوں کی گنتی کے پابند ہیں ——— "
اور میں نے کہا
عرصۂ زندگی ہم پہ محدود ہے
ہم اسیرِ زماں و مکاں ہیں
مگر حدِ امکاں میں آزاد ہیں
اور حدوں کا تعین اضافی ہے
یہ تو ہمیشہ بدلتی رہی ہیں، بدلتی رہیں گی
زمان و مکاں میں بدن کا سفر تو فقط ذہن کا عکس ہے
عکس کو پیٹنے سے بھلا فائدہ
جھوٹ، افلاس، جبر و تشدد
کثرتِ رنج، ہر اک سزا
قتل اور خودکشی
سب جہالت کا سرمایہ ہیں
اور جہالت گناہِ کبیرہ ہے
اور علم کی روشنی اس کا خمیازہ ہے
خوف ڈر اور دہشت سے جو چیز پھیلے وہ نیکی نہیں ———
بائیں بازو کے لوگوں کی آنکھوں میں
گہرے شگفتہ خیالوں کی پہلی لگن جاگ اٹھی
درمیاں کے بہت دور تک پھیلے چہروں پہ
گہری مسرت کے آثار تھے
دائیں بازو میں ہنگامہ برپا ہوا
اور تکبیر تکوین خطوں سے اُلجھنے لگیں
لوگ اُٹھنے لگے
ہر طرف ایک آفت مچی
دائیں بازو کے پیچھے مسلح قطاروں کے سالار نے
اپنی آنکھوں پہ پٹی کسی
ایک سو ایک احکام جاری کیے

ایک سو ایک تیروں کی بارش ہوئی
ایک سو ایک روشن مقاموں کو سُرخی ملی
علم و عرفان و حکمت کی اُونچی بلندی کو جاتے ہُوئے
ہر بڑے راستے پر
حفاظت کی خاطر سپاہی مقرّر ہُوئے
امن قائم ہُوا
ہر سپاہی کے دل میں مگر ناگ کا خوف تھا
ناگ جس کی حفاظت میں روشن بلندی تھی اور علم کا نُور تھا
ناگ کے دھیان سے ڈر کے سالار نے
جسم پر زرد مٹی ملی
اور اُونچی مقدس بلندی پہ آیا
مرے ایک سو ایک زخمیدہ روشن مقاموں کی سُرخی کو
بُجھتے دہکتے ہُوئے ایک سو ایک داغوں سے داغا گیا
اور مرے زرد ماتھے کی بارہ لکیروں پہ
موٹی سیہ پٹیاں کس کے باندھی گئیں
آخر کار سالار نے
میری خواہش کے ہر ایک امکاں کو جانچا
تو پہلی اچھوتی شگفتہ مسرّت کو روشن بلندی پہ آنے کا پروانہ جاری کیا
اور رخصت ہُوا
چاند کی چودھویں تک
شگفتہ مسرّت نے میرے بدن کے تقاضوں کو پورا کیا
اور فکر و تخیّل کی تہذیب و تقریب میں
آنے والے دنوں کی بہاروں کے خواہش بھرے گیت گاتے
بدن کو زمیں پر نئی زندگی کی تمنّا کا تحفہ دیا
زخم کا فور تھے
ایک تازہ نئی زندگی سے مرا ربط قائم ہُوا
چاند بڑھتا رہا
اُس کی آنکھوں میں گہری اچھوتی لگن چاند کے ساتھ بڑھتی رہی
چودھویں رات کی شام نے
چودھویں رات کے چاند کی روشنی میں
شگفتہ مسرّت کا گورا بدن نیم عریاں لبادے میں دیکھا
تو لوگوں میں باتیں ہوئیں
اور شگوفے کھلے
دائروں اور قوسوں سے نکلیں لکیریں خطوں کے سہارے اُلجھنے لگیں
اور نقطے فضا میں بکھرنے لگے
ہر کسی کے لیئے زندگی کے معانی الگ تھے
کسی نے اُسے میری بیوی بنایا
کسی نے کہا داشتہ ہے
کسی نے کہا اس کے اعمال دیکھو
تو یہ نیک بیٹے کی چاہت میں گھُلتی ہُوئی ماں کا عکسِ حسیں ہے
کسی نے کہا ایسے وقتوں میں اچّھی بہن کے سوا کون نزدیک آتا ہے
یہ تو بہن ہے
کسی نے کہا یہ تو بیٹی ہے
ورنہ یہاں کون بے لوث خدمت میں
راتوں کی نیندیں اڑانے پہ آمادہ ہوگا
کسی نے کہا یہ حقیقت میں پہلی
ازل کی دبی خواہشوں کے تقاضوں کی آسودگی کے لیئے
استعاروں کی سمٹی ہُوئی کہکشاں ہے
کسی نے کہا دوستی سے بڑا کوئی رشتہ نہیں ہے
کسی نے کہا اس جہانِ توہّم میں ہر شے تخیّل کی تجسیم ہے
ہر کوئی حدِّ امکاں سے ناآشنا
اپنے اپنے معانی میں پابند و مجبور تھا
ہر نظر اور مقدس بلندی کے مابین پردہ لٹکتا رہا
ہر کسی کے لیئے زندگی سے مرا رابطہ راز تھا۔

چاند نے مسکرا کر کہا
"آفتاب کہن سے زیادہ مجھے علم ہے
مرد عورت کے مابین پہلا حقیقی تعلق
وہی مرد عورت کا پہلا حقیقی تعلق ہے
جس کے لئے ناگ روزِ ازل سے زمانے میں بدنام ہے
اور باقی سبھی سلسلے بعد کے سلسلے ہیں
حقیقت جہاں منقسم سات رنگوں میں
قوسِ قزح بن کے
دل کو بھاتی تو ہے ہاتھ آتی نہیں ——"
رات خاموش تھی
وقت اُس کے لئے ضبط کا امتحاں تھا
مگر خامشی ہر گھڑی تیر بن کر چبھی
آگہی کے سمندر پہ پھیلی ہوئی چاندنی میں ستارے لرزنے لگے
رات بولی
"زمیں کی مسافت میں انسان نے
اپنی فطرت کو جُرم و گنہ جان کر
روشنی سے بچاتے ہوئے
میرے پھیلے ہوئے دامنِ تیرگی میں چھپنے دیا
اور یوں چاند اور آفتابِ کہن سے زیادہ مجھے علم ہے
اور سارے زمانوں کے سارے حقائق
مری کوکھ میں دفن ہیں
اور میں پیٹ کی ایسی ہلکی نہیں ہوں
زمانہ وہ نزدیک آتا ہے
جب علم و عرفان و حکمت کے پرچم کی دُنیا میں تعظیم ہوگی
کوئی سُورما تیشۂ نُور لے کر
زمیں اور زمیں کی مقدس چٹانوں کے سب راز افشا کرے گا
تو میری ازل کی بھری چھاتیوں سے
جُوئے شیر بہنے لگے گی
مری کوکھ سے کسمسا کر نکلتا ہوا تازہ سُورج
زمانے کو روشن کرے گا
بہ ہنگامِ جشنِ طلوعِ سحر
زندگی اپنے ظاہر کے سارے لبادے اُتارے گی
عُریاں حقائق کی تقدیس میں
لوگ خواہش کے ہر لفظ کے آستاں پر جھکیں گے
تمنا کی یورش میں لفظوں کے فولادی دروازے کُھل جائیں گے
اور صدیوں کے معتوب قیدی خیال
اپنے پاؤں میں بوسیدہ اقدار و معنی کی زنجیریں توڑیں گے۔
اور پتھروں کی جگہ سُرخ پھولوں کی بارش میں
سارا زمانہ اُنھیں بڑھ کے چومے گا۔
پیالوں میں زہرابِ نفرت کی شعلہ فگن آتشیں لرزشوں کی بجائے
محبت کے مشروب کی پیشکش
رقصِ فردا کا آغاز ہوگی
بکھرتی ہوئی موجِ نغمہ کے بل پر
تھرکتی ہوئی زم زمیں
حسیں دائروں میں کُھلیں گی
لچکتے بدن
بارِ لذت سے رُک رُک کے بہتے ہوئے
گھومتے دائروں کے مدور خیالوں میں پھیلیں گے
اقرارِ عہدِ محبت میں ہر لفظ کے ہونٹ
معنی کی شدت سے لرزیں گے
امکانِ تشریحِ اصلِ حقیقت کی افشاں میں
تازہ نئے دور کے نام کے جام چھلکیں گے ——"
تازہ نئے آنے والے زمانے کے خوش کُن تصور میں
آنکھوں کے پیمانے چھلکے

تو فکر و تخیل کے آہنگ نے کروٹیں لیں
تمنا کے لمحے کے گھیرے کی حدت میں دو جسم گھلنے لگے
ناچتی رقص کرتی شگفتہ مسرت نے
پیمانِ اُلفت میں
اپنی جوانی کی اور چاند تاروں کی قسمیں اُٹھائیں
زمیں پر محبت کا اظہار چاہا
تو دل اور دل میں بکھے تیرِ الفت کی تصویرِ عنواں بنی
اور نیچے شہادت کی اُنگلی سے لکھا
"یہ ہے روحِ معنی"
جو تم نے مرا ساتھ چھوڑا
تو میں زہر کے زرد پیالے کو منہ سے لگا کر کہوں گی
کہ یہ مجھ کو برسوں پہ پھیلی جدائی کے لمحوں کی کلفت سے بہتر ہے ــــ"
لیکن تمنا کے ساتھی بچھڑنے کو تھے
رات کا نصفِ اول گزرنے کو تھا
چاند سر پر لرزنے لگا
امتحاں کی گھڑی آ گئی
سینکڑوں مشعلیں دُور ڈھلوان سے
دھیرے دھیرے بلندی کی جانب سرکنے لگیں
اور لمبی زبانوں کے شعلے فضاؤں میں پھیلے
دھوئیں کے سیہ بادلوں نے بلندی کو گھیرا
شگفتہ مسرت کو نیچے بلایا گیا
امتحاں کی گھڑی اس کے عزم و ارادہ پہ بھاری ہوئی
میں نے چاہا کہ روکوں
مگر وقت کا لمحہ مجھ سے گریزاں
مری دسترس سے پرے دُور ہوتا گیا
دُور آندھی اُٹھی
اور گہن چاند کو کھا گیا

لوگ نزدیک آئے
تو اُن کی زبانوں پہ تالے تھے
کانوں پہ مُہریں تھیں
آنکھوں پہ پردے تھے
کچھ لوگ آگے بڑھے اور مرے بازوؤں کو
مرے زرد شانوں پہ رکھے گئے چوبی تختے سے باندھا گیا
مرے چہرے پہ خوشیوں کی لہریں بکھرنے لگیں
اور مجھے لذتِ درد و گریہ ملا
چند لمحوں کی فرصت میسر تھی، میں نے
بلندی پہ استادہ پتھر کو اپنی دہکتی ہوئی دونوں آنکھوں سے چوما
تو پتھر پہ آنکھوں کی تصویر کندہ ہوئی
اور دو آنسوؤں کی لکیریں زمیں تک گئیں۔
دائیں جانب کھڑے زرد سالار نے بوڑھے راہب سے تعبیر چاہی
تو اُس نے کہا
"اِس مقدس بلندی کے پتھر کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کی لکیریں
اُفق پر بکھرتی ہوئی سُرخ اور زرد آندھی
سروں پر لرزتے ہوئے چاند پر پھیلی دھرتی کا سایہ ــــ
قیامت کے آثار ہیں ــــ"
مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا
اِس بلندی کے پتھر کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کی لکیریں
حقائق کے رستوں پہ بہتے ہوئے وقت کی داستاں ہیں
گزرتے ہوئے المیے کی علامت ہیں
اور آگہی کے سمندر سے نکلے ہوئے درد و لذت کے موتی ہیں
پھیلی زمیں کا لرزتے ہوئے چاند پر پورا سایہ
علامت ہے
ہم رات کے وسط میں ہیں
اُفق پر بکھرتی ہوئی سُرخ اور زرد آندھی

اشارہ ہے
طوفان آنے کو ہیں
اپنے شہروں کو جاؤ تو ہر سمت امن و تعاون کا پیغام بھیجو
پُرانی فصیلوں کے رخنوں میں فولاد و آہن بھرو
سرحدوں پہ کھڑے دیوداروں کی مانند نگراں رہو
اور بوسیدہ صدیوں کے مُردہ سوالوں کی تکرار چھوڑ دو
کہ تکرار میں مَوت ہے
زندگی دو قدم آگے بڑھنے کو کہتے ہیں
نیکی بدی اور جزا و سزا ایک مربُوط و نا منقسم تجربہ ہے
جہاں زندگی کے فریضے کی لمبی مسافت کا ہر پل قیامت ہے
پل کی عدالت کے سب فیصلے ذات کے فیصلے ہیں
زمانہ حقیقی عدالت نہیں ہے

———— . . . . . ————

ڈراما اور سفرنامہ

ریوتی سرن شرما
اختر ریاض الدین

ریوتی سرن شرما

"کچھ سفیدی کچھ سیاہی"

کرشن ۔ میں حاضر ہو سکتا ہوں ڈرامہ نگار صاحب ؟

سریندر ۔ کون کرشن ! ارے آؤ آؤ ، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا ۔

کرشن ۔ باپ رے باپ ! تب میں یہیں سے لوٹا ۔ آج میرے پاس آپ کا ڈرامہ سننے کا نہ کلیجہ ہے نہ وقت ۔

سریندر ۔ (ہلکے سے ہنس کر) ابے گھبراتا کیوں ہے ۔ تیری بد دعا سے پورا ہی نہیں ہوا ۔

کرشن ۔ تب میں اندر قدم رکھنے کا خطرہ مول لے سکتا ہوں ۔

سریندر ۔ ابے جا جا ، اپنے نصیبوں کو نہیں سراہتا کہ ایک عظیم ڈرامہ نگار نے تجھے اس بات کا شرف بخشا ہے کہ . . . . . .

کرشن ۔ اُسے اپنی بکواس سنائے اور خرافات پر سر دھنوائے ؟

سریندر ۔ کیا کہا ؟ ۔ میں خرافات لکھتا ہوں اور بکواس کرتا ہوں ؟

کرشن ۔ بالکل ۔ اور رونا یہ ہے کہ وہ بھی روانی سے نہیں کرتے ۔ ہفتوں مہینوں جھک مارتے ہو ، تب کہیں ایک گھٹیا سے ڈرامے کی بھولدار گدڑی تیار کر پاتے ہو ۔

سریندر ۔ (سنجیدہ ہو کر) یہ تو ٹھیک کہتا ہے کرشن ۔ میں واقعی جھک مارتا ہوں ۔ ورنہ کیوں مجھے ایک ایک لائن کے لئے گھنٹوں فرزیجی کرنی پڑے ۔ کیوں ایک ایک سین پر دنوں کام کرنا پڑے ؟ کیوں آدھا اپنا ڈرامہ لکھ کر میں رُک جاؤں ؟

کرشن ۔ نہیں ، خیر ایسی بات تو نہیں ہے ۔ تمہارے ڈراموں میں ایک بات ہوتی ہے ، ڈائیلاگ میں جان ہوتی ہے ، وہ ایک خیال کی طرف لے جاتے ہیں ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کلائیمکس پر پہنچ کر تم ہمیشہ ٹھٹھک جاتے ہو ۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے کیرکٹروں کو آگے لے جاؤ یا پیچھے ہٹاؤ ۔ ان سے بغاوت کراؤ یا ان کے سر جھکواؤ ۔

سریندر ۔ تم نے بالکل درست محسوس کیا ہے کرشن ۔ اپنے کیرکٹروں کو ڈرامہ کی اُلجھن میں گرفتار کر کے میں خود اس اُلجھن میں گرفتار ہو جاتا ہوں کہ انہیں کس راستے پر لے جاؤں ۔

کرشن ۔ لیکن اس میں اِتنا سوچنے کی کیا بات ہے ۔ وہ جس راستے پر جاتے ہیں ، جانے دو ۔

سریندر ۔ چاہے وہ غلط ہو ؟

کرشن ۔ ہاں ۔ دنیا میں لوگ غلط راستوں پر نہیں جاتے ہیں ؟ کیا بہکنا بھٹکنا زندگی کی سچائی نہیں ہے ؟

سریندر ۔ ہے اور اسی لئے میں ایسے کیرکٹروں کو پیش بھی کرتا ہوں ۔ لیکن کیا زندگی کی طرح ڈراموں میں بھی ان کو بہک جانے دوں ؟

کیا اس سے سماج میں بھٹکنے کو بڑھاوا نہ ملے گا ؟

کرشن :۔ ہو سکتا ہے۔ مگر اس میں تمہارا کیا قصور ؟ تم تو محض اس کی تصویر پیش کرو گے۔

سریندر :۔ لیکن میں فوٹو گرافر ہی نہیں ہوں۔ میں یہ بھی بتاتا ہوں کہ انسانوں کا کیا ہونا چاہیئے۔

کرشن :۔ تو پھر اپنے کیرکٹروں کو شطرنج کی مہروں کی طرح گردن سے پکڑ کر صحیح راستہ پر لے آیا کرو۔

سریندر :۔ لیکن یہ قدرتی نہ لگے گا۔ بناوٹی سدھار واد کہلائے گا۔

کرشن :۔ کہلانے دو۔

سریندر :۔ لیکن وہ کسی اچھے لکھنے والے کو منظور نہیں ہو سکتا۔

کرشن :۔ تو پھر کھڑے رہو۔ اٹکے ہوئے دوراہے پر۔

سریندر :۔ کھڑا تو ہوں، تین دن کی سر کھپائی کے بعد بھی اس ڈرامہ کا صرف ایک ہی سین اور لکھ پایا ہوں۔

کرشن :۔ بس ایک ہی سین ؟

سریندر :۔ ہاں۔

کرشن :۔ ذرا سنیں تو۔

سریندر :۔ وقت ہے ؟

کرشن :۔ ابے وہ تو مذاق تھا۔ ورنہ اپنے پاس کچھ اور رہے نہ رہے وقت ہمیشہ رہتا ہے۔

سریندر :۔ تو سنو۔ تم پڑھ چکے ہو کہ میرے ڈرامے کی ہیروئین آشا اپنے پتی کشور سے خوش نہیں رہتی۔ اُسے نہ چاہنے کی وجہ سے ہر وقت اسے غصّہ اور جھنجھلاہٹ چڑھی رہتی ہے۔ لیکن کچھ دن بعد اس کا کشور کے پارٹنر چندر سے پیار ہو جاتا ہے اور اس کی گھٹن اور جھنجھلاہٹ کہرے کی طرح چھٹ جاتی ہے۔ وہ قہقہوں میں پھوٹ پڑتی ہے۔

(ڈرامہ کا سین۔ ایسے باقاعدہ پیش کیا جائے)

آشا :۔ اوہ چندر! تم مجھے ہنسا ہنسا کر مار ڈالو گے۔ اب بس کرو۔

چندر :۔ نہیں، نہیں آج نہیں آشا۔ آج تو اتنے دنوں کے بعد بلبل کو نغمے لٹاتے دیکھا ہے۔

آشا :۔ لیکن بلبل اب نغمے لٹاتی ہی رہے گی چندر۔

چندر :۔ مجھے مت بہلاؤ آشا۔ میرے لیے بہار کے دو چار دن ہی آتے ہیں۔ ان کے جاتے ہی بلبل پھر خاموش ہو جاتی ہے۔

آشا :۔ لیکن اب خاموش نہیں ہوگی۔ جس نے بلبل کے دل کی ٹھٹھری ہوئی کلی کھلائی ہے، جس نے اس کی آتما میں چھپے ہوئے سوتوں کو آزاد کیا ہے، بلبل اس کی ڈال پر بسیرا کئے بنا اب نہیں رہ سکتی۔

چندر :۔ (معنی خیز انداز) کشور کے آنے کے بعد بھی ؟

آشا :۔ (کھٹے دل سے) ہاں، ان کے آنے کے بعد بھی۔

چندر :۔ پھر کشور پرسوں واپس آ جائے گا۔

آشا۔ آ جانے دو اب میں اور نہیں چھپاؤں گی۔ سب کچھ بتا دوں گی۔ کہ اب میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتی۔ لیکن کیا اس وقت تم ان کا ٹور آگے نہیں بڑھا سکتے؟

چندر۔ کیوں نہیں بڑھا سکتا۔

آشا۔ تو بڑھا دو۔ ان کو تار دے کر کوئی اور کام بتا دو کہ تمہاری نمبی کو چھپانے کے لئے کچھ دن اور مل جائیں۔

چندر۔ کل ہی لو۔ میں ایکسپریس تار دے کر ایسا کام بتا دونگا کہ وہ آٹھ دن سے پہلے نہ آ سکے گا۔

آشا۔ ضرور بتا دو اور میں بھی چٹھی لکھ دونگی۔

چندر۔ تمہارے چٹھی لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟

آشا۔ یہ تم نہیں جانتے۔ اگر میں چٹھی نہیں لکھوں تو تمہارے تار اور ٹیلگرام سب بیکار رہیں گے۔ کشور تار دار سب کی پرواہ کیے بغیر پرسوں نہیں آجائے گا۔

چندر۔ اتنا یقین ہے؟

آشا۔ یقین نہیں تجربہ ہے۔ ایک بار لکھنؤ ٹور پر گئے تھے، میری چٹھی ڈاک میں گم ہوگئی تھی، چوتھے دن دیکھتی ہوں ٹور ادھورا چھوڑ کر گھر آ گئے تھے۔

چندر۔ روپ ہی ایسا ہے تمہارے پاس۔ مجھے دیکھو ان آٹھ دنوں میں اپنے کو بھول بیٹھا ہوں۔

آشا۔ تم بھولے ہو کہ میں؟ چندر یہ من آج تک کسی کے لئے بے کل نہیں ہوا۔ یہ آنکھیں آج تک کسی کے انتظار میں دروازے پر نہیں لگیں۔ ان ہاتھوں نے آج تک کسی کا دامن کھینچ کر کچھ کہنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن تم جب تک نہیں آتے میں انتظار میں تارے کی طرح دھڑکتی رہتی ہوں۔ جب تم گھر جانے لگتے ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے سورج جا رہا ہے، روشنی جا رہی ہے، برفیلے دلیشوں کا دھند میں لپٹا ہڈیوں کو کاٹنے والا جاڑا آ رہا ہے۔

چندر۔ آشا۔ کیا تم مجھے سچ مچ اتنا چاہتی ہو؟

آشا۔ (درد کے ساتھ) تمہیں شبہ ہے؟

چندر۔ نہیں۔ لیکن سوچتا ہوں اگر تم مجھے اتنا چاہتی ہو تو کشور کے لئے تمہارے دل میں کیا جگہ ہے؟

آشا۔ کشور کے لئے؟ چندر تم چونک اُٹھو گے۔ پر یہ ایک سچ ہے کہ مجھے آج بھی نہیں معلوم کہ میری زندگی میں اس کی کیا جگہ ہے۔ کبھی لگتا ہے، وہ ایک ڈھولا ہے جس کے اوپر میری مغرور اور ضدی طبیعت کی ڈانٹ کھڑی کی گئی ہے۔ کبھی لگتا ہے، وہ ایک زینہ ہے جس کی ہر سیڑھی کو بے دردی سے روند کر میں مغرور کی، ضد کی، خود پسندی کی منزلیں سر کرتی چلی گئی ہوں۔ اس سے زیادہ وہ میرے لیے کچھ نہیں ہے۔

چندر۔ پھر تمہاری شادی کیسے ہوئی؟

آشا۔ میری اپنی مرضی سے۔

چندر۔ کیا؟

آشا۔ میری اپنی مرضی سے۔

چندر۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟

آشا۔ جو میری زندگی کا سب سے اُلجھا ہوا پیچ ہے۔ چندر میں ایک بڑے بد مزاج پولیس افسر کی بیٹی ہوں۔ حکومت کرنا، دوسروں کو اپنے سے چھوٹا سمجھنا شاید انھیں سے میرے خون میں آیا۔ چھوٹی تھی تبھی گھمنڈ نے میرے مزاج پر قبضہ کر لیا۔ کشور میرے پتاجی کے دوست کا لڑکا تھا۔ وہ میرے پاس آتا، میں اُسے ڈانٹتی، پھٹکارتی، نظر انداز کرتی، پر وہ اس کھلتی بھاؤ سے میری پوجا کرتا رہا۔ میں نے جتنا جھکایا، وہ جھکتا گیا۔ لیکن اُسے جھکاتے جھکاتے جیسے میں بھی جھک گئی میرے حکم چلانے کے لیے، اپنی پوجا کروانے کے لیے وہ بالکل ناگزیر ہو گیا۔ وہ نہ آتا تو میری ضدی گھمنڈی طبیعت ایک سانپ کی طرح اپنا زہر نکالنے کے لیے پھن مارتی پھرتی۔ اس لیے ایک دن جب میرے پتاجی نے اس سے بیاہ کے لیے پوچھا، تو میں ناز کر سکی۔

چندر۔ (خوف زدہ ہو کر) اوہ . . . . تم نے دل کی تسکین کے لیے نہیں، اپنی ضدی اور ہٹیلی طبیعت اور انا کی تسکین کے لیے کشور سے شادی کی؟

آشا۔ ہاں چندر۔ اور اس آدمی نے اپنی شخصیت کو میری نذر کر کے میرے مزاج کو اور میری مغرور طبیعت کو اتنا خونخوار بنا دیا کہ اس نے میرے اندر سب جذبوں، سب بھاؤناؤں کو کھا لیا۔ بس رہنے دیا ایک جذبہ ـــــ غرور کا، گھمنڈ کا، خود پسندی کا۔

چندر۔ (ذرا خوف سے) اور میں؟ تب میں کیا ہوں؟

آشا۔ تم؟ چندر تم میرے دل کی وادی میں اس طوفان کی طرح آئے ہو جس نے میرے اندر اُگے ہوئے غرور کے تناور درخت کو جڑ سے پکڑ کر فرش سے ملا دیا ہے۔ تم وہ طوفان ہو جس نے اپنی ٹاپوں کی دھمک سے دھرتی کے منجمد سینے میں دھڑکن پیدا کر دی ہے۔ تم نے میرے دل کو دھڑکنا سکھا دیا ہے۔

چندر۔ میری آشا۔ میں نے کبھی زندگی میں کسی کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے۔ ہر چیز کو ہاتھ کے ایک جھٹکے سے اپنی راہ سے ہٹا دیا ہے۔ لیکن تم کو . . . . . . تم میری زندگی کی پہلی ہار ہو۔

آشا۔ تو مجھے اپنی زندگی کی آخری جیت بنا لو چندر۔ کیونکہ میں پیار کرانا نہیں، کرنا چاہتی ہوں۔ پوجا کروانا نہیں، کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنے پیار کی آگ میں بس ایسے جل جانے دو، جیسے پوجا میں دھوپ جل جاتی ہے۔

(سین ختم)

کرشن۔ واہ واہ . . . . . . کیا خوبصورت اور اچھوتی چیز لکھی ہے۔ ایک مرد عورت کے قدموں میں قالین کی طرح بچھ کر اس کا دل نہیں جیت سکتا اور ایک عورت محض پیار پا کر ہی خوش نہیں ہو سکتی ـــــ اس سچ کو تم نے کیا خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ سچ کہتا ہوں، یہ تمہارا سب سے کامیاب کیرکٹر ہے۔

سریندر۔ لیکن میرے نزدیک سب سے زیادہ خطرناک اور اُلجھن میں ڈالنے والا کیرکٹر . . . .

کرشن۔ یہ کیوں؟

سریندر۔ اس لئے کہ یہ ایک غلط کام کر رہا ہے۔ یہ اپنے پتی کے ہوتے ہوئے ایک پرائے مرد کی محبت میں گرفتار ہوا جا رہا ہے۔ اگر میں

اسے محبت کرنے دیتا ہوں تو مجھ پر سماج کے اخلاق کو بگاڑنے کا الزام عائد ہوتا ہے۔ اگر اسے محبت کرنے سے باز رکھتا ہوں تو پرکیریکٹر ختم ہو جاتا ہے۔

کرشن۔ یعنی ڈرامہ لکھتے لکھتے آپ خود ہیملٹ بن کر رہ گئے ہیں، جسکی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے، کیا نہ کرے؟

سریندر۔ ہاں کرشن، میں سچ مچ ہیملٹ سا بن کر رہ گیا ہوں۔ ڈراموں میں ایسے انسانوں کو پیش نہ کروں تو ڈرامہ نہیں بنتا اور اگر ایسے انسانوں کی مدد سے ڈرامہ بناتا ہوں تو سماج بگڑتا ہے۔

کرشن۔ یعنی ایک طرف کنواں، ایک طرف کھائی۔

سریندر۔ ہاں یار۔ تم ہی بتاؤ کیا کروں؟

کرشن۔ ہیملٹ کی طرح دُھراتے رہو "ٹو بی اور ناٹ ٹو بی"۔ ڈرامہ نگار نہ ہو گے، ایکٹر بن جاؤ گے۔

سریندر۔ تو تُو مذاق کرتا ہے۔

کرشن۔ تو اور کیا کروں؟ میں تو خود اپنے خیال کی شطرنج کا مہرہ ہوں، تجھے کیا چال بتا سکتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں جو زندگی کا سچ ہے اسے اپنے ادب کا سچ بنانے سے ہرگز نہ ڈر۔ جیسے لکھا جاتا ہے ڈرامہ کو لکھ ڈال۔

سریندر۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب اسے ختم کر کے ہی اُٹھوں گا۔

کرشن۔ بالکل۔ میں اب جاتا ہوں، کل آؤنگا۔

سریندر۔ کس وقت؟

کرشن۔ اِسی وقت۔ لیکن ڈرامہ تیار ملے؟

سریندر۔ دیکھو کوشش تو کرتا ہوں۔ اچھا۔

کرشن۔ بائی، بائی۔

سریندر۔ (لکھتے ہوئے) اب اگلا سین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس میں کیا ہو؟ کشور ٹور سے واپس آ جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ آشا کے لئے بہت سی چیزیں لائے۔ کشور پوچھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیسی ہیں؟ آشا بنا کسی جذبہ کے کہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "اچھی ہیں۔ کس کے لئے ہیں؟" کشور حیران رہ جائے ۔ ۔ ۔ "تمہارے لئے" ــــ "میرے لئے"۔ ۔ ۔ اب آشا ایک دم کھڑی ہو جائے اور کشور کے بالکل قریب جا کر کہہ دے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "دیکھو اب سے تم میرے لئے کچھ نہیں لاؤ گے۔ اب میں تم سے کچھ نہیں لے سکتی۔ میں جنیدر سے محبت کرنے لگی ہوں"۔

خیال ا۔ (تبھی سفید لباس میں ملبوس ایک عورت داخل ہوتی ہے۔ یہ زندگی میں پاکبازی کی تمثیل ہے اور زندگی کے بارے میں پہلا خیال ہے) نہیں نہیں قلم روک دو، آگے ایک لفظ نہ لکھو۔

سریندر (چونک کر) کون؟

خیال ا: میں۔

سریندر۔ تم؟

خیال ا۔ ہاں۔ میں تمہیں یہ سب کچھ نہ لکھنے دوں گی۔

سریندر:۔ لیکن تم ہو کون ؟

خیال:۔ ایک خیال۔

سریندر:۔ لیکن کیسا خیال ؟

خیال:۔ جو زندگی میں پاکیزگی کا، رشتوں میں پوترتا کا حامی ہے۔

سریندر:۔ لیکن میں ایسا کیا کر رہا ہوں ؟

خیال:۔ تم زندگی کی پاکیزگی ختم کر رہے ہو۔ ایک شادی شدہ عورت کو اس کے آدرش سے گرا رہے ہو۔ اس سے وہ کام کرا رہے ہو جو دھرم اور انسانیت دونوں کے خلاف ہے۔

سریندر:۔ لیکن میں خود کچھ نہیں کرا رہا۔ میں نے زندگی میں ایک ایسی عورت دیکھی ہے، اسی پر لکھ رہا ہوں۔

خیال:۔ لیکن اُسی عورت پر کیوں ؟ دنیا میں اور عورتیں بھی تو ہیں ؟

سریندر:۔ ہیں ؟

خیال:۔ پھر ؟

سریندر:۔ بات یہ ہے ...... کہ اس عورت کو دیکھ کر ذہن میں خیال آیا ..... چاہ ہوئی، کہ معلوم کیا جائے، اس نے ایسا کیوں کیا ؟

خیال:۔ یعنی آپ بُرائی کی وجہ معلوم کرنا چاہتے ہیں ؟ بُرے کو سمجھنا چاہتے ہیں ؟

سریندر:۔ ہاں، اس میں بُرائی کیا ہے ؟

خیال:۔ (زور سے) اس میں بُرائی ہے۔ بُرائی کا جتنا ذکر کیا جائے، وہ اتنی پھیلتی ہے۔ اس کو جتنا قریب سے دیکھا جائے وہ اتنی ہی دلکش معلوم ہوتی ہے۔

سریندر:۔ کیسے ؟

خیال:۔ جیسے تمہارے سلسلے میں ہوا۔

سریندر:۔ میرے ؟

خیال:۔ ہاں، تم نے اس عورت کو دیکھا تو تمہارے اندر اس کی بُرائی کو جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ تم اس کے بارے میں لکھوگے تو اور لوگوں کے دل میں ان سے ملنے کی خواہش پیدا ہوگی۔ بُرائی چھپی رہنے کے بجائے ننگی ہو جائے گی، پھیلتی چلی جائے گی۔

سریندر:۔ لیکن اگر ڈاکٹر کسی مریض کے اصلی حالات معلوم کرنا چاہے، اس کے مرض کی وجوہات معلوم کرنا چاہے تو کیا مرض دوسروں میں پھیلتا ہے ؟

خیال:۔ مرض اور بُرائی کی ایک جیسی بات نہیں ہے۔ مرض میں کشش نہیں ہوتی، لذت نہیں ہوتی۔ لیکن بُرائی میں اکثر ایک آوارہ قسم کی دلکشی ہوتی ہے۔ غلط قسم کی لذت ہوتی ہے۔ وہ آدمی کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

سریندر:۔ کیا میں بُرائی کی طرف کھنچا ہوں ؟ میں نے لذت لی ہے ؟

خیال:۔ بالکل۔

سریندر۔ کیسے ؟

خیال ا۔ اپنے اس ٹکڑے کو پھر سے پڑھو جس میں آشا اپنے پتی کے پارٹنر سے محبت کا اظہار کرتی ہے۔ کیا تم نے اس کے گرنے کو ہمدردی سے پیش نہیں کیا؟ کیا تم نے چندر کے لیے آشا کی ناجائز محبت کو ایسے خوبصورت اور پاکیزہ الفاظ میں نہیں باندھا کہ وہ صحیح نظر آنے لگیں ؟

سریندر۔ صحیح نہیں، قدرتی نظر آنے لگے۔

خیال ا۔ یہ اور بھی خطرناک بات ہے۔ اگر برائی قدرتی نظر آنے لگے تو اس کے نتیجے اور بھیانک ہوتے ہیں۔

سریندر۔ لیکن کیا برائی قدرتی نہیں ہوتی ؟

خیال ا۔ ہوتی ہے اور اسی لئے اس کی روک تھام کے لئے ضروری ہے کہ اسے قدرتی بنا کر پیش نہ کیا جائے۔

سریندر۔ لیکن یہ تو ذہنی بے ایمانی ہوگی۔ انسان کو اندھیرے میں دھوکے میں، گمراہی میں رکھنے کی ناپاک کوشش ہوگی۔

خیال ا۔ ناپاک نہیں، پاک اور نیک نیتی سے بھرپور کوشش ہوگی۔ جب برائی انسان کی، اس کے امن وچین کی دشمن ہے تو تم اتنے ایماندار کیوں ہو کر برائی کو قدرتی قرار دو؟ جب برا آدمی اپنے اور دوسروں کے لئے خطرناک ہوتا ہے تو تم اسے اچھا بھی ثابت کرنے کی کوشش کیوں کرو ؟

سریندر۔ اس لئے کہ ...... کہ لکھنے والے کو ایمانداری سے کام کرنا چاہیئے۔ اُسے ہمیشہ سچ کو پیش کرنا چاہیئے۔

خیال۔ سچ کو نہیں..... آدرش کو پیش کرنا چاہئے۔ اسے اونچے اصولوں پر اٹل رہنے والے مرد اور عورت پیش کرنے چاہئیں اسے نیکی اور دھرم اور ایمان کی تعلیم دینے والی کتھا کہانیاں لکھنی چاہئیں تاکہ کمزور مرد عورتوں کو سہارا ملے۔

سریندر۔ لیکن تب وہ ادب یا ساتھیہ آدرش وادی ہو جائے گا لوگ اسے فرضی اور لیکچر بازی سے بھرپور سمجھ کر ہاتھ بھی نہ لگائیں گے۔

خیال۔ یہ محض تمہاری ناتجربہ کاری ہے تم نے تلسی داس کا رام چرت مانس پڑھا ہے ؟

سریندر۔ پڑھا ہے۔

خیال۔ اس میں کیا ہے ؟

سریندر۔ آدرش اور اپدیش۔

خیال۔ اسے کتنے لوگوں نے پڑھا ہے ؟

سریندر۔ ان گنت لوگوں نے۔

خیال۔ اسکی کتنی کاپیاں بکی ہیں ؟

سریندر۔ لاکھوں !

خیال۔ کب سے۔

سریندر۔ سینکڑوں سالوں سے۔

خیال۔ اور تمہاری اور تم جیسے خیال رکھنے والے لیکھکوں کی۔

سریندر (لہجہ گر جاتا ہے) بہت کم

خیال ۔ تو خود ہی فیصلہ کرو کہ تمہاری بات سچ ہے یا میری؟ خود ہی کہو کہ لوگ انسان کی کمزوری کی کہانیاں پسند کرتے ہیں یا اس کی مضبوطی اور آدرش کی؟

سریندر ۔ (رُک کر) اس سے تو تمہاری ہی بات ثابت ہوتی ہے۔

خیال ۔ پھر تم آوارہ مردوں اور بدچلن عورتوں کی کہانیاں کیوں لکھتے ہو؟ گناہ سے سیاہ اور پاپ کے کوڑھ سے کالے چہروں میں روشنی کی کرن دکھانے کے جتن کیوں کرتے ہو؟ کیوں نہیں دکھاتے ان مرد عورتوں کی جدوجہد جو دنیا بھر کے دُکھ بھوگ کر بھی پتی پتنی کے آدرش پر جمے رہتے ہیں۔

سریندر ۔ تو اس ڈرامہ کا کیا کروں؟ اسے پھاڑ ڈالوں؟

خیال ۔ نہیں۔ اگر اتنی محنت کی ہے ذرست پھاڑو

سریندر ۔ لیکن پھر اسے پورا کرنا ہوگا۔

خیال ۔ کر ڈالو۔

سریندر ۔ لیکن کیسے؟ یہی تو تین دن سے سمجھ میں نہیں آرہا۔

خیال ۔ وہ تو نہیں آئے گا، کیونکہ تم اس عورت کے پاپ کو نبھانا چاہتے ہو۔ غلط میں صحیح کا چہرہ دیکھنا چاہتے ہو۔ لیکن اگر تم میرے بتائے راستہ پر چلا کروگے تو کبھی رُکاوٹ نہ پڑا کرے گی۔ تم اس عورت سے پشچاتاپ کرا ڈالو۔

سریندر ۔ پشچاتاپ؟

خیال ۔ ہاں۔

سریندر ۔ کس طرح؟

خیال ۔ کوئی وجہ نکال لو۔

سریندر ۔ کوئی وجہ؟ میری سمجھ میں تو کوئی نہیں آتی!

خیال ۔ تمہاری سمجھ میں کیوں آنے لگی۔ بسے بسائے گھر اُجاڑنے اور مرد عورتوں کو غلط راستے دکھانے کی عادت جو پڑی ہوئی ہے۔ تم ایسا کرو کہ ․ ․ ․ ․ ․ ․ ․ کہ آشا کو چندر کے ساتھ بھیج دو۔

سریندر ۔ آشا کو چندر کے ساتھ۔ یعنی وہ اپنے پتی کشور کو چھوڑ دے؟

خیال ۔ ہاں۔ لیکن اسی رات جب وہ گاڑی میں جا رہے ہوں تو ان کا ایکسیڈنٹ ہو جائے۔ چندر کو معمولی چوٹ آئے لیکن آشا کا چہرہ بھیانک طور پر زخمی ہو جائے۔ اس کا نتیجہ فوراً چندر، آشا کے روپ کے پھول کا یہ انت دیکھ کر اسے چھوڑ جائے اور پچیس دن کے بعد آشا کو اسپتال سے چھٹی ملنے کا دن آئے تو ․ ․ ․ ․ ․

(یہ منظر پیش کیا جائے)

نرس ۔ دیکھو، تم ٹھیک ہو گئی ہو، آج تمہیں چھٹی مل جائے گی۔

آشا ۔ مجھے معلوم ہے۔

نرس ۔ تمہارا وہ آدمی ایک ہفتہ میں واپس آنے کو کہہ گیا تھا، اب تک نہیں آیا۔

آشا ۔ وہ میرا آدمی نہیں تھا۔

نرس ۔ کیا؟

آشا ۔ وہ میرا آدمی نہیں تھا۔ وہ میرے رس کا لوبھی تھا۔

نرس ۔ تو کیا تم اس کے ساتھ . . . ؟

آشا ۔ ہاں ۔ میں اپنے آدمی کو چھوڑ کر اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ میں اپنے دیوتا سمان پتی کا ساتھ چھوڑ کر اس کے ساتھ پاپ کے پانیوں میں اُتر رہی تھی۔ لیکن مجھے پھل مل گیا۔

نرس ۔ تو اب کہاں جاؤ گی؟

آشا ۔ جہاں بھی میری تقدیر لے جائے گی۔

نرس ۔ اپنے پتی کے پاس نہیں جاؤ گی؟

آشا ۔ یہ منہ لے کر؟ پاپ کے داغوں سے چھدا ہوا چہرہ اور واسنا کے بوجھ سے جھُوٹی آنکھ لے کر؟

نرس ۔ لیکن سچا پتی اپنی پتنی کا روپ نہیں دیکھتا۔

آشا ۔ گُن دیکھتا ہے۔ لیکن میرے پاس گُن بھی کیا ہیں؟ نرس! میں نے اپنے روپ پر گھمنڈ کرنے کے سوا آج تک کچھ نہیں کیا۔ میں نے اپنے پتی کی کوئی سیوا نہیں کی۔ ان کو کوئی سُکھ نہیں دیا۔ جب بھی اُنھوں نے پیار مانگا، میں نے ان کے ساتھ چھل کر کے اپنا پیار ایک دوسرے آدمی کو دے دیا۔ مجھ جیسی عورت کے لئے نرک میں بھی جگہ نہیں ہو سکتی۔

(تبھی کشور داخل ہوتا ہے۔ وہ ایسے بولتا ہے جیسے سبق رٹ کر آیا ہو)

کشور ۔ ایسے نہ کہو آشا۔

آشا ۔ کون؟

کشور ۔ میں، کشور۔

آشا ۔ آپ . . . . . آپ (. . . . . . (منہ پھیر کر) بھگوان کے لئے لوٹ جائیے۔ میرے سامنے مت آیئے۔ مجھ پاپن کے منہ سے اپنی آنکھوں کو کلنکت نہیں کیجئے۔

کشور ۔ آشا تمہیں دیکھ کر میری آنکھیں کلنکت نہیں ہو سکیں۔ میں تمہارا روپ دیکھنے نہیں آیا ہوں۔ آتما دیکھنے آیا ہوں۔

آشا ۔ میری آتما؟

کشور ۔ ہاں آشا۔ کشٹ کی آگ میں جل کر آتما کا کھوٹ بھی جل جاتا ہے۔ آنکھوں پر پڑا ہوا موہ مایا، روپ دھن کا پردا بھی پھٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد صرف آتما رہ جاتی ہے۔

آشا ۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

کشور ۔ جو پریم سیہ ہے۔ تمہارے اور میرے بیچ روپ کا بادھا تھی۔ آج یہ بادھا ہٹ گئی ہے۔ اب تم مجھے پورے من سے، ہمیشہ ہمیشہ

کے لئے چاہ سکوں گی۔

آشا۔ آپ اب بھی میرا پیار سویکار کریں گے؟

کشور۔ ہاں ...... کیونکہ تم میری پریمیکا (محبوبہ) نہیں ہو بلکہ ہو پتنی جس کے ساتھ پرماتما نے جنم جنمانتر کے بندھن باندھے ہیں۔

آشا۔ پر میں نے پاپ کیا ہے۔

کشور۔ لیکن اب پشچاتاپ کر لیا ہے۔

آشا۔ لیکن پرائشچت نہیں۔

کشور۔ پشچاتاپ سے بڑا پرائشچت نہیں ہوتا آشا۔ دوشی میں بھی ہوں۔ میں بھی پہلے تمہارے روپ کو چاہتا تھا۔ پر آج سے میرا پیار بھی شریر کے موہ سے مکت ہو گیا۔ اب سے ہمارا تمہارا پیار آتماؤں کا پیار ہو گا۔

آشا۔ میرے دیوتا، میری سوامی آپ کتنے وشال ہیں۔

کشور۔ میرے پیروں میں نہ پڑو آشا ...... شرن میں آؤ اس پرماتما کی جس نے ہمارے من میں دیا اور دھرم کا دیپک جلایا۔ جس نے ہمیں اس سینہ کا گیان کرایا کہ ....

دیا دھرم کا مول ہے، پاپ مول ابھیمان

تلسی دیا نہ چھوڑیو جب لگ گھٹ میں پران

خیال ۱۔ کیوں کیسا رہا؟ ہو گیا نہ تمہارا ڈرامہ پورا؟

سریندر۔ (رک رک کر) ہاں ایک طرح سے کچھ ہو تو گیا۔

خیال ۱۔ (سختی سے) ایک طرح سے نہیں، سب طرح سے۔ اس ڈرامے کا اور جس طرح بھی انت کرو گے۔ اس سے برائی پھیلے گی۔ زندگی کا تانا بانا ادھڑے گا۔ کیا سوچنے لگے؟

سریندر۔ کچھ نہیں۔

خیال ۱۔ تو بس اسے لکھ ڈالو، میں جاتی ہوں۔

سریندر۔ اچھا۔

(خیال ۱ چلا جاتا ہے۔ خیال ۲ آتا ہے) یہ بھی عورت کی آواز میں بولتا ہے)

خیال ۲۔ (طنزاً) تو جناب کا جینئس بدل گیا۔

سریندر۔ کیا مطلب؟

خیال ۲۔ کچھ نہیں۔ صرف یہ کہ جناب کو سمتی آ گئی۔ ان الجھنوں سے بچنے کا راستہ مل گیا جو اب تک آپ کے قلم کی راہ میں پہاڑ بنی ہوئی تھیں؟

سریندر۔ ہاں۔

خیال ۲۔ اور آپ اپنی حسین ہیروئن کو بدصورت عورت اور محبت کے موم سے بنے ہیرو کو آدرش کا دیوتا بنانے جا رہے ہیں؟

سریندر۔ ہاں۔

خیال ۲۔ (اور تیزی سے) اور پھر آپ کے اس ڈرامہ کو جو بھی آشا پڑھے گی، وہ سدھر جائے گی؟ جو کشور پڑھے گا وہ اپنی بھٹکتی ہوئی عورت کا ہاتھ تھام کر پیار کے گیت گاتا ہوا موکش کی اور چلا جائے گا؟

سریندر۔ (سا قدرے بگڑ کر) کیا مطلب؟

خیال ۲۔ کچھ نہیں۔ صرف اتنا معلوم کرنا تھا کہ ابھی ابھی جو محترمہ تشریف لے گئی ہیں، کیا آپ ان کی بات پر سچ مچ ایمان لے آئے ہیں؟

سریندر۔ ہاں۔ میں اس بات کو محسوس کرنے لگا ہوں کہ بُرائی اور بُرے لوگوں کا جتنا ذکر کم کیا جائے، اتنا برائی کا پھیلاؤ کم ہوگا ہمیں انسانوں کی کمزوریاں نہیں، اُن کی اونچائی، ان کی آستھا، اُن کے آدرش پیش کرنے چاہیئے۔

خیال ۲۔ بہت خوب۔ پھر تو رنگ کافی گہرا چڑھا ہے۔ لیکن ایک سوال پوچھ سکتی ہوں؟

سریندر۔ کیا؟

خیال ۲۔ اس قسم کا سُدھارا ور آدرش وادی لٹریچر آپ ہی پہلی مرتبہ لکھیں گے یا پہلے بھی کچھ لکھا جا چکا ہے؟

سریندر۔ اس سے پہلے، اس سے بہت بہتر اور بہت زیادہ لٹریچر لکھا جا چکا ہے۔

خیال ۲۔ اور لوگوں نے اسے پڑھا ہے؟

سریندر۔ اُنھوں نے پڑھا ہی نہیں ہے، پوجا ہے۔ ماتھے سے لگایا ہے۔ صبح شام اس کا پاٹھ کیا ہے۔

خیال ۲۔ اور بُرائی رُکی ہے؟

سریندر۔ ضرور رُکی ہے۔

خیال ۲۔ یعنی دنیا پہلے سے بہتر ہو گئی ہے؟

سریندر۔ (چونک کر) ایں؟

خیال ۲۔ یعنی آج کے لوگ پچھلے لوگوں سے زیادہ اچھے، زیادہ ایماندار، زیادہ نیک ہو گئے ہیں؟

سریندر۔ نہیں۔

خیال ۲۔ تو پھر آج کل کے لوگ پُرانے لوگوں سے بُرے ہیں؟

سریندر۔ ہاں۔ نہیں، نہیں۔ آج کل لوگوں نے ان کو پڑھنا کم کر دیا ہے۔

خیال ۲۔ غلط۔ مذہبی اور آدرش وادی کتابیں آج بھی کروڑوں کی تعداد میں چھپتی ہیں اور مُفت کے مول بانٹی جاتی ہیں۔ دُنیا کی ۸۰ فیصدی آبادی آج بھی اپنا بہترین وقت اُنھیں کی گردان میں گنواتی ہے۔

سریندر۔ پھر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟

خیال ۲۔ صرف یہ کہ یہ آدرش وادی قصّے اور ناٹک لکھنے اور پڑھنے سے نہ کچھ حاصل ہوا ہے، نہ ہوگا۔ انسان جتنا بُرا تھا، اتنا ہی بُرا ہے اور رہے گا۔

یہ غلط ہے۔

یہ سَو فیصدی صحیح ہے۔ انسان آج بھی لڑتا ہے، آج بھی قتل کرتا ہے۔ اور آج بھی چوری، زنا اور زیادتی کرتا ہے۔

سریندر۔ مگر اتنے بڑے پیمانے پر بے ایمانی، بے انصافی اور بدکاری نہیں کرتا ہے۔

خیال ۲۔ کیونکہ اب اس کے لئے اُسے خون بہانے اور انسانوں کو غلام بنا کر رکھنے کی ضرورت نہیں۔ کارخانے کے ایک کمرے میں بیٹھ کر مزاعونوں کی طرح وہ لاکھوں مزدوروں کی محنت سے اپنے لئے محل تعمیر کرا سکتا ہے۔ دوکان کے ایک کونے میں بیٹھ کر بنا دانت گڑائے نفع اور سود کے ذریعہ لوگوں کے خون چوس سکتا ہے۔ آرٹ اور کلچر، کلمٹ اور لائسنس کی معرفت بنا حرم کھوے ننگے ناچ اور راوباتسانہ مناظر دیکھ کر اپنے نفس کی تسکین کر سکتا ہے۔ انسان جو کچھ جنگل میں کرتا تھا، اب بھی کرتا ہے۔ صرف ہم نے تجارت، سیاست، شادی، آرٹ اور کلچر کے شائستہ نام دے کر اسے قبول کر لیا ہے۔

سریندر۔ تب تو انسان بے حد بُرا ہوا؟

خیال ۲۔ ہاں، پر ساتھ ہی شکر بھی مرو کر وہ بُرا ہے۔

سریندر۔ کیا؟

خیال ۲۔ کہ وہ بُرا ہے۔ جس دن اس کی بُرائی ختم ہو جائے گی۔ اس کی ترقی بھی رُک جائے گی۔ یہ ....

سریندر۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟

خیال ۲۔ وہ جو انسان کی تاریخ کا سب سے بڑا سچ ہے۔ اگر انسان قاتل اور ظالم نہ ہوتا تو تیر سے لے کر طیارے تک نہ بناتا۔ اگر عیاش نہ ہوتا تو پھول سے عطر، کوئے سے ریشم اور نانت سے رُبہ نکالتا۔ اگر ناجائز اور چوری چھپے محبت نہ کرتا تو کالیداس کے ڈرامے اور شرت کے افسانے نہ لکھتا۔ اگر بے ایمان نہ ہوتا تو ارتھ شاستر اور ڈاس کا کیپیٹل نہ لکھے جاتے۔ انسان نے جو کچھ پیدا کیا ہے، اس وجہ سے کیا ہے کہ وہ بُرا بھی ہے۔ جس دن وہ بُرا نہیں رہے گا، نفرت، غصہ اور حرص و ہوس سے محروم ہو جائے گا، اس دن تالاب کے ٹھہرے پانی کی طرح سڑ کر سیاہ ہو جائے گا۔

سریندر۔ تو........ تو...... پھر کیا ہم بُرائی کو جوں کا توں قبول کر لیں؟ اُسے دُور کرنے کی کوشش نہ کریں؟

خیال ۲۔ ہم اسے دور نہیں کر سکتے۔ سمجھ کر صرف باڑھ کے پانی کی طرح قابو میں کر سکتے ہیں اور وہ بھی تھوڑے عرصہ کے لئے۔ اس کے بعد ہمیں اس کے بہاؤ کے لئے اور راستے نکالنے ہونگے۔

سریندر۔ یعنی اگر میں نے اپنے ڈراموں میں آشا جیسی عورتوں کا ذکر کیا ہے، اُنھیں سمجھنے کی کوشش کی ہے تو بُرا نہیں کیا؟ سماج میں بُرائی کا کوئی بیج نہیں بویا؟

خیال ۲۔ قطعی نہیں۔ ڈرامے اور کہانیوں میں انسان کی فطرت کو ظاہر کرنا، اس کی اونچائی نیچائی اور ٹیڑھے سیدھے پن کو ظاہر کرنا سماج کے ساتھ دشمنی نہیں ہے۔ بر تو اس کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ کیونکہ جب تک انسان اپنی فطرت کے جوہر کو نہیں جانے گا، دوسرے کی فطرت کے ٹیڑھے پن کو نہیں پہچانے گا، وہ کبھی ٹھیک فیصلہ نہیں کر تا کہ اسے کس دل کی گھاٹی میں اپنا خیمہ ڈالنا ہے، کس دل کے ڈھلان کی پھسلن سے بچ کر نکلنا ہے۔

سریندر۔ تب میں اپنے ڈراموں کا انجام ویسا نہیں بناؤنگا۔ آشا کا ایکسیڈنٹ کرا کے اسے بدصورت نہیں بناؤں گا۔

خیال ۲۔ ہرگز نہ بناؤ۔ تم آشا کو آشا رہنے دو تاکہ وہ پشچاتاپ کے تیزاب میں گل کر ضائع ہونے کے بجائے پوری ہمت سے کہہ اُٹھے ....

(یہیں پیش کیا جائے)

آشا۔ کشور، اب میں تمہارے پاس نہیں رہ سکتی۔

کشور۔ (چونک کر) کیا؟

آشا۔ میں اب تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ مجھے چندر کے پاس جانا ہوگا۔

کشور۔ پر کیوں؟

آشا۔ اس لئے کہ تم میرے لئے نہیں بنے ہو۔ میں تمہارے لئے نہیں بنی ہوں۔ میں آگ ہوں، تم موم ہو۔ میں آندھی ہوں، تم سناٹا ہو۔

کشور۔ نہیں نہیں یہ غلط ہے۔ ہم اتنے سال ایک ساتھ رہے ہیں۔ تمہیں خوش رکھنے کے لئے میں اب تک تمہارے سانچے میں ڈھلتا آیا ہوں۔ آگے بھی اسی طرح ڈھلتا رہوں گا۔

آشا۔ لیکن میں تمہارے سانچے میں نہیں ڈھل سکتی۔

کشور۔ لیکن تم کو کیا ضرورت ہے؟

آشا۔ بس یہی تو تم نے بھول کی ہے کشور۔ میں ایک عورت ہوں، میں بھی کسی کے پیار میں ڈھلنا چاہتی ہوں، لیکن تم وہ آدمی نہیں ہو جسے میں پیار کر سکوں۔ اس لئے میں پیار کرنے کو تڑپتی اور ترستی رہی ہوں۔

کشور۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے آشا۔ تم کیا کہہ رہی ہو؟

آشا۔ جو میری اور تمہاری فطرت اور مزاج کا فرق ہے۔ کشور۔ میں ایک ابنارمل عورت ہوں۔ میرے پتا بڑے رعب دار تھے۔ وہ ہر وقت انگارا سی آنکھیں، اور شیر جیسی دھاڑتی آواز سے انسانوں کے کلیجے کپکپاتے رہتے تھے۔ ان کی ایک بہت گہری چھاپ بچپن سے مجھ پر پڑی۔ میرے تصور میں مرد کا انہیں جیسا تصور بن گیا اور میرے اندر کی عورت ایک ایسے مرد کا انتظار کرنے لگی، جو چلے تو زمین دہل جائے، بولے تو فضا تھرا جائے۔ دیکھے تو چیزیں جھلس جائیں۔ لیکن بدنصیبی سے تم وہ مرد نہ نکلے۔

کشور۔ نہیں نہیں . . . . یہ تو ایڈی پس کامپلیکس کی تھیوری کا فتور ہے۔ تم کو چندر نے بہکا دیا ہے۔

آشا۔ چندر نے مجھے نہیں بہکایا۔ چندر کو دیکھ کر خود میرے اندر کی عورت نے کہا ہے . . . . . . یہ ہے تیرا اصلی آدمی۔

کشور۔ نہیں نہیں ایسے نہ کہو۔ آشا میری اتنی بے عزتی نہ کرو۔ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ بے انتہا محبت کی ہے۔

آشا۔ میں بھی بے عزتی نہیں کر رہی . . . . صرف صاف گوئی سے کام لے رہی ہوں۔ میں مانتی ہوں کہ تم نے مجھے بہت چاہا ہے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن میں کیا کروں کہ میرے اندر وہ غدود ہی کام نہیں کرتے جو تمہاری قربانی اور خدمت کو پسند کرتے۔

کشور۔ تم نے یہ کیا کہا؟

آشا۔ وہ جو شاید تم نہیں جانتے۔ کشور۔ آدمی کی پسند ناپسند، اس کے جھکاؤ اور کھنچاؤ کا فیصلہ در اصل اس کے غدود کرتے ہیں۔ کچھ انسانوں میں وہ گلینڈز زیادہ کام کرتے ہیں جو بہادری کو، بے دھڑکپن کو، زور زبردستی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کچھ انسانوں میں وہ گلینڈز زیادہ کام کرتے ہیں، جو قربانی کو، تکلیف سہنے کو، دوسرے کی خاطر مٹ جانے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کشور۔ بدنصیبی سے میرے اندر پہلے قسم کے گلینڈز کام کر رہے ہیں۔ دوسری قسم کے نہیں۔

کشور۔ نہیں نہیں یہ سب گورکھ دھندا ہے۔ میں تمہاری اس ڈاکٹری اور سائیکالوجی کو بالکل نہیں مان سکتا۔ بالکل نہیں سمجھ سکتا۔
آشا۔ اس لئے تم میری محبت کا رُخ اپنی طرف نہ موڑ سکے۔ اور میں تمہاری محبت کی قدر نہ کرسکی۔ لیکن اس میں ہم دونوں کا کوئی قصور نہیں ہم دونوں اپنے اپنے گلینڈز کے ہاتھوں مجبور ہیں۔

(سین ختم)

(خیال ۳ داخل ہوتا ہے۔ یہ مرد کی آواز میں ادا کیا جائے)

خیال ۳۔ (زور سے) غلط، بالکل غلط۔ یہ سب بالکل بکواس ہے۔ جنگل کی جہالت اور اندھیرے سے بھرا ہوا رجعت پسندانہ فلسفہ ہے۔
سریندر۔ تم کون ہو؟ بنا اجازت کیسے یہاں آگئے؟
خیال ۳۔ میں آنے کے لئے اجازت نہیں لیتا۔ بس آجاتا ہوں۔
سریندر۔ یہ ہو کون؟
خیال ۲۔ (نفرت سے) وہ انسان جس کے مغز کو سیاست کے ریگستان کی گرمی چڑھ گئی ہے۔
خیال ۳۔ کیا کہا جنگل کی آواز؟
سریندر۔ یہ کیا بدتمیزی ہے؟
خیال ۲۔ بدتمیزی نہیں، یہ تو اس کا عام اخلاق ہے (بڑی نرمی سے) میں جاسکتی ہوں؟
سریندر۔ ضرور ضرور۔ میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے میرے ڈرامے میں اتنی دلچسپی لی۔ میں آپ کے مشورہ پر عمل کروں گا۔
خیال ۲۔ مجھے بہت تسلّی ہوگی۔ میں جاتی ہوں۔
سریندر۔ شکریہ۔

(چلی جاتی ہے)

خیال ۳۔ تم نے اس کا شکریہ ادا کیا؟ یہ تو دھکے دے کر نکالنے کے لائق ہے۔
سریندر۔ اور آپ؟
خیال ۳۔ جو اسے دھکے دے کر نکالنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔
سریندر۔ دیکھئے۔ کسی کے لئے ایسے الفاظ نکالنا شائستگی نہیں ہے۔
خیال ۳۔ میں جنگل کے نمائندوں کے ساتھ شائستگی برتنے کا قائل نہیں ہوں۔
سریندر۔ لیکن آخر آپ انھیں بار بار جنگل کی آواز، جنگل کا نمائندہ کیوں کہہ رہے ہیں؟
خیال ۳۔ اس لئے کہ یہ انسان کو تہذیب کے شہر سے نکال کر جنگل کے قانون کے رحم و کرم پر ڈالنا چاہتا ہے۔
سریندر۔ کس طرح؟
خیال ۳۔ یہ ثابت کرکے کہ انسان جانور کی طرح اپنی فطرت کا غلام ہے۔ وہ بُرا ہے اور بُرا رہے گا۔
سریندر۔ آپ اسے غلط سمجھتے ہیں؟

خیال ۲۔ میں اسے انسان پر سب سے بڑی تہمت سمجھتا ہوں ۔ انسان تو ایک کچی دھات ہے، اسے مساوات انصاف اور اچھائی کے سانچے میں بالکل اس طرح ڈھالا جا سکتا ہے جیسے کہ لوہے کو ٹریکٹر اور سڑک کوٹنے والے انجنوں میں ۔

سریندر۔ یعنی برائیاں انسان کی فطرت میں نہیں ہیں؟

خیال ۲۔ بالکل نہیں ہوتیں ۔ یہ شوشہ تو فرائیڈ اور دوسرے بیمار سائیکلاجسٹس کا چھوڑا ہوا ہے ۔

سریندر۔ تو پھر انسان بُرا کیوں ہے؟

خیال ۲۔ ابھی بتاتا ہوں اور آپ کی آشا دیوی کی مثال لے کر بتاتا ہوں ۔ آشا کس کی بیٹی ہے؟

سریندر۔ ایک بدمزاج افسر کی ۔

خیال ۲ ۔ وہ کیسا آدمی تھا؟

سریندر۔ بہت ظالم اور غصیل ۔

خیال ۲ ۔ بچپن میں آشا کی زندگی کیسے گزری؟

سریندر ۔ بڑے آرام سے ۔

خیال ۲ ۔ اُسے کوئی کام تھا؟

سریندر ۔ سوائے پڑھنے کے کچھ نہیں ۔

خیال ۲ ۔ اس نے دل لگا کر پڑھا؟

سریندر ۔ شاید نہیں ۔

خیال ۲ ۔ شادی کے بعد اس نے کچھ کیا؟

سریندر۔ نہیں ۔ کشور نے نوکر رکھ دیئے تھے ۔

خیال ۲ ۔ یعنی بچپن سے لے کر شادی ہونے کے بعد تک اس نے کوئی کام نہیں کیا؟

سریندر۔ نہیں ۔

خیال ۲ ۔ تم بتا سکتے ہو کہ دن بھر خالی رہنے والے کا دماغ کیا بن جاتا ہے؟

سریندر (بہاؤ میں آ کر) شیطان کی دوکان؟

خیال ۲ ۔ بس تو تمہاری آشا کا مسئلہ صرف اتنا ہے کہ اس نے ظلم اور زیادتی کرنا اپنے باپ سے سیکھا ۔ اپنے پتی کو اس کا شکار اس لئے بنایا کہ وہ کمزور تھا، نرم تھا، اٹھارویں صدی کے رومانیت کے فلسفہ کا مارا ہوا تھا ۔ میں پوچھتا ہوں اگر وہ آشا کی ناز برداریاں کرنے کے بجائے اس سے دن رات کام کراتا اور کبھی وقت بیکار نہ بیٹھنے دیتا تو کیا اس کو یہ اوٹ پٹانگ باتیں سوجھتیں؟ بناؤ سنگھار اور نخرے بازی کا خبط سوار ہوتا؟ عاشق معشوق کا سرسام ہوتا؟

سریندر۔ شاید ...... شاید نہیں ۔

خیال ۲ ۔ بس تو انسان میں کچھ بُرائیاں ہیں صرف اس لئے ہیں کہ اس پر پُرانی تاریخ اور پُرانے فلسفہ کا اثر پڑتا ہے ۔ وہ کام سے جی

چرانا اور دوسرے کی محنت پر پلنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس کے اندر پیدا ہونے والی انرجی (قوت) اکٹھا ہوتی جاتی ہے اور آخرکار غلط کاموں اور عیاشانہ حرکتوں میں پھوٹ پڑتی ہے۔ میں کہتا ہوں تاریخ اور فلسفے کی سب پُرانی کتابیں جلا دو۔ فالتو وقت میں کھیتی باڑی یا کھیل کُود کے سوا کوئی کام نہ کرنے دو۔ پھر دیکھو کہ ایڈی پس کامپلیس کا اور گلینڈز کے باوجود وہ صحیح راستے پر جاتا ہے کہ نہیں۔

سریندر۔ یعنی ـــــ یعنی پھر میں آشا کو کشور سے طلاق نہ دلواؤں؟ اُلٹا کشور کو سخت بنا دوں۔ وہ نوکر نکال دے۔ اس سے دن بھر کام کرائے۔ رات کو ۔۔ ۔۔۔۔؟

خیال ۲۔ (بے زاری سے) نہیں نہیں وہ نکار رجعت پسند کشور یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔ اس سے طلاق دلانا ہی ہوگا۔

سریندر۔ اور چندر سے شادی؟

خیال ۲۔ (بیزاری سے) چندر سے شادی بھی کرا دو۔ کیونکہ کچھ دن بعد سے چندر سے بھی طلاق لینا ہوگا۔

سریندر۔ یہ کیوں؟

خیال ۲۔ اس لئے کہ آشا اس خطرناک غلط فہمی میں ہے کہ اس کی اُلجھنیں ایڈی پس کامپلیس کی وجہ سے ہے۔ در اصل آشا کی سب سے بڑی اُلجھن ہے وہ انرجی جو اس میں بنتی ہے اخرج نہیں ہوتی۔ چونکہ سریندر بھی اُسے عیش و آرام میں رکھے گا، اس سے کوئی کام نہ کرائے گا، آشا کچھ عرصہ بعد بے زار ہوکر اسے بھی چھوڑ دے گی۔

چندر۔ (گھبرا کر) پھر اس کا کیا ہوگا؟ وہ کہاں جائے گی؟

خیال ۲۔ پھر وہ وہاں جائے گی جہاں ہر آگ اور آندھی کے بنے انسان کی اصلی جگہ ہے۔ وہ پارٹی کی ممبر بن جائے گی۔ سیاست میں حصّہ لے گی۔ مزدور عورتوں اور مردوں کو انقلاب کے لئے اُکسائے گی۔ اُنہیں بتائے گی کہ ۔۔۔۔۔۔

(تالیوں کا شور۔ آشا لیکچر دے رہی ہے)

آشا۔ پہلے میں بھی سمجھتی تھی کہ مجھے کبھی خوشی نہیں مل سکتی۔ میں کبھی کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ ڈاکٹروں نے بتایا تھا میں ایڈی پس کامپلیس کی شکار ہوں۔ میرے اندر غلط قسم کے گلینڈز زیادہ زور پکڑ گئے ہیں۔ لیکن جب میں نے نیا علم پڑھا، اس پارٹی کے میدان میں قدم رکھا، تو میں نے پایا، انسان کی فطرت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ وہ گلینڈز یا دماغی کامپلیکسز کا غلام نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی ضرورت کام ہے۔ اِنسان کو کام کرنا چاہیئے۔ کام کا نہ ہونا اس کے سب مرضوں کی جڑ ہے اور کام کا ملنا سب مرضوں اور رغموں کا واحد آخری علاج۔

(تالیوں کا شور۔ منظر ختم)

خیال ۲۔ کیوں ۔۔۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں آیا؟

سریندر۔ ہاں ۔۔۔۔۔۔۔ کچھ تو آیا۔

خیال ۲۔ تو کیا سوچتے ہو۔ زیادہ سوچنا بھی ایک رجعت پسندانہ بیماری ہے۔ قلم اُٹھاؤ اور بس لکھ ڈالو۔

سریندر۔ لکھتا ہوں۔ اور آپ؟

خیال ۳۔ میں جاتا ہوں۔ تم جیسے بہت سے آدمی ہیں جو دوراہے پر کھڑے ہیں۔ مجھے انہیں راہ بتانا ہے۔ انقلاب زندہ باد۔

سریندر۔ (ڈر کر) انقلاب زندہ باد۔

(چلا جاتا ہے۔ ایک بوڑھے کی بہت ہلکی مگر تجربہ کار آواز سنائی دیتی ہے)

خیال ۴۔ اُلجھ گئے؟

سریندر۔ (بے خیالی میں) ہوں؟ (پھر چونک کر) کون؟ تم کون؟

خیال ۴۔ کوئی نہیں ۔۔ ۔۔۔۔ ایک بوڑھا۔

سریندر۔ لیکن یہاں کیوں آئے ہو؟

خیال ۴۔ ویسے ہی۔ جا رہا تھا، آواز سُن کر رُک گیا ـــ سوچا یہ بھی سنتا چلوں۔

سریندر۔ کیا کام کرتے ہو؟

خیال ۴۔ بڑھاپے میں کوئی کیا کام کر سکتا ہے۔ بس بال سفید کرتا ہوں۔ کچھ دھوپ میں، کچھ تجربہ میں۔

سریندر۔ اچھا اچھا، اب جاؤ مجھے لکھنا ہے۔

خیال ۴۔ پر کیا لکھو گے؟ بتا دو، ڈرامہ پڑھنے کا موقعہ ملے نہ ملے۔

سریندر۔ تمہیں ڈرامہ پڑھنے کا شوق ہے؟

خیال ۴۔ بے حد۔

سریندر۔ لکھنے بھی ہیں؟

خیال ۴۔ نہیں۔ صرف دیکھے ہیں۔ تم بھی بتا دو اسے کیسے پورا کرو گے؟

سریندر۔ دراصل ۔۔۔۔۔ دراصل کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

خیال ۴۔ اتنی باتیں سن کر بھی؟ اتنے سُجھاؤ پا کر بھی؟

سریندر ہاں۔ جو بھی آیا مجھے اس کی بات سچ لگی۔ اس کا سجھاؤ معقول لگا۔ لیکن دوسرے نے آکر پہلے کی بات کو ایسے کاٹ دیا جیسے پہلا سب کچھ جھوٹ تھا۔

خیال ۴۔ پھر تم نے کیا سمجھا؟

سریندر۔ میں نے ۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب دیکھ کر تو میں نے یہ سمجھا ہے بوڑھے بابا کہ ۔۔۔۔۔۔۔ کہ دنیا میں یا تو کچھ بھی سچ نہیں ہے یا پھر سب کچھ سچ ہے۔

خیال ۴۔ (خوشی کے جوش میں) بہت خوب میرے بیٹے، بہت خوب۔ تو نے آخر سچ کو پا لیا ہے۔

سریندر۔ میں نے؟

خیال ۴۔ ہاں۔ کیونکہ سچ کے بارے میں اس سے بڑی کوئی سچائی نہیں ہے کہ سچ کا پورا روپ کوئی نہیں دیکھ پاتا۔ زیادہ تر لوگوں کو سچ کے ستون کا صرف ایک حصہ، ایک پہلو ہی نظر آتا ہے۔

سریندر ۔ لیکن کیوں ؟ ایسا کیوں ہے ؟

خیال نمبر ۔ اس لئے کہ سب انسان دُنیا میں ایک ہی نقطہ پر ، ایک ہی سطح پر ، ایک ہی اینگل پہ نہیں کھڑے ہیں ۔ وہ الگ الگ ، آگے پیچھے ، آڑے ترچھے ، اُوپر نیچے کھڑے ہیں ۔ ان کو پورا سچ یا اس کے سب پہلو دکھائی ہی نہیں دے سکتے ۔ صرف آڑے ترچھے ٹکڑے ہی دکھائی دیں گے ۔

سریندر ۔ اور وہی اُن کے سچ ہونگے ؟ اسی لئے وہ ایک دوسرے سے میل نہیں کھائیں گے ؟ ایک ہی تصویر کا حصّہ نظر نہیں آئیگا ؟

خیال نمبر ۔ ہاں ۔ اسی لئے کہ ہر بھاونا اور ہر جذبہ کا ، ہر موقعہ اور ہر جگہ کا ، ہر عمر اور ہر زمانہ کا ، الگ اور اکثر ایک دوسرے سے متضاد سچ ہوگا ۔

سریندر ۔ تو پھر میں کیا کروں ؟ میرا تو کام ہی انسانوں کے جذبات اور ان کے خیالات کے ٹکراؤ اور اُلجھاؤ کو پیش کرنا ہے ۔ اگر آشا بھی صحیح ہے اور کشور بھی صحیح ہے اور چندر بھی صحیح ہے تو میں کس کو غلط ٹھہراؤں ؟ اگر پہلی عورت کا سُدھار واد بھی صحیح ہے ، دوسری عورت کا فرائیڈ واد بھی صحیح ہے اور تیسرے صاحب کا محنت واد بھی صحیح ہے تو ڈرامہ کو کس طرح ختم کروں ؟

خیال نمبر ۔ سچ مچ بہت بڑی اُلجھن ہے ۔ بہت بڑا گورکھ دھندا ہے ۔ ہر آدمی کے ہاتھ میں سچ کے ہنڈ کے پورے کاغذ کا ایک ایک پھٹا ہوا ٹکڑا ہے ۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انسان کے اچھا بُرا ہونے میں اس کی پرورش ، اس کے گھر کے ماحول یا اس کے دماغی اُلجھاؤں کا ہاتھ نہیں ہے ۔ کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ دھرم اور آدرش کے لٹریچر سے آدمی کو سدھارا جا سکتا ہے ۔ کوئی اس بات کو بھی ہوا میں نہیں اڑا سکتا کہ انسان کو کام میں لگائے رکھنے سے اس کے بہت سے ٹیڑھے پن دور کئے جا سکتے ہیں ۔ سب سچائی کے ایک ایک پہلو کو پیش کرتے ہیں ۔ پھر تم ان میں سے صرف ایک کو چننے کی کوشش کیوں کرتے ہو ؟

سریندر ۔ ایسا نہ کروں تو ڈرامہ کا اینڈ نہیں بنے گا ۔ کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا ۔

خیال نمبر ۔ کیسے نہیں نکلے گا ؟ آشا کی اُلجھن تم نے پیش کر دی ۔ کشور کو وہ کیوں پیار نہیں کر سکتی ، یہ تم نے بتا دیا ۔ چندر کو وہ کتنی شدّت سے پیار کرنے لگتی ہے ، یہ تم آخری سین میں بتا چکے ہو ۔ یہاں تک انسان کی نیچر کا سچ ہوا ۔ لیکن اس سے آگے ایک انسانیت کا سچ ہے کہ کشور بے قصور ہے ۔ اگر اس نے کوئی قصور کیا ہے تو یہ کہ اس نے آشا کو بے انتہا چاہا ہے ۔ اگر آشا اسے چھوڑ کر چلی گئی تو وہ زندہ رہتے ہوئے بھی مر جائے گا ۔ تم یہ تینوں پہلو پوری ایمانداری سے پیش کر دو اور پھر تم دیکھو گے کہ آشا کی نیچر ، اس کی انسانیت ، خود بخود ایک فیصلہ کر دے گی ....

(سین کے طور پر)

چندر ۔ (آتے ہوئے) آشا میں آ گیا ...... سیٹیں بُک ہو چکی ہیں ، گاڑی کا وقت ہو رہا ہے ، کار نیچے کھڑی ہے ۔

آشا ۔ (جیسے خواب میں بول رہی ہو) ہوں ۔

چندر ۔ یہ کیا ؟ تم کیسے ہو رہی ہو ؟ تمہاری آنکھیں جل رہی ہیں ۔ چہرہ سفید ہے ۔ بال بکھرے ہیں ۔ تم تیار نہیں ہو ؟

آشا ۔ کاہے کے لئے ؟

چندر ۔ میرے ساتھ جانے کے لئے ...... ایک نیا گھر ، ایک نئی زندگی بسانے کے لئے ۔

آشا۔ چندر...... مجھے افسوس ہے میں نہ جا سکوں گی۔
چندر۔ آشا؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ اتنا کچھ کرنے، اتنا کچھ آگے بڑھنے کے بعد یہ کیا کہہ رہی ہو؟
آشا۔ جو سچ ہے۔
چندر۔ یہ جھوٹ ہے۔ شام تک تم تیار تھیں۔ کشور سے سب کچھ طے ہوگیا تھا۔ اس نے الگ ہونے کی اجازت دے دی تھی۔
آشا۔ کشور نے اجازت دے دی تھی ...... (گہرا سانس لے کر) لیکن شاید کسی اور کی اجازت لینی باقی رہ گئی تھی۔
چندر۔ کس کی؟
آشا۔ اپنی یا اپنے اندر کسی کی۔
چندر۔ آشا تم ...... تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تم ٹھیک ہو؟
آشا۔ صرف تھکی ہوئی ہوں، کیونکہ رات بھر سوئی نہیں ہوں۔ چندر، کشور سے اجازت لینے کے بعد رات میں نے اپنے سے پوچھا۔ معلوم ہوا میں نہیں جا سکتی۔
چندر۔ لیکن کیوں؟
آشا۔ اس لئے کہ میں آزاد نہیں ہوں۔ پنجرے میں ہوں۔
چندر۔ کیسے پنجرے میں؟
آشا۔ ایک پنجرے میں جو بانس یا گھاس کی تیلیوں سے تو نہیں بنا ہے۔ لیکن بھاؤناؤں کے بہت کمزور، بہت مہین، پر بے حد خوبصورت تاروں کا بنا ہے۔
چندر۔ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کن بھاؤناؤں کی بات کر رہی ہو؟
آشا۔ جس کا مجھے بھی آج تک پتہ نہ تھا۔ چندر۔ کشور سے فیصلہ کرکے رات جب جانے کے لئے سامان باندھنے لگی تو میں نے پایا کہ میرے پیر میں کچھ دھاگے الجھے ہوئے ہیں۔ میں نے جھک کر دیکھا تو پایا کشور نے میرے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اپنے ساتھ باندھ لیا ہے۔
چندر۔ لیکن کس طرح؟
آشا۔ مجھے چاہ کر۔ اپنے کو مجھ پر مٹا کر۔ چندر اس نے مجھے اتنی بری طرح چاہا ہے کہ میری خوشی کی خاطر اپنی خوشی، اپنی عزّت، اپنی شخصیت کو مٹا دیا ہے۔ میرے کچھ نہ دیتے ہوئے بھی اس نے مجھے اپنا اتنا کچھ دے دیا ہے کہ آج اس کا سب کچھ لوٹانے اور واپس کرنے کے بعد بھی باقی ہوں۔ اس کا کچھ مجھ پر رہ گیا ہے۔ کچھ چیزیں میرا راستہ روکے کھڑی ہیں۔
چندر۔ کون سی چیزیں؟
آشا۔ شاید انسانیت ...... شاید احسان ...... شاید وہ قرض، جو ایک انسان کسی دوسرے کو جی جان کی حد تک چاہ کر ہی اس پر چڑھا سکتا ہے۔ چندر۔ اپنی خوشی اور اپنی محبت کی خاطر میں سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں، سب کچھ توڑ سکتی ہوں۔ لیکن احسان اور انسانیت کی ان تیلیوں کو توڑنا میرے بس کا نہیں ہے۔

چندر۔ لیکن کیوں؟

آشا۔ اس لئے کہ ان کو توڑنے کے بعد میرے پاس کچھ نہ رہے گا۔ میں کبھی خوش نہ رہ سکوں گی۔ کبھی اپنی عزت نہ کر سکوں گی۔ میں اپنی آخری خوشی اور آخری خوبصورتی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاؤں گی۔ اور یہ مجھے قطعی منظور نہیں۔

(سین ختم)

سریندر۔ واہ بزرگ بابا واہ ...... تم نے کس خوبصورتی سے انسان کی فطرت، اس کی چاہ اور اس کے آدرش تینوں کی لاج رکھ لی میرے ڈرامہ کا اس سے خوبصورت انجام اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

اختر ریاض الدین احمد

قاہرہ

ہمارا جہاز نہر سویز میں آہستہ آہستہ ایک عجب بے اعتنائی کے ساتھ داخل ہوا۔ ہم سب باہر ڈیک پر نکل آئے اور مختلف خیالات میں ڈوب گئے ، سب چپ چپ تھے اور اپنی اپنی یادوں سے ہم کلام۔ "فکرِ ہر کس بقدر ہمت اوست"۔ کوئی سویز کی تاریخ میں گم تھا۔ کوئی قاہرہ کی شبانہ رنگینیوں کے پروگرام میں۔ کوئی خرید و فروخت کے خیال میں کھویا ہوا تو کوئی اُبھرتے ہوئے چاند کے رومان میں۔ میں اکیلی کھڑی موجوں کی تنظیم کو دیکھ رہی تھی۔ کس قسم کا کس فراخدلی سے یہ موجیں ہماری "اطالوی حویلی" کو راستہ دیتی جا رہی تھیں۔ سویز کسی بھی سیاسی طاقت یا گروہ کے قبضے میں ہو، اقوام متحدہ کی اسمبلی میں اس پر کتنے ہی طویل مباحثے ہوں، دنیا کا امن چاہے اسی کی وجہ سے خطرے میں پڑ جائے۔ لیکن اس کے پانی غیر جانبدار ہیں، ہر مہمان کا خیر مقدم کرتے ہیں، ہر ایک سے یکساں سلوک روا رکھتے ہیں۔ کتنی للچائی نظریں اس پہ ڈالیں، کیسی کیسی ناگہانی آفتیں اس پر آئیں۔ لیکن یہ نیلگوں شاہراہ، یہ مغرب و مشرق کی معاشی شاہ رگ اپنی فطری معصومیت میں رواں ہے۔ تاریخی جرائم سے بے خبر، موجودہ دھمکیوں سے نابلد، اس امن و سکون سے بہتی جا رہی ہے۔

شام ایک ریشم زبان سیاستدان کی طرح آہستہ آہستہ روشنی کی جڑیں کاٹتی ہوئی آرام سے کائنات پر غالب آ گئی۔ شفق کے کچے رنگ پانی میں گھل کر پھیل گئے۔ لہروں کی پھوار میں۔ آبی فاختاؤں کے غولے! ہر طرف سفید سفید جھاگ! معلوم ہوتا تھا زیرِ آب ہزاروں گوالنیں دودھ بلو بلو کر اچھال رہی ہیں۔ پورٹ سعید قریب تر ہونے لگی۔ ننھی ننھی روشنیوں کی قطاریں دور ساحل پہ! جیسے جل پریوں کی سرحدِ آب پہ درخشاں حباب آویزاں ہوں۔

جہاز نے لنگر ڈال دئیے۔ رات بے تابی سے کٹی۔ کل صبح قاہرہ کی سیر! جہاز والوں نے بارہ گھنٹے کا پورا پورا استعمال بتا کر ۵۰ روپے وصول کر لئے تھے۔ صبح کاذب سے اُٹھ کر تیار ہوئے۔ میلی میلی کشتیوں میں بیٹھ کر گدلے گدلے پانی پر گزرتے ہوئے مصری سرزمین پر قدم رکھا۔ جہاز کی بند فضا سے نکل کر زمین کی فراخی بہت بھائی۔ کسٹم افسر نے پاسپورٹ دیکھا پھر مجھے دیکھا "لندن جا رہی ہیں"؟ "جی"! "کیا کریں گی۔ یہیں رہ جائیے"۔ میں نے پہلی دفعہ غور سے کسٹم افسر کی شکل دیکھی۔ مصری گول چکنی مونچھلی شکل۔ تو یہ ہیں مصر کے "شیر دل جوان"! میں نے دل میں سوچا، اور ہنسی۔ پھر ذرا سی ڈری۔ اگر سرکاری شروعات یہ ہیں تو آگے شہر میں کیا حشر ہوگا۔ دو ڈچ عمر رسیدہ میموں نے مجھے اپنے ساتھ شامل کرنے کے لئے بہت پیار سے دیکھا۔ ایک کا خاوند اور اکلوتا بچہ اُس کی نظروں کے سامنے جرمنوں نے گولی سے مار دیا تھا۔ وہ جب سے دنیا کی سیروں میں سرگرداں تھی یہ بوڑھیاں خاصی دلچسپ تھیں لیکن اسی کے پار جا چکی تھیں۔ ایک تو میرے ساتھ قدم ملا کر چل نہیں سکتی تھی اور میں قدم چھوٹے کر نہیں سکتی۔ اگر کوئی مجھے آہستہ چلنے کو کہے تو میرا دم گھٹ کر گھٹنوں میں آ جاتا ہے۔ دوسری وہ بزرگی اس مرحلے پہ پہنچ چکی تھیں کہ ان کو دیکھ کر قاہرہ کے آثارِ قدیمہ کو دیکھنے کا شوق ذرا دھیما پڑ جاتا تھا۔ اور شکستہ دنداں اہرام مصر سے

سامنے تو شاید زیادہ بے آہنگ نہ لگیں لیکن صبح ناشتہ پہ تازہ گلابی مکھن اور کرارے ٹوسٹ کے سامنے بھوک پہ ذرا سی اوس ڈال دیتے تھے۔ میں نے اپنے پرہیز پر لعنت بھیجی۔ لاکھ غیرت دلائی آخر ہم پرہیز ہی پہ دقت آئے گا۔ اگر خدا نہ کرے اتنا جی گئے۔

لاطینی امریکی مسٹر یوسف بے کارواں ہو کر پھر رہے تھے اور کئی دفعہ گفتگو کے لئے بہانے ڈھونڈ کر آ چکے تھے۔ ہم نے دن بھر کے لئے اُن کو اپنا محافظ بنا لیا۔ اگر مجھے ذرا بھی کھٹکا ہوتا کہ ان کی محافظت، بین الاقوامی خصومت و صعوبت بن کر میرا ذہنی امن پراگندہ کر دے گی۔ تو میں ان کو بھی پرے پرے رکھتی۔ موسیو رالو اور یہ تھے تو بہت شریف اور نیک نیت لیکن میرے لئے ہر ایک سے بلاوجہ لڑنے اور مرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ دو جگہ ان کو عربوں کی ضربوں سے بچایا۔ دو تین بار خود اپنے جہازی ہمراہیوں سے بھڑ گئے۔

پورٹ سعید سے قاہرہ کافی دور ہے۔ ہماری بس اڑھائی گھنٹے میں قاہرہ پہنچی، قاہرہ کے بازاروں میں سے گزرتے ہوئے ہماری ٹورسٹ بس نے ہمیں ایک بڑے ہوٹل میں اُتار دیا۔ ہاتھ منہ دھو کر ہم اپنے مقررہ تاریخی مقامات دیکھنے روانہ ہوئے۔ قاہرہ قدیم و جدید تہذیب کی ایک کھچڑی ہے۔ اُس کی عمر چار ہزار سال قبل از مسیح بتائی جاتی ہے۔ اور بعض مقام پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی ابھی ۱۹۶۰ء میں دائی کے ہاتھوں میں گرم گرم نرم نرم دھر ہوا ہے۔ جدید ترین ہوٹل، عیش کدے، تھیٹر، ناچ گھر، اسے مشرقِ وسطیٰ کا موڈرن پیرس بھی کہتے ہیں۔ اور قدامت کا گہوارہ بھی۔ وہ نقشہ جو عموماً اسلامی ممالک میں ہے۔ یہاں پر بھی ہے۔ ایک طرف بدو اور اونٹ۔ دوسری طرف کیڈلک اور بیوک۔ ادھر پھٹے حال ننگے پیر بچے۔ ادھر موٹی چکنی امیر عورتیں بنیل ابرو۔ پنسل ہیلون کے ساتھ اپنی شاپنگ میں مصروف لیکن اب ایک عرصے سے یہ تفرقہ مٹتا جا رہا ہے۔ خدا ناصر کی عمر میں برکت دے۔

ہماری بس دریائے نیل پر جا کر رُکی۔ دریائے نیل تاریخ کی سیرگاہ۔ مصر کی رگ زراعت۔ اس نے تبرز کی آبدار فوجیں، قلوپطرہ کے جشن محبت دیکھے ہیں۔ اس نے تن تخاتون کے ظلم و ستم۔ اور بنی اسرائیل کے غم و الم، یوسف کا حُسن، زلیخا کے ناز دیکھے ہیں۔ یہ نپولین کی اماجگاہ مشرق اور مارک انتھونی کی کربلا! یہ مورخوں کا تخیل اور شاعروں کا خواب! کیا یہ دریائے نیل ہے؟ ایک چھوٹی چھوٹی سی گدلی نہر جس کے ایک طرف محفلیں محفلیں اور نقرئی قہقہے۔ دوسری طرف سنسان غربت۔ یہ حقیر نالہ تاریخی نیل کا مضحکہ لگ رہا تھا۔ اس کے سارے ڈرامہ پر ایک تشکیک، اشاید کتابوں میں چیزیں بڑی اور شاندار معلوم ہوتی ہیں۔ مورخ کا زورِ قلم ان کا رقبہ دوگنا کر دیتا ہے، لیکن ہم نے تو سُنا تھا۔ کہ دُور سے چیز چھوٹی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں قریب آ کر اور چھوٹی معلوم ہوئی۔ یہ دریا جس کے ایک کنارے پر مغربی موسیقی کے لئے اُٹھ رہے تھے۔ اور مغربی لباس، مغربی آداب، میں نے آنکھیں دوبارہ ملیں۔ کیا یہی دریائے نیل ہے۔ کہیں دھندلیوں کا مغالطہ تو نہیں ہو گیا۔

ہم SPHINX کے قریب گئے، سر عورت کا، چہرہ مرد کا، جسم شیر کا۔ یہ رازوں کا صیغہ! ایک شاہی معمہ! ایک انگریزی استعارہ! خیال تھا۔ کہ میں اس کے آگے بونا معلوم ہونگی۔ لیکن میں نے اس کے سامنے گردن تان کے تصویر کھنچوائی۔ نہ میں اتنی چھوٹی تھی، اور نہ وہ اتنی بڑی۔ ایک وقت میں ہم دونوں کیمرے کے لینز میں سما گئے۔

آگے چلے تو اہرامِ مصر۔ باہر سے اینٹوں کے سنگین تکون۔ اندر سے مہیب فرعونی مقبرے۔ ہولناک حیرت انگیز! تین ہزار سال

نوٹ:۔ یہ فروری کا مہینہ تھا۔ اور نیل کا پانی بالکل اُتر چکا تھا۔

قبل از مسیح! کن شاہی معماروں نے تراشے ہونگے! کتنے سالوں میں کتنے مزدوروں کی قربانی سے تیار ہوئے! ان کی نئی انسیان کے خون سے گندھی۔ ان کی اینٹوں میں انسان کی ہڈیاں پیسیں! لاکھوں غلاموں کے آنسو اور آہ و بکا سے فرعونیت نے ارض ابدیت خریدی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انسان کی نخوت کہاں جا کر رُکے گی! اہرام مصر اندر سے زیادہ وسیع اور بارعب معلوم ہوتے ہیں۔ ہم نے چالیس منٹ میں چار ہزار صدیاں طے کر لیں۔ جادو تھا۔ کہ طلسم ہوشربا کے افسانے۔ چھو منتر اور اونٹ گاڑیوں سے کود کر جدید کاروں میں بیٹھ گئے۔ صحراؤں کی ازلی خاموشی اور بیسویں صدی کے ہارن موٹر۔ مختلف زمان و مکان کا تصادم۔

موٹر کچھ میل چلی تو ایک اشارہ ہوا کر رو کو۔ ایک میم کے گردے کمزور تھے۔ اتر کر غسلخانہ جانا چاہتی تھی۔ اس کے شوہر نے مضحکہ آمیز لہجہ میں اس سے کہا۔ "تم ان کے مقدس ملے کو پلید مت کرو،" مصری ڈرائیور ہتھے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گیا۔ "نہ میں مصر کی تحقیر سنونگا۔ نہ اسلام کی" انگریز کو معافی مانگی پڑی۔ مجھے انگریز کی ذہنیت پہ ذرہ غصہ نہ آیا۔ البتہ افسوس ہوا کہ یہ لوگ اتنی تعلیم کے باوجود فراخ دل نہ ہو سکے۔ اسلام کا نام آتے ہی ان کا ذہنی افق سکڑ جاتا ہے۔ اور پُرانے تعصبات عود کر آتے ہیں۔ وقت کی بات ہے۔ عمر کے ساتھ پختگی آتی ہے۔ شاید چند سال پہلے اس قسم کے فقرے پہ مجھے طیش آتا۔ لیکن اب مجھے یوں محسوس ہوا وہ میرے مذہب کی بے عزتی نہیں کر رہا، خود اپنی تہذیب اور ایمان کی تحقیر کر رہا ہے۔ مجھے کچھ احساس برتری ہو چلا کہ شائد میرا خدا، اور میرا مذہب، زیادہ فراخ حوصلہ ہیں۔ میرے خدا کی رواداری کے کیا کہنے، جس نے خود فرعون کی رسی دراز کی کہ وہ خدا بن کے اپنی پرستش کروائے۔ میرے مولا نے مصری دیوتاؤں کو جینے اور مٹی میں لافانی ہونے کی اجازت دے دی۔ روم کے دیوتا سنگ مرمر میں، ہندی دیوتا پیتل سوتے میں آج بھی کھڑے ہیں۔ آج بھی انسان انسان کو پوج رہا ہے۔ جب یہ سب میرے رب کو روا ہے تو ہم کون بُرا ماننے والے!

میرے نگہبان دوست موسیو رالواریز سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ بازاروں میں میرے لئے راستہ بناتے ہوئے عربوں کے لبادوں، اور لبیکوں سے بچاتے ہوئے مجھے ایک تحفوں کی دوکان پرے گئے۔ بس مختلف کونوں کو ٹٹولتی دو چیزیں اُٹھا لائی۔ ملکہ نفریتی اور حشیش کا حقہ اور دونوں میز پر دھر دیئے "یہ حشیش پائپ کتنے کا ہے؟" میں نے پوچھا۔ عربی جوان دوسری طرف سے بولا ہر دفعہ جب آپ حشیش کہتی ہیں۔ میرا دل ہلا دیتی ہیں۔ میں نے سر ہلا دیا اور موسیو رالواریز لپک کر میری مدد کو پہنچ گئے۔ میں تو کھسک گئی وہ دام چکاتے رہے اور آدھی قیمت پہ ملکہ نفریتی اور حقہ حشیش میرے تھیلے میں ڈال دیئے۔

ہم نے ہوٹل میں آن کر کھانا کھایا۔ پھر اپنی پرانی بس میں بیٹھ کر واپسی کا رُخ کیا۔ ایک امریکی معہ بیوی اور سات بچوں کے سارا دن کی خرید و فروخت سے لدا پھندا آن کر بیٹھ گیا۔ ہر بچے کے سر پہ فاروقی ٹوپی تھی۔ اس نے شائد مصری تاریخ تو کتابوں میں پڑھی ہوگی اور نہ بھی پڑھی تو پھر کبھی پڑھ لے گا۔ لیکن مصری بازاروں کے سستے سودے کہاں ملتے! دوسرا جوان جرمن جوڑا آتے ہی سیٹ پہ نڈھال ہو کر ایک دوسرے کے کندھے پہ سر رکھ کر سو گیا۔ دونوں طالب علم تھے۔ اور دن بھر قاہرہ کی اینٹ اینٹ کا مطالعہ کرتے کرتے خود گارا بن گئے تھے۔ تاریخ دماغ میں بھنبھنا رہی تھی۔ نیند جلد چھا گئی۔

خنکی شدید ہوتی جا رہی تھی۔ بس ابھی گرم ہی ہوئی تھی کہ کوئی بیس میل پہ روک دی گئی۔ فوجی قافلوں نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ واپس قاہرہ جاؤ۔ اسرائیل نے کئی جگہ چھاپے مارے ہیں۔ اور پورٹ سعید کے راستے بند کر دیئے گئے ہیں۔" بس میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ ہمارا جہاز لنگر ڈالے کھڑا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ دو بجے رات کو اُسے لنگر اُٹھانا تھا۔ ہمارے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے۔ کہ رات قاہرہ

قاہرہ گزار کر ہوائی جہاز سے دوسرے دن جینوا چلے جائیں۔ ایک شور، ایک خلفشار! آخر قاہرہ واپس آئے۔ انگریزی سفیر نے مرکزی وزارت خارجہ سے اجازت دلوائی۔ بس روانہ ہوئی۔ پچاس میل بعد پھر مصری فوجوں نے روک دیا۔ "واپس جاؤ"، ہم کوئی پرمٹ وغیرہ نہیں مانتے "ہمارے ساتھیوں کا اعصابی ڈھیر ہو گیا۔ گالیوں پر اتر آئے۔ وہ انگریزی میں گالیاں دے رہے تھے۔ اور فوجی دستے عربی زبان میں ہم کو بے نقط سُنا رہے تھے۔ ان کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ کچھ مصری سپاہیوں نے تالیاں بجا بجا کر انگوٹھے دکھانے شروع کئے۔ وقت کم تھا۔ اور ہمارا جہاز انتظار کر رہا تھا۔ کہاں ہے تمہارا کپتان بلاؤ اُسے" میں اس ساری کیفیت کے مزے لے رہی تھی۔ صدیوں سے سفید حمزہ نی عربی اعصاب کے ساتھ کھیلتی رہی ہے۔ اور آج بھی کھیل رہی ہے۔ دو منٹ کے لئے ان یورپینوں کے تنے ہوئے اعصاب اور بگڑے ہوئے مزاج دیکھ کر مجھے لطف آیا۔ موسیو دالوار یز نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔ "آپ مُسکرا رہی ہیں؟ کیا مشرقی عورت کا خمیر اتنا ٹھنڈا ہوتا ہے؟" خالص ستانے کی نیت سے میں خاموش مُسکراتی رہی۔ نوسیو رُنج آکر اوروں سے ہم کلام ہو گئے۔

بہت سی کج بحثی کے بعد آخر کار بس روانہ ہوئی۔ رات کے خنک میں چاند اکیلا تن تنہا ٹھٹک رہا تھا۔ گویا ساری مخلوقات کے گناہ کی پاداش میں صلیب پر چڑھا دیا گیا ہو۔ صرف دو تارے اُس وقت اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ باقی سب روپوش ہو چکے تھے۔ کچھ دُھندلاہٹ میں اپنی دُم میں پیچھے چھوڑتے گئے۔ جوں جوں بس میل طے کرتی مسافروں کے رُکے ہوئے سانس رواں ہوئے اُمید بندھی کہ آخر ہم وقت پر پہنچ ہی جائیں گے۔ ایک دو گنگنانے لگے۔ ایک نے ہلکی ہلکی سیٹی میں اپنا دبا ہوا احساس خوف ظاہر کیا۔ حُسن پرستی نہ قحط سالی میں ہوتی ہے اور نہ خوف کی حالت میں۔ ذرا اطمینان ہوتے ہی موسیو دالوار یز کو بھی چاند یاد آیا۔ اس کی طرف اس فخر سے نظر ڈالی۔ گویا چاند ان کی اپنی تازہ تازہ دریافت ہے۔ "دیکھئے ذرا دیکھئے، کتنا حسین کتنا جوان ہے چاند" ! میں نے گردن موڑے بغیر کہا۔ "یہ تو بالکل فاقہ مست ننگ ملنگ سادھو لگ رہا ہے۔ جو چالیس چلّے کاٹ کر اپنے حجرے سے باہر نکلا ہو۔ اس کا تو آدھا انجر پنجر رہ گیا۔ پسلیاں گن سکتے ہیں۔" لاطینی امریکی خون غرایا۔ "آپ نے بھی نرالا مذاق پایا ہے۔ آپ کو چاند میں بھی رومان محسوس نہیں ہوتا۔" میں بولی چاند کا رومان تو روس نے پنکچر کر دیا۔ جب سے ان کا لال جھنڈا وہاں لہرایا ہے۔ عاشقوں نے اور سیارے تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ شاعروں نے استعارے بدل دیئے۔ زبان نے دوسرے محاورے گھڑ لیے۔ اب چاند تو روس کی سولہویں ری پبلک ہے۔ اور ایک سرد اور سنسان سائبیریا۔"

نوسیو بولے! "خدا بچائے مجھے مشرق سے اور اس کی عورت سے نہ کبھی اسے سمجھا اور نہ اُسے سمجھ سکوں گا"!

"زندگی سمجھنے کا وقت کہاں دیتی ہے۔ وہ دیکھو منزل کے آخری پاؤں"!

ہمارا جہاز ساحل سے دُور سُرمئی دُھند میں کھڑا صور اسرافیل پھونک رہا تھا۔

بانیٔ ادبِ لطیف کی یاد میں

ز دُنیا چودھری برکت علی رفت
شُد اُو را جنّت الفردوس ماوا
پئے تاریخ اُو رضواں ز جنّت
"بجنّت برکتِ مرحوم" گُفتا ؎
۱۳ ھ ۷۱

حفیظ ہوشیارپوری

منظور احمد

چوہدری برکت علی مرحوم

(ہمعصروں اور رفیقوں کے تاثرات)

مولانا صلاح الدین احمد، حکیم احمد شجاع، صوفی تبسم، احمد ندیم قاسمی، مولانا مظہر علی اظہر، ظہیر کاشمیری، شورش کاشمیری، قتیل شفائی، مرزا ادیب، میاں محمد شفیع، ایم۔ اسلم، عارف عبدالمتین، حکیم نیر واسطی، اے حمید — سب ہمارے دور کی ممتاز شخصیتیں ہیں۔ ان شخصیتوں کے حلقے میں چوہدری برکت علی مرحوم و مغفور کو پبلشر کی حیثیت سے مرکزیت حاصل تھی۔ انھوں نے تمام عمر ان ادبا و شعرا کی "تخلیقات" کو عوام تک باوقار اور پُر کشش انداز میں چھاپ کر پہنچانے کا فریضہ انجام دیا۔ وہ مکمل طور پر فنِ اشاعت سے واقف تھے۔ انھوں نے ہمارے ملک میں سب سے پہلے خوبصورت اور خوش شکل کتابیں چھاپنے کی ابتدا کی اور بہت سے لوگوں کی ادبی تخلیقات عوام تک پہنچائیں۔ اس فنِ اشاعت کے لحاظ سے بھی وہ اپنی جگہ ایک بلند پایہ فن کار تھے۔

میں نے یہ سمجھنے کی مہم باندھی کہ مرحوم چوہدری صاحب کی یاد ان لوگوں کے تصور میں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا کس حد تک زندہ ہے، اور اب وہ لوگ مرحوم کے متعلق کس طرح سوچتے ہیں۔ سب سے پہلے میں حکیم احمد شجاع سے ملا۔

حکیم احمد شجاع : حکیم صاحب کی عمر ماشاء اللہ اس وقت ۹۲ برس کی ہو چکی ہے۔ وہ پچھلی پوری صدی کی زندہ تاریخ ہیں۔ حافظہ اس قدر جوان کہ اگر ان سے لاہور کے کسی گلی محلے کے متعلق بات کی جائے تو وہ وہاں رہنے والے خاندانوں کے تمام بڑے بوڑھوں کے نام، مشاغل، عادات وغیرہ پر مکمل روشنی ڈالیں گے اور اس محلے کی پوری صدی بھر کی تاریخ دُہرا ڈالیں گے۔

"مجھے بڑی اچھی طرح یاد ہے کہ تقریباً ۱۹۲۹ء میں چوہدری برکت علی صاحب اپنے بڑے بھائی غلام علی اور اپنے ایک عزیز راجا محمد امین کی معیت میں میرے پاس آئے۔ اس وقت انھوں نے تازہ تازہ بی اے کیا تھا۔ انھوں نے کہیں اشتہار پڑھ لیا تھا کہ اسمبلی میں کچھ کلرکوں کی اسامیاں خالی ہیں۔ محمد امین صاحب جو میرے دوست بھی تھے اور چوہدری برکت علی کے عزیز بھی میرے پاس یہ سفارش کرنے کے لیے آئے تھے کہ میں چوہدری برکت علی کو ملازمت دلا دوں۔ آئے تو -/35 روپے کی ملازمت کے لیے تھے مگر قدرت نے ان کے مقدر میں ایک کارِ خاص لکھ رکھا تھا۔ چوہدری برکت علی کی بھوری آنکھیں ذہانت کی روشنی سے معمور تھیں۔ جب مجھے باتوں باتوں میں اس بات کا علم ہوا کہ وہ اپنی برادری کے سب سے پہلے ایسے ہونہار نوجوان ہیں جنھوں نے گریجویشن کر کے اپنی پوری برادری کا سر بلند کیا ہے تو میرا ارادہ بدل گیا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے گھر میں روپے پیسے کی کمی نہیں، لہٰذا میں نے اپنے دوست اور چوہدری برکت علی کے بھائی غلام علی صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ان کی ملازمت کا خیال چھوڑ دیں۔ میری یہ بات سن کر وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور میرے دوست محمد امین نے حیران ہو کر پوچھا۔

"حکیم صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" ـــــ

میں نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ چوہدری برکت علی کو پبلشنگ ہاؤس قائم کرنے کی ترغیب دلائیں۔ تجارت، ملازمت سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ ملازمت ایک نہ ختم ہونے والی غلامی ہے اور تجارت آزادی کے ساتھ ساتھ سنتِ نبوی بھی ہے۔ آپ اس برخوردار کو پبلشنگ ہاؤس کھول دیں۔ انشاء اللہ خداوند برکت دے گا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان پبلشرز کی تعداد بہت کم تھی اور دوسری اقوام کے غیر مسلم پبلشرز درسی کتب شائع کر کر کے دھڑا دھڑ کثیر منافع حاصل کر رہے تھے۔ خوش قسمتی سے چوہدری برکت علی کو میرا یہ مشورہ پسند آیا اور انھوں نے میری ہی پرائمری اور مڈل کی درسی کتابوں کی اشاعت سے اپنے پبلشنگ ہاؤس کا آغاز کیا۔ اس کے بعد میرے ہی مشورے سے انھوں نے "ادبِ لطیف" جیسا رسالہ شروع کیا۔ اس رسالے کا نام "ادبِ لطیف" بھی میرے کہنے سے رکھا۔ میں نے اس رسالے کا نام ادبِ لطیف اس لیے تجویز کیا کہ میں کسی زمانے میں "ہزار داستان" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا کرتا تھا اور اسی ہزار داستان میں میں نے ہی سب سے پہلے (LIGHT LITERATURE) کا ترجمہ ادبِ لطیف کیا تھا۔ اور اسی خیال کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے یہ نام تجویز کیا تھا۔ پھر انھوں نے میرے مختصر افسانوں کی کتاب (حسن کی قیمت اور دوسرے افسانے) شائع کی اور اس کتاب کی رائلٹی کے طور پر انھوں نے ایک بار مجھے پانچ سو روپے دیئے۔

انھیں ہمیشہ سے نئے نئے ہونہار اور اچھوتے خیالات کے ادیبوں اور شاعروں کو آگے لانے کی خواہش اور تلاش رہتی تھی۔ وہ ادب دوست ہونے کے علاوہ ادیب دوست بھی تھے۔ اور وہ ادباء و شعراء کی خدمت کر کے ایک روحانی مسرت اور دلی خوشی محسوس کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ایک دن باتوں ہی باتوں میں مجھ سے مرزا ادیب کا ذکر کیا۔ اور بعد میں میرے کہنے پر مرزا ادیب کو اپنے یہاں ملازمت دی۔ وہ اپنے حلقے کے ادباء و شعراء کی ہر خوشی اور غم میں برابر کے حصہ دار تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مرزا ادیب کی شادی پر مجھے خود آ کر ساتھ لے کر گئے۔

وہ جب تک زندہ رہے میرے پاس آتے رہے۔ اُن کے کردار کی بلندی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ پبلشنگ ہاؤس قائم کرنے کے بعد جب تک میرے پاس ملنے آتے رہے انھوں نے میرے سامنے کبھی اپنی کسی غرض کا اظہار نہ کیا۔ اُن کی برخورداری کا یہ عالم تھا کہ میرے ہر مشورے پر عمل کیا۔ ادیب دوستی کے سلسلے میں اُن کی زندگی کا ایک خاص واقعہ یہ ہے کہ جب "ہزار داستان" بند ہو گیا تو انھوں نے ہزار داستان کی اُجڑی ہوئی محفل کے بہت سے ادباء و شعراء کو "ادبِ لطیف" میں اکٹھا کر لیا۔ وہ ایک پبلشر اور تاجر ہی نہیں بلکہ ایک شریف النفس انسان بھی تھے۔ اُن کے چند بہت ہی قیمتی اصول یہ تھے کہ محنت اور ایمانداری سے کماؤ۔ مگر صرف اس قدر منافع لو جو جائز ہو۔ اور جس منافع سے عزت کی زندگی بسر ہو سکے! ان کا نصب العین سرمایہ نہیں بلکہ بہبودیِ انسانیت تھا۔

صوفی تبسم، صوفی تبسم صاحب کی ادبی خدمات سے کون واقف نہیں؟ — انھیں بہت سی زبانوں میں شعر کہنے کی استطاعت حاصل ہے۔ لوگ انھیں حکمت استاد تسلیم کرتے ہیں۔ نہایت مشفق اور ملنسار طبیعت کے مالک ہیں۔ میں نے ان سے چوہدری صاحب کا ذکر چھیڑا تو وہ شروع ہو گئے:—

"میں نے زیادہ تر بھاٹی دروازے کے علاقے میں ہی زندگی گزاری ہے۔ بھاٹی دروازے میں استاد گام حسن کا اصل نام (غلام نبی) تھا میرے سب سے پہلے واقف بنے اور پھر انھوں نے بہت سے لوگوں سے میرا تعارف کرایا۔ اور انھیں کی بدولت میں چوہدری برکت علی صاحب سے متعارف ہوا میرے ان کے تعلقات بالکل اسی قسم کے تھے جیسے ایک بزرگ اور کم عمر نوجوان کے ہوتے ہیں۔ گو میری اور چوہدری صاحب کی عمر میں کچھ خاص فرق نہ تھا مگر پھر بھی وہ مجھے اپنا بزرگ سمجھتے رہے۔ میں ان دنوں سنٹرل ٹریننگ کالج میں تھا۔ جب وہ مجھ سے متعارف ہو گئے تو اکثر مجھ سے مشورے طلب کرنے کے لیے آتے رہے۔ میرے مشورے سے انھوں نے "ادبِ لطیف" نکالا۔ "ادبِ لطیف" نکالنے کی بھی ایک خاص وجہ تھی۔

اُس زمانے میں مسلمان پبلشر بہت کم تھے ۔ چوہدری صاحب نے درسی کتابیں چھاپیں تو ہندو پبلشرز نے اُن کتابوں کو (حالانکہ وہ محکمۂ تعلیم کی طرف سے پاس ہو چکی تھیں) اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر سکولوں میں نہ بکنے دیا۔ اس سلسلے میں چوہدری صاحب نے مجھ سے مشورہ طلب کیا تو میں نے انھیں ایک ہوالی رسالہ نکالنے کی تجویز دی ۔ اور یہ بھی بتایا کہ وہ اس رسالے میں اپنے ادارے کی کتابوں کی فہرست دیا کریں۔ شروع شروع میں انھوں نے سولہ صفحات پر مشتمل ادب لطیف نکالا اور مجھ ہی کو اس میں بیکنے ہوئے مضمون لکھنے کے لیے کہا "صوفی صاحب گو میرے پرچے میں مضمون لکھنا آپ کے شایانِ شان تو نہیں لیکن میں اس امید پہ یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ مجھے اس پرچے کو معیاری بنانے میں مدد دیں گے اور کوئی مضمون سرشمارے کے لیے دیا کریں گے ۔' لہٰذا میں ایک عرصے تک اس میں لکھتا رہا۔

اُسی دور میں انھوں نے خاص کام یہ کیا کہ (" VILLAGE LIBRARY ") کے سلسلے کی کتابیں شائع کیں ، اور خود اپنی محنت سے گاؤں گاؤں اور شہر شہر گھوم کر ان کتابوں کے آرڈر بک کیے اور آہستہ آہستہ یہ کتابیں مشہور ہو گئیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ چوہدری برکت علی صاحب کی گفتگو اور عادات و اطوار میں کچھ ایسی کشش موجود تھی کہ جو شخص اُن سے ایک بار متعارف ہو جاتا تھا اس سے بہت جلد راہ و رسم پیدا کر لیتے تھے ۔ وہ ایک بامروت ، ملنسار اور بلند کردار شخصیت کے مالک تھے ۔ وہ تمام عمر محنتِ شاقہ کے قائل رہے ۔ نیا ادارہ ، پنجاب بک ڈپو ادارۂ نو ، مکتبہ جدید ، اور میری لائبریری سب اُن کی محنت اور تجربوں کو فنِ اشاعت کے متعلق دی ہوئی تعلیم اور ہنر کا نتیجہ اور صلہ ہیں۔"

ایم اسلم

صوفی صاحب سے نیٹ کر میں ۱۸۷ ناولوں کے مصنف ایم اسلم کی خدمت میں پہنچا۔

یہ ایک قدیم قلعہ نما عمارت کی حویلی کا دروازہ ایک تاریخ کے صفحات کی طرح کھلا تھا۔ دروازہ کے فوراً بعد ایک وسیع اور کشادہ ڈیوڑھی میں ایک تخت پوش بچھا تھا جس پر نرم سی چٹائی پڑی تھی اور اُس پر ایم ۔ اسلم صاحب کے ایک سفید ریش ہم جماعت جگری دوست سو رہے تھے۔ میاں ایم ۔ اسلم صاحب کا خاندانی ملازم امام دین انھیں اطلاع دینے کے لیے گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میاں صاحب اپنے ہمیشہ جیسے سادہ مشرقی لباس شلوار اور قمیص میں ملبوس تشریف لائے ۔ تعارف کے بعد گفتگو شروع ہوئی ۔

" میاں صاحب ۔ چوہدری برکت علی صاحب بانی "ادب لطیف" سے آپ کی پہلی ملاقات کب ہوئی ؟"

" یہ آج سے کئی برس پہلے کی بات ہے ۔ چوہدری برکت علی صاحب نے انھیں دنوں گریجویشن کرنے کے بعد پبلشنگ ہاؤس کھولا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں تسکار کھیل کر واپس آیا تھا۔ وہ سردیوں کا موسم تھا۔ برکت علی صاحب نے ایک سیاہ رنگ کی قراقلی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ انھوں نے مجھ سے میری شائع شدہ کتاب کی کاپیاں لینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے انھیں اجازت دے دی۔ اُن کے ساتھ اُن کا ایک ملازم تھا جسے وہ نام پکارنے کی بجائے "شاہ" کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ چوہدری برکت علی اور شاہ نے میری کتاب کی کاپیاں گنیں اور اپنے ادارے پر لے گئے "۔ اس معاملہ کے بعد بھی میری کئی کتابیں انہوں نے شائع کیں۔

عبدالحمید عدم

خرابات ، گردشِ جام اور نبطِ مے والے عبدالحمید عدم نے چوہدری صاحب کے متعلق جو فرمایا وہ درج ذیل ہے۔

"چوہدری صاحب ایک متوکل شخصیت تھے۔ اُن کے سینے میں ایک دردمند دل تھا۔ وہ رفاہی اور قومی کاموں میں بھی دل کھول کر چندہ دیا کرتے تھے اور اگر کسی کو اُن سے کوئی کام پڑ جائے تو اُس کام کو پورے خلوص سے سرانجام دیتے اور اس میں ایک خوشی محسوس کرتے۔ وہ بہت سی سیاسی جماعتوں سے تحریک آزادی کے سلسلے میں منسلک رہے۔ وہ ہر وقت ہشاش بشاش رہتے اور اُن کی موجودگی دوستوں میں ایسی ہی اہمیت رکھتی تھی جس طرح سینے میں دل دھڑکتا ہے۔ وہ بڑے جہاندیدہ شخص تھے۔ اُن کے کردار کی بلندی کا سب سے بڑا وصف اور ثبوت یہ ہے کہ جب کوئی ادیب یا شاعر اُن کے پاس جاتا تو وہ اس کے حالات اُس کے چہرے کو دیکھ کر پڑھ لیتے۔ کئی بار انھوں نے میری موجودگی میں بغیر کسی غرض و منفعت کے اختر شیرانی مرحوم کو بیس تیس روپے تک کی رقم دی۔ میں جب بھی پانچ یا چھ ماہ کے عرصے کے بعد انھیں ملنے گیا انھوں نے اکثر گلا کیا کہ میں اتنا عرصہ کہاں تھا اور پھر وہ اپنے کسی ملازم یا بیٹے کو آواز دے کر کہتے،

"بھئی پچاس روپے تو لانا۔ عدمؔ صاحب تشریف لائے ہیں" اور وہ یہ رقم میری جیب میں ڈال کر دیر تک مسکراتے رہتے۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ "عظمت آدم" اور "تغزل" والے ظہیر کاشمیری دندناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور آتے ہی عدمؔ کے منہ سے آخری فقرہ سن کر اُلجھ پڑے "ایسے کیوں اس یادہ گوئی سے کام لے رہا ہے۔ اُسے صرف ایک پبلشر کی حیثیت سے (TREAT) کر" عدم صاحب کو سن کر تاؤ آگیا "ظہیر تیری تو ہمیشہ سے یہ عادت بن چکی ہے کہ تو ہر کسی کے خلاف بولے۔ کونسا ایسا پبلشر ہے جس کی تو نے کبھی تعریف کی ہو۔ میرے ساتھ چوہدری صاحب کا جو سلوک تھا میں فراموش نہیں کر سکتا۔ اس دور میں اُن جیسا کوئی بھی پبلشر نہیں۔ وہ ان پبلشرز سے بدرجہا بہتر تھے۔"

"عدم صاحب چوہدری صاحب نے آپ کی کوئی کتاب بھی شائع کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"میری ایک کتاب آتش کدہ انھیں نے چھاپی تھی اور اُس کے عوض انھوں نے مجھے ۷۰۰/- روپے کی معقول رقم دی تھی۔ چوہدری صاحب نیک سیرت اور محنتی شخص تھے یہ انھیں کی نیک نیتی اور محنت کا پھل ہے کہ اُن کے بعد بھی ان کے خاندان کے اپنے الگ الگ پنجاب بک ڈپو، نیا ادارہ اور مکتبہ جدید جیسے ادارے موجود ہیں۔"

تنبیل شفائی

"میں ۱۹۴۲ء میں مری میں، پنڈی مری ٹرانسپورٹ میں منیجر کی سیٹ پہ کام کر رہا تھا اور اس کے عوض مجھے ۱۲۰/- روپیہ مشاہرہ ملا کرتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ میں "ادب لطیف" کے لیے لکھا کرتا تھا کہ چوہدری نذیر صاحب نے جو آج کل "نیا ادارہ" کے مالک ہیں مجھے خط لکھا اور میں لاہور آیا۔

فکر تونسوی، چوہدری برکت علی، چوہدری نذیر اور میں اکٹھے نظام ہوٹل گئے اور وہاں ایک دوستانہ فضا میں ہم لوگوں نے چائے پی۔ چوہدری برکت علی صاحب کی گفتگو کا انداز بالکل دوستانہ تھا۔ یہ میری چوہدری صاحب سے پہلی ملاقات تھی۔ فکر تونسوی میرے دوست بن گئے۔ اور میں اپنی پہلی نوکری چھوڑ کر "ادب لطیف" میں کام کرنے لگا۔ مگر بعد میں چوہدری برکت علی صاحب کی عدم موجودگی میں اُن کے ادارے کے ایک منتظم نے مجھے ۱۴/- روپے ماہوار کی پیشکش کی جس سے میں دل برداشتہ ہو کر واپس مری چلا گیا۔ بعد میں چوہدری برکت علی صاحب نے خط کے ذریعہ اظہار افسوس کیا اور لکھا کہ کم از کم میرا انتظار تو کر لیتے، تاکہ میں تمہاری بہتری کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکتا۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے ملازموں کے ساتھ بھائیوں اور دوستوں جیسا سلوک کیا۔

مجھے ایک اہم واقعہ یاد ہے۔ اُن دنوں میں اُن کے ساتھ ٹمپل روڈ پر رہا کرتا تھا۔ میں فلم نویسی کے سلسلے میں لاہور آچکا تھا۔ یہ ہندو مسلم فسادات کا دور تھا انھیں دنوں مکان کو آگ لگ گئی، بہت سا نقصان ہوا۔ اسی بدحواسی کے عالم میں میری جیب سے ساٹھ روپے نکل گئے۔ میں نے دوسرے دن چوہدری صاحب کو

ایک سونے کی انگوٹھی دی اور اس کے عوض -/۱۰۰ روپے مانگے۔ انھوں نے کل کے وعدے پر وہ انگوٹھی اپنے پاس رکھ لی مگر وقت مقررہ سے پہلے ہی انھوں نے وہ انگوٹھی اور -/۱۰۰ روپے اپنے ایک عزیز کے ہاتھ بھیجے اور ساتھ ہی یہ بھی کہلا بھیجا کہ اس انگوٹھی والے تکلف کی ضرورت نہ تھی۔

وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اور سرمائے کی نسبت محنت شاقہ اُن کا نصب العین تھا۔ ادبا و شعراء کو اُن سے زیادہ ہمدرد اور مشفق پبلشر اس دَور میں نہیں مل سکتا۔ اُن میں ادبی تحریروں کو سمجھنے کی حساس فکر موجود تھی۔ وہ اچھے شعر اور فقرے پر پھڑک اُٹھتے تھے اور جی بھر کر داد دیا کرتے۔

مولانا مظہر علی اظہر

میرے اور چوہدری برکت علی صاحب کے تعلقات دوستانہ ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی ساتھی کے بھی تھے۔ انھوں نے ہمیشہ سیاسی جلسے اور جلوس پر مسلمانوں کی بہتری کے لیے سرمایہ خرچ کیا۔ وہ ہر کسی کی مصیبت میں کام آنے والے شخص تھے۔ میں جب بھی قید ہوا انھوں نے میری اولاد کی ایک باپ کی طرح نگہداشت اور دستگیری کی۔ وہ میری اسیری کے زمانے میں میرے بچوں کی کتابیں، کاپیاں اور سکول فیس تک اپنی جیب خاص سے دیتے۔ میرے گھر میں گندم کی بوریاں بھیجے جاتے اور میرے گھر کا کرایہ بھی ادا کرتے رہتے۔ ایک بار جب میں قید و بند کے مصائب جھیل رہا تھا تو میرے بیٹے خاقان بابر کو اپنے ساتھ باصرار شملہ لے گئے اور وہاں اُن کے ساتھ اپنے بیٹوں جیسا سلوک کیا۔ ایک بار میری قید کے دوران خاقان بابر کو اپنے ساتھ لے گئے اور ادبِ لطیف میں کام نہ ہوتے ہوئے بھی ملازم رکھ لیا۔ خاقان بابر سکول سے فارغ ہو کر اُن کے پاس جا کر دوپہر کا کھانا اُن کے ساتھ کھاتا اور ایک یا دو گھنٹے روزانہ ادبِ لطیف کی پروف ریڈنگ کرتا جس کے عوض چوہدری صاحب ایک عرصے تک خاقان بابر کو -/۱۵۰ روپے ماہوار دیتے رہے۔ وہ تحریک آزادی کے بڑے سرگرم رکن تھے۔ مجھے اُن کی دوستی پر آج بھی فخر ہے۔ اگر وہ میری اسیری اور عدم موجودگی کے دوران میری اولاد کا ساتھ نہ دیتے تو آج میرا بیٹا خاقان بابر ہائی کورٹ کا ایڈوکیٹ نہ ہوتا۔

عارف عبدالمتین

جب میں "ادبِ لطیف" کے عملہ میں کام کرنے کے لیے گیا تو وہاں پہلے ہی سے ممتاز مفتی اور فکر تونسوی جیسے لوگ مدیر تھے۔ خیر میں بھی اُن مدیران کی قطار میں داخل ہوگیا۔ چوہدری صاحب خود صوم و صلوٰۃ کے پابند ضرور تھے مگر اُن میں مذہبی تعصب اور تنگ نظری نام کو نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ممتاز مفتی صاحب جو کٹر قسم کے مذہبی تھے اور فکر تونسوی جو ہندو مذہب کے تھے اور میں جو بالکل آزاد خیال کا تھا، سبھی مل جل کر ادبِ لطیف میں کام کر رہے تھے۔ اور چوہدری صاحب فکر تونسوی کے ساتھ بھی ہمیں جیسا، میرا مطلب ہے ایک مسلمان جیسا برتاؤ کرتے۔

وقت گزرتا رہا اور فسادات کا زمانہ آگیا۔ ظاہر ہے کہ "ادبِ لطیف" کی اشاعت ہندو مسلم فرقہ وارانہ فساد کے خونریز ہنگاموں کی وجہ سے رک گئی۔ مگر چوہدری برکت علی صاحب نے اپنے عملہ کے کسی بھی فرد کو ملازمت سے الگ نہ کیا۔ عملہ کے لوگ بیکار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ اس کے باوجود سب کو چوہدری صاحب کی طرف سے تنخواہیں برابر مل رہی تھیں۔ ایسے حالات میں اپنے ملازمین کے ساتھ اس قسم کا سلوک ایک بلند ظرف شخص ہی کر سکتا ہے۔ انھوں نے سرمائے کو کبھی نصب العینِ حیات نہ بنایا بلکہ وہ بانٹ کر صرف کرنے کے حق میں تھے۔

اس بیکاری سے جب ممتاز مفتی، فکر تونسوی اور میں اکتا گئے تو چوہدری مرحوم نے یہ تجویز کیا کہ اگر تم لوگ خالی بیٹھ ہی نہیں سکتے تو "ادبِ لطیف" کی تمام فائلوں میں سے بہترین نظمیں، غزلیں، افسانے، اور مضامین کا ایک انتخاب کر لو۔ لہٰذا ادبِ لطیف کے اس انتخاب میں ممتاز مفتی کے سپرد افسانوں کے

انتخاب کا کام کیا گیا۔ مجھے حصہ نظم و غزل کا انتخاب کرنے کے لیے کہا گیا اور فکر تونسوی کے ذمے مضامین کا انتخاب ہوا۔ ہم نے اس انتخاب کا کام "سنگ میل" کے نام سے شروع کیا۔

ان دنوں میری رہائش آبکاری روڈ پر تھی اور فکر تونسوی سنت نگر میں رہتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان بن گیا تو میں فکر تونسوی کو آبکاری روڈ پے گھر لے آیا۔ فکر تونسوی ہندوستان نہ جانا چاہتے تھے مگر حالات سے مجبور ہو کر اپنی دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے چوہدری مرحوم نے فکر تونسوی کو رائے دی کہ اب شاید ہم لوگ تمہاری حفاظت نہ کر سکیں۔ لہٰذا تم ہندوستان ہی چلے جاؤ تو بہتر ہے۔ میں اور ممتاز مفتی افسانوں اور نظموں غزلوں کا انتخاب کر چکے تھے اور میں ان دنوں فکر تونسوی کو مضامین کے انتخاب میں مدد دے رہا تھا۔ لہٰذا برکت علی صاحب نے "ادب لطیف" کی تمام فائلیں فکر تونسوی کے حوالے کر دیں اور کہا کہ تم انتخاب کر کے ہندوستان سے پاکستان بھیج دینا۔ مگر فکر تونسوی نے اس سلسلے میں غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ نہ ہی انھوں نے آج تک وہ انتخاب بھیجا اور نہ ہی ادب لطیف کی فائلیں۔ مجھے آج تک اس بات کا دکھ ہے جس وقت چوہدری صاحب نے ہماری موجودگی میں لاہور سٹیشن پر فکر تونسوی کو اپنے بھائیوں کی طرح ہندوستان روانہ کیا تو وہ ایک عجیب کربناک لمحہ تھا۔

اس کے بعد ایک وہ زمانہ آیا کہ ممتاز مفتی بھی میرا ساتھ چھوڑ کر گورنمنٹ کے "ہفت روزہ استقلال" میں چلے گئے۔ میں ادب لطیف ایڈیٹ کرتا رہا۔ اس زمانے میں استقلال میں ایک مضمون چھپا جس کے خلاف میں نے ایک مبسوط تبصرہ کیا۔ ممتاز مفتی کو شکایت پیدا ہوئی اور انھوں نے چوہدری صاحب کی توجہ اس تلخ و ترش تبصرے کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا ایک طرف تو آپ "ادب لطیف" میں آج تک میرا نام اعزازی طور پر مدیر کی حیثیت سے دے رہے ہیں اور دوسری طرف میرے پرچے کے خلاف عارف عبدالمتین کو تبصرہ کرنے سے نہیں روک رہے۔

چوہدری صاحب نے اس سلسلے میں مجھ سے کہا کہ اگر "تبصرہ ناگزیر ہی تھا تو تم انکا لہجہ بدل لیا ہوتا۔ اس سلسلے میں ذرا احتیاط سے کام لیا کرو" اس بات پر مجھے تاؤ آ گیا اور میں نے چوہدری مرحوم سے تلخ ہوتے ہوئے کہا۔ میں احتیاط نہیں کر سکتا۔ میں آپ کے ہاں سے جا رہا ہوں۔ چوہدری مرحوم نے مجھے روکنے کی بہت کوششیں کیں مگر میں نہ مانا۔ جب میں چلا گیا تو ترقی پسند مصنفین نے "ادب لطیف" کا بائیکاٹ کیا۔ مگر میں نے اپنے ان سب دوستوں کو سمجھایا کہ یہ میرے اور چوہدری صاحب کے ذاتی معاملات ہیں۔ آپ "ادب لطیف" کا ہرگز بائیکاٹ نہ کریں۔ ان تمام دوستوں کو چوہدری مرحوم نے خود بھی کہا کہ میں تو اب بھی یہ چاہتا ہوں کہ عارف واپس آ جائے مگر وہ مانتا ہی نہیں۔

ان واقعات کے چھ ماہ بعد جب کہ میں "مری" میں تھا "ادب لطیف" پر میرے اسی تبصرے کی وجہ سے جو میں نے استقلال کے خلاف کیا تھا پابندی لگ گئی۔ لیکن آج کل کے ادب لطیف کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔

میں :- وہ کیوں عارف صاحب ؟

عارف عبدالمتین :- اس دور کے اور آج کے ادب لطیف میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں تو کہوں گا کہ ادب لطیف سے اس کی روح چھین لی گئی ہے۔ بانی "ادب لطیف" چوہدری برکت علی مرحوم کے زمانے میں اس پرچہ کی ایک مضبوط اور بلند پالیسی تھی لیکن آج اس کی پالیسی بدل گئی ہے مرزا ادیب کے زمانے تک کم از کم یہ رسالہ چوہدری صاحب کی پالیسی کے مطابق تھا۔ مگر اب نہیں۔

میں : عارف صاحب چوہدری مرحوم کی پالیسی کیا تھی ؟

عارف عبدالمتین : چوہدری برکت علی آزادی اور حریت کے شیدائی تھے۔ وہ جاگیردارانہ نظام کے خلاف تھے اور چونکہ ترقی پسند

مصنفین بھی اسی نظریہ کے قائل تھے لہذا یہ پرچہ چوہدری مرحوم نے ترقی پسند مصنفین ہی کے لیے نکال رکھا تھا۔

میں: اور اب اس کی پالیسی کیا ہے؟

عارف عبدالمتین: وہی جو انتظار حسین مدیر ادبِ لطیف کی ہے۔

میں: وہ کیا پالیسی ہے؟

عارف عبدالمتین: یورپ میں یونگ نے ایک تحریک (SURREALISM) چلائی تھی۔ انتظار اُسی انداز میں نانی اماں کے حوالے سے ادب میں لکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا اندازِ تحریر بالکل (SURREALISTIC) ہے لیکن اس ادب میں کوئی بلند نظریہ موجود نہیں۔ یہ ادب زندگی اور شعور سے بہت دور ہے (SURREALISM) تحریک کے تمام پیروکار لاشعور میں ڈوب کر لکھنا چاہتے ہیں اور آپ جانتے ہی ہیں کہ لاشعوری باتوں میں کوئی خاص معقولیت نہیں ہوتی۔ گو ترقی پسند مصنفین بھی ذہنی طور پر یوٹوپیائی ہیں اور (SURREALISM) کے پیروکاروں کے ذہن کے سامنے بھی ایک یوٹوپیا ہے لیکن دونوں کے یوٹوپیا میں ایک بہت بڑا فرق ہے (SURREALISM) کے پیروکار مصنفین کے ذہنوں میں جو یوٹوپیا ہے (کہ دنیا میں انسان اس انداز سے رہیں۔ ہر شخص ایک دوسرے کے ساتھ یوں برتاؤ کرے۔ یہ دنیا اس قسم کی ہو تو جنت بن جائے گی۔ اس دنیا میں کوئی بھی غم اور مصائب کا ذکر نہیں کرے گا وغیرہ) وہ آج سے بہت پہلے کے دور میں تھا۔ لیکن ترقی پسند مصنفین جس قسم کے نظامِ حیات کے متعلق جس یوٹوپیا کے قائل ہیں وہ آئندہ اور مستقبل میں ہے۔ لہذا اس لحاظ سے (SURREALIST) لوگ رجعت پسند ہیں اور ہم لوگ ترقی پسند ہیں۔ انتظار حسین سے مجھے یہی اختلاف ہے کہ اس نے ادبِ لطیف کی پالیسی کو چوہدری برکت علی کی پالیسی سے مختلف راستہ پر ڈال رکھا ہے۔

ڈاکٹر محمد باقر

میں نے آج تک کسی آدمی کو اپنا دوست کہنے کی جسارت نہیں کی۔ دوست ہونے کا حق اور اختیار دوسرے آدمی کے پاس ہوتا ہے۔ اس لئے میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ چوہدری صاحب مرحوم میرے دوستوں میں سے تھے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں اُن کا نیاز مند تھا۔

چوہدری برکت علی مرحوم نے مجلس احرار کے لئے ہر اُس خدمت کو اپنے اوپر فرض سمجھا ہوا تھا جو مجلس اُن کے سپرد کر دیتی تھی۔ اور وہ اسے قومی خدمت قرار دیا کرتے تھے۔ لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجلسِ احرار نے کوئی قومی خدمت سرانجام دی یا نہیں۔ کیونکہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی کتاب (خود نوشت سوانحمری) میں مجلس احرار کے متعلق ایک سٹیج پر آ کر یہ کہا ہے کہ کانگرس سے علیحدہ یہ جماعت کچھ بھلی معلوم نہیں ہوتی۔

۳۔ مجلہ ادبِ لطیف کا دائرہ صرف ترقی پسند ادبا تک محدود نہیں رہا۔ پھر ترقی پسند ادیب کوئی خاص جماعت نہیں۔ بیس بائیس سال پہلے چند لوگوں نے یہ لیبل اپنے لئے محفوظ کیا تھا لیکن عصرِ حاضر میں ہر LEFTIST اپنے آپ کو ترقی پسند کہتا ہے۔ اور بعض لوگ دشمنی یا حقارت سے "سرخا" بھی کہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں نہ کوئی سرخا ہے نہ ترقی پسند۔ کیونکہ منظم تحریک کی صورت میں یہ چیزیں اس ملک میں موجود نہیں۔ اور تقریباً ہر LEFTIST کو یہ خطاب بلا وجہ دے دیئے جاتے

ں۔ اس سلسلے میں یہ حرف یہی کہوں گا کہ ادب لطیف نے ہر قسم کے ادب کی خدمت کی ہے

جہاں آرا شاہنواز

چودھری برکت علی مرحوم قوم کے ایک درخشندہ ستارے تھے اور ایسے قابل سپوت اور بے غرض کارکن ایک قوم کا بیش بہا سرمایہ ہوتے ہیں۔ جس کام کو ہاتھ میں لیا اُسے کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مرحوم کی زندگی ایک نمونہ مثال ہے

مولانا صلاح الدین احمد

چودھری برکت علی مرحوم ان نادر و نایاب انسانوں میں سے تھے جن کا عمل ہمیشہ ان کے قول سے دو قدم آگے رہتا ہے جس کسی سے انہوں نے پیمانِ وفا باندھا اسے مرتے دم تک سینے سے لگائے رکھا اور بدترین حالات میں بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ حسن کردار کی یہ کیفیت اب ہمارے معاشرے سے قطعی طور پر رخصت ہو چکی ہے اور یقیناً یہی وجہ ہے کہ ہمارے بیشتر معاملات اپنی اندرونی کمزوری اور بودے پن کے باعث اس انجام خیر کو نہیں پہنچ پاتے جو حسنِ عمل کا فطری حق ہے۔

مجھے بے حد افسوس ہے کہ میری ان کی دوستی زندگی کے آخری مراحل میں استوار ہوئی اور مجھے ان کی صحبت و رفاقت کے بہت کم مواقع نصیب ہوئے۔ تاہم جو کچھ اس سلسلے میں ارزانی ہوا میں اسے زندگی کی بہترین نعمتوں میں شمار کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں ہمیشہ ہمیشہ شاد و آباد رکھے اور ان کی سعادت مند اولاد کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا رہے!

ایم اے عزیز (ہیڈ ماسٹر مسلم ماڈل ہائی سکول لاہور)

حقیقت یہ ہے کہ مسلم ماڈل ہائی سکول چودھری برکت علی مرحوم و مغفور کی ایک عظیم یادگار ہے۔ شروع شروع میں چودھری صاحب نے چند دوستوں کے تعاون سے ۱۹۴۲ء میں مسلم ماڈل ہائی سکول کی بنیاد نواں کوٹ میں رکھی۔ جس کے پہلے صدر ملک نور الٰہی تھے اور برکت علی صاحب بحیثیت منیجر اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ اور ساتھ ہی مسلم تعلیمی مجلس کی داغ بیل ڈالی۔ جس میں چودھری صاحب کے ساتھ سرگرم ارکان کی حیثیت سے نمایاں حصہ لینے والے شیخ نیاز احمد اور شیخ محمد اشرف صاحب تھے۔

اس مجلس کی بنیادی خواہش یہ تھی کہ اس اسکول میں زیادہ سے زیادہ ایک سو طالبعلم پڑھیں۔ پہلے سال اس اسکول میں طالب علموں کی تعداد نوے تھی۔ اور یہ اسکول بطور ریذیڈنشل اسکول کے نہایت کامیابی سے چل رہا تھا۔ لیکن اگلے ہی سال ان منتظمین حضرات کی خواہش کے برعکس طلباء کی تعداد نوے سے تجاوز کر کے ایک صد پینتالیس تک پہنچ گئی۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں یہ سکول ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات کی نذر ہو گیا۔

فسادات کے بعد ہی اسکول موجودہ بلڈنگ کچہری روڈ میں منتقل ہوا۔ مسلم تعلیمی مجلس کے روشن دماغ ممبران نے اس اسکول کو ایسے اصولوں پر چلایا کہ خدا کے فضل سے صوبہ بھر کے بہتر اسکولوں کی فہرست میں شامل ہے۔ اس واقعہ سے یہ بات صاف طور پر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ چودھری مرحوم تعلیمی مشاغل میں کس قدر بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے؟

اس کے ساتھ ہی چودھری صاحب نے اپنے مخلص ساتھیوں کو بھی اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مزید دو اسی قسم کے اسکولوں کو

بھی اپنے زیرِ اہتمام و انتظام چلائیں۔ کیونکہ اس وقت تک مہاجرین بھی اپنا وطن چھوڑ کر مملکتِ خداداد پاکستان میں آ چکے تھے اور چودھری صاحب ایک صحیح سرشت کے انسان ہونے کے باعث یہ محسوس کرتے تھے کہ مہاجرین کے تعلیمی مسئلہ کو اسی طرح سلجھایا جا سکتا ہے کہ مہاجرین کے بچوں کے لئے زیادہ سے زیادہ تعلیمی مجلس کے اراکین نے دو مزید اسکول (اسلامیہ ہائی سکول مدہنی روڈ اور اسلامیہ ہائی سکول مصری شاہ) قائم کئے۔

ان کے ساتھ میری سب سے پہلی ملاقات، جہاں تک میرا حافظہ ساتھ دیتا ہے۔ جموں میں "اکبر اسلامیہ ہائی اسکول" میں ہوئی۔ جہاں میں ہیڈ ماسٹر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ غالباً مجھ سے وہ کتابوں کا آرڈر لینے کی غرض سے آئے تھے۔ اس ملاقات میں مجھے ان کے احراری ہونے کا علم ہوا۔ اور انہیں میرے پکے مسلم لیگی ہونے کا۔ انہوں نے میرے سیاسی نظریات کی یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں پکا مسلم لیگی ہوں بے خوف و خطر بے دھڑک اور بے باکانہ دھجیاں اڑائیں۔ اور پہلی ہی ملاقات میں میرے زندگی بھر کے اصولوں کو تہس نہس کرنے میں کوئی کسر نہ رکھی۔ میں ان کی اس گرمجوشی اور بے باک گفتگو سے بے حد متاثر ہوا۔ اور اس وقت سے لے کر ان کے اس دنیائے فانی کو خیرباد کہنے تک میرے ان کے دوستانہ تعلقات قائم رہے۔

یوں تو ان کی بہت سی یادگاریں ہیں۔ مگر ان سب کے علاوہ "ادب لطیف" بھی ان کی ایک خاص علمی و ادبی یادگار ہے۔ وہ ایک مخلص خادمِ ادب، نہایت معاملہ فہم تاجر، دوربین نگاہ رکھنے والے منتظم، بڑے انتھک سیاسی کارکن، صاف گو، خود دار اور دوست نواز تھے۔ سب سے کٹھن مرحلہ انہیں پوری زندگی میں اس وقت پیش آیا جب انہیں ایک زمیندار کا بیٹا ہوتے ہوئے تمام خاندان کی مخالفت برداشت کرتے ہوئے پبلشنگ کا کاروبار شروع کرنا پڑا۔ لیکن خدا کے فضل اور اپنی انتھک محنتوں کے باعث باری تعالیٰ نے انہیں کامیابی ہی عطا کی!

عبدالمجید چودھری (مکتبۂ کارواں)

میرا خیال ہے کہ چودھری صاحب سے میری پہلی ملاقات تقریباً ۱۹۴۸ء کے اوائل میں ہوئی۔ مگر یہ ملاقات صرف تعارف کی حد تک ہی تھی۔ لیکن جب میں مستقل طور پہ لاہور میں آ گیا تو ان سے گاہے گاہے ملنے کے مواقع میسر آتے رہے۔

لاہور کے مسلمان پبلشرز میں ان کا بڑا احترام تھا۔ اس سلسلے کا مجھے ایک خاص واقعہ یاد ہے۔ یہ واقعہ پاکستان بک سیلرز ایسوسی ایشن کے ایک خاص اجلاس میں روپذیر ہوا۔ اس میٹنگ میں درسی کتب کے متعلق ایک بل پیش ہوا جس پہ سب ممبرانِ اجلاس متفق ہو گئے۔ لیکن چودھری موصوف اس مسئلہ کے حق میں نہ تھے۔ تمام ممبران ایک طرف اور چودھری صاحب بغیر کسی گھبراہٹ کے حزبِ مخالف کی حیثیت سے تنہا پُرجوش انداز میں اس بل کی مخالفت کرتے رہے۔ اسی طرح یہ اجلاس بغیر کسی فیصلہ کے برخاست ہو گیا۔

اس اجلاس کے بعد یکے بعد دیگرے اسی زیرِ بحث مسئلہ کے فیصلے کے لئے تقریباً سات بار اجلاس منعقد کئے گئے مگر چودھری صاحب اپنی بات کے پکے تھے۔ وہ تنہا اس بل کے خلاف بولتے رہے۔ ادھر ممبرانِ ایسوسی ایشن کا ارادہ یہ تھا کہ جب تک چودھری صاحب متفق نہ ہوں گے ہم یہ بل پاس نہیں کریں گے۔ بات یہ نہ تھی کہ "پاکستان بک سیلرز ایسوسی ایشن" یہ بل پاس نہ کر سکتی تھی۔ بلکہ صرف چودھری صاحب کا احترام ملحوظِ خاطر تھا۔ بالآخر جب چودھری صاحب کو اس بات کا علم ہوا کہ صرف میرا احترام آڑے آ گیا ہے اور مسئلہ بلاوجہ التوا میں ہے، تو انہوں نے آخری میٹنگ میں بخوشی مسکراتے ہوئے کہہ دیا کہ یہ بل پاس کر دیا جائے۔

چودھری مرحوم اس دور میں آل راؤنڈر پبلشر کی حیثیت سے اس وقت کے سب سے بڑے پبلشر تھے۔ کیونکہ وہ درسی اور ادبی دونوں قسم کی کتب کا کاروبار کرتے تھے۔ وقت نے انہیں ایسا سرچشمہ ثابت کیا کہ اس میں سے کئی سوتے پھوٹ پڑے مثلاً چودھری نذیر صاحب نے "نیا ادارہ" -

قائم کیا اور چودھری نذیر صاحب کے دوسرے بھائیوں بشیر احمد چودھری، رشید احمد چودھری، جناب حنیف رامے اور حنیف چودھری نے اپنی کوششوں سے مکتبۂ جدید کو ایک کامیاب ترین ادارہ بنایا۔

لیکن چودھری صاحب کا اپنا ادارہ "پنجاب بک ڈپو" ان کی موت کے بعد چودھری مرحوم کے بیٹوں کی خاندانی سرگرمیوں کے باعث اور نظریاتی اختلافات کی بدولت انحطاط پذیر ہو گیا مگر امید ہے کہ چودھری افتخار صاحب اس کی حالت دوبارہ سدھار لیں گے کیونکہ انہوں نے "ادب لطیف" کو ایک نئے انداز سے چلانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ابھی تک چودھری افتخار صاحب نہ جانے کیوں اس معیار کی کتابیں نہیں چھاپ رہے جس نوع کی کتابیں ان کے والد مرحوم چھاپا کرتے تھے۔

چودھری برکت علی صاحب میں منطقی اندازِ گفتگو کی بجائے شخصی رسائی کی ایک خاص قوت بھی موجود تھی اور انہیں اسی عطیۂ خداوندی کی بدولت ترقی و کامیابی حاصل ہوئی۔ میرے ان کے ساتھ کچھ زیادہ گہرے تعلقات نہ تھے، تاہم آج ان کی موت کے بعد بھی میرے دل میں ان کا اسی طرح احترام قائم ہے جیسا کہ ان کی زندگی میں تھا۔ وہ ایک خود اعتماد تاجر اور ناقابلِ فراموش شخصیت کے مالک تھے!

شیخ محمد امین (پبلشرز یونائیٹڈ)

چودھری برکت علی سے میرا تعارف شیخ اشرف صاحب جو اشرف پریس کے مالک اور میرے بزرگ ہیں کی وساطت سے ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ان دنوں شیخ اشرف صاحب کے ہاں ہی مقیم تھا اور چودھری صاحب وہاں اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ لیکن جب پبلشرز یونائیٹڈ قائم ہوا تو وہ اس کے اعزازی ڈائرکٹر کے طور پر، میرے شعبہ پریس اور دکان کے اعزازی ڈائرکٹر ہو گئے اور انہوں نے مجھے اس سلسلے میں بہت مفید مشورے دیئے اور میں نے ان کے مشوروں کی ہمیشہ تکمیل کرنے کی کوشش کی۔

دراصل چودھری صاحب پبلشرز یونائیٹڈ کے بانیوں میں سے تھے۔ شروع شروع میں یہ ادارہ "یونائیٹڈ بک ڈپو" کے نام سے قائم ہوا۔ اس ادارہ کی وجہ تشکیل یہ تھی کہ اس دور میں ہندو پبلشرز بڑے زوروں پر تھے اور ان کا اثر رسوخ بھی بہت زیادہ تھا۔ اس کے برعکس مسلمان پبلشرز گنتی کے تھے۔ کاروبار پر زیادہ تسلط ہندوؤں کا تھا اور وہ لوگ کسی بھی مسلمان پبلشر کو آگے نہ بڑھنے دیتے تھے۔ چودھری صاحب موصوف نے نہایت دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے یہ تجویز کیا کہ تمام مسلمان پبلشرز کو اتحاد کرنا چاہیے تاکہ وہ کاروبار میں ہندوؤں کے برابر چل سکیں۔ اس رائے سے تمام لوگ متفق ہو گئے۔ اور یہ ادارہ یونائیٹڈ بک ڈپو کے نام سے قائم ہوا۔ یہ سارا سلسلہ عبدالسلام صاحب کے ہاتھوں میں تھا۔ اس ادارے کے اعزازی انچارج اور محرک جناب چودھری برکت علی صاحب ہی تھے۔

ان کی شخصیت میں ایک نامعلوم سی کشش تھی کہ انسان غیر محسوس طور پر متاثر ہوتا اور گرویدہ ہوتا چلا جاتا۔ ان سے جس کی بھی ایک بار ملاقات ہوئی وہ ان کے اخلاق اور ملنسار طبیعت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ان کی یادگاروں میں سے دو قابلِ ذکر یادگاریں "ماہنامہ ادب لطیف" اور "مسلم ماڈل اسکول" ہیں۔ چودھری صاحب انتھک فیلڈ ورکر تھے۔ وہ تمام عمر محنت شاقہ کے قائل رہے وہ اس قدر محنتی تھے کہ کتابوں کے آرڈرز بک کرنے کے لیے تمام ہندوستان کا سفر کیا کرتے اور شہروں کے علاوہ قصبوں اور دیہات تک کی لائبریریوں میں معیاری قسم کی ادبی اور درسی کتب بہم پہنچاتے رہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اس ملک کے زیادہ سے زیادہ لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں اور وہ اس سلسلے میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ کاش ان کی زندگی اللہ سے دعا کرتی!

وہ ایک بلند کردار انسان، ایک تنقید نگار، ایک قابل فخر دوست اور ایماندار تاجر تھے۔ وہ ایک ذہین ادیب دوست تھے۔ انہوں نے "ترقی پسند ادب" کی ترقی و ترویج کو اس نازک وقت میں سہارا دیا جب ترقی پسند مصنفین کو کوئی بھی پبلشر اور رسالہ چھاپتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔

اس کے علاوہ انہوں نے ادیبوں سے ہمیشہ بہتر سلوک کیا اور نئے نئے ادیبوں کو عوام سے متعارف کرایا۔ اور معیاری انداز میں کتابیں چھاپ کر ترقی پسند ادب کو ملک کے کونے کونے میں پھیلا دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چودھری صاحب نے سعادت حسن منٹو مرحوم کے لئے مجھے ایک بار کہا کہ جب بھی منٹو صاحب کوئی تحریر دے کر آیا کریں انہیں بطور معاوضہ پچیس روپے فی افسانہ کے حساب سے رقم ادا کر دیا کریں کیونکہ میں اکثر انہیں اپنے دفتر میں، اپنی مصروفیات کی وجہ سے نہیں ملتا اور انہیں غیر ضروری زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ لہٰذا میں ان کے اس حکم کی عرصہ دراز تک تعمیل کرتا رہا اور چودھری صاحب بعد میں مجھے یہ رقم لوٹا دیا کرتے تھے۔

چودھری صاحب بڑے مزاح پسند تھے۔ وہ ہمیشہ بلند آواز میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ وہ پبلشر حضرات کے اجلاس میں یوں بولا کرتے تھے جیسے لڑ رہے ہوں۔ مگر میٹنگ کے بعد وہ اصرار کر کے تمام لوگوں اور دوستوں کو کسی ہوٹل میں چائے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ اور اس وقت یوں محسوس ہوتا کہ چودھری صاحب زندگی بھر کسی شخص سے کسی مسئلے پہ الجھے ہی نہیں۔ چودھری صاحب واقعی رنگا رنگ شخصیت کے مالک تھے اور ان کے جاننے والے انہیں عمر بھر فراموش نہ کر سکیں گے!

ڈاکٹر عبدالوحید (فیروز سنز)

میں آج یہ سن کر دلی اور روحانی مسرت محسوس کر رہا ہوں کہ "ادب لطیف" کو شائع ہوتے ہوئے پچیس برس ہو گئے ہیں اور یہ جریدہ مسلسل مارکیٹ میں آ رہا ہے۔ ورنہ اکثر رسائل اتنا عرصہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ چودھری صاحب کے بعد بھی ان کے بیٹوں نے چودھری صاحب کی اس انمول یادگار کو قائم رکھا۔

گو میرے چودھری مرحوم سے تعلقات میری کوتاہی کی وجہ سے استوار نہ ہو سکے۔ مگر میں نے ان کے بھتیجے نذیر احمد چودھری کو جو "نیا ادارہ" کے مالک ہیں پبلشرز کے اجلاس میں اکثر دیکھا ہے۔ وہ واقعی ایک متین و سنجیدہ طبیعت کے مالک ہیں اور ان کی سوچ اور گفتگو کا مثبت انداز مجھے پسند ہے۔

میں تو ان کے متعلق صرف اسی قدر جانتا ہوں البتہ میرے ادارے میں ان کے قریبی لوگوں میں سے مقبول انور داؤدی صاحب موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کو ان کے متعلق کچھ اور بتا سکیں۔

مقبول انور داؤدی

ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بڑے مخلص بات کے پکے، ارادے کے مضبوط، جوشیلے سیاسی کارکن، پکے احراری اور صاحب کردار تھے۔

میں نے انہیں احرار کے اکثر جلسوں، اجتماعوں اور مظاہروں میں پورے جوش و خروش سے حصہ لیتے دیکھا۔ وہ احرار تحریک کے مفاد کے لئے لڑ مرنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ احرار ہی ایک ایسی سیاسی تحریک ہے جو کہ مسلمانانِ ہند کے حقوق

کے تحفظ کے لئے ایماندارانہ اور بے لوث خدمات سرانجام دے رہی ہے۔

وہ گفتگو میں بڑے بے باک تھے۔ اور ان کی صاف گوئی کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی وہ "مجلس احرار" کی خاص میٹنگ میں ممبران مجلس احرار اور بڑے بڑے احراری لیڈروں کے حلقے میں حسب عادت اپنے جوشیلے اور بے باک انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تو وہ مولانا عطا اللہ شاہ جیسے بلند پایہ مقرروں سے بھی نہ گھبراتے تھے۔

(پبلشرز اینڈ بک سیلرز) شیخ محمد اشرف
(غلام علی اینڈ سنز) شیخ نیاز احمد
(روزنامہ احسان) ملک نور الٰہی

شیخ محمد اشرف:۔ چودھری صاحب، شیخ نیاز صاحب، ملک نور الٰہی اور میں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم سب کا روزانہ محفل جمانے کا ایک معمول بن چکا تھا۔ اور ہم لوگ اکثر رات کے گیارہ بجے تک کسی ہوٹل میں یا پھر اگر سیر کا موڈ ہو تو لارنس گارڈن چلے جایا کرتے تھے۔ خوب خوب خوش گپیاں ہوتیں لطیفہ گوئی، فقرہ بازی، سیاست، ادب، پبلشنگ ہر قسم کی گفتگو کیا کرتے تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ محفلیں انہی کے دم سے تھیں۔ چودھری صاحب فی الواقع ہماری محفلوں کی جان تھے۔ ایک غمگسار تھے۔ وہ دوستوں کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔ ہم سب لوگ ان کے ادارہ میں چوکڑی جمائے بیٹھے رہتے اور اس دوران اگر کوئی ملنے آیا ہو اور اس سے ملنے میں چودھری صاحب کو مالی طور پر کتنا ہی نفع حاصل ہونے کا امکان کیوں نہ ہو وہ اطلاع لے کر آنے والے ملازم کے ہاتھ کہلا بھیجتے کہ میں اس وقت مصروف ہوں۔ پھر کسی وقت تشریف لائیں۔ ہم نے اپنی زندگی میں ایسے دوست نواز لوگ کم ہی دیکھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کی وفات کو تقریباً گیارہ یا بارہ سال کا عرصہ تو ہو ہی گیا ہے۔

ملک نور الٰہی:۔ میرے خیال سے یہ روح فرسا واقعہ ۱۹۵۲ء کا ہے۔

شیخ نیاز احمد:۔ ملک صاحب گو بارہ برس کا طویل عرصہ گذر چکا ہے مگر آج بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ "کل" کی بات ہے۔ اور جب ہم تینوں دوست مل بیٹھتے ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ ہم چودھری صاحب کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ وہ ابھی آ جائیں گے اور ہماری محفل کو زعفران زار بنا دیں گے۔

ملک نور الٰہی:۔ آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔ بالکل یہی احساس ہوتا ہے۔ ہم جب تک زندہ ہیں۔ چودھری صاحب کی کمی محسوس کرتے رہیں گے۔ مجھے اس وقت بیدم وارثی کا ایک شعر یاد آ گیا ہے۔

جلا کر شمع ساری عمر پروانے کو روتی ہے
اور اپنی جان دے کر چین سے سوتا ہے پروانہ

شیخ اشرف:۔ ان کی ملاقات پبلشرز یونائیٹڈ کی تشکیل کے زمانے میں ہوئی تھی۔ یہ یونائیٹڈ پبلشرز کی پہلی میٹنگ تھی۔ اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ میٹنگ "دارالاشاعت پنجاب" میں منعقد ہوئی تھی۔ اور پھر یہ دوستانہ تعلقات مضبوط تر ہی ہوتے گئے۔

شیخ نیاز احمد:۔ ملک صاحب آپ کو یاد ہوگا کہ اس دور میں ایجوکیشنل پبلشرز میں چودھری صاحب کا نام اگر سرفہرست نہیں تو ایک نمایاں مقام ضرور رکھتا تھا۔

ملک نور الٰہی:۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اور آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ درسی کتابوں کے علاوہ بھی ہر نوع کی کتابوں کے کامیاب

ناشر تھے۔

شیخ محمد اشرف: ۔ انہوں نے "ادب جدید" کی اشاعت میں بڑی محنت کی ہے۔ "ترقی پسند ادب" کے لئے وہ بڑا خطرناک دور تھا۔ بڑے بڑے پبلشر ترقی پسند مصنفین" کی تحریریں چھاپنے سے گھبراتے تھے۔ ایک تو مارکیٹ میں اس ادب کی کوئی خاص مانگ نہ تھی۔ دوسرے حکومت بھی ایسے پبلشرز کو تنگ کرتی تھی جو ترقی پسند ادب چھاپنے کی جرأت کرتا۔

ملک نور الٰہی: ۔ مگر شیخ صاحب ہمارے چودھری صاحب کا یہ قدم قابل تحسین و آفرین۔ ایک وقت تو انہوں نے اس ادب کی اشاعت کے سلسلے میں اپنی فطری حوصلہ مندی اور جرأت کا مظاہرہ کر کے ایک جوا ہی کھیلا تھا مگر بعد میں اس کے نتائج بڑے صحت مند ثابت ہوئے کیا خیال ہے آپ کا!

شیخ اشرف: ۔ میں تو یہ کہوں گا کہ چودھری صاحب کی بدولت ہی اس دور میں ادب کا ایک جدید اور انوکھا پہلو سامنے آیا۔ اور صرف یہی نہیں، بلکہ نئے نئے ادباء و شعراء بھی دریافت ہوئے۔ اور اس کا سہرا چودھری صاحب کے ہی سر رہا۔

شیخ نیاز احمد: ۔ اور شیخ صاحب "ماہنامہ ادب لطیف" کے ذریعے بھی تو چودھری صاحب نے اس "جدید ادب" کی تحریک کو عوام میں بڑی محنت سے پھیلایا اور عوام کے دلوں میں ترقی پسند ادب کی جڑیں مضبوط کر دیں اور یہ "ماہنامہ ادب لطیف" بھی جو ربع صدی سے متواتر شائع ہو رہا ہے، یہ بھی تو انہیں کی انتھک محنتوں کا نتیجہ ہے۔

شیخ محمد اشرف: ۔ اس میں کیا شک ہے! اگر وہ اس ادب کی اشاعت میں اس قدر مشقت اور کاوش سے کام نہ لیتے تو ممکن ہے کہ یہ ادب شائع تو ضرور ہوتا مگر شاید اپنا صحیح مقام حاصل نہ کر سکتا اور پھر ہمارے چودھری صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین بھی تو انتھک اور مسلسل "کام" اور "محنت" ہی تھا۔

ملک نور الٰہی: ۔ شیخ صاحب، چودھری صاحب ایک کامیاب ناشر ہی نہیں تھے بلکہ آپ جانتے ہیں کہ اس دور کی علمی اور مذہبی سیاست میں بھی ایک خاص مسلک رکھتے تھے۔

شیخ محمد اشرف: ۔ وہ "مجلس احرار" کے بے لوث اور سرگرم رکن تھے۔

شیخ نیاز احمد: ۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے انہیں "سرخ" قمیض میں ملبوس "مجلس احرار" کے اکثر مظاہروں میں نعرے لگاتے دیکھا ہے۔

شیخ محمد اشرف: ۔ صرف یہی نہیں شیخ صاحب، آپ اور ملک صاحب اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ زبانی طور پر ہی اس تحریک سے وابستہ نہیں تھے بلکہ وہ "احرار" کے لئے اپنا قیمتی وقت بھی صرف کرتے تھے اور آپ شاہد ہیں کہ انہوں نے "مجلس احرار" کی کئی بار کثیر رقم سے بھی مدد کی۔ اور وہ اس تحریک کے مفاد کو نقصان پہنچتا دیکھ کر لڑ مرنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔

شیخ نیاز احمد: ۔ ان کی وفات بالکل غیر متوقع طور پر ہوئی۔ ان کی صحت اتنی اچھی تھی کہ ان کی موت کا یقین نہ آتا تھا۔ وہ تمام عمر صوم و صلوٰۃ کے پابند رہے۔ وہ ماہ رمضان تھا۔ چودھری صاحب آٹھ پہرے روزے سے تھے۔ وہ ہمیشہ چائے کی پیالی سے روزہ افطار کیا کرتے تھے۔ لیکن اس روز خلاف معمول انہوں نے غیر معمولی ٹھنڈے دودھ سے روزہ افطار کیا۔ وہ دودھ کا لبالب گلاس ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پی گئے۔ دودھ کا پینا تھا کہ تڑپ کر بے ہوش ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی صحت خراب ہو گئی۔ کچھ عرصہ تک وہ ڈاکٹروں کے زیر علاج

رہ کر تندرست ہو گئے۔ اس کے بعد ایک روز ملک نور الٰہی صاحب نے ہم سب دوستوں کو اپنے برف خانے میں آموں کی دعوت پر مدعو کیا۔ چودھری صاحب بھی موجود تھے۔ اس دعوت میں آموں اور انواع و اقسام کے کھانوں کے علاوہ مرغ کا گوشت بھی تھا۔ مرغ کا گوشت چودھری صاحب کی مرغوب خوراک تھا۔ لہٰذا انہوں نے مرغ کی ایک ٹانگ کھانی شروع کی تو ہم لوگوں نے ٹوکا کہ ڈاکٹروں نے آپ کو مرغ خوری سے پرہیز کی ہدایت کر رکھی ہے۔ مگر وہ نہ مانے بس اس کے بعد دوبارہ ان کی صحت خراب ہونی شروع ہو گئی بالآخر ڈاکٹروں کی تجویز کے مطابق انہیں میو ہسپتال داخل کرایا گیا لیکن پھر ان کی صحت بہتر نہ ہو سکی۔ انہوں نے اپنی موت سے تین روز پہلے یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ مجھے صرف تین روز کی مہلت ملی ہے۔ اب مجھے گھر لے چلو تاکہ میں اپنی موت سے پہلے خاندان کے لئے وصیت وغیرہ کر کے بے فکر ہو جاؤں۔ لہٰذا انہیں ان کی خواہش کے مطابق گھر لایا گیا۔ انہوں نے اپنے خاندانی فرائض "وراثت و وصیت" ادا کئے اور اپنی پیش گوئی کے مطابق ۸ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو وفات پا گئے۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے!

آغا شورش کاشمیری

ان دنوں وہ چودھری عبدالحق صاحب کے ہاں آیا کرتے تھے۔ بس ان سے میری ملاقات بھی چودھری عبدالحق صاحب کے ذریعے ہی ہوئی۔ میرے چودھری مرحوم سے کچھ زیادہ گہرے تعلقات نہ تھے۔ البتہ سیاسی طور پر وہ میرے ہم خیال تھے اور ان کے میرے درمیان صرف یہی ایک قدر مشترک تھی۔

چودھری مرحوم ان تمام تر لوگوں کے مددگار و معاون رہے ہیں جو برٹش امپیریلیزم کے خلاف جدوجہد کرتے رہے وہ صحیح معنوں میں حریت پسند تھے اور ملک کی آزادی کے خواہاں تھے۔ انہیں کسی عہدے کی خواہش نہ تھی۔ وہ احرار کے ایک سرگرم اور بے لوث سیاسی کارکن تھے۔ ایسی جماعتوں کا مرحوم نے وقتاً فوقتاً مالی طور پر بھی ساتھ دیا۔

"ترقی پسند ادب" ـــــ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ترقی پسند ادب کو پنجاب میں اشاعتی اعتبار سے روشناس کرانے والے بھی چودھری برکت علی مرحوم اور ان کا مکتبہ ہی تھا۔

وہ بڑے محنتی اور جفاکش تاجر تھے۔ وہ فن اشاعت کے تمام رموز سے مکمل طور پر واقف تھے۔ کتابوں کی اشاعت میں انہیں خاص دسترس و مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے ہمیشہ دیدہ زیب اور اشاعتی اعتبار سے معیاری کتابیں چھاپیں پنجاب کے مسلمان ناشروں میں پہلی بار سیاسی کتابیں چھاپنے کا شرف "مکتبۂ اردو" ہی کو حاصل ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ چودھری مرحوم دل کے غنی اور خدا ترس و غریب پرور تھے۔ مرحوم اپنی زندگی میں بے شمار بے سہارا، یتیموں، بے کسوں اور بیواؤں کی خفیہ مالی امداد کرتے رہے۔ لیکن ان کی زندگی میں مجھے اس کا علم نہ ہو سکا۔ ان کے کردار کے اس قابل ستائش پہلو کا انکشاف پہلی اور آخری بار ان کے جنازے پر، ان یتیموں اور بیواؤں کی آہ و زاری کی بدولت ہوا جو اس وقت ان کی موت کی روح فرسا خبر سن کر اپنے اس محسن و مددگار کو آخری بار دیکھنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر تصدق حسین خالد

چودھری مرحوم سے میرے دوستانہ تعلقات نہیں تھے۔ وہ میرے پاس پہلی بار، جہاں تک مجھے یاد ہے "کلوپیٹرا" کے اس ترجمے کی بات چیت کرنے

کے لئے آئے تھے جو میری بیگم نے کیا تھا۔ اس کے بعد وہ کبھی کبھار کوئی قانونی مشورہ کرنے کی غرض سے آتے رہے۔

اس میں شک نہیں کہ "ماہنامہ ادب لطیف" ان کی ایک ناقابلِ فراموش ادبی یادگار رہے۔ انہوں نے اس ماہنامہ کے بل بوتے پر ترقی پسند ادب کو عوام میں روشناس کرایا۔ یہ ترقی پسند مصنفین کا واحد جریدہ تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی بساط سے زیادہ سرمایہ صرف کیا۔

بیگم تصدق حسین خالد

وہ سیاسی ہماہمی کا دور تھا تمام سیاسی ورکر الیکشن کی سرگرمیوں میں تھے میں خود بھی چونکہ انتخابات میں عورتوں کی ممبر کی حیثیت سے الیکشن لڑ رہی تھی۔ اس لئے دن رات اسی سلسلے میں مصروف تھی۔ اس الیکشن کے دور میں ہی چودھری برکت علی مرحوم سے ملاقات ہوئی وہ بڑے پرجوش سیاسی کارکن تھے۔ وہ اس درجہ مخلص اور ایسے بے لوث شخصیت کے مالک تھے کہ انہوں نے بغیر کسی پیش کش اور غرض لالچ کے میرے الیکشن کے بہت سے کام اپنے ذمے لے لئے۔

اس کے بعد انہوں نے ایک روز مجھے اپنے گھر دعوت دی۔ میں نے پہلی بار ان کے بیوی بچوں کو دیکھا۔ وہ اس دعوت کے روز بڑے خوش خوش نظر آرہے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ وہ اپنے قریبی دوستوں اور عزیز و اقرباء کی دعوتیں کرکے ہمیشہ خوش ہوا کرتے تھے۔ اس دعوت میں انہوں نے بغیر کسی بناوٹ کے مجھ سے کہا "آپ جب بھی قومی خدمت کے موقع پر میری ضرورت محسوس کریں، میں اس میں حصہ لینے میں اپنی خوش بختی سمجھوں گا! ہر ایسے موقع پر آپ مجھ کو تیار پائیں گی۔"

ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ تمام مسلمانانِ ہند کو آزادی مل جائے اور وہ برطانوی سامراجیت کے چنگل سے نکل جائیں۔ وہ تعلیمی کاموں میں بھی بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ مسلمانوں میں علم کی ترقی و ترویج کے بے حد خواہاں تھے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت "مسلم ماڈل اسکول" ہے۔ جو انہوں نے اپنے چند ہم خیال دوستوں کے تعاون سے قائم کیا۔

انہوں نے اپنے ادارے کے ذریعے "ادب لطیف" کی وساطت سے ایک ناشر کی حیثیت سے ناقابل فراموش ادبی خدمات سرانجام دیں۔ ہم لوگوں کو اور مسلمان قوم کو ان کی یہ خدمات ہمیشہ یاد رکھنی چاہییں۔ میں خوش ہوں کہ ان کے پسماندگان نے ان کے مسلک ادب کے بوجھ کو بڑی قابلیت سے سنبھالنے کی کوشش کی ہے۔ خدا انہیں دن دگنی رات چوگنی ترقی دے تاکہ وہ چودھری مرحوم کی "ادبی یادگار" "ادب لطیف" کی صحیح دیکھ بھال کر سکیں۔

شیخ حسام الدین بی اے

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ میرا خیال ہے کہ تقریباً جنوری یا فروری کا مہینہ تھا۔ لیکن میں یہ پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سنہ ۱۹۲۱ء میں جمیعت العلماء کی کانفرنس لاہور میں ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کی صدارت مولانا آزاد مرحوم نے کی تھی۔ میں اس کانفرنس میں شمولیت کے لئے امرتسر سے خلافت والنٹیرز کا ایک جیش لے کر لاہور آیا تھا۔ وہ بڑا جذباتی دور تھا۔ اس دور میں مسلمان قوم نے یوں محسوس ہوتا تھا گویا اپنے بہترین دل و دماغ اور ادراک کے لوگ اگل کر رکھ دیئے تھے۔ اس جمیعت العلماء کی کانفرنس میں میری اور چودھری صاحب کی علیک سلیک ہوئی پھر یہ تعلقات، بے شمار سیاسی اختلافات کے باوجود بھی کبھی منقطع تو کیا بال برابر کم اور کمزور نہ ہوئے۔

مجھے یاد ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا حبیب علی برادران ناراض ہو چکے تھے اور میں تحریکِ خلافت ہی کے سلسلے میں مرکز سے الگ ہو گیا، لیکن قومی خدمت کے جذبہ نے مجھے ہمت نہ ہارنے دی اور میں مایوس نہ ہوا۔ بلکہ مرکز سے الگ ہو کر بھی "پنجاب خلافت کمیٹی" قائم کر کے قوم کے ایک سچے اور بے لوث کارکن کی حیثیت سے قوم کی خدمت کرتا رہا۔

مرحوم نے ان سیاسی اختلافات کے باوجود ذاتی تعلقات میں سرِ مو فرق نہ آنے دیا۔ مرحوم ہمیشہ ایک دردمند دل رکھنے والے مخلص سیاسی کارکن کی حیثیت سے پوری حوصلہ مندی سے ہمارا ساتھ دیتے رہے۔

مگر انہوں نے عملاً "آزادیٔ پاکستان" سے پہلے ہی سیاسی طور پہ ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ لیکن ناراض ہو کر نہیں بلکہ وہ پنجاب کی دہشت پسند تحریک سے کچھ اس حد تک متاثر ہوئے کہ انہیں نے سیاست سے الگ ہونا ہی ناگزیر محسوس ہوا۔ اس کے علاوہ ان کی علمی اور تعلیمی محکموں کی کاروباری مصروفیات بھی اس قدر بڑھ گئیں کہ وہ ہمارا ساتھ چھوڑنے پہ مجبور ہو گئے۔ لیکن سیاست سے الگ ہو کر بھی اپنے مسلک پہ قائم رہے۔ سیاسی علیحدگی کے بعد "ادبِ لطیف" کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ برطانوی حکومت کی پولیس اگرچہ ان کے راستے میں ہر نوع کی رکاوٹوں کی دیواریں کھڑی کرنے کی کوششیں کرتی رہی لیکن یہ حوصلہ مند شخص پوری عمر اپنے اختیار کردہ مسلک پہ ڈٹا رہا۔ اور ان کی یہی ایک ایسی خوبی تھی کہ جو آج کے معاشرے میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ ملک کی جدید ضرورتوں کو اگرچہ انہوں نے نظر انداز نہیں کیا لیکن یہ ان کی خوبی تھی کہ وہ اپنے مسلک پر بھی قائم رہے اور ملک کی ترقی کے راستے میں ان پر کسی قسم کی شکایت آمیز تنقید نہ کی جا سکی۔ بدلتے ہوئے حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے انہوں نے مثبت طور پر "ادبِ لطیف" کے ذریعے قوم کے نوجوانوں میں صحیح سیاسی شعور پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کی ترقی کی طرف توجہ دلانے کی خاموش مہم بھی جاری رکھی۔ اس خاموشی کے ساتھ کہ بدترین دشمن بھی ان کے خلاف زبانِ طعن دراز نہ کر سکے۔

مجھے تفصیلاً علم ہے۔ اگرچہ میں ان تفصیلات میں نہیں جا سکتا کہ وہ سیاسی انجمنوں کے علاوہ ضرورت مند طلباء اور تعلیمی و معاشرتی اداروں کی بھی مالی طور پہ باضابطہ خاموش خدمت و مدد کرتے رہے۔ مجھے ان کی دوستی پر ناز ہے۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر مرحوم کی اس بلند کرداری پر فخر ہے کہ وہ مرتے دم تک ایک ہی سیاسی جماعت "مجلسِ احرار" سے منسلک رہے۔

میاں نعیم، نعیم اینڈ کمپنی

۱۹۲۰ء میں چودھری برکت علی کا ہمارے گھر آنا جانا تھا۔ اور چودھری برکت علی اس زمانے میں بھاٹی سکول میں پڑھتے تھے۔ پھر میں بھی سنٹرل ماڈل سکول سے یہاں آ گیا۔ چودھری برکت علی تعلیمی طور پہ مجھ سے ایک سال پیچھے تھے۔ اس طرح وہ میرے کلاس فیلو تو نہیں البتہ سکول فیلو ضرور تھے۔ لہٰذا ہم دونوں ایک دوسرے کو اوائل عمر ہی سے جانتے تھے۔

ایک دن چودھری برکت علی نے باتوں باتوں میں مجھ سے اس بات کا اظہار کیا کہ مسلمان پبلشرز کا اتحاد ہونا چاہیے تاکہ ہم مسلمان پبلشرز ہندو پبلشرز کا مقابلہ کر سکیں۔ اس ارادے کی تکمیل کے لیے میں نے "دارالاشاعت پنجاب" والے حمید علی، احسان اخبار کے مالک ملک نور الٰہی، غلام علی اینڈ سنز والے شیخ نیاز احمد، اشرف پریس والے شیخ اشرف صاحب اور برکت علی اینڈ سنز والے شیخ برکت علی جیسے لوگوں کو چودھری برکت علی صاحب کی حسبِ منشا اکسایا۔ لہٰذا ان سب لوگوں کے تعاون کی بدولت یونائیٹڈ پبلشرز کی تشکیل ہوئی۔

چودھری مرحوم دوستوں کے دوست تھے اور بعض اوقات تو وہ دوستوں کے لیے جان جوکھوں میں ڈالنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ ان

میں ہر ضرورت مند کی مدد کرنے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اس سلسلے میں میں ایک واقع بتانا چاہتا ہوں۔ چودھری صاحب کے ایک دوست محمد رفیق صاحب تھے۔ یہ اچھے کے ذیلدار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۹۲۸ء میں چودھری صاحب اپنے چند دوستوں کے ساتھ، جن میں رفیق صاحب بھی شامل تھے۔ ہمارے پاس "مری" آئے۔ کیونکہ ان دنوں جہاں آج کل گورنمنٹ ہاؤس ہے۔ وہاں "جنیکل ہال" پر ہماری رہائش گاہ تھی۔ چنانچہ یہ تمام لوگ ہمارے ہاں مہمان ہوئے۔ ایک دن ہم سب سیر کر رہے تھے کہ اچانک محمد رفیق صاحب کا پاؤں پھسلا اور وہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے لڑھکتے ہوئے تقریباً چار سو فٹ کی گہرائی تک چلے گئے۔ ہم سب کے حواس ٹھکانے نہ رہے۔ لیکن چودھری برکت علی صاحب اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر محمد رفیق کو جو کہ بہت زخمی ہو چکا تھا۔ اٹھا کر لائے۔ اس کے بعد ایک بار جب ہم سب لوگ مہاراجہ کشمیر کے مہمان تھے۔ تو سری نگر میں ڈل دیکھ کر رفیق صاحب کو تیرنے کا شوق چرایا۔ تیرتے تیرتے ان کا سانس پھول گیا اور وہ بے بس سا ہو گیا۔ اس میں واپس لوٹنے کی طاقت نہ رہی۔ آخر اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے حتیٰ کہ وہ اسی حالت میں ڈل کی تہہ تک جا پہنچے یہ دیکھ کر برکت علی صاحب نے بھی ڈل میں چھلانگ لگا دی اور رفیق صاحب کو مرنے سے بچایا۔

شاید اسی جذبہ کا نتیجہ تھا کہ وہ قوم کی خدمت کرنے کے لیے "مجلس احرار" سے منسلک ہو گئے اور انہوں نے اس جماعت کے ذریعے اپنی قوم کی یعنی تمام مسلمانانِ ہند کی خدمت کرنے کی کوشش کی۔ وہ "مجلس احرار" کی مالی طور پر بھی خدمت کیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے اپنی موت سے تقریباً چار روز پہلے بھی "مجلس احرار" کو ایک کثیر رقم دی۔

اس میں کوئی شک نہیں "ادب لطیف" ان کی ایک اہم یادگار ہے گو اس کی پالیسی بدل چکی ہے۔ چودھری صاحب نے اپنے گرد بہت سے ادیب و شعرا اکٹھے کر رکھے تھے۔ وہ اس درجہ دریا دل اور ساتھ ہی ساتھ حساس تھے کہ اکثر اپنے مصنف دوستوں کے گھر جا کر اگر ان میں سے کسی کے حالات خراب ہوں تو بغیر کسی تحریری ثبوت اور شہادت کے حسبِ ضرورت رقم دے آتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ جب چودھری برکت علی نوبت سے امارت کی طرف آئے تو اس وقت بھی انہوں نے اپنے عزیز و اقارب اور بجولیوں کو نہیں بھلایا اور ان کی پہلے سے زیادہ خدمت کی۔ میں ان کی موت کے بعد اب صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ مرنے والا بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔

م۔ش (اقدام والے)

اس میں شک نہیں کہ چودھری صاحب ایک صاحب کردار شخص تھے۔ میرے اُن کے دوستانہ تعلقات نہیں تھے۔ وہ "مجلس احرار" کے ایک مخلص کارکن تھے اور میں پکا مسلم لیگی۔ اس لحاظ سے وہ میرے لئے ایک حزبِ مخالف کی حیثیت رکھتے تھے۔ ویسے وہ ایک سلجھے ہوئے ناشر اور ایک محنتی تاجر تھے۔

اصل میں اُن کے بھتیجے چودھری نذیر صاحب سے ہی میرے زیادہ مراسم تھے، جو "نیا ادارہ" کے مالک ہیں۔ ویسے چودھری مرحوم نے ایک مخلص ناشر کی حیثیت سے "ادبِ لطیف" کے ذریعے ترقی پسند مصنفین کی عوام میں ساکھ قائم کرنے کا ایک عظیم کارنامہ سر انجام دیا۔ علاوہ ازیں "ادبِ لطیف" اُن کی ایک اہم یادگار ہے۔

ان کی شخصیت کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ وہ ایک مستعد، پُرجوش اور انتہا پسند محنتی شخص تھے۔ انہوں نے اپنی خون پسینہ ایک ہو جانے والی انتھک اور مسلسل محنتوں سے اپنے کاروبار میں بہت ترقی حاصل کی۔

مخمور جالندھری

ترقی پسند اور صحت مند ادب کی اشاعت کے لئے ہاتھ بھر کا کلیجہ چاہیئے۔ اور ہاتھ بھر کا کلیجہ چودھری برکت علی کا تھا۔ جنہوں نے سب سے پہلے وقت کی آواز کو پہچانا اور ایسے ادب کی اشاعت کی جو ہماری زندگی سے بہت قریب تھا۔ اشاعت کے سلسلے میں نئی نئی راہیں پیدا کیں۔ کتابوں کی گٹ اپ کے سلسلے میں ان کی کوشش اجتہاد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ چودھری صاحب کے سلیقہ اور نفاست پسندی کا ثبوت ہے۔ وہ بنی ہوئی لکیروں پر کبھی چلنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ اُن دنوں جہاں ترقی پسند ادیبوں پر رجعت پسندوں کی طرف سے عتاب نازل ہو رہا تھا وہاں اس ادب کے ناشر چودھری صاحب پر بھی لٹھ روایت پسند حلقے اپنی جھلاہٹ کے تیر چھوڑ رہے تھے۔ مگر چودھری برکت علی ایک حوصلہ مند انسان تھے۔ اپنی دھن کے پکّے تھے۔ عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو پر فحاشی کے سلسلے میں مقدمے چلائے گئے تو چودھری صاحب سرکاری مشینری سے ٹکرا گئے مگر پیچھے نہ ہٹے۔ مقدموں کے دوران میں ان کا رویہ ایک جنگجو سپاہی کا سا تھا۔ انہوں نے ہمّت اور دریا دلی کا کئی مرتبہ مظاہرہ کیا بعض اوقات تو وہ اپنی بساط سے زیادہ چھلانگ لگا دیتے۔ ان دنوں نئی پود کے امام جوشؔ ملیح آبادی سمجھے جاتے تھے۔ چودھری صاحب نے جوشؔ کے تمام مجموعوں کے سلسلے میں پانچ سالہ معاہدہ کیا یعنی پانچ سال تک وہ کلامِ جوشؔ چھاپتے رہیں گے اور اس کے عوض میں چودہ ہزار روپے دیں گے۔ چودہ ہزار روپیہ شاید چودھری صاحب کے لئے بھاری رقم نہیں تھے لیکن دوسرے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ایک ہی مصنف کو اتنی رقم پیشگی بہت بڑی بات تھی۔ جبکہ دوسرے ناشروں ہاں کسی تصنیف کے دائمی حقِ اشاعت لینے کے لئے پچاس روپیہ سے زیادہ ادا کرنے کی روایت ہی نہ تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ مکتبۂ اُردو کی بنیاد کے وقت اُسے مضبوط بنانے کے لئے چودھری صاحب نے بھی کچھ مسودے سستے داموں لئے لیکن بعد میں انہوں نے ادیبوں اور فنکاروں کو معقول رائلٹی دینے کی رسم چلائی۔ اس رواج کی پہل چودھری صاحب ہی نے کی۔ اس پر اُن کے ہمعصر ناشروں نے ناک بھوں چڑھائی۔ وہ بھنّائے اور جھلّائے مگر بعد میں انہیں بھی ہوش آ گیا کہ کاروبار کا صحیح طریقہ وہی تھا جس پر چودھری صاحب چل رہے تھے۔

اُدھر ہندوستان کے ادیبوں کو پہلی مرتبہ احساس ہُوا کہ ان کی ادبی ریاضت "نیکی کر اور دریا میں ڈال" کے مترادف نہیں۔

چودھری صاحب کی ناشرانہ سرگرمیاں اپنے ہی ادارے تک محدود نہیں تھیں۔ وہ اُردو کی ترویج و ترقی کے لئے بھی دوڑ دھوپ کرتے رہے۔ کتابت طباعت اور گٹ اپ کے اعتبار سے اچھّی کتابیں چھاپ کر نئے لکھنے والوں کو ادب کے میدان میں آتا رکر اور اُن کی حوصلہ افزائی کر کے انہوں نے اُردو میں نہایت اچھّی چیزیں لکھوائیں۔ ایک دفعہ تو انہوں نے عجیب و غریب پروگرام بنایا۔ ادیبوں سے زبردستی کچھ نہ کچھ لکھوانے کے لئے، انہوں نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ ہندوستان کے جس کونے میں بھی کوئی ادیب چھپا ہُوا تھا چودھری صاحب چیک بُک لے کر اس کے پاس پہنچے۔ کسی کو افسانوں کے لئے، کسی کو ڈراموں کے لئے، کسی کو تنقید و تحقیق کے لئے اور کسی کو ناول لکھنے کے لئے اُبھارا۔ اور رائلٹی پیشگی دے دی۔ یہ اس طوفانی دورے کا نتیجہ تھا کہ عصمت چغتائی نے ناول "ٹیڑھی لکیر" لکھا۔ باری نے "کمپنی کی حکومت" کو اور جامہ بنایا۔ اختر حسین رائے پوری نے "جنگ اور ادب" کے نام سے تنقیدی مضامین لکھے۔ کرشن چندر نے "نئے زاویے" کی جلد دوم مرتب کی۔

چھان بین، کرید اور تجسّس کو چودھری صاحب نے اُوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ جس کسی سے ملتے مشورہ کرتے۔ جن لوگوں کا مطالعہ

وسیع ہوتا ان سے موضوع پر شہرۂ آفاق کتابوں کی فہرس بنواتے۔ ہر نئے لکھنے والے کے بارے میں دوسروں کی رائے معلوم۔ اگر کسی کے ہاں کسی نئے ڈھنگ کا گردپوش دیکھا ہوتا تو اس گردپوش والی کتاب کو فوراً منگوا لیتے۔ حتیٰ کہ کتابت کو بہتر بنانے کے طویل بحث کرتے۔ شریف عباسی۔ اقبال عباسی اور محمد حسین شاہ نوجوان کاتبوں کی صلاحیتوں کو منظرِ عام پر لانے والے بھی چودھری صاحب ہی تھے۔ اور آج جو ہمیں کتابت ایسے فن میں ارتقاء کی جھلک نظر آتی ہے وہ چودھری برکت علی کی مرہونِ منّت ہے۔ جنہوں نے کاتبوں کو یقین دلایا کہ اس فن میں ترقی کی کافی گنجائش ہے۔ مشوروں کی افادیت تو چودھری صاحب خوب پہچانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شام کو وہ ادیبوں اور فنکاروں کا ایک جلوس لے کر چائے پینے نکلتے تھے۔ انارکلی کا نظام ہوٹل ادبی مباحثوں کا شام کو اکثر اکھاڑہ بنتا۔ اور اسی نظام ہوٹل کی قدیم مغل شاہی چھتوں کے نیچے اہم فیصلے ہوتے۔ پھر یہی فیصلے چودھری برکت علی کے ہاتھوں عمل میں آکر اردو ادب کو خوب صورت پیرہن دیتے۔ چودھری صاحب کو ادیبوں اور فنکاروں کی صحبت بہت پسند آتی تھی۔ رات کو کھانے پر اکثر اُن کے ہاں ادیبوں کا جمگھٹا ہُوا کرتا۔ ادیبوں کی چھوٹی چھوٹی اور ہنگامی ضرورتیں شاید سب سے زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ حقیر قسم کے اور ہر وقت کے۔ ننھے ننھے مطالبات سے ہرگز تنگ نہ آتے ——— ان کی پیشانی پر کبھی بل نہ پڑتا۔ ایک دلفریب سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر نمودار ہوتی اور ساتھ ہی چودھری صاحب جیب میں ہاتھ ڈال کر رومال نکالتے (کیونکہ اکثر وہ نوٹ رومال میں باندھ کر رکھا کرتے تھے) اور رومال جب کھلتا تو وہ کسی ادیب کے گلے میں گرم کوٹ بن جاتا ——— کسی کے پاؤں میں جوتی اور کسی کے لئے شام کی بوتل۔

اور اس طرح چودھری صاحب نے اُردو ادب کی عظیم خدمت کی۔ چودھری صاحب کی موت جس کا یقین نہیں آتا جس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اُردو کے صحت مند اور حقیقت پسند ادب کی موت معلوم ہوتی ہے۔ سامراجی دلیسوں میں بیچ کے نمائندہ ادب کو سر بازار جلایا جا رہا ہے ——— اور ایسے ادب کے ناشروں کے کان پکڑوائے جا رہے ہیں۔ وہ تائب ہو کر اپنی زندگی برقرار رکھنے اور حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے، فحش، تخیلی اور زہر بھرا لٹریچر لوگوں کے دل و دماغ میں ٹھوس رہے ہیں۔ آج ننگی کہانیاں اور ننگی تصویریں چھاپنا زیادہ آسان ہے ———۔ جمہوریت کو بے نقاب کرنے والے ادب کی اشاعت، جان جوکھوں کا کام ہے۔ ایسے وقت میں چودھری صاحب کی جدائی فاشی قوتوں اور اُن کے پٹھوؤں کی جیت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن صحت مند روایت ہمیشہ آگے بڑھتی ہے۔ مجھے چودھری صاحب کے لواحقین سے پوری توقع ہے کہ وہ اُسی دل گردے سے کام لے کر حقیقت پسند ادب کی اشاعت کا بیڑا اُٹھائیں گے اور اتنے ہی ثابت قدم رہیں گے جتنے کہ چودھری صاحب تھے کیونکہ انہیں زندہ رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

ابنِ انشا

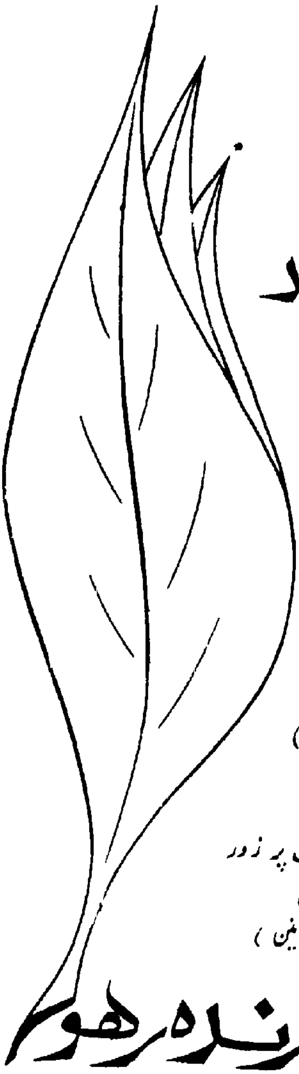
چودھری صاحب کی زندگی کیسی تھی سب کو معلوم ہے۔ انہوں نے لاکھوں کمائے اور لاکھوں ہی خرچ کئے۔ کتنے ہی اسکول اور خیراتی ادارے ان کے دم قدم سے چل رہے تھے۔ نوجوان مصنفوں سے ان کا سلوک پدرانہ اور مشفقانہ تھا۔ لیکن بات چیت اور برتاؤ میں وہ اسی بے تکلفی سے کام لیتے تھے جو برابر کے لوگوں میں ہوتی ہے۔ ان کا قہقہہ بے پناہ ہوتا تھا اور وہ ایک جگہ جم کر بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی طبیعت سیمابی تھی۔ میں نے انہیں بیٹھے بہت کم دیکھا ہے وہ ہمیشہ بھاگتے نظر آتے تھے۔ جیسے انہیں زندگی میں کام بہت کرنے ہوں

اور وقت تھوڑا ہو ——— یہ بات سچ تھی۔ ہماری نئے ادب کی تحریک جس کا ترقی پسند تحریک محض ایک حصہ ہے ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء کے قریب شروع ہوئی اور قریب قریب اسی زمانے میں "مکتبۂ اُردو" اور "ادبِ لطیف" کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس کے بعد سے اب تک اس تحریک کا ان اداروں سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور انہیں ہم ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ ہمارے اکثر بڑے مصنفین ادبِ لطیف کی وساطت سے اُبھرے اور مکتبۂ اُردو کی وساطت سے ان کی کتابیں ہمارے سامنے آئیں۔ قدامت پرست حلقوں نے نئے ادب پر ہر پہلو سے تاک تاک کر حملے کئے کبھی اس پر فحاشی کا الزام لگایا کبھی اشتراکیت کا لیبل چسپاں کیا لیکن چودھری صاحب اس ہونہار پودے کو مقدس امانت سمجھتے تھے اور ان مخالفتوں سے بے نیاز اپنی انفرادی اور ناشرانہ حیثیت میں اس کی حفاظت کے لئے سینہ سپر رہے۔

میں ان ہزاروں میں سے ہوں جنہوں نے انہیں کبھی دور سے اور کبھی نزدیک سے دیکھا ہے اور ہر بار ان کے خلوص، ایثار اور زندہ دلی سے متاثر ہوئے ہیں۔ ان کے انتقال کی خبر کے ساتھ کتنی ہی صحبتوں کی یاد میں تازہ ہو جاتی ہیں۔ کتنی ہی شخصیں ——— ذہن کے پردۂ سیمیں پر فلم کے مناظر کی طرح آتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں۔ چودھری برکت علی صاحب ایک انسٹی ٹیوشن تھے اور ادب کے سلسلے میں ان کی خدمات انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ ان کی بہترین یادگار مکتبہ اردو اور ادبِ لطیف ہیں اور یہ قائم رہنے چاہئیں۔ زندہ دلوں کے مزار ان کے دوستوں کے سینوں میں رہ جاتے ہیں۔ اس لئے ہم لوگوں کے لئے وہ اپنے کارنامے ہی نہیں بلکہ خوشگوار یادوں کا سرمایہ بھی چھوڑ کر رخصت ہوتے ہیں۔

مضامینِ نو کا ایک انبار

افراد
و
آیات
کو
خلقِ جدید
کی
دعوت



۲۶ حکایات کے ساتھ ساتھ:-

قائدِاعظم اور دورِ حاضر

ہماری ادھوری آزادی (کشمیر)

ہماری تاریخ کے پریشان اوراق

ماضی کا مستقبل

مشرقی پاکستان کا مسئلہ

پاکستان اور خدا کا خوف (دستور)

سیاسی جماعتیں اور جمہوریت

رفاہی مملکت اور ہم

قیادت کی تعمیر

زراعت پہ زور

آبادی، خوشحالی اور خانہ خرابی

خاندانی زندگی کی بنیادیں (عائلی قوانین)

باز آؤ اور زندہ رہو

حنیف رامے

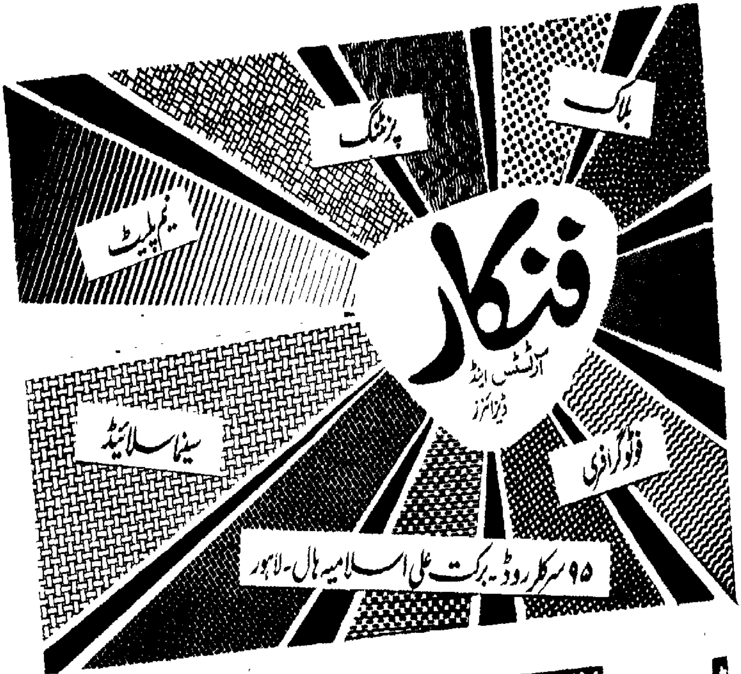
اداریے

مجلد ایڈیشن : 7.00

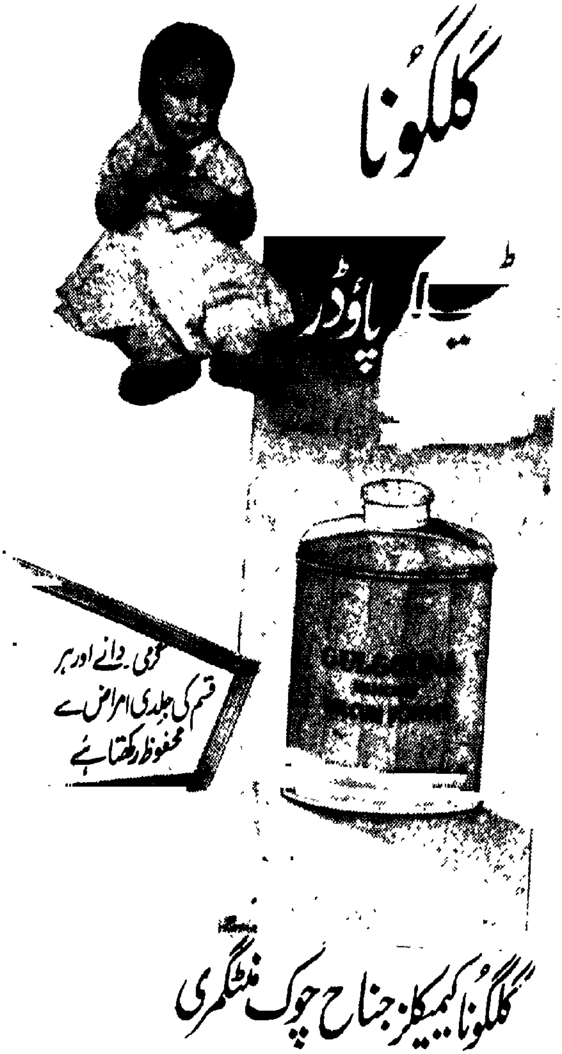
زندہ کتابیں : 3.00

مکتبۂ جدید۔ لاہور

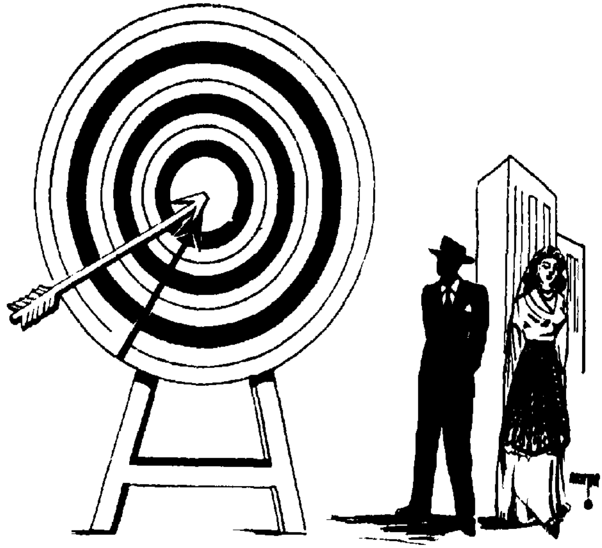
چودھری افتخار علی پرنٹر پبلشر نے استقلال پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا ۳۱۴


بلاک
پرنٹنگ
نیم پلیٹ
فنکار
آرٹسٹس اینڈ
ڈیزائنرز
سینما سلائیڈ
فوٹو گرافی
۹۵ سرکلر روڈ۔ برکت علی اسلامیہ ہال۔ لاہور


QUALITY · SERVICE · ECONOMY
GENUINE
LANGFORD
REPLACEMENT
LANGFORD INDUSTRIES P.O. BOX No. 262/CIRCULAR ROAD, LAHORE
Sales Offices.. LAHORE · DACCA · CHITTAGONG


گلگونا
پاؤڈر
گرمی۔ دانے اور ہر
قسم کی جلدی امراض سے
محفوظ رکھتا ہے
گلگونا کیمیکلز جناح چوک منٹگمری

The right **SPOT** *for the right* **JOB!**



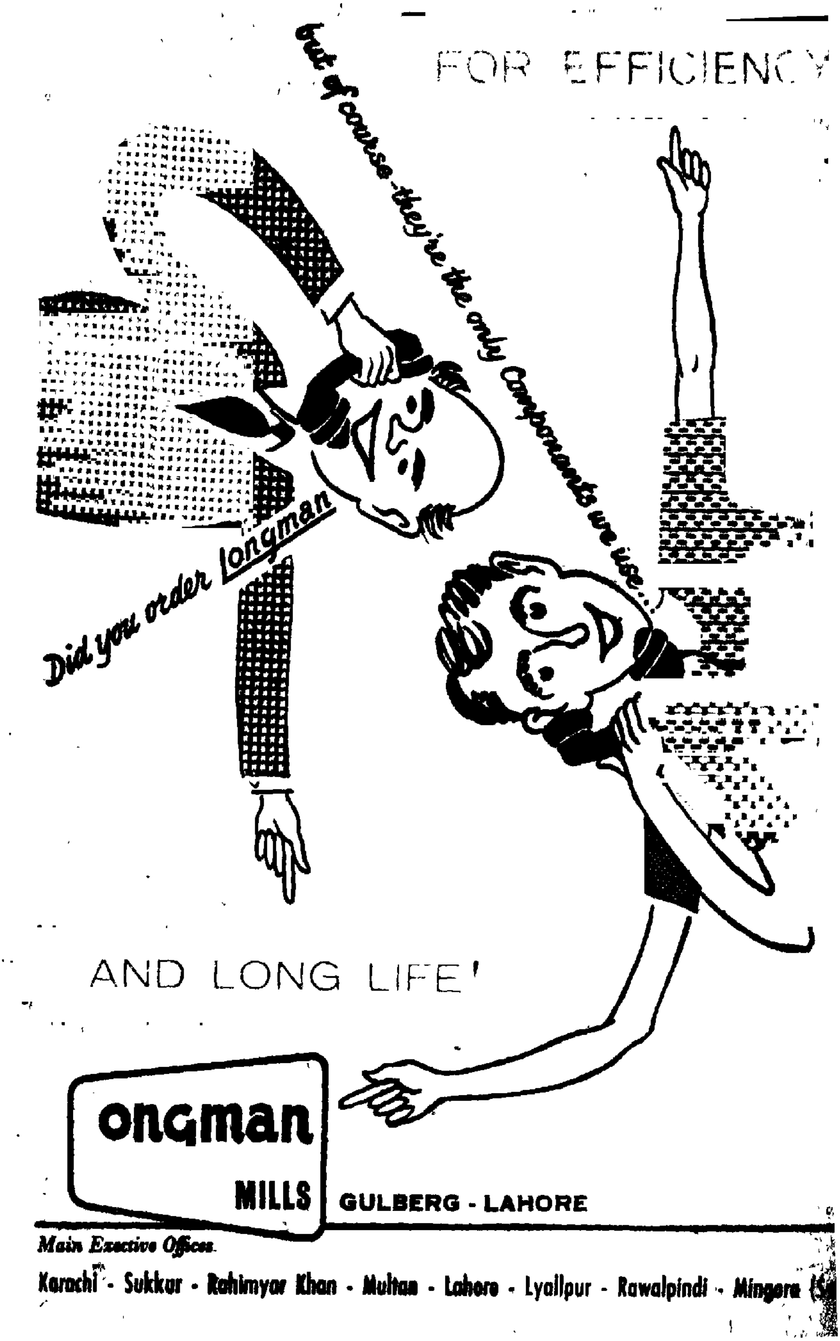
کرسٹل ڈرائی کلینرز اینڈ ڈائیرز

CRYSTAC

ELECTRIC DRY CLEANERS & DYERS

NILA GUMBAD

LAHORE


FOR EFFICIENCY
but of course—they're the only Components we use...
Did you order Longman
AND LONG LIFE'
ongman
MILLS
GULBERG - LAHORE
Main Executive Offices.
Karachi - Sukkur - Rahimyar Khan - Multan - Lahore - Lyallpur - Rawalpindi - Mingora